اجرا 24

زیر اہتمام
BEYOND TIME PUBLICATIONS
Karachi - Pakistan
اجرا
A-137, 15 A-5، بلال ٹاؤن۔ بفرزون، کراچی، پاکستان
موبائل: 0321-2312907
ijrakarachi@gmail.com
انٹرنیٹ پر دستیاب ہے: ijrakarachi.wordpress.com

اجرا 24

کتابی سلسلہ 24

کمپوزنگ، لے آؤٹ ڈیزائننگ: افضال جی/ ملک فہیم حبیب

ٹائٹل: سید شہزاد مسعود

طباعت: فضلی پرنٹرز، سائٹ۔ کراچی

قیمت: -/500 روپے فی شمارہ
بیرون ملک: (سالانہ) -/100 امریکی ڈالر (4 شمارے)
زرِ سالانہ: (پاکستان) -/1500 روپے (4 شمارے)

بیرون ملک سے ویسٹرن یونین اور ایکسپریس منی کے ذریعے
اور اندرونِ ملک ایزی پیسہ کے ذریعے زرِ سالانہ
بنام محمد اقبال شیخ
قومی شناختی کارڈ نمبر: 45501-1833847-9
پر بھیجا جا سکتا ہے

نوٹ: ادارے کا مضامین/ خیالات اور آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔
ای میل کے ذریعے اپنی نگارشات بھیجتے ہوئے ان کا عنوان اور لکھاری کا نام ای میل کے سبجیکٹ میں ضرور لکھئے۔

(فہرست)

تہذیب

خیابانِ خیال
(اداریے)

نشاطِ باریابی
(حمد، نعت، سلام، منقبت)

موضوعِ سخن
(مباحث، مسائل، تصوّرات)

مشرق و مغرب
(علاقائی اور بین الاقوامی ادب کے تراجم)

فلک آثار
(نظمیں)

نافۂ نایاب

(یادیں، خاکے، مضامین، مشاہیر کے خطوط)

خرد افروزیاں

(علمی و فکری مضامین)

سخن سخن

(غزلیں)

داستان سرا

(افسانے)

حرکتِ فکر اسلامی فی الہند

وسعتِ بیاں

(تبصرے، مضامین، اظہار خیال)

بیادِ احسن سلیم (خصوصی گوشہ)

☆-----☆-----☆

(اداریے)

اداریہ

بیتے دنوں کو سوچا نہیں جاتا، البتہ مڑ کر ضرور دیکھا جا سکتا ہے جب کہ ''حال'' میں الجھنے کی بجائے اس طرح سے دیکھنا ہوتا ہے کہ مستقبل کی تفہیم کسی حد تک ممکن ہو سکے۔ گو کہ حال، ماضی اور مستقبل وقت کے ہی نام ہیں، لیکن وقت اور زندگی کے فلسفے کی بحث میں اب ہم سب کو یوں محسوس ہونے لگا ہے گویا وقت قائم رہتا ہے اور بس ہم گزر جاتے ہیں۔

اہل دانش کا کہنا ہے کہ ادب، آرٹ اور کلچر میں وقت کا تصور ہماری دنیا کے زمانی تصور سے مختلف ہوتا ہے، چند اہم تخلیق کار، فن کار ہمارے شعور میں موجود رہتے ہیں، اس اعتبار سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ادب اور آرٹ کی دنیا میں تخلیق کار کا عرصۂ حیات قاری کے شعور اس کی حسّیت اور طرزِ احساس کا رہین منت ہے۔

اس حوالے سے احسن سلیم کے عرصہ حیات کے معاملات اس کی تخلیقات اور قاری کے مابین ہیں لیکن بہر حال یہ بات طے ہے کہ احسن سلیم نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا، وہ ہمارے معاشرے کی رکی رکی، جھکی جھکی اور مڑی تڑی زندگی کا گواہ بن گیا تھا، وہ ایسے لکھنے والوں کی تلاش میں رہتا تھا، جو اس عہد کی سچائیوں کا نہ صرف شعور رکھتے ہوں بلکہ اس عہد کی عکاسی کے عمل میں ایک دوسرے کی معاونت بھی کریں، فرد کی اہمیت اور انسانی تعلقات کے زمزمے اس کے ایقان کا حصہ تھے، وہ صوفی ازم کا مطیع (Follower) تھا اور سماجی جمہوریت (Social Democracy) کا ماننے والا بھی تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جہاں معاشی تقسیم میں واضح ناانصافیاں ہوں، افراد اور باشعور گروہوں کے طبقاتی شعور کی نمائندگی ممکن نہ ہو وہاں تضادات فروغ پاتے ہیں، بارہا اس نے یہ بھی کہا کہ ہمارے ہاں تاریخ کو محض اقتدار کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے، اس کا ایک خیال یہ بھی تھا کہ ''حال'' کے معاملات میں جذباتیت رنگ دکھاتی رہتی ہے اور ماضی کو ہم اکثر Introvert (داخلی) طریقوں سے ہی دیکھتے ہیں، احسن سلیم کا یہ سماجی شعور ہمیں ''اجرا'' کے اداریوں میں بھی نظر آتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ احسن سلیم کی شعری تخلیقات میں ابلاغ کا مسئلہ ہے، یہ اعتراض تو مگر ن۔م راشد اور شفیق فاطمہ شعریٰ ایسے شعرا کی تخلیقات کے بارے میں بھی کیا جاتا رہا ہے جب کہ احسن سلیم کے تخلیقی اداریوں کو اہم قومی اخبارات میں چھاپا گیا اور انھیں زبردست پذیرائی حاصل ہوئی۔

احسن سلیم کو سب نے دیکھا ہے وہ بہت تیز دوڑنے والا تھا، زمانے کے جَلد بَدل جانے کی خواہش رکھتا تھا... جلد چلا گیا!

''انجمن ترقی اردو'' کا حسن ظہیر، ادارے کی ترقی کے لیے اُس نے بھی دوڑ لگائی تھی اور جانے میں... دیر نہیں کی تھی!

احسن سلیم کے نزدیک ''اجرا'' کی Ownership پر ہر ادیب ہر صحافی کا یکساں استحقاق تھا، اس کے چلے جانے کے بعد ''اجرا'' کی اشاعت کا تسلسل یقیناً ہر قاری اور ہر ادیب کے لیے اہم ہے اور اب یہ بھی سوچنا ہے کہ کیا ہم ادب کے فکری، تہذیبی اور اخلاقی رول (Role) پر مزید دھیان دینے کے لیے تیار ہیں؟

کیا ادیبوں کے سارے حلقے ادب کی مقناطیسیت کو اخلاقی سروکار کے حوالوں سے اہم تر سمجھنے، سمجھانے کی کاوش کے لیے مستعد ہیں اور کیا ادب اور زندگی کی حقیقت کو ایک دوسرے سے جدا کر کے دیکھنے کی روش کو ترک کرنے پر آمادہ ہیں؟ جبکہ ادب سے جڑے سب لوگ اس امر کو جانتے مانتے ہیں کہ کسی ادیب کو بھی شدت پسندی، فرقہ واریت اور رجعت پسندی سے آلودہ معاشرے میں ایک غیر جانب دار اور محض تماشائی کا کردار زیب نہیں دیتا اور یہ بھی سچ ہے کہ تہذیبی و اخلاقی عروج اور انسانی اقدار کی حرمت کا تقاضا ادیبوں ہی سے کیا جاتا رہا ہے۔

آج کے ماحول میں کیا واقعی ہمارا ایقان یہ ہے کہ ادب میں موجود Status Quo کو توڑتے ہوئے آگے بڑھنا ہے، بین الاقوامی تناظر میں Out of Box سوچ کو اپنانا ہے، اور کیا ہم مذہبی و مسلکی تفریق کو کم ترین سطح پر لانے کے لیے اپنی تخلیقات میں ربط کے فقدان کو دور کرتے ہوئے اپنی تہذیبی اقدار کو سامنے لانے پر رضامند ہیں، سماجیات کے ضمن میں عالمگیریت (Globalization) کا ہمہ جہت منظر نامہ تسلیم، مگر کیا ایک کھلی حقیقت نہیں ہے کہ فکری اور تہذیبی ادارے عالمی سرمایہ داری کی زبردست یلغار تلے مرجھا گئے ہیں۔ جہاں انسانی آبادیاں معاشی خوف میں مبتلا ہوں، اُنھیں اپنی شناخت کی ضرورت محسوس ہو، انتہا پسندی اور دہشت بھری سرگرمیوں کا جب انھیں سامنا ہو تو بقول ڈی۔ ایچ لارنس ایسے منظر نامے میں نرم اور ملائم اشیا مرجاتی ہیں، تو پھر اس طرح کی صورت حال میں ادبی معاشرے کس طرح سانس لے پاتے ہیں، نبض کی رفتار کس قدر مدھم ہوتی ہے، ادبی معاشرے کے ناتواں ہو جانے والے شانے سماجی اقدار کا بوجھ اٹھائے کس قدر تخلیقیت اور حسیت کے مظاہر سامنے

لا سکتے ہیں، یقیناً ایسے ماحول میں کردار، جرأت اور رواداری ہی ان کے موثر ہتھیار ہوں گے۔

تو کیا ہم سب متفق ہیں؟

''اجرا'' کا پلیٹ فارم ہم سب کا ہے...سفر جاری رکھنا ہے!

انسانیت کی نگہبانی کا فریضہ واجب ہے...سب کو ادا کرنا ہے!

یہی نہ ہوگا کہ مقتل میں جا کے دم لیں گے
اُٹھیں چلیں کہ زمانے کے درمیاں جائیں

محمد ناصر شمسی

❁❁❁

تعزیت

رواں برس اردو ادب کو فقط احسن سلیم کی جدائی کا غم نہیں سہنا پڑا، کئی اہم شخصیات ہم سے جدا ہوئیں۔ اِس فہرست میں کشمیری لال ذاکر (7 اپریل 1919 تا 31 اگست 2016)، انتظار حسین (7 دسمبر 1923 تا 2 فروری 2016) ڈاکٹر اسلم فرخی (23 اکتوبر 1923 تا 15 جون 2016)، جوگندر پال (5 ستمبر 1925 تا 22 اپریل 2016)، اسلوب احمد انصاری (1925 تا 4 مئی 2016) ڈاکٹر انور سدید (4 دسمبر 1928 تا 20 مارچ 2016)، فاطمہ ثریا بجیا (یکم ستمبر 1930 تا 10 فروری 2016)، محی الدین نواب (ستمبر 1930 تا 6 فروری 2016)، پرتو روہیلہ (1933 تا 29 ستمبر 2016)، آغا سلیم (7 اپریل 1935 تا 12 اپریل 2016)، زبیر رضوی (15 اپریل 1935 تا 20 فروری 2016)، آغا ناصر (1937 تا 12 جولائی 2016)، ندا فاضلی (1938 تا 8 فروری 2016) نسرین انجم بھٹی (وفات: 26 جنوری 2016) پیغام آفاقی (1956 تا 20 اگست 2016) ذکاالرحمان (وفات: 3 جولائی 2016) جیسے اہم نام شامل ہیں۔ گذشتہ برس جمیل الدین عالی (جنوری 1925 تا 23 نومبر 2015) ہم سے بچھڑ گئے تھے۔

ساتھ ہی ہمیں عبدالستار ایدھی (یکم جنوری 1928 تا 8 جولائی 2016) جیسی ممتاز سماجی اور معراج محمد خاں (20 اکتوبر 1938 تا 21 جولائی 2016) جیسی معتبر سیاسی شخصیات سے بھی محروم ہونا پڑا۔ ہم ان افراد کے لواحقین کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ دعا ہے کہ خدا ان کے درجات بلند فرمائے۔ (ادارہ)

ہمیں بلا چوں و چرا کام میں مصروف رہنا چاہیے

اقبال خورشید

یہ درست کہ ادبی مضمون ذاتی حوالوں سے پاک ہونا چاہیے، مگر کیا کیجیے، حادثہ ہی ایسا ہوا کہ اس کے ارتعاش سے قلم کا محفوظ رہنا ممکن نہیں!

کبھی کالموں میں، کبھی دوستوں کے درمیان اور کبھی خود کلامی کی صورت یہ سوال روبرو آیا کہ ''تبدیلی'' کس طرح وقوع پذیر ہوتی ہے۔

یونانی فلسفی، ہیراکلیٹس کا یہ کہنا درست کہ ''ہر شے مسلسل حرکت میں ہے!'' البتہ اِس حرکت کا، اشیاء اور ماحول سے موازنے میں، انسانی فکر سے جو تعلق، وہ ذرا پر پیچ۔ یہ حرکت افقی یا عمودی نہیں۔ برناڈ شا نے کہا تھا: ''ترقی، تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں۔ اور وہ، جو اپنا ذہن تبدیل نہیں کرتے، ہر نوع کی تبدیلی میں ناکام رہتے ہیں۔''

فکری تبدیلی کا براہ راست تعلق اپنی ضد یعنی فکری جمود سے ہے۔ جمود کی چٹخ سے فکری تبدیلی کا جنم ہوتا ہے۔ سمجھنے کی بات یہ کہ فکری تبدیلی کا ظہور، یہاں تک کہ عروج بھی فکری جمود کی موت نہیں۔ وہ تبدیلی کے بہاؤ کے نیچے ہمیشہ موجود رہتا تھا، خاموش اور منتظر۔ اور پھر تاریخ اور حالات کے جبر یا بے ربط ترقی سے ایک انتشار جنم لیتا ہے۔ منظر پر پھر جمود کی دھند چھانے لگتی ہے۔ افغانستان اور اس کے ملحقہ علاقوں کا ماضی کی طرز زندگی اور طرز فکر کی سمت پلٹنا، مغرب میں قوم پرستی کی تازہ لہر جمود ہی کا کہرا ہے۔ تاہم تبدیلی کا امکان ہنوز موجود، زیر زمین۔ موزوں حالات کا منتظر۔

جمود اور تبدیلی کا تعلق ایک دائرہ ہے۔ ہر نئے دائرے کا قطر پچھلے دائرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اور اِس کا سبب گزرتے وقت کے ساتھ فرد کے حسی ادراکات میں نمو پذیر ہونے والی تبدیلیاں ہیں، جو اسے آگاہی عطا کرتی ہیں۔ اور آگاہی کیا ہے؟ کسی حس سے جنم لینے والا عقلی تاثر۔ دماغ میں کسی خیال (thought) یا حس (sensation) کا احساس پیدا ہونا، گذشتہ یادداشتوں اور معلومات

کے ملاپ سے اُس احساس کی بصیرت اور گہرا تاثر دماغ میں نمودار ہونا آگاہی ہے۔

گو فکری تبدیلی کا زمانۂ جمود میں ڈھلنے کا پرخطر امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے، مگر اطمینان یہ کہ آگاہی اپنا سفر جاری رہتی ہے۔ تبدیلی سے جمود میں داخل ہونے والا انسان گذشتہ عہد کی عطا کردہ آگاہی کا حامل ہوتا ہے، جسے جمود کا سایہ دھندلا ضرور دیتا ہے، پر ختم نہیں کر پاتا۔ اس کا ذہنی سانچا اپنے اجداد سے مختلف ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ جب دوبارہ تبدیلی کا عہد آتا ہے، تو وہ اپنا سفر صفر سے شروع نہیں کرتا۔ وہ اپنے اندر، چاہے عہد جمود کتنا ہی کٹھن ہو، ماضی کی فکری تبدیلیوں کا اکتسابی علم رکھتا ہے۔

تو کیا آگاہی کا یہی تسلسل وہ حرکت، جسے یونانی فلسفی نے ''مستقل'' قرار دیا؟

اگر ہاں، تو یہ تبدیلی ایک ارتقائی عمل ہے۔ اور اسے کارگر اور اثرانگیز بنانے کے لیے موزوں ترین کا انتخاب کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اور یہاں موزونیت سے مراد موزوں ترین نظام، موزوں ترین نصاب، موزوں ترین قیادت اور موزوں ترین ادب۔

یہ مزدور اور کسان نہیں، جو پہلے مرحلے میں تبدیلی کا پہیا چلاتے ہیں، بلکہ پڑھا لکھا متوسط اور متمول طبقہ ہے، جن کی فکری اور عملی کاوش سے تبدیلی کے لیے وہ سازگار صورت حال پیدا ہوتی ہے، جہاں بالآخر محنت کش طبقے کی قوت کام میں آتی ہے۔ (پہلے مرحلے میں، عام طور سے، اشرافیہ لاتعلق اور نچلا طبقہ غیر متعلقہ ہوتا ہے) قیام پاکستان کے بعد فضا فکری تبدیلی کے لیے سازگار تھی، مگر پھر آمریت اور غیر مستحکم جمہوریت کے باطن سے جمود کا جنم ہوا۔ نئے ہزاریے کے بعد سماج نے کروٹ لی۔ 80 اور 90 کی دہائیوں کے جمود سے نکلنے والے تعلیم یافتہ پاکستانی مڈل کلاس کو جب سوشل میڈیا کا ہتھیار میسر آیا، خبر کو ایشو بنانے میں اس طبقے کا کردار بڑھنے لگا، اظہار پر قدغن کمزور ہوئی، نوجوان نسل میں انفرادی اور اجتماعی ترقی کی خواہش پنپنے لگی، تو تبدیلی کا ایک امکان پیدا ہوا۔ گو مذہب پسندوں اور روشن خیالوں کی تازہ تقسیم نے، جس کا سبب اغیار کی سازشیں بھی ہیں اور اپنوں کی غفلتیں بھی، اس امکان کو کچھ کمزور کیا، مگر سرنگ کے دہانے پر اب بھی روشنی ہے۔

سوال یہ ہے کہ پاکستانی سماج کا یہ طبقہ، جو انفرادی اور اجتماعی ترقی کا خواہاں، موجودہ اردو ادب سے کس قدر جڑا ہے، اور اردو ادب کو اِس سے کس حد تک سروکار ہے، اور ہمارے پیش نظر یہ سوال ہے کہ اس تبدیلی کے لیے آمادہ ذہن فراہم کرنے کے لیے ادب کیا کردار ادا کرسکتا ہے؟

اس سوال کا جواب تاریکی کو دبیز کر دیتا ہے۔ ایسا نہیں کہ یہ نسل مطالعے سے دور ہے۔ یہ انگریزی لٹریچر پڑھتی ہے، فیض اور منٹو کو بھی جانتی ہے، ادبی میلوں میں دکھائی دیتی ہے، مگر موجودہ عہد کے اردو ادیب سے اِس کا ناتا کمزور۔ اس کا ایک سبب جہاں عہد حاضر کا ادیب، جو شاید حالات کے جبر کے باعث خود کو روح عصر کا نمایندہ ثابت کرنے میں ناکام رہا، وہیں حکومتیں بھی اس کی ذمے دار، جن کی ترجیحات میں فنون لطیفہ کا فروغ شامل نہیں۔ ذرایع ابلاغ پر بھی اس کی ذمے داری عاید ہوتی ہے، جو آج سماجی اور ثقافتی مباحث میں بھی ادیب کی رائے کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں۔

جب ادیب رائے عامہ کا نمایندہ ہی نہیں، تو پھر وہ فکری تبدیلی میں کوئی کردار کیوں کر ادا کرسکتا ہے؟

یہی وہ بے چین کرنے والا سوال تھا، جس نے مرحوم احسن سلیم ''کو تحریک ادب برائے تبدیلی'' کی بنیاد رکھنے پر مجبور کیا۔ اپنے فکرانگیز اداریوں اور اجرا میں شایع ہونے والے وقیع مضامین کے ذریعے انھوں نے اس تحریک کو مباحثوں کا موضوع بنایا۔ ادیب کی بین الاقوامی حیثیت پر اصرار کیا، اور اردو کے حقیقی ادیبوں کو پلیٹ فارم فراہم کرنے کی ٹھانی۔ احسن سلیم نے اجرا اور ادب برائے تبدیلی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ ان کی بے وقت موت اس تحریک کے لیے گہرا صدمہ ہے۔

اجرا کا تسلسل انھیں خراج تحسین پیش کرنے کی کوشش ہے۔ اجرا 24 کا بڑا حصہ اُنھوں نے اپنی زندگی میں منتخب [مرتب] کرلیا تھا۔ اس شمارے کی ترتیب میں اُن ہی کے فیصلے اور فکر کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اُن کا ایک گوشہ بھی شامل، جو اُن کے فن و شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس کوشش کا تسلسل آنے والے پرچوں میں بھی دکھائی دے گا۔ خواہش ہے، ادب برائے تبدیلی پر مباحث کا سلسلہ جاری رہے۔

اور ساتھ ہی یہ آرزو بھی کہ پاکستانی ادیب رائے عامہ کا نمایندہ بنے، زندگی کے مرکزی دھارے میں شامل ہو۔ اس کے لیے عملیت پسندانہ طرز عمل اختیار کرتے ہوئے مرحلہ وار آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ ایک مرحلے میں ناشروں کی استحصالی زنجیر توڑنی ہوگی، دوسرے مرحلے میں ذرایع ابلاغ کا موثر استعمال ضروری۔ مگر اپنی سیاسی، لسانی اور مذہبی وابستگی اور شناخت سے اوپر اٹھتے ہوئے صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہنے کا حوصلہ پیدا کرنا پہلی شرط۔

گو آج فکری جمود ہے، مگر مایوسی نہیں۔ والٹیئر کا لازوال ناول ''کاندید'' یاد آتا ہے، جس میں مرکزی کردار نے ناول کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا: ''ہمیں بلا چوں و چرا کام میں مصروف رہنا چاہیے، یہی حالات کو قابل برداشت بنانے کا اکلوتا طریقہ ہے۔''

اجرا بھی، حالات کو قابل برداشت بنانے کی ایک ایسی ہی کوشش ہے۔

***

نوٹ: اجرا کے اِس شمارے کو اغلاط سے پاک رکھنے کی حتیٰ الامکان کوشش کی گئی ہے، مگر سہو کا امکان رہتا ہے۔ پھر احسن سلیم کی وفات کے بعد جو نامکمل اجرا، سافٹ کاپی کی صورت ہم تک پہنچا، اصل مسودے نہ ہونے کی وجہ سے اُس میں شامل تخلیقات کی تصدیق اور تصحیح ایک دشوار عمل تھا۔ کہیں مضمون نامکمل، کہیں شاعر کا نام غائب، کہیں کسی کی نظم پر کسی اور کا نام درج۔ ہماری کوشش کے باوجود اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو، تو پیشگی معذرت۔ (ادارہ)

حمد باری تعالیٰ

صفدر صدیق رضی

جب تری خاکِ درِ دولت پہ ہے میری نشست
ہو نہیں سکتا کہ تو رکھے مجھے پھر تنگ دست

اے خدا تیری پرستش سے مفر ممکن نہیں
کیسے ممکن ہے کہ ہو بندہ ترا اور خود پرست

قادر مطلق ہے تو لیکن تری مخلوق میں
کیوں بہت سے ہیں زبردست اور اتنے زیردست

تو ہی جانے، دست و بازو بھی عطا کردہ ترے
میں تو کرسکتا نہیں اندازۂ فتح و شکست

ہم نہ ہونے اور ہونے کے گماں میں مبتلا
تجھ سے ہست و بود ہے سب ورنہ کیا ہے بود و ہست

روک سکتا ہے بکھر جانے سے اک تُو ہی مجھے
تیرے ہاتھوں میں ہے شرح دو جہاں کا بندوبست

☆☆☆

نعت

قاضی حبیب الرحمٰن

نہیں کہ بادہ وساغر کی بات کرتا ہوں
کسی خیالِ مُخیّر کی بات کرتا ہوں

مشام شام میں نافے سے کھل گئے جیسے
ہوائے زُلف مُعنبر کی بات کرتا ہوں

مُدام کھلتے رہیں سبز موسموں کے گُلاب
فضائے گنبد اخضر کی بات کرتا ہوں

چہکتے پھرتے ہیں کیا کیا نہ طائرانِ چمن
بہارِ رُوئے پیمبرؐ کی بات کرتا ہوں

مری نجات کو بس ہے یہی حوالہ کہ میں
شفیعؐ عرصۂ محشر کی بات کرتا ہوں

اُترنے لگتا ہے اک کیف سا دِلوں میں حبیب
میں جب بھی ساقیؐ کوثر کی بات کرتا ہوں

کچھ ایسا سہل نہ تھا' نفی ذات کا اِثبات
خزاں چشیدہ گلِ تر کی بات کرتا ہوں

عجیب خطۂ تہذیب تھا دلِ مرحوم
پلٹ پلٹ کے اسی گھر کی بات کرتا ہوں

☆☆☆

نعت

صفدر صدیق رضی

اس قدر فیض سرعام ہیں جاری تیرے
متکبر ہوئے جاتے ہیں بھکاری تیرے

آسمانوں میں ہے یوں اس کا توازن قائم
کرۂ ارض پہ احسان ہیں بھاری تیرے

خلق سنتی ہے تجھے یوں بہ زبانِ قرآن
حرف تا حرف تجھے پڑھتے ہیں قاری تیرے

اپنی تحریر کی توقیر بڑھانے کے لیے
لکھتے رہتے ہیں ترے وصف لکھاری تیرے

رومی و سعدی و جیلانی و چشتی بن کر
اسوۂ پاک ہیں یوں جاری وساری تیرے

ذہنِ انساں میں یہ آیات یہ افکار و علوم
بارِ رحمت ہیں سب اے رحمتِ باری تیرے

☆☆☆

نعت

رفیع اللہ میاں

میں ان کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو رہا ہوں
محبت کا چمن آنکھوں میں اپنی بو رہا ہوں
کہیں محروم ہو جاؤں نہ گر کر راستے میں
گناہوں کا خدایا بار اپنا ڈھو رہا ہوں
سبھی لمحے انھی کے در سے وابستہ ہوئے ہیں
کبھی جاگا ہوا ہوں اور کبھی میں سو رہا ہوں
مگر امروز کے لطف وکرم کا معجزہ دیکھ
مجھے احساس ہے گزرا ہوا کل کھو رہا ہوں
درِ روشن پہ میری آنکھ کا دیکھو پگھلنا
میں حیراں ہو کہ اپنی بے حسی پر رو رہا ہوں
ہوائے شہرِ احمدؐ نے مری ترکیب بدلی
وگرنہ اپنے گھر میں تو ہوائے نو رہا ہوں

☆☆☆

نعت

فوق کاشمیری

عاصیوں کو حبیبِؐ خدا مل گئے
رحمتِ دوجہاں مصطفیٰؐ مل گئے
جنؐ کی سیرت نمونہ جہاں کیلئے
ایسے کامل ہمیں رہنماؐ مل گئے
گمرہوں کو ہدایت ملی آپؐ سے
چرخِ عالم کو شمس الضحیٰؐ مل گئے
ان کی نظروں میں کیا قصر و جاہ و حشم
وہ جنہیں آپؐ کے نقشِ پا مل گئے
ناز قسمت پہ کیوں نہ کریں فوق ہم
دل گرفتوں کو خیر الوریٰؐ مل گئے

☆☆☆

نعت

ریاض ندیم نیازی

ہے مِرے نبیؐ کا روضہ وہ گلاب مہکا مہکا
کہ شگفتہ جس کا ہر در تو ہے باب مہکا مہکا
کوئی التجا جو کی تھی، وہ قبول ہوگئی ہے
یہ سوال مہکا مہکا' یہ جواب مہکا مہکا
وہ ہراِک کتاب جس میں ہے نبیؐ کا ذکرِ اقدس
جو نظر کے سامنے ہو وہی باب مہکا مہکا
جو اُتارا ہے خدا نے وہی دین ہے مکمل
جو دیا مِرے نبیؐ نے وہ نصاب مہکا مہکا
وہ سماعتیں بھی کیا تھیں جو قریب مُصطفیٰؐ تھیں
کہ صحابہؓ نے سنا ہے وہ خطاب مہکا مہکا
شب روز مُنتہیٰ پر وہ مکالمہ تو سوچو
کہ سوال تھا شگفتہ تو جواب مہکا مہکا
میں ندیم شادماں ہوں کہ نبی کی پیروی میں
مجھے ہر قدم پہ حاصل ہے ثواب مہکا مہکا

☆☆☆

نعت

فائق ترابی

ہو کیسے بیاں رُتبۂ اوصافِ حمیدہ
قرآن میں ہے شہرۂ اوصافِ حمیدہ
ہر صاحبِ کردار ترے در کا بھکاری
اے قاسمِ گنجینۂ اوصافِ حمیدہ
گلدستۂ کردار و کمالات، جوانی
بچپن ہے ترا غنچۂ اوصافِ حمیدہ
صد یوسفِ کنعاں ہوں فدا جس پہ، وہ صورت
سیرت بھی ہے مجموعۂ اوصافِ حمیدہ
انعمت علیہم کے ہیں مصداق وہی لوگ
اپناتے ہیں جو جادۂ اوصافِ حمیدہ
صدیقؓ و عمرؓ ہوں کہ غنیؓ اور علیؓ ہوں
ہر ایک ہے آئینہ اوصافِ حمیدہ
مقصود جو کردار کی تعمیر ہو فائق
ہو پیشِ نظر نقشۂ اوصافِ حمیدہ

☆☆☆

(مباحث، مسائل، تصوّرات)

ادب ایک کارِ درویشی

رشید امجد

اجرا کے اداریے ہمیشہ فکر انگیز ہوتے ہیں جو مکالمے کی فضا پیدا کرتے ہیں، جس سے رواداری اور روشن خیالی کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ اس بار آپ نے جو سوال اٹھائے ہیں، وہ دراصل ایک ہی بڑے سوال کے حصے ہیں جن کا مرکز یہ ہے کہ معاشرے میں ادب کا کردار کیا ہے اور وہ کس طرح تبدیلی کا سبب بن سکتا ہے۔ اس بارے میں مختلف آرا ہوسکتی ہیں لیکن اس سے انکار نہیں کہ ادب بہر حال سمتوں کا تعین کرتا ہے۔ صحافت یا الیکٹرانک میڈیا کی طرح اس کا فوری اثر نہیں ہوتا لیکن وہ خاموشی سے اپنا کردار ادا کرتا ہے' پھر یہ بھی کہ ادب کی جبراً کوئی سمت مقرر نہیں کی جاسکتی۔ افلاطون نے اگر اپنی مثالی ریاست میں شاعر کا داخلہ ممنوع قرار دیا تھا، تو اس کے شاگرد ارسطو نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب کی بحثیں یہیں سے شروع ہوئیں لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ ادب برائے ادب محض ایک تنقیدی اصطلاح ہے ورنہ کوئی ادب زندگی سے مبرا نہیں ہوتا۔ لکھنے والا ایک زندہ شخص ہے جو ایک معاشرے میں رہتا ہے اس لئے زندگی سے دوری ممکن ہی نہیں۔ ہاں البتہ اختلاف رائے ضرور ہوسکتا ہے۔ ہر تحریر اپنے ساتھ اگر نئے رویّے لے کر آتی ہے تو کچھ پابندی بھی عائد کرتی ہے۔ ہر انقلاب موجود جمود کو توڑتا ہے لیکن بالآخر یہی جمود اس میں بھی پیدا ہوجاتا ہے اور اسی لئے انقلاب کے بعد کاؤنٹر انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے۔

آپ نے ترقی پسند تحریک کو اردو ادب پر قید کی پہلی تحریک کہا ہے لیکن یہ بھی تو دیکھئے کہ اس قید نے اردو ادب کو کن موضوعاتی وسعتوں سے روشناس کرایا۔ اگر آپ نے تحریکوں کو قید ہی کہنا ہے تو اس کا آغاز علی گڑھ تحریک سے ہوا، مگر علی گڑھ تحریک ہی نے اردو ادب کو مقصدیت، سادگی اور عقلیت پسندی کے رویے سے آشنا کیا۔ علی گڑھ تحریک کی کوکھ سے رومانوی تحریک نے جنم لیا جو ایک طرح سے ضرورت

سے زیادہ مقصدیت، سادگی اور ضرورت سے زیادہ عقل پرستی کا ردِعمل تھی۔ علی گڑھ تحریک نے فرد، جذبے اور عورت کو نظر انداز کر کے مقصدیت اور اجتماعیت پر زور دیا۔ علی گڑھ ہی کے پروردوں نے رومانوی تحریک کی بنیاد رکھی۔ رومانوی تحریک کی بہت زیادہ فردیت، جذبے کے اہمیت، ماضی پرستی اور دیگر عناصر نے ترقی پسند تحریک کی راہ ہموار کی۔ پھر ترقی پسند تحریک کی مقصدیت نے کسی حد تک موضوعات کو محدود کیا اور اسی کے ردِعمل میں جدیدیت کی تحریک پیدا ہوئی۔ دیکھا جائے تو ہر تحریک نے جس جمود کو توڑا آخر وہی جمود اس میں بھی پیدا ہو گیا جس کے ردِعمل میں ایک نئی تحریک نے جنم لیا، یوں ہر نئی تحریک اپنے سے پہلی تحریک کی کوکھ سے پھوٹی، اس لئے ایک ردّ کے ساتھ ساتھ ایک تسلسل بھی ہے۔

ہر بڑی تحریک افراط وتفریط کا شکار ہوجاتی ہے، ترقی پسند تحریک جو ایک حوالے سے علی گڑھ ہی کا ایک تسلسل ہے افراط وتفریط کا شکار ہوئی۔ ساٹھ کی لسانی تشکیلات (جدیدیت) کے لکھنے والوں نے اولاً اولاً خود کو غیر نظریاتی کہا۔ ایک حوالے سے یہ ترقی پسند تحریک کا ردّ عمل تھا لیکن ستر کی دہائی تک آتے آتے نو ترقی پسندی کا آغاز ہوگیا۔ ہوا یوں کہ 68ء کی عوامی تحریک نے بہت سے بندھے ٹکے معاملات کو ہلا کر رکھ دیا۔ بدترین نظریاتی اور جذباتی آویزش پیدا ہوگئی۔ گھر بٹ گئے۔ میاں بیوی تک بائیں اور دائیں بازو کی تقسیم کی زد میں آ گئے۔ افتخار جالب نے 'شہاب' میں جس کے مدیر کوثر نیازی اور نائب مدیر نذیر ناجی تھے' ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "استعارے کی شاعری منافقت کی شاعری ہے!" جدیدیت کی پہچان ہی علامت اور استعارہ تھی۔ اس مضمون نے نئے لکھنے والوں کو پریشان کر دیا چنانچہ ایک نیا نقطۂ نظر سامنے آیا کہ آپ عوام کے بارے میں لکھیں لیکن آپ ادب لکھ رہے ہیں صحافت نہیں۔ خود میرا اپنا خیال ہے کہ ادب عام آدمی کے بارے میں ہوتا ہے اس کے لئے نہیں ہوتا۔ ادب کا قاری اخبار کا قاری نہیں۔ ادب ایک لکھا ہوا لفظ ہے اور وہ بھی ایک تکنیک اور ہیئت کے حوالے سے، اس لئے اس کے ابلاغ کے تقاضے بھی مختلف ہیں۔ ترقی پسندوں نے ادب کو خارجیت تک محدود کر دیا تھا۔ ردعمل میں ساٹھ کی دہائی کے لکھنے والے ضرورت سے زیادہ داخلیت پسند ہو گئے لیکن ستر کی دہائی میں داخلیت کا یہ زور ٹوٹ گیا۔ داخلیت اور خارجیت دونوں کے امتزاج سے نو ترقی پسندی کا آغاز ہوا۔ اسلوب میں بھی سادہ بیانیہ اور علامت ہم آہنگ ہو گئے۔ اس وقت جدیدیت ہی اردو ادب کی آخری تحریک ہے۔ اس کے تین دور ہیں؛ جدیدیت' اوج جدیدیت اور مابعد جدیدیت جو جدیدیت کی ایک آگے والی صورت ہے' یوں جدیدیت کے ڈانڈے بھی اپنے سے پہلی کی تحریکوں سے جڑے ہوئے ہیں۔

ہر تحریک بلکہ مذاہب تک محدودیت کا تصور دیتے ہیں اور یہ شاید اس صورتحال میں جہاں کوئی تحریک شروع ہوتی ہے، ضروری بھی ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ اس محدودیت کی دیواریں ٹوٹنے لگتی ہیں اور ایک نئی طرح کی لامحدودیت سر اٹھاتی ہے۔ مجھے اس گستاخی کی اجازت دیں تو عرض کروں کہ ادب برائے تبدیلی بھی تو ایک محدودیت ہی ہے۔ تبدیلی کے لئے بھی تو چند قیود مقرر کرنا پڑیں گی اور جب تبدیلی آنا شروع ہوجائے گی تو یہ حدود خود بخود ٹوٹنے لگیں گی۔

اداریے کی بنیادی بات آپ کا یہ جملہ ہے: 'ہمیں قومی، ملی، گروہی یا ذاتی خودنمائی سے گریز

کرتے ہوئے صحت مند تخلیقی مکالمے پرتوجہ دینی چاہیئے۔ مکالمے کا ختم ہوجانا ہی ہماری فکری، اخلاقی اورانسانی اقدار کے زوال کا سبب ہے۔جس معاشرے میں مکالمہ ختم ہوجائے وہ معاشرے بند تالاب بن جاتے ہیں، جس پرکائی جم جاتی ہے اور بدبو پیدا ہوجاتی ہے۔ہم چونکہ خوداس عمل کا حصہ ہیں اس لئے ہمیں اس کائی زدگی اور بدبو کا احساس نہیں ہوتا۔اس جمود کوتوڑنے کیلئے صحت مند تخلیقی مکالمے کی ضرورت ہے، یہ مکالمہ ہی نئی تبدیلی کی بنیاد بنے گا۔

آپ نے ایک اہم بات کی کہ بعض دوسرے درجے کے شاعر، ادیب پی آر یا حلقہ یاراں کے ذریعے بڑے بن جاتے ہیں یا بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ادب میں وکٹری اسٹینڈ نہیں ہوتے۔اچھا لکھنے والا کچھ برا بھی لکھتا ہے اور عام سے لکھنے والے کے یہاں بھی دو چار کام کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ بڑا ادیب وشاعر بیساکھیوں کا محتاج نہیں ہوتا اسے نہ زندگی میں، نہ مرنے کے بعد کسی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔فیض اپنی شاعری کی وجہ سے زندہ ہیں اور رہیں گے، میلوں کی وجہ سے نہیں۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ یہ ان کے لواحقین کیلئے دال دلیے کا سبب ہیں۔

سوال یہ ہے کہ 'محدودیت' ہے کیا؟ کیا یہ سوچا سمجھا شعوری معاملہ ہے یا کسی انقلاب کے مقاصد کی تکمیل کیلئے اسے ضروری سمجھا جاتا ہے؟ ہر انقلاب کسی نظریے پر استوار ہوتا ہے اوراس نظریے کے فروغ کیلئے کچھ پابندیاں بھی ضروری ہوتی ہیں لیکن یہ پابندیاں اگر مستقل ہوجائیں تو ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ ایسی پابندیاں Taboo بن جائیں تو ادب ہی نہیں پورا معاشرہ راہ سے بھٹک جاتا ہے۔اصل مسئلہ یہ ہے کہ محدودیت کی تعریف اور مدت کا تعین کون کرسکتا ہے۔ ہر انقلاب تبدیلی کا نعرہ لے کر آتا ہے لیکن بالآخر تبدیلی کا مخالف ہوجاتا ہے، زندگی مسلسل تبدیلی کا نام ہے لمحہ لمحہ تبدیلی۔اس تبدیلی کی جدوجہد ہی محدودیت کو جنم دیتی ہے، سو محدودیت بہ یک وقت مثبت اور منفی شے ہے۔آپ نے ادب کے ذریعے تبدیلی کا تصور پیش کیا ہے لیکن تبدیلی کی تشریح نہیں کی۔کیسی تبدیلی اوراس تبدیلی کیلئے کیا، کچھ حدود کا تعین نہیں کرنا پڑے گا؟ اگر جواب ہاں ہے تو یہ تعین بھی ایک طرح کی محدودیت ہوگا۔

ترقی پسند تحریک اورنئی لسانی تشکیلات کے درمیان دواور تحریکیں بھی پیدا ہوئیں، بلکہ پیدا کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ یہ پاکستانی ادب اوراسلامی ادب کی تحریکیں ہیں جن کا مقصد صرف ترقی پسند تحریک کا ردّ تھا۔دونوں تحریکیں چل نہ سکیں، نہ ہی انہوں نے لکھنے والوں کو متاثر کیا۔تحریکیں صرف نظریوں پر نہیں چلتیں، ان کی زندگی تخلیقی مواد کے معیار اور مقدار سے ہوتی ہے۔ پاکستانی ادب کی یہ تحریکیں قبل از وقت تھیں۔ممتاز شیریں نے قدرت اللہ شہاب کے ناولٹ 'یا خدا' کے دیباچے میں اس کا تصور پیش کیا، لیکن کتاب کے دوسرے ایڈیشن سے یہ دیباچہ نکال دیا گیا حتیٰ کے شہاب صاحب نے 'شہاب نامہ' میں جو منتخب چیزیں شامل کیں ان میں بھی اس دیباچے کو پذیرائی نہ مل سکی۔ یہ دونوں تحریکیں بھی ایک حوالے سے محدودیت کی تحریکیں تھیں لیکن ترقی پسند تحریک کی محدودیت زیادہ وسیع تھی اسی لئے ان چھوٹے سانچوں میں نہ سما سکی بلکہ یہ دونوں چھوٹے سانچے بڑی 'محدودیت' میں ضم

ہوکر ادبی تاریخ کا ایک موضوع بن کر رہ گئے۔ترقی پسند تحریک کی 'محدودیت' نے پرانی محدودیت کو توڑا۔شاعری (سوائے نظیرا کبرآبادی) اور داستان کس کی نمائندہ تھی؟ کیا عام آدمی ہیرو ہوسکتا ہے، عام آدمی تو پہلی بار پریم چند کے ذریعے ادب میں داخل ہوا اور پریم چند ترقی پسند ادیب تھے۔ترقی پسند تحریک نے اپنے سے پہلے کی 'محدویت' ختم کی اور ایک نئی محدودیت قائم کردی۔

یہ سلسلہ تو پوری کائنات میں جاری ہے ایک محدودیت ختم ہوتی ہے تو دوسری شروع۔ ادب برائے تبدیلی بھی پہلے سے موجود محدودیت کے خلاف ہے لیکن کیا اس سے ایک نئی محدودیت پیدا نہیں ہوگی؟ دراصل جہاں بھی مقصدیت آئے گی محدودیت خود بخود جنم لے گی اور مقصدیت کے بغیر ادب کے کیا معنی؟ ادب اگر زندگی ہے تو زندگی کی اپنی حدود ہیں، معاشرتی بھی، سیاسی بھی، اخلاقی بھی، حتیٰ کہ نفسیاتی بھی۔شعور کی اپنی ایک حد ہے، طبیعات کی اگر ایک حد ہے تو مابعدالطبیعیات کی بھی حدیں ہیں، یہ سلسلہ تو دائرہ در دائرہ ہے۔ایک دائرہ ٹوٹتا ہے تو اس سے بڑا دائرہ پیدا ہوجاتا ہے، زمین سے نظام شمسی، نظام شمسی سے کہکشاں، کہکشاں سے ایک کائنات اوراس کے بعد کائنات پر کائنات، پہلے عرش کے بعد دوسرے اور ساتویں تک۔ یہ تو ہمارا علم ہے اس کے آگے کیا ہے؟ ادب آزاد ہوتا ہے۔ غیر تخلیقی رویے جتنی بھی مصنوعی توانائی رکھیں خود بخود ختم ہوجاتے ہیں۔ زندہ وہی رہتے ہیں جن میں زندہ رہنے کی سکت ہوتی ہے اور یہ دائرہ تو وقت کے ساتھ ساتھ اتنا محدود ہوجاتا ہے کہ اٹھارویں صدی میر، انیسویں صدی غالب اور بیسویں صدی اقبال کی رہ جاتی ہے۔ دیگر ان گنت لکھنے والے عظیم شاعروں کی کھاد بن جاتے ہیں لیکن اس بات سے انکار نہیں کہ کسی صدی کا شعور صرف ایک نمائندہ نام تک محدود نہیں ہوتا، اس میں اس دور کے سبھی لکھنے والوں کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہوتا ہے۔ساری خرابی اس وقت ہوتی ہے جب اپنے طور پر نمائندہ بننے کی کوشش کی جاتی ہے، ہمارے دور میں دیکھتے ہی دیکھتے کتنے ہی لکھنے والے زمانے کی دھول میں گم ہوگئے ہیں۔ادب تو ایک کارِ درویشی ہے جس میں ہم سب اپنا اپنا حصہ ڈال رہے ہیں۔

❁ ❁ ❁

ہم جھلستے ہیں ازل سے چاہتوں کی دھوپ میں
چاہتوں کو اب تو سایہ دار ہونا چاہیے
(منجمد پیاس۔احسن سلیم)

آخری قسط

ادب برائے تبدیلی

ایک مسئلہ' خواہش یا ایک مشن

(زرد پتوں کی لاغری سوال کرتی ہے)

محمد ناصر شمسی

حقیقت یہ ہے کہ طویل غلامی کے دور میں آزادی کے بعد بے سمتی' جذباتیت اور غیر ذمہ دارانہ رویّوں کے امکانات بہت وسیع ہوتے ہیں۔شاید ہمارے یہاں ایسا ہی کچھ ہوا ہے۔کئی دہائیوں تک ہم پر ایک تجارتی کمپنی نے حکومت کی' اس میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا کمال ہو نہ ہو یہ بات یقینی ہے کہ ہم ایسے طبیعتاً محکوم لوگ سر جھکائے' نظریں نیچے کیئے' سُن دماغوں کے ساتھ صدیوں ہندوستان کے بادشاہوں' راجاؤں کی رعایا رہے۔ باہر سے آنے والے حملہ آور ہوں یا مغل سلطنت کی موروثی بادشاہت' ہماری آواز بھی نہ نکلی' غلامی سے نبرد آزمائی کا سوال کس طرح پیدا ہوتا' طویل عرصہ کی محکومی پہلے عادت بنی پھر فطرت ثانیہ۔

نتیجتاً ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہم بحیثیت مجموعی ہر طرح کی Independent Approach سے دُور دُور رہے۔Mental Dependence سے ہماری سماجی' سیاسی' ثقافتی برتری ایک ڈھونگ بن گئی' یہاں تک کہ ہماری معاشرتی اور تہذیبی وراثت ہی بھول بھلیوں میں کھوگئی اور اجتماعی سوچ' قوت فیصلہ ایسی صفات برہمی' اکڑفوں اور نفرت میں Transform ہوگئیں۔

فی الوقت تو شاید ہم ایک خواب آلودہ قوم ہیں اور جو خواب ہم دیکھتے ہیں، وہ بھی ہمارے خواب نہیں ہیں' ہمارے تو خواب بھی مانگے ہوئے ہیں۔ عظیم ٹریجڈی یہ ہے کہ ہم اپنے ماحول سے قطعی بے خبر ہیں' ہم محض Alien Language بولنے والے بن گئے ہیں۔ نہ جانے بارش کا پہلا قطرہ کون ثابت ہوگا' کارواں کب ترتیب پائے گا' اجتماعی شعور کس طرح ابھرے گا' معاشرہ ارتقا کی جانب کب گامزن ہوگا؟

کنفیوشس کہتا ہے کہ'' جو حقائق آنکھوں سے نہیں دیکھے جاسکتے اور کانوں سے سنے نہیں جاسکتے ان سے زیادہ سچے اور یقینی حقائق کوئی اور نہیں ہوسکتے۔'' ہم دراصل Reality کو تسلیم کرنے کیلئے

تیار ہی نہیں ہیں۔

ہم جو کچھ دیکھنا چاہتے ہیں ہماری جو خواہشات ہیں، خواب ہیں، تمنائیں ہیں، ہماری اپنی سوچ کا Module ہے۔ اسی کے مطابق اور بالکل اسی طرح معاملات کو سمجھنے اور پرکھنے کی سعی کرتے ہیں' حالانکہ معاملات کو جس طرح ہونا چاہئے اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ معاملات حقیقتاً کیا ہیں اور کیسے ہیں؟ کیا ہونا چاہئے یہ بعد کا مرحلہ ہے۔ دیکھئے، سوتے ہوئے کو جگایا جاسکتا ہے، مگر مشکل کام تو یہ ہوگا کہ جاگتے کو جگایا جائے۔ کیا یہ ایک مُسلّمہ امر نہیں ہے کہ فطرتِ سلیم کے حامل لوگ تو سچ پر یقین رکھنے والے لوگ ہی ہوتے ہیں، اخلاقی حِس ہی دراصل برائی سے بچنے کی صلاحیت ہے۔ انسان میں اپنے اندر کے نفاق کا شعور بھی ہونا چاہیے، مخمصوں میں پھنسے ہوئے ذہن Ambiguity دورنگی کا شکار ہی رہتے ہیں۔ بے حس، بے شعوری کی دلدلوں میں قید اذہان تو معاشرتی فضاؤں میں تیرتے کلیشوں کے اسیر ہوتے ہیں۔ ابتدا یقینی طور پر اہم ہوتی ہے، لیکن انجام پر یقین رکھنے والے لوگ ہی درحقیقت اپنا قبلہ درست رکھ پاتے ہیں۔ جہاں تک ہمارے موجودہ ادبی منظرنامے کی بات ہے، تخلیق کاروں کے اندر کے نفاق کا عمل تو ہمارے سامنے نہیں ہے، مگر ان کے مختلف الخیال گروپس اس قدر غیر واضح بھی نہیں ہیں۔ ذاتی تعلقات، لسانی اور مسلکی تفرقات کی موجودگی میں بھی ادبی تخلیق کاروں کا مرکزی خیال تو ہر قسم کے تعصّبات سے پاک انسانی معاشروں کا قیام اور فلاحی احوال سے جڑا ہوتا ہے لیکن جہاں تک بحیثیتِ ادیب اپنا احوال واقعی ہے اس کے بکھرے ہوئے آشوب نامے کی شیرازہ بندی یقیناً ایک جواب کی منتظر ہے۔

دیکھئے! ہم سب واقف ہیں کہ ادب کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ سوسائٹی کو اخلاقی ذمہ داریوں کا احساس دلاتا ہے اور نہ صرف اخلاقی حس میں اضافے کا باعث بنتا ہے بلکہ انسانی رویوں کی نازک تہہ داریوں کو بھی سامنے لاتا ہے۔ تو کیا یہاں پر یہ بھی سوچنا ہوگا کہ سماجیات' اخلاقیات' اقتصادیات اور سیاسیات کا سرچشمہ مذہب ہے یا یہ کہ زندگی کے ساتھ چلنے والے یہ اہم عوامل مذہبی اقدار کے دروبست ترتیب دینے میں معاون ہوتے ہیں اور کیا اخلاقیات ہی دراصل سماجیات' اقتصادیات اور سیاسیات کے بہتر نظام کی بنیاد ہیں' کیا مذاہب کے پیغامات یا تصورات میں اخلاقیات کا درس بنیادی عنصر کے طور پر موجود نہیں ہے؟ اب اگر ادب بھی ظلم اور سماجی انصاف کے درمیان ایک خط تنسیخ کھینچتا ہے، انسانی رویوں کو بہتر بنانے اور انسانی شعور کے نئے پیراڈائم ترتیب دیتا ہے اور انسانی قدروں میں اضافے اور تہذیبی ارتقا کے حوالے سے تفہیم و ترسیل کا فریضہ انجام دیتا ہے تو فی الواقع کیا یہ انسانی فلاح کا موجب نہیں ہے اور کیا انسانی معاشروں میں ادب کی اہمیت سے انکار ممکن ہے۔

جہاں تک ہمارے یہاں علمی معیارات اور اس کی اثر پذیری کا تعلق ہے جب تک سماجی اقدار اور علمی اقدار کے درمیان باہمی ربط اور ایک Harmonious Balance نہیں ہوگا ہمارے یہاں کی سوسائٹی میں تجزیاتی اور منطقی سوچ کا کلچر فروغ نہیں پا سکے گا۔ ایسی صورتِ حال میں ایک ذمہ دار اور Participating Citizenship کا ماحول کس طرح بن پائے گا۔ کیا اس پر کسی قسم کی

بحث کی گنجائش موجود ہے؟
تعلیمی نظام اور علمی وسماجی معاملات سے منسلک احوال کی درستگی کے بغیر معاشروں کا ترقی یافتہ شکل اختیار کرنا بہر حال آسان نہیں ہوتا۔

کہا جاتا ہے کہ جہاں Adhocism ہوتا ہے، وہاں Check & Balance کے پُر اثر نظام کا قیام ممکن نہیں۔ ہم اسی دور سے گزر رہے ہیں اور یہ بھی غلط نہیں ہے کہ ہم اپنی غیر فعالیت کی ذمہ داری دوسروں کے کندھوں پر ڈالنے میں ذرا نہیں ہچکچاتے، اس کے قطعی برعکس یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ قومیں' قومیں ہی بناتی ہیں حکومتیں نہیں Nations make Nations not the governments مگر اہم الٰہیات، فلسفے اور علم کے سرچشموں سے عملی طور پر شاید کئی نوری سال کے فاصلے پر ہیں جبکہ دنیا کی کوئی بھی دوسری قوم اس قدر قابل فخر Enriched اور Invaluable Theory کی حامل نہیں ہے۔ ایسی عظیم الشان اور لازوال تھیوری کے حامل ایسے لوگوں کے مقابلے میں محبت، رواداری' اخلاقی حس اور باکمال شائستگی سے کون واقف ہوسکتا ہے؟ مگر حقیقی صورتحال میں ہم محض ایک شکست خوردہ ہجوم ہیں اور بس! شرمساری کی کوئی کیفیت بھی تو ہمارے جسم وجاں سے ظاہر نہیں ہوتی۔ ایسی سچی اور ابدی تھیوری جس کو Falsify کرنا ممکنات کے دائروں سے پرے ہے ہمارے ماحول کی دھوپ میں اس کی چھاؤں کہیں نظر نہیں آتی کیونکہ اس کی ساری چھاؤں تو ہمارے سروں پر بنے طاقوں کے اندھیروں میں پورے' اخلاص واحترام' سے خاموشیوں کے سپرد کردی گئی ہے۔

نہ جانے ہم کب تک Adoption پر انحصار کرتے رہیں گے اور Robatic Approch کے عادی بنے رہیں گے۔ ہمارے ماحول میں Creativity کا کلچر کب جاری وساری ہوگا۔ کیا ہم اس بات سے انکار کرسکتے ہیں کہ ہمارا الیکٹرانک اور سوشل میڈیا بھی ہمارے اندر سے Robatic Approch کی کمان کررہا ہے مگر اس طرح سے ہم روبوٹ بنانے کے اہل نہیں ہوسکتے۔ اس طرح کے Mindset سے تخلیقی عمل ممکن ہی نہیں ہے۔ ہمارا تعلیمی نظام کسی واضح ٹارگٹ اور مقصدیت سے عاری ہے اور اسی لئے غالب امکان یہ ہی ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں Selfie Generations بھی کنفیوژن کا شکار رہیں گی۔ حقیقتاً ہمارے طلبا Learning Process سے نہیں گزر پا رہے ہیں' بلکہ محض Data کے Channels بن رہے ہیں جبکہ ہم سب واقف ہیں کہ کسی بھی قوم کا سماجی ڈھانچا علمی معیارات سے ہی نمو پاتا ہے اور وہ قوم جو اپنے مادی اور انسانی وسائل کو اپنے خیالات' تصورات اور افراد کے Intellect کے مطابق کام میں لاتی ہے اور اس کے دور اندیش ذمہ دار طبقات کی سنجیدہ کاوشیں شامل حال رہتی ہیں' وہ قدر منزلت کے مدارج طے کرنے میں کامیابیاں حاصل کرتی ہے' اس وقت تک کوئی معاشرہ ارتقائی مدار میں داخل نہیں ہوسکتا۔ پانی کی لہروں پہ جو سورج نظر آتا ہے وہ سورج نہیں ہوتا' سورج کا صرف Image ہوتا ہے۔ روّیے ہی ہمیں Anxiety اور Depression اور اس سے منسلک دوسرے ذہنی اور جسمانی عوارض میں مبتلا کرنے کی ایک بڑی

وجہ ہیں' فی الوقت ہم تعلّی اور تکبر کی مثال بنے ہوئے ہیں، عہد الست کو بھول گئے ہیں، ہمارے یہاں Leadership Crisis ہو یا نہ ہو، Leadership Deficit ضرور موجود ہے۔ بحیثیت قوم ہم عجیب ویرانیوں کا شکار ہیں' خزاں کا دور ہم پر تسلسل کے ساتھ وارد ہے اور موسم بہار محض ایک Fantasy۔ زندگی کے رنگین صفحات پر نہ جانے کب کوئی سطر تحریر ہوگی، گزرتے وقت کی راہداریوں میں ٹھہرا ہوا کوئی لمحہ تو ایسا ہوگا جب فضاؤں میں منجمد خاموشیاں بول اٹھیں گی۔ آنکھوں میں خلوص کی چمک نمودار ہوگی' ہماری آنکھوں میں ڈوبتے سورج ایسی سرخی کی بجائے نقرئی چاندنی ابھرے گی۔ ہم میں سے شاید ہر ایک شخص خود احتسابی کے عمل سے گریزاں ہے' جبکہ احتساب سے بَری معاشرہ دراصل مادر پدر آزاد معاشرہ ہی ہوتا ہے۔ ایسے میں ظلم' ناانصافی' نراجیت اور انتشار سے پُر منظر نامے میں استحصال کا ایک خود کار نظام قائم ہوجاتا ہے۔ برائیاں خود پیدا ہوتی ہیں' مافیاز وجود میں آتی ہیں جبکہ دوسری جانب اچھائیاں معدوم ہوجاتی ہیں کیونکہ انہیں تو انسان نے خود پیدا کرنا ہوتا ہے، وجود میں لانا ہوتا ہے۔ اس طرح کے منتشر اور بکھرتے معاشروں میں مختلف النوع معاشی اور معاشرتی جرائم پنپتے ہیں، تحفظ اور احترام کا ماحول مفقود اور سوسائٹی بے یقینی کے حال میں ہوتی ہے، کرپشن اور بے اعتدالی عروج پر، انفرادی اور انداز فکر کا پھیلاؤ وسیع تر اور اجتماعی سوچ کا زبردست فقدان ہوتا ہے۔ اس طرح کے منظر نامے میں قوانین کی مکمل عملداری احتساب کا نظام قائم کرنے میں معاون ہوتی ہے۔ تعلیم وتربیت کی اثر پذیری' ادب کی فکر انگیزی فرد کی سوچ میں دھیما پن پیدا کرنے کا جواز مہیا کرتی ہے۔ غصہ، نفرت، تکبر، انفرادی مفاد اور خود غرضی کے زہریلے اثرات سے افراد کو محفوظ رکھنے میں یہ عوامل کار آمد ثابت ہوتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ کوئی Short Cut فارمولا اس کا مداوا نہیں ہے' یقیناً ایسی تبدیلی کیلئے خاصا وقت اور استقلال ناگزیر ہے۔ آج کے زمانے میں ایسے انقلابات آنا ممکن نہیں، یہ دور اُس دور سے قطعی مختلف ہے، انقلاب فرانس کے ضمن میں ادب کے گہرے اثرات اور نتیجہ خیزی سے کون واقف نہیں ہے' مگر آج ادب کے ذریعے معاشی' سیاسی یا بحرانی کیفیات پر کسی طرح کی اثر اندازی اور فوری نتیجہ خیزی ممکن نہیں ہے۔ مگر جہاں تک انفرادی اور معاشرتی رویوں کا تعلق ہے یا وسیع تر معنوں میں اخلاقی حس کا معاملہ ہے' ادب کی اثر پذیری اور نتیجہ خیزی سے انکار ممکن نہیں ہے۔ ادب اخلاقی حس کی بیداری میں تحرک کا باعث رہا ہے اور رہے گا اور ذرا آگے جائیں تو یہ امر بھی ہر شک اور شبہ سے بالاتر ہے کہ اخلاقی حس سے مالا مال سماجی منظر نامے میں اقتصادیات اور سماجیات ایسے اہم ترین عوامل کبھی ناقابل حل اور پیچیدہ شکل اختیار نہیں کرپاتے۔ ادب محض نثر اور شاعری کے حوالے سے ادبی اضافے تک محدود نہیں ہے۔ ادب کا دائرہ بے انتہا وسیع ہے' ادب انسانی' تہذیبی' نفسیاتی اور عمرانی تاریخ کو بھی اپنے احاطے میں لاتا ہے۔ انسانی رویوں کو مثبت اور پرسکون رکھنے' محبتوں کے پھیلاؤ' رواداری اور باہمی احترام کے جواز مہیا کرنے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔

آج کا دور سائنسی ترقی کا دور ہے' سائنس سے مراد بار بار سامنے آنے والے وہ مسلسل انسانی

مشاہدات ہیں جو بالآخر زندگی کی حقیقتوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ آج کی دنیا فکشن کی دنیا نہیں ہے' یہ حقیقتوں کی دنیا ہے' آج ہم ایک Mathematical World میں رہتے ہیں' زندگی ایک Movement کا نام ہے' آگے بڑھنا ہوتا ہے' آگے بڑھنے کے عمل میں جب ہم نئے افق کی تلاش میں ہوتے ہیں تو دراصل ہم ماضی سے باخبر ہوتے ہیں' حال پر نظر رکھتے ہیں اور مستقبل کو ریاضی کے فارمولے کی طرح Assess کر سکتے ہیں۔ فیصلہ ہمارے اپنے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ وقت کا دریا اپنی پوری رفتار سے بہتا رہتا ہے' اس کو روکا نہیں جا سکتا۔ ہمیں اس سے آگے نکلنا ہے' رواداری کے سرچشموں میں تبدیل ہونا ہے' وقت کے بہتے دریا کے پانیوں میں اپنے حصوں کی روشنی بکھیرنا ہے' اپنے حصے کا کام کر جانا ہے اور بس......!

گزرتے وقت کا ہر لمحہ گو دعاؤں کا طلبگار ہوتا ہے' لیکن جن انسانی معاشروں میں رواداری' حسن سلوک اور احترام ایسے رویے نیند کی حالت میں ہوں وہاں اخلاقی حس کی بیداری کیلئے دوا بھی ناگزیر ہو جاتی ہے۔ سماجی انصاف کی توانائیاں پرخلوص انسانی اوصاف کے بغیر حاصل نہیں کی جا سکتیں' دوسری صورت میں زرد پتوں کی لاغری سوال کرتی ہی رہے گی......اور پھر یہ سوال دردناک مرحلوں میں داخل ہوتے ہی ایک خوفناک چیخ میں تبدیل ہو جائے گا......قدموں تلے روندے جانے والے' کڑکڑ بولتے یہ زرد پتّے چُور چُور ہونے سے پہلے اس یقین کی جڑوں سے چمٹ جائیں گے جہاں واشگاف الفاظ میں تحریر ہوگا کہ مذہب ہو کہ ادب' دونوں میں تبدیلی فراہم کرنے کیلئے شاید......!!

۞۞۞

یہ گلوبل ولیج کی عملی صورت گری کا دور ہے۔ دنیا بھر کے انسانوں سے ہم آہنگی کا شعور بیدار کرنے کے لیے تخلیقی جدوجہد کو شعار بنانے کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ادب برائے ادب یا ادب برائے زندگی کے مباحث کو ترک کر کے ادب برائے تبدیلی کو شعوری سطح پر اجاگر کرنا عصر، یعنی اسپرٹ آف ایج (Spirit of Age) کا تقاضا ہے۔ ادب برائے تبدیلی کو بھی محض ذہنی خلا پر کرنے کے بجائے ایک عالم گیر ادبی سرگرمی یا گلوبل ادبی تحریک کے طور پر اپنانے کی ضرورت ہے، کیوں کہ ہمارا عہد عالم گیر تبدیلیوں کا عہد ہے۔

(احسن سلیم)

جدید نظم کے مغالطے

سید ایاز محمود

ادب انسانی اظہار کا قرینہ ہے، تاہم الفاظ کے ذریعے اظہار کو لازمی طور پر ادب کے زمرے میں نہیں رکھا جا سکتا۔ ایسے تمام متون جن کی غایت صرف و محض اطلاع/معلومات بہم پہنچانا ہو، ادب کے دائرہ کار سے باہر دیکھے جانے کے مستحق ہیں۔ لہٰذا تکنیکی اور صحافیانہ متون کو بالعموم ادب نہیں گردانا جاتا۔ شاعری کا معاملہ بھی اس صورت حال سے جدا نہیں۔ یعنی ایسی شاعری جس کا علاقہ ادب سے نہیں، کلامِ منظوم کے ذیل میں رکھی جانی چاہیے۔ انگریزی زبان میں شاعری اور ورس(Verse) کو بالعموم ہم معنَی گردانا جاتا ہے مگر یہاں بھی وہ معاملہ درپیش ہے جو شاعری اور کلامِ منظوم کے درمیان ایک حدِ فاصل قائم کر دیتا ہے۔ یعنی ''ورس'' ضروری نہیں کہ شاعری ہی ہو۔ اسی طرح شاعری کے لیے ''ورس'' کا ہونا ایک اضافی قدر سے زیادہ نہیں۔ ادب کے بارے میں یہ تصور بھی گم راہ کن ہے کہ وہ ان تمام تحاریر کا مجموعہ ہے جنھیں قصداً ادبی متون کے طور پر منصۂ شہود پر لایا گیا ہو۔ کچھ انداز کی تحاریر مثلاً روزنامچے اور خطوط بھی ادب عالیہ میں اپنی جگہ بنا چکے ہیں۔ مثلاً گلیورس ٹریولز (Gulliver's Travels) کے مصنف جوناتھن سوئفٹ اور برطانوی مصنف فینی برنی (Frances Burney 1756-1840) کے روزنامچوں کو ادب عالیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح پانچ جلدوں پر مشتمل ورجینیا وولف کے روزنامچے تمام تر ادبی رچاؤ سے مزین ہیں۔ خطوط کا بھی یہی معاملہ ہے۔ ''خطوط غالب'' اردو ادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔ یہی حال فلسفہ کا ہے۔ فلسفہ علوم کی وہ شاخ ہے جس کی غایتِ اولیٰ ایک ایسی حقیقت کی تلاش ہے جو انسان کے عمومی معاملات میں سدھار اور انبساط کے پہلوؤں کو اجاگر کر سکے۔ قدیم یونانی فلسفیوں نے جس طرح مغربی تہذیب و تمدن کو متاثر کیا ہے اس کی جھلک یورپ کی تحریک احیائے علوم میں دیکھی جا سکتی ہے۔ انیسویں صدی میں شوپن ہار اور بیسویں صدی میں برٹرینڈ رسل کی ادبِ عالیہ سے خاص نسبت ہے۔

لٰہذا ادب کا تعلق لازماً کسی ایسی سرگرمی سے نہیں جوڑا جا سکتا جو بالقصد کسی مخصوص نظریے، طریقۂ کار، روایت اور بنے بنائے سانچے میں ڈھل کر وجود پاتی ہو۔ نثر کی حد تک تو ہم طوعاً و کرہاً یہ بات مان لیتے ہیں مگر جب شاعری کا معاملہ ہو تو مشکل آن پڑتی ہے۔ شعری مطالبے اور لوازمات، شاعری کے اوزان، ردیف، قافیہ اور بحور کی پاس داری اور پھر وہ رسومیات جو موجود کو روایت کے ساتھ جوڑ کر رکھتی ہیں ہمارے لیے نہ صرف اہم، بلکہ اہم ترین ہیں۔ یعنی یہ ایک ایسی عمارت ہے جس میں توسیع ہوتی رہتی ہے۔ ضرورت کے مطابق ''توڑ پھوڑ'' اور ''مرمت'' کا کام بھی جاری رہتا ہے، لیکن اہم اور ناگزیر بات تو عمارت کی بنیادیں ہیں۔ بنیاد مضبوط ہو تو عمارت کی توسیع اور مرمت کا کام اس کی پائیداری میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ بہ صورت دیگر کھنڈرات ہی باقی رہ جاتے ہیں جو مورخین اور ماہرین آثار قدیمہ کا موضوع ہیں۔

غزل اردو شاعری کی پہچان ہے، لیکن غور طلب بات یہ ہے کہ کیا ہم آج بھی ان ہی علائم، اسالیب، تشبیہات اور انداز بیان کو اپنانے پر مصر ہیں جو آج سے پچاس برس پہلے مروج و مقبول تھا؟ اگر ایسا ہے تو پھر ''توسیع عمارت'' والے سوال کا جواز بنتا ہے۔ لیکن یہ معاملہ عمارت سازی کا نہیں بلکہ ادب کا ہے۔ اور جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ادب انسانی اظہار کا قرینہ ہے تو پھر اس اظہار کو محدود و محصور نہیں کیا جا سکتا۔ شاعری میں مختلف اصناف اس بات پر دلیل ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ تمام ہی اصنافِ سخن زمانے کے بدلتے ہوئے مذاق کے ساتھ خود کو ہم آہنگ رکھ سکیں۔ مثنوی فارسی اور اردو شاعری کی ایک اہم صنف گردانی گئی ہے۔ میر نے تو خواجہ میر درد کو آدھا شاعر کہا تھا کہ وہ مثنوی نہیں لکھتے تھے۔ آج یہ ایک دم توڑتی ہوئی صنف ہے۔ یہی حال شہر آشوب، ترجیع بند، ترکیب بند اور واسوخت وغیرہ کا ہے۔ رباعی ایک بہت مستحکم روایت کے باوجود آج کی فضا میں پنپتی نظر نہیں آتی۔ آج شعری روایت کی توسیع کی صورت میں آزاد نظم، نظم معریٰ اور ہائیکو کا چلن اپنی جڑیں مضبوط کر رہا ہے۔ نثری نظم بھی اس توسیع روایت کا سلسلہ ہے جسے براہ راست مغربی ادب سے اخذ کیا گیا ہے۔ جدید نظم کی مختلف اصناف کی حد بندی نے ہمارے ہاں بہت سے فکری مسائل اور مغالطے پیدا کیے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ مشرق اور مغرب کے شعری رویے، برتاؤ اور مزاج میں ایک نوع کا فرق ہے جسے سمجھا جانا چاہیے۔ یہ فرق اردو اور انگریزی زبان کی لسانی ساخت میں مضمر ہے۔ ڈاکٹر حنیف کیفی کے مطابق اردو غیر تاکیدی لہجے کی زبان ہے، یعنی بولنے میں کسی بھی لفظ یا اس کے جزو کی ادائی کے لیے لہجے پر زور نہیں دینا پڑتا۔ وہ کہتے ہیں کہ انگریزی کے برعکس اردو نثر میں اس قسم کا خارجی آہنگ نہیں ہوتا۔ عربی، فارسی اور اردو شاعری میں موزونیت کا تعلق ''وزن'' سے ہے۔ ''عشق'' اور ''عمل'' اگرچہ دونوں ہی سہ حرفی الفاظ ہیں، لیکن ہم وزن نہیں۔ انگریزی اور مثلاً جرمن زبان میں بہت سے اختلافات کے باوجود موزونیت کا تعلق تاکیدی اور غیر تاکیدی مصوتوں کے درست استعمال سے ہے۔ مثلاً انگریزی نظم معریٰ میں پنج رکنی بحر (Iambic pentameter) کو عموماً برتا جاتا ہے۔ یہاں ہر رکن دو اجزا پر مشتمل ہوتا ہے، جس میں پہلا جز غیر تاکیدی (Un-stressed) اور دوسرا تاکیدی

(Stressed) ہوتا ہے۔ ولیم شیکسپیئر کے یہاں بھی اس بحر کا استعمال ملتا ہے۔ مثلاً سانیٹ 12 کی ابتدائی سطر کو دیکھیے جہاں غیر تاکیدی اور تاکیدی اجزا کو علی الترتیب (x) اور (/) کے نشانات سے ظاہر کیا گیا ہے۔

x / x / x / x / x /

When I do count the clock that tells the time

اسی طرح اردو اور انگریزی بحور میں زحافات (Modulation) کا استعمال جو مقررہ ارکان سے انحراف کے مترادف ہے، الگ الگ اصولوں پر قائم ہے۔ اسی بنیادی اختلاف کے باعث Blank Verse بالعموم ایک مخصوص بحر کی متقاضی ہے، جب کہ نظم معریٰ میں کسی مخصوص بحر کی پابندی نہیں۔ لٰہذا Blank Verse کو عمومی معنی میں تو نظم معریٰ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ یہ صورت حال بعینہ موجود نہیں۔

اسی طرح آزاد نظم کو Free Verse کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے، مگر یہاں بھی یہ صنف ایک واضح اختلاف کے ساتھ موجود ہے۔ Free Verse جسے فرانسیسی صنف "Verse libre" سے مستعار لیا گیا ہے، کسی ایک منجمد اور حتمی تعریف کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ Blank Verse کے برخلاف Free Verse میں بحر کے استعمال کی کوئی باقاعدہ شکل موجود نہیں۔ یعنی Free Verse موزونیت کے کسی باقاعدہ قرینے سے جڑی ہوئی نہیں ہے۔ اس کے برعکس آزاد نظم ایک مخصوص بحر کی پابندی کو نہ صرف قبول کرتی ہے، بلکہ اس پر اصرار بھی کرتی ہے۔ Free Verse اور نثری عبارت میں امتیاز بعض اوقات مشکل ہو سکتا ہے، لیکن آزاد نظم میں یہ صورت حال نہیں۔

Free Verse کا مطلب نظم کے روایتی اور مروجہ اسالیب سے آزادی ہے۔ یعنی ہم قافیہ الفاظ کے استعمال اور ایک باقاعدہ آہنگ کے اہتمام سے پہلو تہی۔ لیکن یہ آزادی مطلق آزادی نہیں، بلکہ اس کا مطمحِ نظر ایک ایسے شعری آہنگ کی دریافت ہے جو شاعر کی مخصوص و منفرد افتادِ طبع کے تحت پیدا کردہ ہو۔ سطری طوالت کے معاملے میں Free Verse کا رویہ لچک دار ہے۔ تاہم ہمیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ ہیئت کا غیر متعین ہونا اور شاعر کا اپنے فطری رجحانات کو بروئے کار لاتے ہوئے تخلیقی عمل سے گزرنا روایتی پابندیوں کو قبول کرتے ہوئے چلنے سے بہ درجہ دشوار ہے۔ مثلاً غزل کی ہیئت اور روایت کے بنے بنائے سانچوں کی پیروی کرتے ہوئے اچھی خاصی تُک بندی کی جا سکتی ہے۔ ایسی تُک بندی کو ہم پھُسپھُس اور بے مزہ شاعری بھی مان لیتے ہیں، مگر Free Verse میں یہ بات نہیں پنپ سکتی کہ یہ اگر متاثر کن نہیں ہے تو فقط غیر مربوط سطور کا ایک ایسا لایعنی ملغوبہ ہے جسے تحریر کرنا اور پڑھنا کسی وقعت کا حامل نہیں۔ نتیجتاً Free Verse کے خالق کو اس صنف کو اپنانے کا وہ جواز پیدا کرنا ہوتا ہے، جو الفاظ و علائم کی انتہائی موزونیت کا ایسا اہتمام کرے جو بالآخر دونوں افراد یعنی تخلیق کار اور سامع/قاری کے لیے ایک خوش گوار تجربے پر منتج ہو۔ پھر ابلاغ کا سوال بھی ہے، یعنی ایک کامیاب ابلاغ جسے کسی بھی سطح پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

آزاد نظم کا جو تصور ہمارے یہاں رائج ہے اس کے مطابق اس کی بنیاد روایتی عروض پر رکھی گئی ہے۔ ڈاکٹر حنیف کیفی کے بقول: ''فری ورس کے برعکس اردو آزاد نظم نہ تو وزن و بحر سے یکسر بے نیاز ہوتی ہے اور نہ اس کی تشکیل مختلف اوزان و بحور کے امتزاج سے ہوتی ہے۔ اس طرح اردو کی آزاد نظم ان معنوں میں اور اس حد تک آزاد نہیں، جن معنوں میں اس کے مغربی ماخذ کی آزاد نظم ہے۔''

ڈاکٹر حنیف کیفی نے اپنی معرکتہ الآرا کتاب ''اردو میں نظم معرّا اور آزاد نظم'' میں خلیل الرحمان اعظمی کا یہ اقتباس شامل کیا ہے، جو اردو میں رائج آزاد نظم کی بنیادی ہیئت کو واضح کر دیتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے بقول: ''نظم معریٰ میں صرف ردیف و قافیہ کی پابندی نہیں کی جاتی، اور نہ تمام مصرعے برابر ہوتے ہیں۔ اور نظم آزاد میں ایک قدم اور آگے بڑھایا گیا ہے، یعنی مصرعے چھوٹے بڑے ہو سکتے ہیں لیکن ان میں ایک بحر ہوتی ہے۔ مصرعوں میں ارکان کی تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ کسی طویل نظم کے مختلف ابواب کو ہم علیحدہ علیحدہ بحروں میں بھی لکھ سکتے ہیں۔''

نثری نظم اور اس کی مقبولیت سے جڑے مسائل تو بے حد و حساب ہیں۔ یہاں پہلا مسئلہ تو اس اجزائی ترکیب سے پیدا ہوتا ہے، جس میں تخلیقی اظہار کے دو مخالف دھاروں کو آپس میں ملا کر ایک تیسری شکل پیدا کی گئی ہے۔ انتشار (نثر) اور تنظیم (نظم) دو ایسی کیفیات ہیں، جن میں بُعد قطبین صاف نظر آتا ہے۔ اس صنف (اگر یہ کوئی علیحدہ صنف ہے) کے جواز پر سوال اٹھتا ہے کہ آخر نثری نظم کے وہ کون سے مطالبات ہیں، جنھیں شاعری کی دیگر اصناف مثلاً پابند نظم (غزل، رباعی، قطعہ) وغیرہ، آزاد نظم اور نظم معریٰ پورا کرنے سے قاصر ہے؟ ایسے کئی سوالات ہیں، جن کے بالتفصیل احوال کی اس مضمون میں گنجائش نہیں، لیکن ہمیں کچھ کم از کم بنیادی سوالات کا تعین تو کر لینا چاہیے۔ سو یہ چند سوالات کچھ اس طرح ہیں:

1۔ کیا نثری نظم کی کوئی حتمی (یا غیر حتمی) تعریف ممکن ہے؟
2۔ کیا نثری نظم ایک علیحدہ صنفِ سخن ہے؟
3۔ کیا نثری نظم کے اسالیب طے کیے جا سکتے ہیں؟
4۔ کیا نثری نظم کے چند امتیازی اوصاف کا تعین ممکن ہے؟

پہلے سوال کا جواب دیتے ہوئے رسل ایڈسن (Russell Edson) کہتا ہے کہ نثری نظم کی کسی باقاعدہ تعریف میں اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس ضمن میں اس کا یہ قول دیکھیے۔

"We are not interested in the usual literary definitions, for we have neither the scholarship nor the ear. We want to write free of debt or obligation to literary form or idea; free even from ourselves,

free from our own expectations. . ."

چارلس سِمک (Charles Simic) کے مطابق نثری نظم تحریر کرنا اندھیرے کمرے میں ایک ایسی مکھی کو تلاش کرنے کے مترادف ہے جس کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ موجود بھی ہے یا نہیں۔ ایڈسن نے نثری نظم کو کاٹھ کے ایسے طیارے سے تشبیہہ دی ہے، جو فی الواقع اڑ بھی سکتا ہے اور وہ اس لیے کہ اس کے ہواباز کو اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ وہ اڑے گا بھی یا نہیں۔

اوپر درج کیے بیانات سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ نثری نظم کی خارجی ہیئت اور داخلی برتاؤ کے بارے میں مغربی نقاد اسے کسی ایک ڈھرے پر چڑھا ہوا نہیں دیکھنا چاہتے۔ یعنی نثری نظم کی کوئی حتمی یا ڈھیلی ڈھالی تعریف آسان کام نہیں۔ معروف ادبی جریدے The Prose Poem: An International Journal کے مدیر پیٹر جانسن (Peter Johnson) پہلے ہی شمارے میں نثری نظم کی تعریف و توضیح کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

"Just as black humor straddles the fine line between comedy and tragedy, so the prose poem plants one foot in prose, the other in poetry, both heels resting precariously on banana peels"

میرے خیال میں کیلے کے چھلکوں پر کھڑے رہ کر نظم اور نثر کے مابین مخصوص توازن کو قائم رکھنا ایک بہت اہم نکتہ ہے۔ یہاں ہمیں بار بار اس حدِّ فاصل کو ذہن میں رکھنا ہوگا، جو نظم کو نثر سے ممیّز و ممتاز کر دیتی ہے۔

چارلس سمک نے نثری نظم کو ایک دوغلی (Hybrid) صنف گردانا ہے۔ مائیکل بینی ڈکٹ (Michael Benedikt) اسے ایک باقاعدہ صنفِ سخن تسلیم کرتا ہے۔ اس کے خیال میں یہ صنف شاعری کی تمام تر خصوصیات کو سمو لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ان خصوصیات اور رجحانات کو اس نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

"Prose Poem is a genre of poetry, self consciously written in prose and characterized by the intense use of virtually all the devices of poetry, which includes the instance use of device of

verse, except for the lines breaks."

اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ادبی تھیوری نثری نظم کے ضمن میں بہت سے سوالات کو تشنہ چھوڑ دیتی ہے، اور اس کے نظری و تفہیمی مسائل کو ایک ایسے مکالمے سے جوڑ دیتی ہے جہاں طے شدہ معیارات اور رسومیاتی فہم کو ہمہ وقت ردّ و قبول کے مراحل سے گزرتا ہوا دیکھا جاسکے۔ اب ہم یہ بھی جان سکتے ہیں کہ نثری نظم کی روح تعینِ صنف کی نفی میں مضمر ہے۔ اس ضمن میں رابرٹ بلائی (Robert Bly) فنون کو نامعلوم کی دریافت قرار دیتا ہے۔ اسی خیال کو آگے بڑھاتے ہوئے ایڈسن نے لکھنے کے عمل کو عملِ قرات سے مشابہ قرار دیا ہے۔ یعنی قاری کی طرح مصنف کو بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ شاعری کا منصب اشیا اور ان کے مظاہر کو تعقل کے بجائے جذبات و احساسات کی سطح پر سمجھنا اور سمجھانا ہے۔ اس بات کو شاعری کی کسی بھی صنف کی طرح نثری نظم پر منطبق کیا جاسکتا ہے۔

نثری نظم کے گورکھ دھندے کو سمجھنے کے لیے شاعری اور غیر شاعری (نثر) نیز شاعری اور کلامِ منظوم کے فرق کو واضح کرنا ضروری ہے۔ یہ بات پہلے بھی کی جاچکی ہے کہ کلامِ منظوم بذاتہٖ شاعری نہیں۔ بحر، ردیف اور قافیے کا مقصد ایک خوش گوار آہنگ کو وجود دینا ہے۔ مگر شاعری کے ضمن میں یہ ایک اضافی قدر ہے۔ مزید صراحت کے لیے ''الفوز الکبیر'' میں شامل یہ بیان دیکھ لینا چاہیے:

''دنیا کی شاعری اور موسیقی میں جو مناسبت اور مشابہت پائی جاتی ہے، وہ غیر حقیقی اور اضافی چیز ہے۔ اصل میں جو چیز ان سب کے ہاں ایک جیسی اور مشترک ہے، وہ ایک سرسری سا وزن اور آہنگ ہے، جسے 'شعریت' یا 'شاعری کا دلکش احساس' کہا جاسکتا ہے۔ اسی میں شعر اور موسیقی کی دلکشی کا راز پوشیدہ ہے۔ یہی چیز شعر اور موسیقی کی جان ہے۔ ہر ذوقِ سلیم والا اسی کو پسند کرتا ہے، جس میں اصولوں اور بحروں کی پابندی نہیں۔''

واضح ہوا کہ شعریت یا ایک خوش گوار شعری آہنگ لازمۂ شاعری ہے، لیکن کسی بھی طور ان پابندیوں کا محتاج نہیں جو بحر، ردیف اور قافیے نیز اصولِ شاعری کے نام پر وضع کردی گئی ہیں۔ ان سب ''پابندیوں'' کی غایت اگر ایک خوش کن جمالیاتی احساس کو جنم دینا ہے تو دوسری جانب ہمیں ایک قدغن بھی صاف نظر آتی ہے جو بات کہنے کی آزادی کو قدم قدم پر سلب کرتی ہے۔ ایسی صورت حال میں شعر گوئی کا عمل میکانکی انداز میں ہوتا رہتا ہے۔ صرف وہ شعرا جنھیں ہم فنکارانہ عظمت کے مقام پر متمکن دیکھتے چلے آئے ہیں ان جکڑ بندیوں میں رہتے ہوئے بھی تواتر کے ساتھ بڑی اور گہری بات کرنے پر قادر ہیں۔ لیکن ایک ایسا مقام بھی آتا ہے جہاں ان عظیم شعرا کو بھی تنگ دامنی کا احساس کچوکے لگاتا ہے۔ عام شاعر کے یہاں تو اچھے شعر کا آنا ایک اتفاقی امر سے زیادہ نہیں۔

نثری نظم پر مزید بات کرنے سے پہلے ہمیں شعری اور غیر شعری متن کے فرق کو سمجھنا ہوگا۔ اس ضمن میں ان مغالطوں کو بھی دیکھنا ہوگا جہاں نثری نظم کو انشائے لطیف کے ذیل میں دیکھے جانے پر اصرار کیا جاتا رہا ہے۔ شاعری کیا ہے اور کیا نہیں ہے دنیا کی تمام زبانوں میں اس موضوع پر بہت عرق ریزی

کے بعد خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ تاہم، چند بنیادی باتوں کو دہرا لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ شاعری ایک نسبتاً پیچیدہ لسانی اظہار ہے، جس کے چند اہم لوازمات کو کچھ اس طرح دیکھا جاسکتا ہے:

- کفایتِ لفظی
- شدتِ بیان
- کثرتِ معنی
- طاقتور اظہار
- شعری برتاؤ

غور کیا جائے تو ان تمام عوامل میں شعری برتاؤ ہی وہ خاصہ ہے جو واضح طور پر نظم کو نثر سے ممیّز و ممتاز کردیتا ہے۔ یہ امتیاز اس ہیئت کے مخصوص ہونے کے علاوہ ہے جو اپنی نوع میں بصری اور سمعی ہیں۔ مثلاً سطری انقطاع اور موسیقیت۔ یہ بات بھی واضح ہے، نظم میں الفاظ کا استعمال مفہوم کو اشارتی یا تعبیری سطح پر اجاگر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر غالبؔ کا یہ مشہور شعر دیکھیے:

اک نو بہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے

واضح بات ہے کہ یہاں نو بہار ناز، نگاہ، چہرہ، مے اور گلستان کی تراکیب و الفاظ کو ان کے عمومی معنی سے ہٹ کر اصطلاحی معنی میں دیکھا جائے تو جہانِ معنی کی نیرنگیوں کا دائرہ کار بقدرِ ذوق پھیلتا ہی چلا جاتا ہے۔ بلکہ یہی نہیں، مختلف زمانی اور مکانی تناظر میں اخذ شدہ مفاہیم کو تبدّل اور تغیّر کے ایک ایسے لامتناہی سلسلے سے جڑا دیکھا جاسکتا ہے، جو فکر کو گوناگوں سطحات پر انگیخت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ تعینِ مفہوم کا دائرہ جو اپنی نوع میں غیر حتمی ہے، قاری کی متن میں شرکت ہی سے ایسے امکانات کو پیدا کرسکتا ہے جس کا براہ راست تعلق قاری کی افتادِ طبع اور جوہر ذاتی کے علاوہ اس تجربے سے ہے جو قاری کا بلاشرکت غیرے ذاتی اور انفرادی ہے۔

نثر کے برخلاف شاعری پرت در پرت مفاہیم کی رسائی سے تعبیر کی جاتی ہے۔ یہاں اس بات کا اعادہ کرلینے میں کوئی ہرج نہیں کہ مفہوم کے جمود اور اس کی قطعیت پر اصرار نہیں کیا جاسکتا۔ اسی لیے امکانات کی وہ دنیا جسے ہم مفہوم کے دائرے سے تعبیر کرتے آئے ہیں، ایک مکمل دائرے کے بجائے آدھی پونی قوس تشکیل دیتی ہے۔ شاعری کی یہی خصوصیت اسے زمانی اور مکانی تغیر کے باوجود انفرادی اور اجتماعی مطالبات سے غیر متعلق نہیں ہونے دیتی۔ ظاہر ہے، یہ بڑی اور ہمہ گیر شاعری کا خاصہ ہے، جو فکر اور جذبات، دونوں سطحات پر متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں، شعری کمال متضاد کیفیات کو ایک دوسرے کے مقابل لا کر ایک مخصوص تناؤ (Tension) کو اجاگر کرتا ہے۔ یہاں ایک ڈرامائی اور متحرک کیفیت کا پیدا کرنا مقصود ہے۔ اسی ذیل میں غالب

ہی کا یہ شعر دیکھیے:

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کے جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

بڑی شاعری کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ مانوس جذبات و خیالات کو ایک ایسے انداز میں پیش کرے کہ وہ نامانوس اور اچھوتے پن سے مملو نظر آئیں۔ اسی وجہ سے جہاں نثری متن میں براہ راست اور نسبتاً غیر پیچیدہ ابلاغ کی اہمیت رہی ہے، شاعری میں اخفاء معنی کو مستحسن سمجھا گیا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ اخفاء معنی سے مراد عدم ابلاغ نہیں بلکہ ابلاغ کی وہ سطح ہے جہاں مفاہیم پرت در پرت اور سیال حالت میں وجود پاتے ہوں۔ ایسا شعری متن نہ صرف قاری کی قوت مدرکہ کو انگیخت کر کے ایک تخلیقی سرگرمی بن جاتا ہے، بلکہ اسے اس صلاحیت سے بھی بہرہ مند کرتا ہے جہاں عمومی مفاہیم سے بالاتر ارتعاشات کو بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

نظم کے مقابلے میں نثر کی رسومیات نسبتاً سادہ اور غیر پیچیدہ ہیں۔ اوقاف کے نشانات، جملے کی ساخت، ایک جملے کا دوسرے جملے سے ربط، پیراگرافنگ اور صرف و نحو۔ شاعری کی رسومیات کا دائرہ کار وسیع ہے۔ تشبیہہ، استعارہ، تجنیس صوتی، بحر، لفظی تکرار، آہنگ اور قافیہ شاعری کی رسومیات ہیں۔ نثری نظم اپنی ظاہری ہیئت میں نثر لیکن تاثیر اور رسومیات کے حوالے سے شاعری ہے۔ نثری نظم جہاں بیش تر شعری رسومیات کی تائید کرتی ہے، وہاں بحر، وزن، لے اور ایک باقاعدہ آہنگ کی نفی سے اپنے وجود کا اعلان کرتی ہے۔ اس آزادی کا مقصد ابلاغ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنا بتایا گیا ہے۔ یہ باور کیا گیا ہے کہ زمان و مکان کی تبدیلی سے زندگی کے مسائل اور اس کے مطالبات بدلتے رہتے ہیں اور ایک پرانا سانچا بدلتے ہوئے معروضی حقائق اور ان سے جڑے انسانی ردعمل کو ایک منضبط اور بامعنی اکائی میں ڈھالنے کے لیے قطعی ناکافی ہے۔ کلیم الدین احمد نے جب غزل کو نیم وحشی صنف گردانا تو ادبی حلقوں میں ایک طوفان کھڑا ہو گیا۔ 1978 میں خدا بخش لائبریری، پٹنہ کے زیر اہتمام انہوں نے سالانہ خطبات کے سلسلے میں لیکچر دیتے ہوئے اپنے موقف کی تائید ان الفاظ میں کی:

”غزل گو شاعر انسان دوستی کے جذبات رکھتا ہے، مگر ان سے کوئی بڑا کام نہیں لیتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بکھری ہوئی تجلّیوں اور پسی ہوئی بجلیوں کا قائل ہے۔ غزل کے نشتروں سے ایک لطیف خلش پیدا ہوتی ہے... مگر یہ نشتر تلوار نہیں بن سکتے۔ غزل کی زبان بڑی ڈھلی منجھی چیز ہے، مگر اس میں انفرادیت کو پھولنے پھلنے کا موقع مشکل سے ملتا ہے۔ اس کی رمزیت خاصی جامع اور گہری ہے، مگر پھاوڑے کو پھاوڑا کہنے کے دور میں زیادہ عرصے تک کام نہیں دے سکتی۔ اس لیے شاعری کا مستقبل زیادہ تر غزل سے نہیں نظم سے وابستہ ہے۔“

اس بات سے قطع نظر کہ غزل نیم وحشی صنف ہے یا نہیں، ہمیں مصنف کے اس نکتے کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیے جہاں وہ غزل کی تنگ دامنی کا علاج نظم میں ڈھونڈتے ہیں۔ یہ بات غزل کی

حد تک ہے، مگر اس سلسلے کو آگے بڑھایا جائے تو پابند نظم، نظمِ معریٰ اور آزاد نظم کسی نہ کسی رسمی یا غیر رسمی پابندی کے چوکھٹے میں پابند نظر آئیں گی۔ اگر یہ پابندیاں شاعری کے ابلاغ میں سدِّ راہ بنتی ہیں، تو کیا ان کا تج دینا اور ان سے آزادی ایک مستحسن سوچ ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے جناب شمس الرحمان فاروقی کی رائے کو دیکھ لینا مناسب ہوگا۔

”جس تہذیب میں اس طرح کی شاعری ہو سکتی ہو اور جو شعریات ایسی شاعری کے لیے راہ ہموار کرتی ہو، اسے 'نیم مہذب، نیم شائستہ، ریزہ خیالی پر اکتفا کرنے والی وغیرہ وہی لوگ کہہ سکتے ہیں، جن کے بارے میں صمٌ بکمٌ اور لایبصرون کہا جائے، تو غلط نہ ہوگا، یعنی وہ دیکھتے ہیں، مگر دیکھتے نہیں، لیکن افسوس ہے کہ آج بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں، جو غزل کے مضامین کو محدود، اس کے طرز بیان کو انتشار فکری اظہار اور اس کی دنیا کو 'مصنوعی اور نقلی' بتاتے ہیں۔“

ظاہر ہے، یہ دونوں متضاد آرا ہیں۔ پہلی رائے کے مطابق شعری ابلاغ کے بنے بنائے سانچے تا دیر عصری مطالبات کے لیے موزوں و مناسب نہیں رہیں گے۔ دوسری رائے اول الذّکر کے یکسر خلاف ہے جس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ بڑا فنکار شعری رسومیات کے تحت عائد کردہ پابندیوں کو اپنی جولاں گاہ سمجھتا ہے جہاں بڑی اور گہری بات کہنا کوئی ناممکن العمل فعل نہیں ہے۔ ان دونوں آرا پر حاشیہ آرائی سے پہلے میں ایک طالبہ کی انگریزی زبان میں لکھی گئی ایک نظم پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ لڑکی پاکستان میں پیدا ہوئی لیکن اب ایک عرصے سے اپنے والدین کے ساتھ دیارِ غیر میں مقیم ہے:

And I realized again, that it was too late
That when she left the earth
She took all the untold stories with her
I would never be able to ask her again
About her childhood and memories
Or her memories of me
I would never ask her for her special recipe
That contained no real special ingredients
I could never watch her to do the things she did
Even as she did nothing
No one would scold me the way she did
Life wouldn't exist the same way

The smell of her breath
The gentle caress
The unnecessary burden she constantly felt
The love she had for me
No longer existed in the world
And I realized again that I was too late
I had wasted my time, without her
And now regret would waste me, without her.
(Rabeea Siddiqui)

یہ ایک بچی کی اپنی دادی کے لیے دکھ بھرے جذبات کی شاعرانہ تجسیم ہے۔ نظم کی قرأت واضح کر دیتی ہے کہ متکلم اور ممدوح کے مابین خرد سالی اور بزرگی کا ایک محبت بھرا رشتہ ہے جسے موت کے بے رحم ہاتھ نے منقطع کر دیا ہے۔ اس نظم میں نہ تو ہم آواز الفاظ کی تکرار کا اہتمام ہے اور نہ ہی سطری طوالت کا کوئی باقاعدہ قرینہ وضع کیا گیا ہے۔ یعنی یہ نظم ان شعری رسومیات کی پاس داری نہیں کرتی جن کا تعلق بحر، آہنگ اور قافیے سے ہے۔ اس کے باوجود یہ ایک متاثر کن نظم ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعرہ جو کہنا چاہتی تھی اسے وہ کاغذ پر منتقل کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ یہ نظم قاری کو اس کے انفرادی تجربے سے جوڑنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ یہ سب اس حقیقت کے باوجود ہے کہ نظم کی لکھاری سنِ شعور کے آس پاس ایک طالبہ ہے اور کوئی پختہ کار اور مستند قلم کار نہیں۔

اب 10 لاکھ روپے کا سوال یہ ہے کہ کیا شاعرہ بحر اور قافیے کی پابندیوں کو اپناتے ہوئے اتنے ہی موثر انداز میں اپنے جذبات کا اظہار کر سکتی تھی؟ یقیناً بحر اور قافیے کا اہتمام موزونی طبع کے ساتھ جڑا ہوا ہے اور ساتھ ہی ساتھ کچھ اکتسابی معاملات بھی ہیں، لیکن کیا روایتی شعری رسومیات سے کماحقہ آگاہ کوئی عام قلم کار تمام تر پابندیوں کو قبول کرتے ہوئے اپنی تمام تر بات کہہ دینے پر قادر ہے؟ ہمارا مشاہدہ ہے کہ عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ ایک پابند ترتیب کو قبول کرتے ہوئے شاعر خود کو ان ہی باتوں کے اظہار تک محدود رکھ سکتا ہے جہاں تک اس صنف کی مخصوص ساخت اس کو اجازت دیتی ہے۔ نتیجتاً بہت سی باتیں برائے بیت بھی شامل کرنی پڑتی ہیں جو کلام کی وقعت کو کم اور اس کے وفور کو زائل کر دیتی ہیں۔ کہنے والی باتیں رہ جاتی ہیں۔ یہ بات پہلے بھی کی جا چکی ہے کہ فقط بڑے شعرا ہی ہیئت کی عائد کردہ جکڑ بندیوں کو توڑ کر تواتر کے ساتھ بڑی اور گہری بات کہنے پر قادر ہیں۔

جناب کلیم الدین احمد نے اپنے مذکورہ بالا لیکچر میں میر، درد، سودا، مومن، ذوق اور غالب کے بارے میں یہ عجیب و غریب اندازہ لگایا ہے کہ یہ تمام شعرا بزرگ شعرا ہو سکتے تھے، اگر وہ نظمیں لکھتے۔ کلیم الدین احمد، ظن و تخمین کے سلسلے کو خاصے پیچھے تک لے گئے ہیں۔ اگر وہ اپنے حال پر بھی ایک نگاہ ڈال لیتے تو انھیں غزل اور نظم، دونوں اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہوئے شعرا نظر آتے۔ مثلاً کیا وہ

فیض کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ غزلوں کے مقابلے میں ان نظموں کا کینوس وسیع تر اور ان کی شعری معنویت وقیع تر ہے۔ فیض تو خیر اہم شعرا کی صفِ اول کے شاعر ہیں، کیا کسی نسبتاً درمیانے درجے کے شاعر کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ردیف، قافیے اور بحر کی پابندیوں سے صرف نظر کرتے ہوئے جب وہ جدید نظم لکھتا ہے، تو یک لخت ایک وسیع تر فکری دھارے کا حصہ بن جاتا ہے۔ دیگر الفاظ میں اگر "پابندیاں" ابلاغ میں رخنہ ڈال رہی ہیں، تو ان پابندیوں کو تج کے کون سا تیر مار لیا۔

جدید نظم پر مزید بات کرنے سے پہلے ہمیں ان حد بندیوں کو دُہرا لینا چاہیے، جن سے مختلف اصناف کی پہچان ہوتی ہے۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ایک صنفِ سخن جب مغرب سے در آمد ہو کر ہمارے یہاں آتی ہے تو اس میں حسبِ ذوق کچھ ردّ و بدل بھی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے آزاد نظم یوں تو Free Verse ہی کو کہیں گے، لیکن Free Verse سے آزاد نظم تک آنے کے مراحل نے اصطلاحی معنی کو جوں کا توں نہ رکھا۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل تقابلی کیفیات کو دیکھا جانا چاہیے:

Blank Verse: پنج رکنی بحر (Iambic pentameter) کی روایت۔ کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے ایک موثر پیرایہ بیان۔ بے قافیہ، فطری گفتگو کے آہنگ سے قریب۔

نظم معریٰ: مختلف البحور، بے قافیہ، بحر کا اہتمام، یکساں سطری طوالت۔ مساوی الوزن۔

Free Verse: سطری انقطاع۔ شاعری کے روایتی قواعد اور اسالیب سے پہلوتہی۔ بحر اور قوافی سے آزادی کا اعلان۔ شاعر کی انفرادی حیثیت میں فکری اور صوتی وضع کی تخلیق کاری۔ اپنا آہنگ خود دریافت کرنے پر زور۔ زندگی اور اس کے متعلقات کا جذباتی سطح پر اظہارِ عمیق۔ وزن کے بجائے آہنگ۔

آزاد نظم: مختلف البحور۔ بحر و اوزان کی پابند۔ لچک دار سطری طوالت۔ غیر مساوی سطور۔ عروضی آہنگ۔ تشکیلِ آہنگ کی ترسیلِ معنی پر فوقیت۔

Prose Poem: نثر اور نظم کی درمیانی شکل۔ کاغذ پر دیکھنے میں نثری پیراگراف کی طرح لیکن شاعری کی طرح پڑھی جانے والی۔ کسی باقاعدہ آہنگ اور ہم قافیہ الفاظ کے استعمال سے اجتناب۔ لاشعور کی جھلکیاں۔ بھاری بھرکم اور پر تکلف الفاظ سے احتراز کرتے ہوئے روزمرہ کی بولی پر اصرار غیر ضروری اور پر تصنع الفاظ سے اجتناب۔

نثری نظم: ایضاً (عموماً سطری انقطاع کا اہتمام کیا جاتا ہے)

انشائے لطیف: نثر میں شاعرانہ اسلوب کی خالصتاً شعوری کوشش۔

اس بات کا تعین مشکل نہیں کہ ہم نے جدید شاعری کی مختلف اصناف کو اپنے مزاج کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنایا ہے۔ لہٰذا بلینک ورس بعینہ نظم معریٰ نہیں۔ اسی طرح آزاد نظم کو فری ورس کے مماثل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ نظم معریٰ اور آزاد نظم کی حد تک تو ٹھیک ہے، لیکن نثری نظم کے بارے میں ہمارے تحفظات ابھی تک خاصے شدید ہیں۔ مشرقی شعریات سے شعوری اور لاشعوری سطح پر ہم آہنگ اذہان شاعرانہ صفات سے تہی ایک بظاہر نثری متن کو شاعری ماننے کے لیے تردد کا شکار ہیں۔ ان ہی تحفّظات

پر گفتگو کرتے ہوئے معروف محقق اور قلم کار خواجہ رضی حیدر نے چند سوالات قائم کر کے ان کے جوابات تک رسائی کی کوشش کی ہے۔ اپنے مضمون ''نیرنگی حیات کا شاعر...قمر جمیل'' (مطبوعہ سہ ماہی اجرا، کتابی سلسلہ۔23) میں فاضل مصنف نے اس خیال کا اظہار کیا ہے، ''اگر نثری نظم فراق و فیض جیسے قد آور شعرا کے حوالے سے متعارف ہوتی، تو یقیناً اس کو سنجیدہ صنفِ سخن تصور کیا جاتا، بلکہ قابل تقلید بھی قرار پاتی۔'' اس ضمن میں ان کے خیالات کو سوالاً جواباً کچھ اس طرح دیکھ سکتے ہیں:

سوال: نثری نظم کا جواز کیا ہے؟

جواب: ''نثری نظم کا آغاز بھی دراصل جدید حسی رو کا مرہون منت ہے۔ برق رفتار سائنسی ترقی نے جہاں کاروبارِ جہاں کو سمیٹ دیا ہے، وہاں انسان کو ایسے نت نئے مسائل میں الجھا دیا ہے کہ اس کے پاس وقت تنگ ہو گیا ہے اور وہ خود کو تغیر کی اس تیز رو سے ہم کنار کرنے کے لیے بڑی عجلت کا شکار ہے۔ اس عجلت نے اس کے اندر انتشار پیدا کر دیا ہے اور یہ انتشار اس کی قوت متخیلہ کا جزو بن گیا ہے۔ چنانچہ فکری تسلسل اس کی نفسیات سے متصادم نظر آنے لگا ہے۔ جدید انسان کی ہمہ وقت یہ کوشش ہے کہ وہ تخیل کی متحارب اور متضاد لہروں کو من وعن بیان کر دے۔ نثری نظم دراصل جدید انسان کی ان ہی متضاد اور متحارب لہروں کی وحدت مخفی کا ایک شاخسانہ ہے''۔

سوال: کیا نثری نظم کے لیے ضروری ہے کہ اس کا خالق روایتی معنوں میں شاعر بھی ہو؟

جواب: ''ہمارا شعری وجدان ہر لمحہ یہ گواہی دیتا نظر آتا ہے کہ نثری نظم لکھنے کے لیے تخلیق کار کا شاعر ہونا ضروری ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اکثر نئے تخلیق کاروں کی نثری نظم پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ان نظموں کا خالق کوئی افسانہ نگار ہے، شاعر نہیں کیوں کہ شاعر کی تخلیق کردہ نثری نظموں میں نہ صرف صوتی آہنگ ہوتا ہے، بلکہ ایک تہہ دار معنویت بھی ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک افسانہ نگار یا نثر لکھنے والے کی موضوع یا خیال پر گرفت زیادہ مستحکم ہو، لیکن وہ اظہار کے اس بین السطوری لحن سے محروم رہتا ہے، جو نثر کو بھی شاعری بنا دیتا ہے۔ اسی بنیاد پر نثری نظم کے وکلا کا ایک طبقہ دیگر اصنافِ شعر کی مروجہ پابندیوں سے انحراف کرنے کے باوجود کہتا ہے کہ نثری نظم صرف شاعر ہی لکھ سکتا ہے۔ کیوں کہ اس کے ہاں ساخت اور اسلوب سے ایک کھلی بغاوت کے باوجود ہماری شعری روایت سے ایک ربط ظاہر ہوتا رہتا ہے''۔

سوال: نثری نظم ایک معتبر صنف سخن کی حیثیت سے کیوں متعارف نہیں ہو سکی؟

جواب: ''نثری نظم کی جانب ابتداً ان افراد نے توجہ دی جو یا تو تخلیقی سطح پر کوئی امتیازی جوہر نہیں رکھتے تھے یا شعر کے حوالے سے اپنی شناخت کے سفر میں بہت جلد تھک گئے تھے۔

اوپر دی گئی بحث سے ہمیں جو بنیادی نکات حاصل ہوئے ہیں، انھیں ہم کچھ اس طرح سے

دیکھ سکتے ہیں۔

الف: معاشرتی انتشار اور نہایت سرعت سے بنتی بگڑتی اقدار نثری نظم کی پیدائش کا باعث ہیں۔

ب: نثری نظم میں موجود داخلی آہنگ، تہہ دار معنویت، بین السطوری لحن اور شعری روایت سے ربط اسے زمرہ شاعری میں لے آتا ہے۔

ج: نثری نظم کے فروغ کے لیے جس سنجیدگی اور تسلسل کی ضرورت تھی، ہمارے ہاں وہ اسے نہ مل سکا۔

ہمیں اب جھجکتے ہوئے یہ بات مان لینی چاہیے کہ گزشتہ پینتیس چالیس برسوں سے اردو غزل کی حد تک کوئی اہم یا رجحان ساز کام سامنے نہیں آیا ہے۔ اگر کہیں کہیں مستثنیات کے کچھ چھینٹے ہیں، تو ان میں وہ تواتر نہیں جو ایک نقشِ دوام قائم کر سکے۔ ایسا نہیں ہے کہ غزلیہ شاعری کی طرف توجہ کم ہو رہی ہے یا اس میں کمی آئی ہے۔ غزل آج بھی ہماری مقبول ترین صنفِ سخن ہے۔ مشاعرے اور شعری نشستیں بھی ہو رہی ہیں اور ہر دوسرے تیسرے دن ایک نیا مجموعہ کلام بھی منظر عام پر آ رہا ہے۔ قارئین ادب کو یہ شکایت ہے کہ غزلیہ شاعری کی اس بھیڑ بھاڑ میں کوئی منفرد لہجہ سامنے نہیں آ رہا ہے۔ یہ اہم بات ہے۔ ہم لہجے کے قیام کو ابھی بھی بڑی شاعری کے ساتھ مشروط کرتے ہیں۔ جبکہ شاعری کے ضمن میں لہجہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی یہ مقصود بالذّات نہیں ہے۔ اصل بات تو یہ دیکھنا ہے کہ پیش کردہ شاعری ان مطالبات کے ساتھ ہم آہنگ بھی ہے، جس کا تعلق قاری کی محسوساتی سطح پر ثروت مندی سے ہے۔

''عصری شعور'' کی بھرمار نے شاعری کو یک رخا اور صحافیانہ کر دیا ہے۔ بڑی شاعری میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ اشیا اور خیالات کے مظاہر کو موضوعی انداز میں پیش کر سکے۔ بہ الفاظ دیگر ہم بڑی شاعری سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان خفیف ارتعاشات کو ہمارے سامنے لائے جو ہیئت اور روایت کی پاس داری کرتے ہوئے ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ شعری اظہار کے یک رخے ہونے کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ وہ اپنے ابلاغ میں براہِ راست ہو گیا ہے۔ یہ رویہ شاعری سمیت دیگر فنون لطیفہ کے لیے سمِ قاتل سے کم نہیں۔ اسی بات کی وضاحت کرتے ہوئے والیری کا کہنا ہے بجا ہے کہ ''ایک شخص (شاعر) اگر دوسرے شخص (سامع/قاری) تک بات کو براہِ راست پہنچانے لگے، تو یہ عام فنون کا انہدام ہوگا اور نتیجۂ فن کی تاثیر جاتی رہے گی۔''

بڑی شاعری مانوس سے غیر مانوس کی طرف پیش قدمی ہے۔ لہٰذا ہر بڑے شاعر کی تفہیم مشکلات پیدا کرتی رہی ہے۔ شاعری کی قرأت ایک تخلیقی تجربہ ہے۔ یعنی سباق کو موجود اور موجود کو آئندہ سے مربوط کیے بغیر شعری متن کی تفہیم کی طرف پیش قدمی ممکن نہیں۔ یہ تو اس ربط کی بات ہے جو دوران مطالعہ ایک ہمہ وقت سرگرمی ہے لیکن موجود سے آئندہ تک کا مرحلہ قاری کی توقع کے قیام کے بغیر طے ہی نہیں ہو سکتا۔ ادب کا ہر صاحب ذوق قاری یہ توقع رکھتا ہے کہ موجود سے آئندہ کو جوڑتا ہوا ٹانکا اس چابک دستی اور بے ساختگی کا مظہر ہو، جو اس کی توقع کے درجے کو گرنے نہ دے، بلکہ اسے ہمہ وقت

ایک ترقی پذیر کیفیت سے ہم کنار کرتا رہے۔

میں نے اپنے ایک مضمون بہ عنوان ''غالب کی مشکل پسندی'' میں یہ نکتہ اٹھانے کی کوشش کی تھی کہ غالب فقط مشکل شاعر ہی نہیں، مشکل پسند بھی ہے۔ اس نے اپنے لیے جو اسلوب ایجاد کیا ہے، اسے صرف اتباعِ بیدلؔ پر محمول نہیں کیا جاسکتا، اس میں غالب کی افتادِ طبع کا بڑا ہاتھ ہے۔ یعنی مشکل پسندی مقصود بالذات ہے۔ اسی ضمن میں یہ عرض کیا تھا کہ انگریزی ادب کی مقتدر ترین شخصیات ولیم شیکسپیئر اور ملٹن کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ شیکسپیئر کے یہاں ایک پر پیچ اور معماتی اسلوب کو اپنانے کے شواہد ملتے ہیں۔ اسی طرح ملٹن کی شہرہ آفاق تصنیف ''جنت گمشدہ'' (Paradise Lost) کا اسلوب اس کے کسی بھی فن پارے کے مقابلے میں زیادہ لاطینی زدہ ہے۔

نثری نظم بحر، قافیہ، مساوی الوزن سطور، حتیٰ کہ سطری انقطاع سے آزادی کا اعلان ہے۔ اردو ادب کی حد تک عموماً سطری انقطاع کا اہتمام کیا جاتا ہے، لیکن اس کے برعکس اشکال بھی ملتی ہیں۔ مثلاً ثروت حسین نے چند نظموں کو اس اہتمام سے گریز کرتے ہوئے پیراگراف کی شکل میں پیش کیا ہے۔ نثری نظم تخلیقی کشادگی کے تمام امکانات کو بروئے کار لانے کا نام ہے۔ یہ کشادگی دراصل اس تخلیقی آزادی کا مظہر ہے جو نثری نظم کے شاعر کو درکار اور مہیا ہوتی ہے۔ تکرارِ لفظی، تناؤ، تحیر، روشن خیالی، مختلف شبیہات میں تسلسل (ربط) سے گریز، سریّت، سیاق وسباق سے شعوری اجتناب، ملگجا پن اور عام بول چال کی زبان کا استعمال نثری نظم کو متشکل کرنے میں بہت اہم کردار ہے۔ تاہم اس صنف سخن کے حوالے سے تعینِ قدر کے مسائل اردو ادب کی حد تک تو ضرور دیکھے جاسکتے ہیں۔ ہم بنیادی طور پر نثری نظم کی کامیابی کو ان کیفیات پر محمول کر سکتے ہیں جن کا ابلاغ شاعر کا مقصودِ اول ہے۔ لیکن کیفیات کے ساتھ معاملہ یہ ہے کہ ان کا تعلق مخصوص حالات اور موصول کنندگان کے مخصوص ومنفرد ذوقِ سلیم سے جڑا ہوا ہے۔ لہٰذا اس پر انحصار کرتے ہوئے تعینِ قدر کے کسی بھی حتمی فیصلے تک رسائی ایک مشکل عمل ہے۔ میں اس بات سے واقف ہوں کہ ایسے حتمی فیصلوں کی ادب میں گنجائش نہیں۔ اسی طرح ادب میں تعینِ قدر تنقید کا بنیادی مسئلہ اور سروکار نہیں۔ قاری کا علاقہ ادب سے حظ اٹھانے سے ہے۔ اس طرح تنقید کار کا پہلا کام متن اور قاری کے بیچ ایک ایسے پل کی تعمیر ہے، جو قرأتِ متن کے تجربے کو مزید معنی خیز اور پر کیف بنا سکے۔ لیکن کچھ بنیادی امور کا تعین بہرحال باقی ہے جو نقادان ادب سے نثری نظم پر بھرپور توجہ کا متقاضی ہے۔

بڑی شاعری اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتی ہے۔ شاعری کے کثیر الجہات ہونے سے مراد فقط معنی کی کثرت نہیں۔ معنویت ایک چیز ہے، مگر الفاظ کا چناؤ اور ترتیب (جو بڑی حد تک لاشعوری ہوتی ہے) سے ایک ایسی کیفیت کو بیدار کرنا مقصود ہے، جو بعض اوقات مفہوم پر فوقیت حاصل کر لیتی ہے۔ نثری نظم کی کامیابی کا علاقہ بھی مفہوم کے بجائے کیفیت یا تاثر سے ہے۔

اپنے محولہ بالا مضمون میں خواجہ رضی حیدر نے قمر جمیل کی نثری نظم کو ایک ایسی کاوش قرار دیا ہے، جس کو انھوں نے تمام تر سنجیدگی کے ساتھ نہ صرف اپنایا، بلکہ اس صنف کے دفاع میں ایک طویل استدلال

بھی پیش کیا۔ جناب قمر جمیل کے پیش رو شعرا میں احسن سلیم کا نام ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ احسن سلیم کی نثری نظم میں دلچسپی کسی ''عصری رجحان'' کا پیش خیمہ نہیں تھی بلکہ ان کی مخصوص افتادِ طبع کا ایک ایسا اظہار تھی جس نے ان کی غزلوں میں بھی اپنا ظہور کیا۔ اس وقت ان کی نظموں پر تبصرہ مقصود نہیں، بلکہ نمونے کے طور پر ان کیفیات کو دکھانا ہے جو تمام تر دل سوزی اور اثر انگیزی کے ساتھ نثری نظم کی صورت میں بہ خوبی متشکل کی جاسکتی ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں بات کیفیات کی ہے، مفہوم کی نہیں۔

''دھوپ اور دیئے''

صبح
میری چائے کی پیالی میں بیدار ہوتی ہے
اور شام
میری انگلیوں سے لپٹ کر
ایش ٹرے میں سوتی ہے
میں ان دنوں
راتوں کی خواہش نہیں کرتا
سب کچھ زہر لگتا ہے
بس اک دن
دھوپ کو لپیٹ کر
کسی درخت کے سائے میں رکھ آؤں گا

اور یہ دیئے
تیرے آنگن میں بجھا کر چلا جاؤں گا

شاعری لسانی اظہار کو صوتی اور معنوی اعتبار سے تبدیل کرنے کی بے پایاں صلاحیت رکھتی ہے۔ Richard Lowell کے بقول شاعری واقعاتی بنت کا مظہر نہیں، بلکہ اس کا ظہور خود ایک واقعہ ہے۔ اگر آپ کا ذوق اس نظم کو پڑھتے ہوئے ایک واقعہ نمو پذیر ہوتے دیکھ رہا ہے، تو یقیناً یہ ایک کامیاب نظم ہے۔

❁❁❁

شہرت کا عذاب سہہ رہا ہوں

ڈاکٹر اسد اریب

میر صاحب نے سچ کہا۔

عَجب ہوتے ہیں شاعر بھی، میں اس فرقے کا عاشق ہوں
کہ بے دھڑکے بھری مجلس میں یہ اسرار کہتے ہیں

اس عقیدے کا ایک فرد میں بھی ہوں۔ میرا کامل یقین ہے کہ اگر کوئی شاعر سچ کہنا چاہے' اس کی طاقت اظہار سے بڑھ کر دنیا کا بڑے سے بڑا سچ بھی ایسی تاثیر کمال کو پہنچ نہ پائے۔ خیال کی نزاکتوں، کنایوں کے حسن اور لفظ و معنی کے ان معجزاتِ ہنر کے آگے کسی خطیب کی شعلہ بیانی، متکلم کی شائستہ گفتاری، نگارشِ قلم کے حرف آشنا، نثر نویس کی سحر طرازی، اظہار کے یہ سارے پیرائے ہیچ معلوم ہوتے ہیں۔

اِجرا کے 23 ویں شمارے میں فلک آثار دیکھ رہا تھا، طالب جوہری کی نظم 'پچھتاوا' پر نظر رک گئی۔ پہلے تو میں نے اس نظم کی ہیئت پر غور کیا، اپنی ساخت کے اعتبار سے یہ ایک بالکل نیا سانچہ ہے۔ اردو نظم نگاری میں ترجموں کے اعتبار سے آرزو کے سُریلے نغموں، عظمت اللہ کے 'سُریلے بول' سے لے کر ترقی پسندوں کے سلسلہ امامت کی آخری ولایت عظیم قریشی تک کیسے کیسے باکمال لوگ ہمارے سامنے ہیں۔ 'میں کیسے مسکراتی ہوں' اور 'ماوری سے استانزے' تک کا یہ سفر طرح طرح کی ترکیبوں سے عبارت ملتا ہے۔ اس سارے تناظر میں طالب جوہری کی یہ نظم اردو شاعری میں نئے امکانات کا در کھولتی دکھائی دے رہی ہے۔ اس کے بُطون معانی سے اردو شاعری کا ایک نیا جنم سر اٹھاتا نظر آ رہا ہے۔

اس نظم کے پہلے چار اجزائے خیال برابر ہم وزن (بحر متقارب) مصرعوں میں ہیں۔ پھر ان ہی اوزان کے زحافاتی تصرف کے ذریعے معمولی اُلٹ پھیر سے اگلے ربیع (چار مصرعوں کی اِکائی) بنائے ہیں۔ ان میں شفّاف خیالوں اور فطرت کی پکار سے معمور جذبوں کی لہریں جوار بھاٹا کا منظر نما معلوم ہوتی ہیں۔ یہ ایک تاثیر اور تاثر کا عمل ہے جو بہت کم نظم نگاروں کے ہاں مل پائے گا۔ نئی

نظم نگاری کے ان تجربوں میں بحر کے اجزا ایسے صوتیوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں جس کے نتیجے میں مصرع کا آخری صوتیہ بعد میں آنے والے (ملحقہ) ذیلی مصرع سے پیوست ہو جائے۔ جیسا کہ ان مثالوں میں ملے گا۔

شاعر کی اصل عبارتیں:

"گاؤں کے اندر
اُس کے احاطے کی دیوار کی چھاؤں میں بیٹھے
اپنے شکم کی آگ بجھا کر
اونٹ جُگالی کرتے ہوں گے
کاش میں ایک چرواہا ہوتا
دشت میں اونٹ چَراتا پھرتا"

تجزیہ عبارتوں کا:

......اندر اُس کے
چھاؤں میں بیٹھے
اپنے شکم کی
آگ بجھا کر اونٹ جُگالی
کرتے ہوں گے
کاش میں اک چرواہا ہوتا
دشت میں اُونٹ چَراتا پھرتا

یہ نظم اپنی مکمل ساخت کے اعتبار سے بالکل ایک نیا تجربہ ہے، ممکن ہے اس کے ذریعے اردو کی نظم جدید کے چہرے پر طنز و تعریض کے لگے بہت سے داغ دُھل پائیں۔ ایسے تجربوں پر ابہام، ژولیدہ خیالی، بے کیفی اور اِنتشارِ اوزان کے جو طعنے اب تک سہنے کو ملے ہیں اس نظم کو پڑھ کر شاید وہ بوجھ بھی ہلکا ہو سکے۔ مجھے کوئی عار نہیں، نظم جدید (خصوصاً نثری نظم) کے مخالفوں کی فہرست اگر کوئی ندیم مرتب کرے اور میرا نام بھی وہاں ملے کہ میں ایک طویل عرصہ تک اس تبرّہ ایجی ٹیشن کا فعال رُکن رہا ہوں۔ فنون کے شمارے 8، سال 1978 میں 'شعور کی منفی رَو' کے عنوان سے میرے تنقیدی مضمون پر احمد ہمیش، افتخار جالب، جیلانی کامران کے بہت سے طرف داروں نے کافی دیر تک ناک بھوں چڑھائے رکھی۔ مگر اب اعتراف کرتا ہوں، غزل کے مقابلے میں نظم جدید کا پیراہن زیادہ کُشادہ ہے۔ پچھتاوا تو نہیں لیکن confession کے قریب تر ضرور ہوں۔ اگر ہماری نئی نظم میں ایسے تجربات سامنے آئیں، جن کا مظہر طالب جوہری کی نظم 'پچھتاوا' کی صورت میں ملے تو کیا ہی اچھا ہو!

اب میں اس نظم کے بُطون معانی کی طرف آتا ہوں۔ ظاہری پیکر میں یہ نظم ضرور ہے' اسے نظم

کہئے لیکن فی الاصل، یہ کسی خودنوشت کا پہلا 'ورق' ہے ایسی خودنوشت جو ابھی لکھی نہیں جا سکی اور یہ کہ لکھنے والا اگر لکھنا بھی چاہے تو کبھی نہ لکھ سکے' کہ اس دشت پُر خطر میں ایسی ایسی بلاؤں کا سامنا ہے جن کا شمار بھی مشکل ہو۔ یہ نوشت اگر کبھی سامنے آئی تو اس کا پہلا باب ہوگا کیا کھویا کیا پایا۔ جس ہنر پر اس وقت اس کی شہرت کا مدار ہے' دراصل وہی اس کا آزار ہے لیکن اس حقیقت حال کو وہ ماضی کی پکار اور گزرے جنم کے زمانوں کی یاد میں تحلیل کر کے تسکین خاطر کا سامنا بہم کرنا چاہتا ہے مگر یہ تو ایک وصفِ اضافی ہے۔ دنیا کے تمام بڑے آدمی خواہ کیسے ہی صاحب عسکر و لشکر ہوں، چاہے مالکِ محراب و منبر ہوں، زمانے بھر میں اُن کا طوطی بولتا ہو، اپنے گزرے زمانوں، اپنے جنم استھانوں، اپنے اوائل زندگی کے منظر ناموں کو اپنی نگاہوں سے کبھی محو نہیں ہونے دیتے ہوں۔ خواہ ان کا حال کتنے ہی عیش و طرب سے معمور، خُدّامِ ادب، غلام گردشوں، پائیں باغوں، پہرے داروں، نقیبوں اور حاجبوں سے آباد ہوں، لیکن وہ اپنی شہرت کے عذاب سے پناہ مانگنے کے لئے گُمنامی کے خواہاں ہو کر ماضی کے دام میں سمٹ جانے ہی کو اپنی عافیت جانتے ہیں۔ اس نظم کو بھی شاعر نے ایسی ہی عافیت و امان کا استعارہ بنانے کی سعی کی ہے۔ وہ اپنی شہرت کے عذاب سے پیدا ہونے والے جہنم سے نکل بھاگنا چاہتا ہے، اُس نے جانا کہ وہ اس منزل موجود پر غلط راستوں کا سفر طے کر کے پہنچا ہے' اس نے اپنے اس حاصل کو پچھتاوے کا نام دیا۔ وہ چاہتا ہے اے کاش میں وہاں ہوتا، جہاں پنگھٹ پر رہٹ چلتا تھا، کچی دیواروں پر کھپریل چڑھی ہوئی کھپریلیں ہوتیں، گلی گلی نٹ کھٹ کا تماشا ہوتا' صدیوں پرانے درختوں کی شاخوں پر چمگادڑیں جھولتی نظر آتیں، نرھیائی پر جنگلوں میں آئے ہوئے گائے، بھینسیں اور بکریوں کے ریوڑ ہوتے ہیں۔ بیہڑوں، میدانوں، کھیتوں کھلیانوں میں گھومتا پھرتا کیا ہی اچھا ہوتا! اسے اپنے حال خوش منظر، متمدن سماج اور مہذب معاشرے سے وہ زمین وہ زمانہ، وہ لوگ زیادہ بھلے لگتے ہیں جو اپنی زندگی آپ جیا کرتے تھے۔ وہ ان زمانوں کی طرف پلٹے تو کیسے پلٹے؟ اپنی شہرت و عظمت کا ایسا اسیر بے دام ہوا کہ رات کے اندھیرے میں بھی اپنے دریچوں سے سر باہر نکالنے سے ڈرتا ہے، کافروں کی تلاش میں نکلے ہوئے سپاہیوں کی گولی کا نشانہ نہ بن جائے۔

یہ ایک نظم ایک ایسے آزردہ شخص کا نوحہ ہے جو اپنے کمال ہنر کا سزایافتہ ہو۔ جو گھر سے نکلے تو حفاظت کی امان مانگے۔ اُسے تاسّف ہے وہ کوچہ ہنر وَراں کی سمت کیوں آیا، ہر چند کہ اس ہنر میں تکریم بھی تھی اور تقدیس بھی، صلہ و ثواب کی عمدہ بشارتیں بھی تھیں، لیکن یہ سب کچھ جب سوہانِ روح بن جائے، اُس کے کس کام کا؟ وہ سوچتا ہے، اے روشنی طبع تو مجھ پر ایسی بلائیں نہ لاتی، بہتر تھا کہ کمال ہنر کے اس عذاب سے میں آزاد ہوتا، پہچان سے بری ہو کر شہر کے اس طلسمی محل سے باہر نکل آتا۔ اپنی زندگی آپ تو جیتا۔ یہ جینا بھی کیا جینا ہے؟ مجھ سے تو وہ بندر نچانے والا مداری بھی اچھا ہے جو کم از کم اپنی مرضی سے جی تو سکتا ہے۔

۞۞۞

سرچشمۂ مسرت

ماہ طلعت زاہدی

بارش کے بعد دھلا ہوا نیلا کنج آسمان تھا۔ بہار کی خوشگوار دوپہر تھی میں مابعد الطبیعیات کے مسائل پڑھ کر موجود میں گم تھی۔ مگر کچھ گزرے ہوئے اپنوں کی ارواح ضرور میرے ساتھ ساتھ تھیں، میں اس قدر اپنے آپ میں گم تھی کہ مجھے اپنے سے ماورا کا شدید احساس ہو رہا تھا۔ فضا میں سکوت آفریں بول چال بھی تھی۔ نیلے آسمان پر سفید رُوئی کے گالے تیر رہے تھے۔ سدا بہار کے گلابی پھول مسکرا رہے تھے، پتے ہرے اور آنکھوں کو کُھب رہے تھے۔ ہوا چلنے لگی تھی۔ سامنے کے احاطے میں لگا بلند و بالا نیم کا درخت عجیب سرشاری میں جھومنے لگا تھا............ ادھر اور اُدھر............ میرا وجود بھی ڈول رہا تھا، اندر اور باہر............ آنکھوں میں شدید آنسو تھے۔ مگر روح میں ایک گہرا اطمینان............ میں اس کیفیت کو کیا نام دے سکتی ہوں؟

اور وہ ایک تاریک رات تھی دل اندیشوں میں ڈُوبا جا رہا تھا، کہیں دور بارش ہوئی ہوگی۔ مجھے اُفق پر لہراتی ہوئی برق کی لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ ہر مرتبہ ایک تیر کمان سے نکلتا اور آنکھوں سے جگر تک اُتر جاتا۔ وہ آسمانی بجلی تھی مگر ڈرا نہیں رہی تھی۔ اُس کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی، لیکن ہر دفعہ ایک جھما کا سا آنکھوں کو خیرہ کر جاتا............ آہستہ آہستہ دل اندیشوں سے باہر نکل آیا اور میرے ہمراہ آسمان کے کناروں کو چُھونے لگا، یکا یک کوئی انجانا پرندہ چیختا ہوا بیچ آسمان سے گزر گیا۔ اب طبیعت بحال ہو چکی تھی اور میں مطمئن ہو کر ٹہلنے لگی۔ یہ کون سے اندیشے اور کیسی بحالی تھی؟ میں نے بچپنے سے ہی چاند کو بارہا دیکھا تھا۔ کبھی دستی پنکھے کی جھریوں سے، کبھی سامنے لگے جامن کے درخت کے پتوں میں، کبھی آدھی رات کو اپنے اوپر جھکے ہوئے، کبھی ساتھ ساتھ چلتے ہوئے، کبھی پچھلی رات کو افسردگی اور پیلاہٹ میں، جُدا ہوتے ہوئے............ لیکن پھر بھی ایک شام ایسی تھی کہ جو چاند کے نام کی تھی۔ جُھٹ پٹے کا وقت نکل چُکا تھا جب اچانک میری نظر سامنے مشرقی آسمان کے کناروں سے طلوع ہوتے ہوئے چودھویں کے چاند پر پڑی............ اُف میرے خُدا............ کیا منظر تھا۔ ایک سنہری چاندنی کا

ساتھال آہستہ آہستہ سیاہی مائل پر اُبھرتا ہی چلا آ رہا تھا، ایک جادو کی چھڑی من پر پھر چُکی تھی میں تو کہیں بھی نہیں تھی۔ وہاں تو صرف بڑا سا چاندی کا تھال تھا، جو سنہرا بھی تھا اور جادوئی بھی............وہ جادو کہاں سے پھوٹ رہا تھا، یہ سوال بغیر جواب کے رہ گیا۔لیکن اتنا یاد ہے کہ اُس شام میں نے چاند کو اتنے تحیر سے دیکھا کے چاند خود مجھے دیکھتا رہ گیا۔

کشمیر کے پہاڑي گاؤں میں موسلا دھار بارش کے بعد آسمان صاف سُتھرا ہو چکا تھا۔بجلی تو اب شہروں میں بھی نایاب تھی وہ تو پہاڑی گاؤں تھا۔ ہرطرف سیاہ رات کی حکمرانی تھی، سیاہی میں ہی سفیدی اُجاگر ہوتی ہے............جُوں جُوں اندھیرا بڑھنے لگا، تُوں تُوں ستارے جگمگانا شروع ہوئے، اور ایک وقت ایسا آیا کہ ستارے بڑے بڑے نگینوں کی مانند اتنے نزدیک چلے آئے کہ ہاتھ بڑھا کر چھولیا جائے۔ کیا سحر انگیز رات تھی جیسے کسی نے بڑے بڑے جھلملاتے، موتیوں، نگینوں، ہیروں، جواہرات سے بھرا جڑاؤ آنچل میرے سر پر ڈال دیا تھا۔ وہ بھی ایک رات تھی مگر شہر کی برقی قمقموں سے روشن رات، ہم ایک بڑے کمپنی باغ میں گھوم پھر رہے تھے۔ جولائی، اگست کے حبس زدہ موسم میں، سبزے اور پھولوں کی کیاریاں دل کو تسلی دے رہی تھیں، چمن کے کیفے میں بلب روشن تھے، لیکن کہیں کہیں بڑے بڑے قد آور درختوں کے نیچے اندھیرا سا بھی تھا۔ چلتے چلتے ایسے ہی کسی تاریک سے گوشے پر میری نظر پڑی............سینکڑوں جُگنو اُڑتے پھر رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے اُڑتے ہوئے چراغ آنکھوں میں بَسے رہ گئے۔ وہ جُگنو آج بھی میرے ساتھ ہیں............ ہر تاریک گوشے میں یہ چراغ مجھے راہ دکھاتے ہیں۔

سہ پہر کا وقت تھا۔گرم ترین دن کے بعد گھٹا ٹُوٹ کر آئی تھی اور چھاجوں پانی برس رہا تھا، میں چھت کی برساتی میں بیٹھی یہ منظر دیکھے ہی چلی جا رہی تھی۔ آسمان سے زمین تک پانی کا ایک تار بندھا ہوا تھا............درختوں کا سبزہ نکھر رہا تھا۔کلیاں، پھول ہنس رہے تھے، میری آنکھیں لگاتار ہوتی بارش کو دیکھ دیکھ کر تھک چُکی تھیں لیکن میرا دل آسمان، زمین کے بیچ پانی کے تار میں کہیں اٹک سا گیا تھا............وہ کیسی بارش تھی؟

رات کو صحن میں سوتے ہوئے اچانک آنکھ کھلی............سامنے کی دیوار پر چنبیلی کی بیل پھیلی ہوئی تھی اور اُس پر جوبن کا عالم تھا............اس قدر پھول تھے کہ پتے چُھپ گئے تھے، نیند آنکھوں سے اُڑ چکی تھی صرف چنبیلی کے سفید پھول، مدھر خوشبو بکھیرتے ہوئے مسکرائے جا رہے تھے مجھے سوتے سے اُٹھا کر ان خوش مذاق پھولوں کو کیا ملا؟ سِوائے اس کے آج تک وہ پھول میری یادوں میں آویزاں ہیں۔چنبیلی کے اُن مُسکراتے ہوئے پھولوں پر کبھی خزاں نہیں آئی............وہ آج بھی مُسکراتے ہوئے تروتازہ ہیں گلاب تو ہزاروں، لاکھوں دیکھے ہوں گے۔لیکن ایک گلاب ایسا دیکھا جس نے میرے دل کا خون کر دیا، کشمیر کے گاؤں ٹنگی کا وہ پہاڑی علاقہ تھا جہاں سرما میں پانچ پانچ فٹ برف پڑتی ہے............ریسٹ ہاؤس کے احاطے میں پہاڑ کی جڑ میں ایک نرم و نازک گلاب کا

پودا لگا تھا۔ پتہ چلا یہ ایسا گلاب ہے جو گرمی، سردی، تروتازہ ہی رہتا ہے......حتیٰ کہ برف میں بھی اسی توانائی کے ساتھ پھول کھلا رہتا ہے۔

اُس گلاب کا تعلق شاید وفا کے ناچیے سے جُڑا تھا............میں دَم بخود رہ گئی............اتنی لطافت، نزاکت کے ساتھ موسموں کی سختی جھیلتا ہوا وہ انوکھا گلاب تھا۔

میرے چھٹپن کا زمانہ تھا جب ہم ایبٹ آباد کی شملہ پہاڑی پر پیدل چڑھائی کر رہے تھے۔ میں تو تقریباً بھاگ ہی رہی تھی۔ پہاڑی کی بلندی بارہ سو فٹ بتائی گئی تھی اوپر پہاڑی پر پہنچ کر زمین ہموار ہو گئی تھی............ وہاں ہواؤں کا شور کانوں میں شائیں شائیں کر رہا تھا............واپسی میں بھی میں بھاگتی دوڑتی نیچے اُتر آئی۔ بھائی جان میرے ہمراہ اور امی پاپا پیچھے تھے۔ نیچے پہنچ کر پاپا امی نے بتایا کہ انہوں نے ایک ایسی پہاڑی گُپھا دیکھی تھی، جہاں لاتعداد سانپ پڑے ہوئے تھے............مگر وہ بھی کیا دن تھے............ نہ خوف نہ ڈر بلکہ سڑک پر کھڑے پیسٹری والے سے پیسٹری لے کر کھانے میں لذت محسوس ہو رہی تھی............وہ پیسٹری والا جو سائیکل پر ٹین کے بکسے میں پیسٹریاں بیچ رہا تھا...... وہ تو مجھے کبھی نہیں بُھولا۔ ایسے ہی دن تھے جب مری کے مُشک پوری ریسٹ ہاؤس میں لان کے سبزے پر بادل اتر آئے............ میری حیرانی بے حساب تھی، پھر وہ بادل کھڑکیوں، دروازوں سے اندر کمروں میں بھی سما گئے............ میں خوشی اور حیرت سے ناچ رہی تھی ملتان میں پیدا ہونیوالی بچی کیلئے بادلوں سے یہ پہلی ملاقات اچھوتی تھی وہ بچی جس کے والدین یو پی کی موسلا دھار بارشوں میں وقت گزار کر اب صحرا نشین تھے............جن کی آنکھیں آسمان پر بادل کے ایک ٹکڑے کو ترسا کرتی تھیں۔ اُس بچی کو بادلوں نے اپنی آغوش میں بھر لیا تھا کیا سُہانی ملاقات تھی............ایسی تو کسی سے کبھی ملاقات بھی نہیں ہوئی۔

شفق پھولنے کا ذکر بہت دفعہ پڑھا تھا، لیکن ایک دن اسلام آباد کے ٹیرس پر بیٹھے ہوئے اس شفق کو میں دیکھتی ہی رہ گئی، سامنے کی مسجد کی دیوار کے پرے سورج اتر گیا تھا۔ سرمئی دُھند لکا آسمان پر چھانے لگا۔ ایک آدھ تارا بھی ادھر اُدھر نظر آیا، یکا یک مغرب کی سمت گُل انار بن گئی اور مشرقی سمت یعنی ہمارے گھر کے درودیوار پر اُجالا تھا ایک آسمانی دودھیا روشنی میں سارا مشرق نہا رہا تھا...... اور مغرب سُرخ انگاروں کی طرح دہک رہا تھا............ آنکھیں اُجالے میں دُھل گئی تھیں۔ بینائی تازہ دَم ہو گئی تھی............کیا اس کو شفق پھوٹنا کہتے ہیں؟

لڑکپن کی گرمیوں میں رات کے وقت میں چھت پر لیٹی ہوئی ہوئی تھی۔ کہیں دور سے ریڈیو پر کسی گیت کی آواز گونج رہی تھی: ''نہ یہ چاند ہوگا نہ تارے رہیں گے، مگر ہم ہمیشہ تمہارے رہیں گے'' وہ ہیمنت کمار کی آواز تھی۔ موسیقی کی تشریح میں نہیں کر سکتی مگر اس دھن اور ان سروں میں بہ یک وقت عدم اور وجود کا تاثر موجود تھا۔ گیت کے بول اور موسیقی کا اُتار چڑھاؤ ایک دوسرے کے ہم نوا تھے............ وہ رات، گیت اور دُھن میں کبھی نہیں بھولی بیک وقت فنا کا خوف اور ہمیشگی کا خواب روح میں اُتر گیا۔

بے خواب آنکھوں پر ایک امکان نے پُرسکون نیند کی تھپکی دی اور میں سوگئی۔

مارچ کے دنوں میں جب ملتان میں بھی خوشگواری کا احساس بڑھ جاتا ہے...... ابر بہار بھی کبھی مہربان ہوجاتا ہے اور پھاگن اپنے رنگ دکھاتی ہے، ایک شام مالٹے کے درخت سے خوشبو کے ایسے مرغولے اُٹھے کہ میری روح میرے جسم سے علیحدہ ہوکر مالٹے کے درخت سے لپٹ گئی، وہ درخت جو سفید کلیوں سے گجگجا رہا تھا...... وہ کلیاں جو پورا مدھ بن میرے صحن میں اُتار لائی تھیں وہ مدھ بن جو کھٹی میٹھی مُدھر، مست خوشبو لُٹا رہا تھا........... وہ خوشبو جس نے مجھے، مجھ سے چھین لیا تھا۔ آہ کیا خوشبو تھی، سانسوں میں بسی رہ گئی اب پلٹ کر ایک طول طویل زندگی پر جب نظر ڈالی ہے تو یہی چند مٹھی بھر مناظر ہاتھ آئے ہیں جو شاید زندگی بھر میرے ساتھ رہے ہیں یہ مناظر اور ان سے جُڑے احساسات میرے لئے چشمہ مسرت ہیں سچ تو یہ ہے میں فطرت کی احسان مند ہوں، جس نے ہمیشہ میری انگلی تھامے رکھی اور مجھے ہر برے بھلے سے بچائے رکھا کسی زشت وخوب پر میری نظر ہی نہ پڑی، سخت سے سخت وقت اور کڑے سے کڑے امتحان میں فطرت نے میرے دل کے بہلانے کو کیسے کیسے سامان مہیا کئے اور مجھے ہمیشہ خود سے پیار کرنے پر آمادہ بھی رکھا۔

۞۞۞

تخلیقی فن پارے زبان و بیان کی تشکیل نو کرتے ہیں اور ایک نئے روزمرہ کو زبان کے تجریدی اسٹرکچر میں داخل کرتے ہیں۔ اس طرح شعر و ادب میں نئی توانائی، اجتماعی، معاشرتی ماحول میں تبدیلی کا اشاریہ بن جاتی ہے۔ ایسے تخلیق کاروں کی تحریر بھی قدر و قیمت اور مقام و مرتبے کے اعتبار سے ادب عالیہ میں کلاسیک کا درجہ حاصل کرلیتی ہیں۔ ایسے تخلیق کاروں کی زندگی اپنے تخلیقی نظام میں بسر ہوتی ہے۔ شہرت یا مقبولیت ان کے لیے بے معنی ہوجاتی ہے، وہ کام کرتے ہیں اور بس۔ اگر کبھی لڑتے بھی ہیں، تو ظلم و جبر کے خلاف، وہ بھی محض حق آدمیت اور حقوق انسانی کے لیے۔

(احسن سلیم)

(علاقائی اور بین الاقوامی ادب کے تراجم)

چند نظمیں ادونیس کی

اردو روپ: انور سن رائے

علی احمد سعید المعروف ادونیس کا شمار عہد حاضر کے اہم ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کا ادبی سفر سات عشروں پر محیط۔ عربی شاعری ان کے تذکرہ کے بغیر ادھوری۔ جو رجحانات انھوں نے متعارف کروائے، اسی پر جدید عربی شاعری کی عمارت کھڑی ہوئی۔ اس زبان میں نثری نظم کے وہ بانی ہیں۔ ہر برس جب نوبیل انعام کا اعلان ہونے کا وقت آتا، ان کا نام گونجنے لگتا ہے۔ وہ یکم جنوری 1930 کو شام میں پیدا ہوئے۔ اگرچہ فکری طور پر وہ ادب کے سیاسی استعمال کے مخالف ہیں، لیکن عرب مطلق العنان حکمرانوں کے لیے وہ ناپسندیدہ ٹھہرے، ان کی کتابوں پر پابندی لگی۔ مذہبی طبقات کی مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ 1956 سے وہ جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ عرب قوم پرست اور ترقی پسند بھی ان کے مخالف رہے۔ ناقدین اثر پزیری کے باعث ان کا موازنہ ٹی ایس ایلیٹ سے کرتے ہیں۔ انھیں ایک قد آور مفکر اور نقاد کے طور پر بھی شناخت کیا جاتا ہے۔ عرب نقاد ان کا شمار عشرہ بن شداد، ابونواس اور المتنبی جیسے شعرا میں کرتے ہیں۔ 86 سالہ ادونیس اپنی اہلیہ خالدہ سعید اور دو بیٹیوں کے ساتھ پیرس کے نواح میں رہتے ہیں۔ اردو کے معروف فکشن نگار، شاعر اور صحافی، انور سن رائے نے نہ صرف ادونیس کے کلام کو اردو روپ دیا، بلکہ اپنی تازہ کتاب ''نیویارک کے لیے ایک قبر'' کے ذریعے قارئین اردو کو اس معتبر شاعر سے متعارف بھی کروایا۔ یہ فقط ترجمہ نہیں، ماخوذ زیادہ بہتر اصطلاح ہے۔ (ادارہ)

☆☆☆

زخم

1

ہوا کے نیچے سوتے پتے
زخموں کا جہاز ہیں

اور ایک دوسرے پر منہدم زمانے
زخم کی عظمت ہیں
اور ہماری پلکوں سے بلند ہوتے درخت
زخم کی جھیل ہیں
زخم کو پایا جا سکتا ہے پلوں پر
جہاں تک قبر کی لمبائی جاتی ہے
اور صبر تو جاتا ہے نہ ختم ہونے تک
ہماری محبت اور موت کے ساحلوں کے درمیان
زخم ایک نشانی ہے
اور زخم ہے ایک چوراہا بھی

2

زبان کا دم گھنٹیوں کی آوازوں سے گُھٹ گیا ہے
میں اُسے زخم کی آواز کی پیشکش کرتا ہوں
دور سے آتے پتھر کو
گرد کے سامنے ریزہ ریزہ ہوتی خشک دنیا کو
چرمراتی مسہری پر وقت دوست کے لیے
میں زخم کی آگ جلاتا ہوں
اور جب تاریخ میرے کپڑوں کے اندر جلتی ہے
اور جب نیلے ناخن میری کتابوں کے اندر بڑھنے لگتے ہیں
میں دن کو دُہائی دیتا ہوں
'کون ہو تم اور کون اچھالتا ہے تمھیں
میری باکرہ زمین پر؟'
اور میری کتاب کے اندر اور میری باکرہ زمین پر
میں آنکھوں کی اُس جوڑی کو گھورتا ہوں جسے مٹی سے بنایا گیا ہے
میں سنتا ہوں کوئی کہہ رہا ہے
'میں ہوں وہ زخم جو پیدا ہو چکا ہے
اور نمو پاؤں گا جیسے تمھاری تاریخ نمو پاتی ہے'

3

میں نے تجھے نام دیا: بادل
بچھڑتی فاختاؤں کے زخم
میں نے تمھیں کتاب اور قلم کا نام دیا
اور اب میں شروع کرتا ہوں مکالمہ
اپنے اور قدیم زبان کے درمیان
قدیم کتابوں کے جزائر میں
قدیم زوال کے جزائر میں
اور اب میں سکھاتا ہوں یہ الفاظ
ہوا کو اور کھجور کے درختوں کو
اے بچھڑتی فاختاؤں کے زخم

4

اگر میرے پاس ایک بندرگاہ ہوتی خوابوں اور
آئینوں کے مالک میں، اگر میرے پاس ایک جہاز ہوتا
اگر میرے پاس باقیات ہوتیں
ایک شہر کی، اگر میرے پاس ایک شہر ہوتا
بچوں اور رونے کے ملک میں
تو میں یہ سارے لفظ صرف زخم کے لیے لکھتا
تیر جیسا ایک گیت
جو درختوں، پتھروں اور آسمان میں بھی داخل ہو جاتا
پانی جیسا نرم ہوتا
بے لگام، چونکانے اور فتح کرنے والا

5

بارش کو ہمارے صحرا پر برسا
اے خوابوں اور خواہشوں سے آراستہ دنیا
ہم زخم کی ہتھیلیاں ہیں، ہمیں برسا اور متحرک کر
ان شاخوں کو درختوں سے محروم کر دے جو زخم کی خاموشی کو پسند کرتی ہیں
وہ جھوٹ اس کی نوکیلی پلکوں اور نرم ہاتھوں کو گھورنے کے لیے جاگتا ہے

خوابوں اور خواہشوں سے آراستہ دنیا
دنیا جو ایک تازیانے کی مانند
میری پیشانی پر برستی ہے
قریب مت آؤ قریب تر ہے زخم
مجھے للچاؤ مت زخم کہیں حسین ہے
تمھاری آنکھوں نے آخری سلطنتوں پر
جو جادو چلایا
زخم اس پر سے گزر چکا ہے
گزر چکا ہے اور ایک بھی مسافت نہیں چھوڑی
نجات تک رسائی کے لالچ میں، اور پیچھے نہیں چھوڑا
ایک بھی جزیرہ

☆☆☆

عالم حجاب

جب سورج شام کے لیے
اپنی خواب گاہ کھولتا ہے،
سمندری بگلے ظاہر ہونے لگتے ہیں
جیسے آسمان کے چہرے پر بنا جا رہا ہو ایک پردہ

☆☆☆

بڑھاپا

جب کبھی کہتا ہوں:
بڑی عمر کا ہو گیا ہوں میں،
اور زخموں نے اوڑھ لیا ہے مجھے،
ایک آندھی مجھے جھنجھوڑنے لگی ہے
اور صبح

مجھے نوجوانوں کے سے
چہرے سے آراستہ کر دیتی ہے

☆☆☆

زبانوں کے لیے ایک گیت

یہ تمام زبانیں
یہ ٹکڑے
خمیر ہیں
ان شہروں کے لیے جو آنے والے ہیں
ساخت کو تبدیل کرو، اسم کی
فعل کی اور حرف کی
کہو: کوئی پردہ نہیں ہمارے بیچ
اور اپنے دلوں کو فاتحہ سے خوش کرو
حاجت کی سورۃ
اور مہر بند آسمانوں کے وجد سے

۞۞۞

کبھی اس گلی میں آنا کبھی اس گلی میں جانا
یہی کار دو جہاں تھا اسے کیا کمال کہتے
(منجمد پیاس ۔ احسن سلیم)

فوق مافوق

تخلیق کار: چنوا اچیبے
ترجمہ: محمود احمد قاضی

جولیئس آبی بیٹھا اپنے ٹائپ رائٹر کو گھور رہا تھا۔ موٹا چیف کلرک جو کہ اس کا باس تھا، اپنی میز کے پاس بیٹھا خرّاٹے لے رہا تھا۔ گیٹ کیپر جس نے سبز وردی پہن رکھی تھی' باہر اپنی جگہ پر سو رہا تھا۔ لیکن آپ اس پر کوئی الزام نہیں دھر سکتے کہ تقریباً ایک ہفتے سے کسی ملاقاتی کا گزر اس دروازے سے نہیں ہوا تھا۔ وزن کرنے والی دیوہیکل مشین پر ایک خالی ٹوکری پڑی تھی۔ مشین کے گرد چند پام گری پودے اداسی میں لپٹے ہوئے پڑے تھے۔ وہاں صرف مکھیوں کی حکومت تھی۔

جولیئس اس کھڑکی کی طرف آیا جو نائیجر دریا کے کنارے پر موجود بڑی مارکیٹ کی نگرانی کرتی نظر آتی تھی۔ اگرچہ یہ قصبہ جو آبادی کی بڑھوتری اور پھیلاؤ کی وجہ سے ایک بڑی پام آئل بندرگاہ میں تبدیل ہوتے ہوئے دریائے آفو تک بڑھ آیا تھا، ابھی تک اس کی یہ مارکیٹ نکوو ہی کہلاتی تھی، تاہم اپنی حد سے تجاوز کرنے کے باوجود یہ اپنے اصل نکوو دِن کے موقع پر اب بھی مصروف ترین ہی تھی کیونکہ وہ دیوی جو قدیم زمانے سے اس کی میرِ مجلس تھی' وہ اپنے خاص دن پر اب بھی اس پر سحر طاری کئے رکھتی تھی، تاکہ لوگ اس کے لوبھ میں پھلتے پھولتے رہیں۔

ایک کہاوت کے مطابق وہ مرغے کی بانگ سے کچھ ہی دیر پہلے مارکیٹ کے مرکز میں ایک بوڑھی عورت کے روپ میں ظاہر ہوتی تھی اور کافی فاصلوں پر رہنے والے مردوں اور عورتوں کو مارکیٹ میں کھینچ لانے کیلئے اپنے جادوئی پنکھے کو اپنے دائیں بائیں' آگے پیچھے زمین کے چاروں اطراف میں لہراتی تھی اور وہ لوگ اپنی زمینوں کی پیداوار، پام آئل اور مغزیات، کولا اخروٹ، کیساوا، چٹائیاں، ٹوکریاں اور مٹی کے برتن اپنے ساتھ لاتے تھے اور اپنے گھروں میں بہت سے رنگین کپڑے، دھواں رنگ مچھلیاں، لوہے کے برتن اور پلیٹیں لے جاتے تھے۔ یہ جنگلوں میں رہنے والے لوگ تھے۔ دوسری

آدھی دنیا جو عظیم دریاؤں کے کنارے پر آباد تھی وہ بھی ڈونگا کشتی میں آتی تھی اور اپنے ساتھ دھاگا اور مچھلی لاتی تھی۔ بعض اوقات یہ ایک بڑی ڈونگا کشتی ہوتی تھی، جس میں ایک درجن سے زیادہ لوگ ہوتے تھے اور بعض اوقات تیز بہاؤ والے انیم بارا کے ذریعے ایک چھوٹی کشتی میں اپنی بیوی کے ساتھ آنے والا کوئی اکیلا مچھیرا ہوتا تھا۔ وہ اپنی ڈونگا کشتی کنارے پر لنگر انداز کرتے اور خاص سودے بازی کے بعد اپنی مچھلی بیچتے۔ تب ان کی عورت دریا کے ڈھلوانی کنارے سے چل کر تیل اور نمک خریدنے کے لئے مارکیٹ کے وسط میں چلی آتی' اور اگر اس کا مال بہت اچھا بک گیا ہوتا تو تب وہ بہر حال تھوڑا سا کپڑا بھی لے لیتی۔ اور وہ گھر پر موجود اپنے بچوں کیلئے پین کیک اور مائی مائی خریدتی جو کہ اگارہ عورتوں نے تیار کئے ہوتے تھے۔ شام ہونے پر وہ دوبارہ اپنے پتوار پکڑتے اور غروب آفتاب کی روشنی میں ٹمٹماتے پانی میں کشتی کھینے لگتے اور ان کی ڈونگا کشتی دور جاتی ہوئی، مختصر سے مختصر ہو کر پانی کی سطح پر ایک کالے چاند جیسی شکل اختیار کر جاتی اور اس میں سوار دو کالے جسم آگے پیچھے ہوتے ہوئے دکھائی دینے لگتے۔ تب جنگل کے لوگوں کے لیے جو اِگبو کہلاتے تھے' امورو دان ملنے کی جگہ ہوتی اور وہ اجنبی دریائی لوگ جنھیں یہ اگبو لوگ اولو کہتے تھے' ان کے آگے دنیا لامتناہی انداز سے پھیلی ہوئی تھی۔

جولیئس آبی امورو کا مقامی نہیں تھا' وہ دوسرے ان گنت لوگوں کی طرح ملک کے کسی دوسرے جھاڑ گاؤں سے آیا ہوا تھا۔ وہ ایک مشن اسکول سے چھٹے درجے کا امتحان پاس کرنے کے بعد اس طاقتور ترین یورپی ٹریڈنگ کمپنی کے دفاتر میں کلرک کے طور پر کام کرنے کیلئے امورو آیا تھا جو پام گری کو خود اپنی طے کردہ قیمت پر خریدتی تھی اور کپڑا اور دھات کے برتن بھی اسی طرح اپنی من مرضی کی قیمت پر بیچتی تھی۔ یہ دفاتر اس مشہور مارکیٹ کے پہلو میں واقع تھے اس لئے جولیئس کو اپنے پہلے دو یا تین ہفتوں میں اس کے خاص پیچ و تاب کھاتی بھنبھناہٹ میں گھرے ہوئے ماحول میں اپنا کام سیکھنا تھا۔ بعض اوقات جب چیف کلرک موجود نہ ہوتا تو وہ کھڑکی کی طرف آجاتا اور جھک کر اس سرگرمی کو دیکھنے لگتا۔ وہ سوچتا، بہت سے لوگ کل یہاں موجود نہیں تھے، پھر بھی مارکیٹ بھری ہوئی لگتی تھی۔ دنیا میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو کہ اس طرح دن بہ دن اس کو مزید بھرنے کیلئے ابھی ادھر آنے والے تھے۔ بے شک ایک کہاوت کے مطابق وہ سارے لوگ جو یہاں ادھر اس عظیم مارکیٹ میں آتے تھے اپنا حقیقی وجود نہیں رکھتے تھے، جینٹ کی امّاں، ماں نے ایسا کہا تھا۔ خوبصورت عورتوں میں سے چند ایک جو ہجوم میں سے اپنا راستہ بنا رہی ہوتی ہیں، وہ میری اور تمھاری طرح کے لوگ نہیں ہیں لیکن ہاں قیمتی ووٹا لوگ ضرور ہیں جو کہ دریا کی گہرائیوں کے قریب موجود بستی میں رہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ تم ہمیشہ ایسا کہہ سکتے ہو کیونکہ وہ ایسی خوبصورتی کے حوالے سے خوبصورت ہیں جو بے عیب بھی ہے اور بے پروا بھی ہے۔ تم اپنی آنکھ کے پچھلے حصے سے ایسی کسی عورت کی جھلک دیکھ سکتے ہو، پھر تم پلک جھپکتے ہوئے زیادہ مناسب طریقے سے بھی اسے دیکھ سکتے ہو لیکن وہ تو اس سے پہلے ہی ہجوم میں کہیں گم ہو چکی ہوگی۔

جولیئس اس وقت کھڑکی کے قریب کھڑا خاموش اور خالی مارکیٹ کی طرف دیکھتا ہوا ایسی ہی

چیزوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کس کو یقین تھا کہ ایسی پرشور مارکیٹ کبھی یوں ٹھنڈی بھی پڑ سکتی تھی؟ لیکن ایسی طاقت صرف کتک پا کے پاس تھی جو چیچک کی طاقت کا مجسمہ تھا۔ صرف وہی تھا، جو لوگوں کو یہاں سے دھکیل کر باہر کر سکتا تھا اور اس مارکیٹ کو مکھیوں کے سپرد کر سکتا تھا۔

جب امورو ابھی ایک چھوٹا سا گاؤں تھا تب ایک عمر رسیدہ شخص ہوا کرتا تھا جو نکو و دِن کے موقع پر مارکیٹ کے ہر حصے کی صفائی کیا کرتا تھا لیکن ترقی نے اسے ایک غیر مملوکہ زمین اور لوگوں کے ہجوم سے بھری' چت پڑی ہوئی ایک گندی مصروف ترین دریائی بندرگاہ میں تبدیل کر دیا تھا جو اب زمین کے بیٹوں سے کہیں زیادہ لاتعداد اجنبیوں سے بھری پڑی تھی' وہ زمین کے بیٹے جو سوائے اس کے اور کچھ نہیں کر سکتے تھے کہ وہ اپنی عبادت سے مجموعی طور پر انحراف کرتے ہوئے اپنے سروں کو ہلاتے جائیں۔ لیکن بے شک انھوں نے (اور اس کیلئے ان پر کون الزام دھرے گا) اپنی بستی کے پھلنے پھولنے اور ترقی کرنے کی دعا ضرور کی تھی اور اس نے ترقی کر لی تھی۔ لیکن ایک اچھی ترقی ہوتی ہے اور ایک بری ترقی ہوتی ہے۔ صرف شراب اور غذا اسے ہی تو نہیں بڑھتی یہ ایک گندی بیماری کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے جو اس میں مبتلا شخص کو گھر بدر کر کے ختم کی جا سکتی ہے حتیٰ کے وہ ابھی مکمل طور پر مرا ہوا بھی نہ ہو۔

جو اجنبی امورو میں در آئے تھے وہ یہاں کسی قسم کے فرائض منصبی کی تلاش میں جو کہ خود ان کے اپنے گاؤں میں (جو کہ ان کا گھر تھا) میں بھی وافر موجود تھے، نہیں آئے تھے بلکہ وہ یہاں دولت کے حصول اور تجارت کی غرض سے آئے تھے کیونکہ یہ کوئی اطمینان بخش بات نہ تھی اس لئے امورو مٹی کے جنے نوجوان بیٹے بیٹیاں جو اسکولوں اور گرجوں سے ترغیب پاتے تھے' ان کا سلوک ان سے اجنبیوں سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے پہلے کے سارے سبق بھلا کر ان سے صرف اپنی رقابت کو نبھا رہے تھے۔

تب بستی کی ایسی ہی حالت تھی جب کتک پار سے دیکھنے اور یہاں کے رہنے والوں سے' جو زمینی دیوتاؤں کے مقروض و ممنون تھے، قربانی کا مطالبہ کرنے آیا تھا، وہ یہاں کے لوگوں کے پر چھائی اپنی دہشت کے علم کے بھروسے پر یہاں آیا تھا۔ وہ بدی کا دیوتا تھا اور شیخی بھگارتا تھا، بقول کسے' ان کو جن کو اس نے مارا تھا کوئی تکلیف نہیں دی تھی کیونکہ وہ مارے نہیں گئے تھے بلکہ وہ تو معزز بنا دیے گئے تھے' اسی لئے کسی نے ان کیلئے رونے کی جرأت نہیں کی تھی ۔ اس نے دیہات کے درمیان اور پڑوسیوں کے آپس میں آنے جانے کا خاتمہ کر دیا۔ کسی نے کہا'' کتک پارس گاؤں میں موجود ہے'' اور فوری طور پر اس کا اپنے پڑوسیوں سے قطع تعلق ہو گیا۔ جولیئس غمگین اور متفکر تھا کیونکہ جینٹ یعنی وہ لڑکی جس سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا' اسے اس نے تقریباً ایک ہفتے سے نہیں دیکھا تھا۔ ماں نے اسے بڑی نرمی کے ساتھ بتایا تھا کہ اسے ان لوگوں سے ملنے ابھی نہیں جانا چاہئے تا آنکہ بیوہ کی طاقت کے ذریعے یہ چیز ختم نہ ہو جائے (ماں ایک نو معتقد پارسا عیسائی تھی اور وہ واحد وجہ جس کی بنا پر اس نے اپنی اکلوتی لڑکی کو جولیئس سے منسوب ہونے کی اجازت دی تھی وہ یہ تھی کہ وہ سی ایم ایس چرچ کے گانے والے طائفے میں شامل تھا)

''تمھیں خود کو اپنے اندر تک محدود رکھنا چاہئے'۔ اس نے رازدارانہ لہجے میں کہا کیونکہ کتک پا سختی

سے شور اور اودھم کی ممانعت کرتا ہے۔ تمھیں نہیں معلوم کہ باہر تمھاری کس سے ملاقات ہو جائے۔'' خاندان والوں کو معلوم ہو گیا ہے۔'' اس نے اپنی آواز دھیمی کر لی اور اس مکان کی طرف پراسرار انداز میں اشارہ کیا جو سڑک کی پرلی طرف واقع تھا اور جس کا دروازہ تاڑ کے زرد پتوں سے بند کر دیا گیا تھا۔

'' اس نے پہلے ہی ان میں سے ایک کو سجایا ہوا ہے اور جو باقی کے تھے وہ آج ایک بڑی حکومتی لاری میں یہاں سے کوچ کر گئے تھے۔''

جینٹ نے مختصر سے راستے کو جولیئس کے ساتھ طے کیا اور رک گئی تو وہ بھی رک گیا۔ لگتا تھا کہ ان کے پاس ایک دوسرے کو کہنے کیلئے کچھ نہ تھا۔ وہ پس و پیش کر رہے تھے، تب لڑکی نے خدا حافظ کہا اور اس نے بھی خدا حافظ کہہ دیا اور ایک عجیب بات یہ تھی کہ انھوں نے آپس میں ہاتھ ملائے جیسے کہ رات بھر کے لئے ان کا جدا ہونا کوئی نیا اور سنگین مسئلہ تھا۔

وہ سیدھا گھر کی طرف نہیں گیا کیونکہ وہ نہایت مایوسانہ انداز میں اس عجیب جدائی کو بالکل اکیلے جھیلنا چاہتا تھا، کیونکہ وہ پڑھا لکھا تھا، اس لئے وہ اس بات سے خوفزدہ نہیں تھا کہ کون اس سے راستے میں ملنے والا ہو سکتا تھا۔ وہ دریا کے کنارے تک چلا گیا اور وہ یہاں اوپر سے نیچے تک پھرتا رہا۔ اسے یہاں پر آئے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی کیونکہ جب نائٹ ماسک کا لکڑی کا گانگ بجا' اس وقت تک وہ وہیں تھا۔ وہ فوراً ہی گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ چل بھی رہا تھا اور قدرے بھاگ بھی رہا تھا کیونکہ نائٹ ماسک تو ہم پرستی کا معاملہ نہیں تھا بلکہ یہ حقیقی تھے، وہ اپنی بدمستیوں کیلئے رات کا چناؤ کرتے تھے کیونکہ چمگادڑوں کی طرح ان کی بدصورتی بھی عظیم تر تھی۔

جلدی میں اس کا پاؤں کسی چیز پر پڑ گیا جو کہ ہلکے سے مائع دھماکے کے ساتھ اس کے پاؤں کے نیچے ٹوٹ گئی۔ وہ رکا اور اس نے نیچے جھک کر فٹ پاتھ پر دیکھا۔ ابھی تک چاند نمودار نہیں ہوا تھا لیکن آسمان پر ایک مدھم روشنی میں اس نے دیکھا کہ وہ ایک ایسے انڈے کے اوپر سے گزرا تھا جو کہ قربانی کے لئے پیش کیا گیا تھا۔ کوئی ایسا شخص جسے بدقسمتی نے آ گھیرا تھا، اس نے شام کے وقت اسے چوک میں بھینٹ کے طور پر رکھ دیا تھا اور اس کے اوپر اس کا پاؤں آ گیا تھا۔ وہاں پر اس کے ارد گرد وہی عمومی کم عمر تاڑ کے پودے تھے لیکن جولیئس نے اسے ایک مختلف انداز میں ایسے گھر کے طور پر دیکھا جہاں کہ وہ ڈراؤنا آرٹسٹ اپنے کام میں مشغول تھا۔ اس نے ریتیلے راستے پر اپنے جوتے کے تلے کو صاف کیا اور اپنے ذہن میں ایک اور طرح کی دھندلی سی فکر کو لیے تیزی آگے بڑھنے لگا، لیکن جلدی کرنا اب بے سود تھا کیونکہ تیز قدم ماسک پہلے ہی آزاد ہو چکا تھا۔ وہ (ماسک) تیز چلنے پر شاید اس لیے مجبور تھا کہ چاند کے نمودار ہونے کا ڈر اس کے سر پر موجود تھا لیکن رات کی خاموش ہوا میں اس کی صاف اور اونچی آواز تلوار کی مانند تھی۔ یہ ابھی کافی دوری پر تھا لیکن جولیئس جانتا تھا کہ فاصلے اس کے سامنے دم توڑ دیتے تھے، اس لئے اس نے سیدھا سڑک کے کنارے پر موجود ناریلوں کے فارم کا رخ کیا اور اس نے خود کو پیٹ کے بل گرا دیا، اس طرح اسے چوڑے پتوں کی آڑ مل گئی۔ اس نے بمشکل ہی ایسا کیا تھا کہ عین اسی وقت اس نے روح کے ساتھیوں کی کڑکڑاہٹ کو سنا اور ساتھ ہی اس نے اس کی

پرشور ندی جیسی مجرمانہ مسائل پر مبنی تقریر کو بھی سنا، وہ کانپ کر رہ گیا۔ آوازیں اس پر بوجھ ڈالتے ہوئے اس کے چہرے کو تقریباً دبائے ہوئے نم زمین کے ساتھ لگا رہی تھیں اور اب وہ قدموں کی آواز کو سن سکتا تھا۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے بیس شیطان صفت لوگ اکٹھے بھاگ رہے تھے، وہ خوف سے پسینے میں نہا گیا اور تقریباً اٹھ کر بھاگنے ہی والا تھا۔ خوش قسمتی سے اس نے خود پر قابو پالیا اور پلک جھپکنے میں زمین اور ہوا میں موجود یہ سارا فتنہ یعنی گڑگڑاہٹ اور موسلا دھار بارش، زلزلہ اور سیلاب گزر گیا اور سڑک کی دوسری طرف ایک فاصلے پر غائب ہو گیا۔

اگلی صبح، چیف کلرک کے دفتر میں زمین کے ایک بیٹے نے گزری شب کے سرکش نوجوان کے ذریعے برپا کئے جانے والے کتک پا کے اشتعال دلانے والے مظاہرے کو تلخی سے بیان کیا۔ نوجوانوں نے شور کرتے تیز قدم ماسک والا یہ مظاہرہ اپنے بڑوں کی مخالفت میں کیا تھا جن کا کہنا تھا کہ یوں کتک پا سیخ پا ہو جائے گا اور تب.... مصیبت یہ تھی کہ ان نافرمان نوجوانوں کو ابھی تک خود کتک پا کی طاقت کا اندازہ نہیں تھا۔ انہوں نے اس کے متعلق صرف سن رکھا تھا لیکن وہ جلد ہی اس کے متعلق جان لیں گے۔

اس وقت جب جولیئس کھڑکی کے قریب خالی مارکیٹ کا جائزہ لے رہا تھا تو دوبارہ سے اس رات والے خوف نے اسے جکڑ لیا تھا، حالانکہ ایسا صرف ایک ہفتہ پیشتر ہی ہوا تھا، لیکن پہلے ہی سے یہ ایک دوسری زندگی لگ رہی تھی جو کہ ایک وسیع خالی پن کے ذریعے موجودہ زندگی سے جدا کر دی گئی تھی۔ یہ خالی پن ہر گزرتے دن کے ساتھ گہرا ہوتا گیا۔ اس طرف جولیئس کھڑا تھا اور دوسری طرف ماں اور جینٹ کھڑی تھیں، جنھیں اس دہشت زدہ کرنے والے آرٹسٹ نے سنوارا تھا۔

❁❁❁

نشاط نارسا میں خواب گم ہیں
کسے منظور ہے ابہام کرنا
(منجمد پیاس۔احسن سلیم)

علیحدگی

تخلیق کار: ٹم لوٹ — ترجمہ: ڈاکٹر ندیم اقبال

جنوری:

جنوری کا ایک مختصر دن' بے موسمی حد تک گرم۔ سہ پہر ہی سے اندھیرا چھا رہا ہے جبکہ ابھی چار ہی بجے ہیں۔ گھر تین منزلہ ہے اور لگتا ہے کہ یہاں کوئی خاندان رہائش پذیر ہے۔

سب سے اوپر منزل: دو بیڈ رومز' نیند' خوابوں سے بیداری' چھوٹے چھوٹے جوش اور اشتعال اداسیوں میں بدلتے ہوئے۔

درمیانی منزل: ایک مشترکہ کمرہ' اس کے عقب میں ایک تیسرا بیڈ روم' اس وقت کھیل کیلئے مخصوص بکھرا ہوا' پھیلا ہوا۔ بچوں کی بنائی ہوئی تصویریں' دیواروں پر بنائے گئے نشانات' کھلونے' بچے' دو بہنیں' ایک چار اور ایک دو سال کی' مگر اس وقت موجود نہیں ہیں کیونکہ نانی کے گھر گئی ہوئی ہیں۔

گراؤنڈ فلور: گھر کی آنتیں' سفید رنگ سے لپا غسل خانہ' اخراج' غرقابی' ٹانگ یا چہرے پر رگڑتے ہوئے ریزر کی مدہم آواز۔ باتھ روم کے پیچھے کنکریٹ کا ایک احاطہ جہاں کبھی کبھار بچوں سے چھپ کر' سگریٹ نوشی کی جاتی ہے۔ مونگھے کی شکل کا نیلے پلاسٹک سے بنا اک چوکور قطعہ بچوں کے کھیلنے کیلئے اور اندر مرکزی کمرے کے درمیان ایک سپاٹ کچن' بے پرواہی سے جوڑے گئے فرش کے تختوں میں کئی جگہ درزیں' ایک طرف ایک سوفا پڑا جو بچوں کے بار بار کھانا گرانے سے انتہائی میلا کچیلا ہو چکا ہے۔ پچاس کی دہائی کے انداز کی کھانے کی میز جو بڑی سی کھڑکی کے برابر لگائی گئی ہے۔ ایک عام سا شہری گھر' جسے پُر آسائش تو نہ کہیں گے بلکہ کچھ گندا اور میلا سا۔

اندر موجود جوڑا ابھی ابھی موسم سرما کی کسی سیل سے رعایتی خریداری کر کے واپس آیا ہے۔ مرد پستہ قد' سر کے بال چھدرے' چہرے پر نحوست اور مردنی چھائی ہوئی۔ عورت انتہائی دبلی' سیاہ زلفیں' سانولا رنگ' درمیانہ قد' خوبصورت' اپنی عمر سے مزید کم عمر لگتی، چہرے کا رنگ پھیکا' لگتا ہے چہرے کو دھوپ نہیں لگنے دیتی' جسم ساکن۔

کمرے کے اندر سات آٹھ پتنگے اُڑتے پھر رہے ہیں۔ انھوں نے تین ماہ پہلے یہاں ڈیرا ڈالا تھا۔ ان پتنگوں کو بھگانے کیلئے کھڑکی کی چوکھٹوں' آتش دان کی کارنس اور دیگر جگہوں پر سدا بہار کے جوڈنٹھل رکھے گئے تھے، وہ بے کار ثابت ہوگئے۔ پتنگے بہت آہستہ روی سے اُڑتے ہیں، آپ چاہیں تو اُڑتے ہوئے پتنگے کو آسانی سے پکڑ کر ہاتھ میں مسل سکتے ہیں۔ آدمی کسی شیر خوار کی سی آسودہ بے رحمی کے ساتھ اب یہی کر رہا ہے۔

مرداا اور عورت ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں' درمیان میں تقریباً پانچ فٹ کا فاصلہ ہوگا۔ مرد ایک پرعزم انداز میں زور زور سے بول رہا ہے۔ اسے بخوبی علم ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور یہ بھی کہ اُسے یہ سب کچھ نہیں کہنا چاہئے، مگر نہ تو ہمت ہے نہ پروا کہ اپنے آپ کو روک سکے۔

الفاظ اب پتنگوں کی مانند ہوا میں تیر رہے ہیں اگر پتنگا نہ سہی تو پھر چھوٹے چھوٹے سیاہ پرندوں کی طرح۔

''میں لعنت بھیجتا ہوں تم پر' نفرت انگیز' چوہیا۔''

اس کا غیر ارادی مشن مکمل ہوا اور وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔ الفاظ ابھی تک اس کی کھوپڑی میں گونج رہے ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ وہ ایک خاص حد تک گزر گیا ہے جو اس کی چھ سالہ، کیا یہ ٹھیک ہے؟ نہیں ساڑھے چھ سالہ شادی میں اب تک نہیں ہوا تھا۔ اس نے اس لمحے کی آزادی میں اپنے اندر ایک عجیب جوش اور ولولہ محسوس کیا جبکہ ساتھ ساتھ شرمندگی بھی۔

آج کے الفاظ اُن دونوں کے درمیان پہلے سے طے شدہ تمام حدود و قیود پھلانگ گئے تھے۔ وہ آغاز سے دور تھے مگر اب اندمال اور مفاہمت کے کسی تصوراتی خطے سے بھی بہت دور آچکے تھے۔ مرد نے کبھی بھی اپنی بیوی پر ہاتھ نہیں اٹھایا تھا مگر اب محسوس کر رہا تھا کہ بالکل ایسی ہی چوٹ محسوس ہوتی ہوگی۔ اسے سخت صدمہ تھا کہ یہ سب اتنا خالص اتنا حقیقی محسوس ہوتا ہے۔

پانچ یا شاید دس منٹ گزر چکے ہیں وہ پہلی منزل کے سامنے والے کمرے میں اِدھر اُدھر چکر لگا رہا ہے۔ کبھی ٹھوکر کھاتا ہے' بڑبڑاتا ہے' اِدھر اُدھر بکھری گڑیاں' بھالو' خرگوش اور گوشت خور ڈائنوسار' بیٹری سے چلنے والے۔ وہ اپنے آپ کو مجتمع کرتا ہے اور زینے سے اُترتا ہے۔ یہ بہت مشکل ہے۔ اسے معلوم ہے کہ جو خلا وہ چھوڑ کر آیا ہے وہ کچھ اس طرح تبدیل ہوجائے گا کہ اس کی سمجھ سے بالاتر ہوگا۔ ابھی اسے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کیا کہنے جا رہا ہے؟

اُس کی بیوی ابھی تک اُسی حالت میں ہے جس میں وہ اُسے چھوڑ گیا تھا۔ وہ اس مسئلہ کے کسی حل کے انتظار میں ہے۔ اس کا منہ قرمزی رنگ کی ایک بے حرکت لکیر کی مانند دکھائی دے رہا ہے۔ مرد کو کچھ ہی دیر بعد بچوں کو لینے جانا ہے۔ معاملات کو جوں کا توں نہیں چھوڑا جا سکتا۔

مرد نے جب بولنا شروع کیا تو اس کی آواز میں لرزش نمایاں تھی۔ یہ صرف اس کا خیال تھا کہ وہ اب پُرسکون ہو چکا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''میں صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔''

وہ عورت کے چہرے کی طرف پہلی بار دیکھتا ہے۔ چہرہ سپاٹ ہے۔ ''میں اب پُرسکون ہوں اور

سنبھل چکا ہوں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم یہ جان لو...''

وہ تصور کرتا ہے کہ شاید عورت امید کر رہی ہے کہ مرد معذرت کرے گا۔ وہ ایسی امید اس لئے کر رہا ہے کیونکہ اب اس کا اگلا جملہ عورت کو سٹپٹا دے گا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم اچھی طرح جان لو کہ ایک ایک لفظ جو میں نے ابھی تمھیں کہا ہے وہ حتمی ہے۔ لہٰذا جاگ جاؤ اور کوفی سونگھ لو اس سے پہلے کہ بہت دیر ہوجائے۔''

یہ کہتے ہوئے وہ ایک ادائے خاص سے ہاتھ نچاتے ہوئے کمرے سے روانہ ہونے لگتا ہے۔ اسے اپنے آخری جملے کی کٹیلی آواز بہت پسند آتی ہے۔ یہ کوفی سُونگھنے والا فقرہ اس آدمی کا چھوٹا بھائی اکثر استعمال کرتا ہے اور آدمی نے اسے اسی مقصد کیلئے عاریتاً استعمال کیا ہے۔ مگر اس کی بیوی بجائے اس کے کہ دُکھ یا غصّے میں ہو' ایک عجب مبہم چہرہ بنائے ہوئے تھی۔ وہ بولتی ہے' ایک ایسی آواز جو مرد نے کثرت سے سنی ہے اور اس قدر کہ اب وہ ایک سرگوشی جیسی رہ گئی ہے۔

''اس کا کیا مطلب ہے؟''

''جاگ جاؤ اور کوفی سونگھ لو۔ اس کا کیا مطلب ہے' میں سمجھی نہیں۔''

یہ ایک ایسا فقرہ ہے، جو عورت نے اس سے پہلے کبھی نہیں سُنا اور اس لمحے میں شدّتِ جذبات کے باعث وہ اس کے معنی سمجھنے سے قاصر ہے۔ مرد اب انتہائی احتیاط سے عورت کو اس فقرے کا مطلب سمجھاتا ہے مگر جس شان سے وہ کمرے سے نکلنا چاہتا تھا، وہ اب ہوا بگڑنے سے ایک لنگڑے پن میں تبدیل ہوگئی ہے۔ مرد بے زاری سے سر ہلاتا ہے' اپنی بیوی کیلئے نہیں' بلکہ غیر مرئی تصوراتی خداؤں کیلئے۔ کیونکہ ابھی اس وقت بھی' اس وقتی ہنگامی جوش اور ذہنی شکستگی کے دوران بھی' اُس کی نفرت کی عارضی بھٹی میں' انتہائی عارضی' کیونکہ وہ اپنی بیوی کو بہت پسند کرتا ہے' کافی پسند کرتا ہے' مگر پھر بھی وہ دونوں ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکتے' اب پھر! اس کی سادہ دھمکی اور بے عزتی' اس کی دل آزار دھمکی کا وہی جواب' وہی ڈھول بج رہا ہے جو ہمیشہ ان کے درمیان ہوتا ہے۔ چاہے سب کے سامنے یا پھر تنہائی میں' اندرونی طور پر زبانی طور پر' علامتی طور پر یا پھر لفظی طور پر۔

میں تمھیں نہیں' میں تمھیں نہیں' میں تمھیں نہیں سمجھ سکتا۔

الفاظ کی مشقیں:

یہ آدمی ایک ادیب ہے۔ تنہائی میں وہ اس لفظ ادیب سے اکثر مزا لیتا ہے' کبھی اس لفظ کی خوشبو سُونگھتے ہوئے' اس لفظ کا دفاع کرتے ہوئے' احتیاط سے اس لفظ کو اُس دوسرے لفظ ''صحافت'' سے الگ رکھتے ہوئے جو اس کے نزدیک مہارت سے جمع کئے گئے محض خاموش حقائق ہیں' خوبصورتی سے سجائے ہوئے' ٹکے ٹکے کے خیالات جو دل نشین پیرایہ کلام کی ٹکسال میں ڈھالے جاتے ہیں اور شاذ ہی حقیقی یا صحیح ہوتے ہیں۔

ادیب' جب وہ یہ لفظ اپنی ذات کے متعلق استعمال کرتا ہے تو وہ اسے اپنی بھڑکدار اور نمائشی مگر ٹھوکریں کھاتی' غلطیوں اور چھوٹے چھوٹے خوف اور اوہام سے بھری زندگی کی سب سے عظیم کامیابی

سمجھتا ہے۔

ایک خاص طرز کی اعترافی تحریر لکھنے میں اسے کافی شہرت حاصل ہے۔ تحریریں جو اس کی دکھتی رگیں، کمزوریاں، خامیاں، بدشکل بندروں کی جُفتی کی طرح دکھائی دیں جو سرِعام ہو رہی ہو۔ اب کچھ لوگ اسے بدذوقی پر محمول کرتے ہیں لہٰذا کبھی کبھار وہ اپنی حقیقی زندگی کے متعلق یوں لکھتا ہے جیسے افسانہ طرازی کر رہا ہو۔ دو ایک تبصرہ نگار اس انداز کو اس کے اسلوبِ بیان کی نُدرت یا خیال کا انوکھا پن کہتے ہیں۔ مگر حقیقتاً ایسا قطعی نہیں۔ یہ اس آدمی کا پناہ لینے کا ایک طریقہ ہے، کسی بہت ہی خام یا کھردری سطح کیلئے ایک حفاظتی ملمّع۔ یہ اس کے نزدیک اپنے آپ کو شرمندگی سے بچانے کا بھی ایک طریقہ ہے۔ اس خیال میں شرمندگی کا خوف، دنیا کی سب سے حقیر ترین گردانی گئی قوت ہے۔ وہ اکثر یہ خواہش کرتا ہے کہ کاش وہ اپنی زندگی کو افسانے میں تبدیل کر سکے۔ اُسے یہ چُننے یا پسند کرنے کی آزادی دی جائے کہ وہ اپنی زندگی کو فسانہ کہنے کا دعویٰ کر سکے۔ ویسے اپنے ذہن میں وہ ہر وقت یہی سب کرتا رہتا ہے۔ اس طرح نمایاں کرنے سے اس افسانے نے ایک ایسی دلکشی اور سلیقہ مندی اختیار کر لی ہے جو حقیقی زندگی میں نہیں ہوتی۔ کہاں اس آدمی کی بے ہودہ گالی گلوچ اور کہاں بطور تلافی وہ سوچ بچار کے انداز اور قواعد کی تصوراتی نزاکت، لطافت اور فصاحت۔

وہ جو کچھ بھی تحریر کرتا ہے، وہ اس کی یادداشت میں کندہ ہو جاتا ہے۔ حقیقتاً وہ دماغ میں کہیں کندہ نہیں ہوتا مگر وہ واقعتاً ایسا ہی سمجھتا ہے۔ اس کی بیوی اور بچوں کی یادداشت مختلف ہوگی۔

اس کی کہانی میں موجود جوڑا، وہ کہانی جو اس کے دماغ میں ہے، وہ خود اور اس کی پارٹنر ہے۔ تیسرا شخص، خدا کی مانند، یہ ذہنی نقشہ، یہ صرف اتنا کر سکتا ہے کہ اُسے حقیقت سے دور کر دے، اسے نجات دے دے، چھٹکارا دے دے۔ وہ 'ٹ' ہے اور اس کی بیوی 'س'، ان کی شادی کو چھ بلکہ ساڑھے چھ سال ہوئے ہیں۔ یہ سب جو آج ہوا اس کی ابتدا تو بہت پہلے ہو چکی تھی۔ شاید موسم گرما کے اس دن سے یکم جولائی 1991 سے جب اس نے دلہن کا نقاب ہٹا کر اس کا بوسہ لیا تھا، اسے اس وقت بھی ایک ڈرامے میں اداکاری کرنے جیسا محسوس ہو رہا تھا۔ شادی کے وقت بھی اس کی بیوی شدید تناؤ سے اکڑی ہوئی منجمد سی تھی۔

الفاظ کی مزید مشقیں: ایک بار پھر الفاظ کے ساتھ

وہ مرد 'ٹ' اس بات کو انتہائی اہم گردانتا ہے، جو واقعتاً اس کی ماہرانہ صلاحیت کی کامیابی سے تکمیل کیلئے بہت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ وہ جان سکتا ہے کہ لوگ کیا کیا سوچ رہے ہیں یا ان کے ذہن میں کیا چل رہا ہے۔ اگر سو فیصد درست نہ سہی، تب بھی ممکنہ حد تک بہت اچھے تکّے بھی لگا سکتا ہے۔ لوگوں سے ابلاغ کی اس صلاحیت پر اسے بجا طور پر فخر ہے۔

ابلاغ: اب مرد اور عورت دونوں جانتے ہیں کہ بات اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے، بلکہ خطرناک حد تک طول کھینچ سکتی ہے۔ 'ٹ' کو ایک غبارے کا خیال آتا ہے جو پھولتے پھولتے ایک ناپائیدار ٹھوس پن کے ساتھ ایک سوئی کی نوک کی طرف بڑھ رہا ہے۔ مرد اور اس کی بیوی کو بتایا گیا ہے کہ شادی شدہ جوڑوں

کے مسائل کے علاج پر ماہرِ نفسیات ایک آزمودہ تکنیک استعمال کرتے ہیں، جو ان جوڑوں کے درمیان ابلاغ یا باہمی رابطے میں مدد دیتے ہیں۔ دونوں کو اظہارِ خیال کی ترغیب دیتے ہیں اور اس اظہار کو آسان بناتے ہیں، تقریباً اسی طرح کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ مرد کو یہ فقرہ انتہائی کریہہ لگتا ہے جس میں کچھ واعظ مُناظرے اور تمسخرانہ فکر کی ملاوٹ دکھائی دیتی ہے۔ تاہم، غبارہ پھٹنے کے قریب ہے۔ دونوں قبول کر رہے ہیں کہ غیر معمولی نسخہ جات ضروری ہیں۔ دونوں پارٹیاں، کیونکہ اس کے اپنے ذہن میں ان دونوں کا تصور اب دو پارٹیوں جیسا ہی ہے، دونوں اب رسمی بات چیت کیلئے آمنے سامنے ہیں، دونوں جانتے ہیں کہ ایک دوسرے کو سمجھنے سے بچنے کیلئے انھوں نے جو دیوار کھڑی کی ہے اس میں سے راستہ ڈھونڈنے کیلئے انھیں مدد کی ضرورت ہے۔ مرد کیلئے یہ ایک کرم فرمائی، ایک اختیاری عظمت سے تعمیر کردہ ہے۔ عورت کی یہ دیوار خاموشی اور چیخ و پکار سے پرورش کئے گئے تاؤ یا غصے کا مظہر ہے، جو شاید ماضی میں کہیں دفن ہے مگر اپنے آپ کو لمحہ موجود میں مسلسل ظاہر کرتی ہے۔ مرد کو حیرت ہے کہ کہیں تاریخ ان دونوں کو ایک دوسرے سے آزاد کرنے کا ایک راستہ یا طریقہ تو نہیں؟ آج کل کچھ زیادہ ہی ایسا لگ رہا ہے۔ اب مشق کی طرف آتے ہیں۔

مشق بالکل سادہ اور آسان ہے بلکہ دونوں کو یقین دلایا گیا ہے کہ کارآمد بھی ہے۔ جوڑے میں سے کوئی ایک نصف، کوئی بات چیت شروع کرتا ہے، دوسرا نصف، اس بات کا جواب گفتگو سے دینے کی بجائے اپنے جوابات کاغذ کے ایک پرچے پر تحریر کرتا ہے اور فوراً یہ لکھا ہوا جواب بولنے والے کو دکھاتا ہے اور یوں یہ گفتگو آگے بڑھتی ہے۔ ایک پارٹنر اس طرح ہمیشہ خاموش رہتا ہے، اس کی آواز تحریر کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ وہ دونوں یہ رول یعنی بولنے والا اور لکھنے والا روزانہ کی بنیاد پر باری باری ادا کرتے ہیں۔ شوہر اور بیوی ایک گمبھیر سنجیدگی سے یہ مشق کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بچوں کے سونے کے بعد، ہفتے میں چار دفعہ، آدھا گھنٹہ، ایک فائل بننی شروع ہو جاتی ہے، جس میں وہ تمام دلائل جمع ہو رہے ہیں جو اس شادی کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں۔ مرد ایک فائل کو غور سے دیکھتا ہے جس کے کچھ صفحات پر اس کی تحریر ہے۔

بڑے بڑے الفاظ، ڈراؤنے، کچھ صفحات پر عورت کی تحریر، چھوٹے چھوٹے الفاظ، ایک لڑی پر پروئے ہوئے، مرد اپنی تحریر کردہ جملے دیکھتا ہے، آدھی گفتگو، اس کا نصف حصہ، وہ نصف جو اس نے بولا تھا کہ وہ کہیں لکھا ہوا نہیں ہے۔ گم شدہ، غیر تحریر شدہ، جس کا کوئی ریکارڈ نہیں اور صرف قیاس آرائی یا یاد کرنے سے ذہن میں آ سکتا ہے۔ ''میرے لئے اس سب کا اظہار بہت مشکل ہے۔ میرا خون خشک ہو جاتا ہے، تمھارے ذہن پر اوہام کا غلبہ اور پھر ایک ہی قسم کا لگا بندھا معمول...... کس کے متعلق کیا کروں...... بالکل...... مگر میں یہ کس طرح کر سکتا ہوں تاوقتیکہ اس کی وجہ معلوم نہ ہو...... اس کے علاوہ کچھ بھی ناممکن ہی ہوگا۔ مجھے اپنی نگاہیں پھیرنے کا کوئی طریقہ تلاش کرنا ہی ہوگا...... تم نے تمام عمر اس طرح کیسے کر لیا؟...... اگر تم مجھے بتا سکو، یہ تم نے کس طرح کر لیا تو شاید مجھے بھی پتہ چل جائے کہ میں یہ کیسے کروں...... غلط غلط!...... میرا خیال ہے کہ میں نے اپنی بساط کے مطابق تمہیں قبول کیا تھا اور تم نے

مجھے......اب پتا چلا کہ تم نے ایسا نہیں کیا تھا......نتیجہ؟ جنگ...... مجھے نہیں پتا......''

اسے یہ تمام الفاظ پڑھنا بے معنی اور بے وقوفانہ لگتا ہے، مگر تحریر کے یہ ٹکڑے پڑھنے سے اسے ایک عجیب طمانیت سی محسوس ہوئی' بلکہ یہ پڑھتے ہوئے احساس ہوا کہ جیسے وہ کوئی آزاد نظم پڑھ رہا ہو۔ اپنے ذہن میں اس نے اس نظم کا عنوان ''کبھی کبھی'' رکھ چھوڑا ہے۔

ہاں
کبھی کبھی' ہاں
بُرے طور پر' مجھے نہیں پتا
تم کیوں سوچتے ہو؟

اس تحریر میں سے سوالات غائب ہیں، جبکہ زندگی میں اس کے بالکل برعکس ہے۔ اب وہ دوسرے صفحات پر نظر ڈالتا ہے، جن پر اس کی بیوی کی تحریر ہے۔ اب مرد کی آواز غائب ہے۔ شاید اب کچھ سراغ مل جائیں۔ ''تو پھر تم غصے میں اتنے اینٹھے ہوئے کیوں ہو؟..........تم مجھے احساس دلاتے ہو کہ مجھے انتہائی شکر گزار ہونا چاہئے......تم مجھے احساسِ گناہ میں مبتلا دیکھنا چاہتے ہو مجھے سزا کا مستحق گردانتے ہو۔ میں تھک چکی ہوں...... مجھے ہمیشہ لگا کہ یہ ناانصافی ہے...... میں نے یہ نہیں کہا...... میں کیا بنوں گی۔ ایک گرہستن' ایک ماں؟...... یہ کافی نہیں......کیا یہ ایک سوال تھا؟ کیا ایسے جواب کی ضرورت ہے..........ٹھیک ہے۔ اسے رہنے دیتے ہیں۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ تم دوسرے تمام باپوں سے مختلف ہو...... مجھے نفرت ہے......تمھاری ہر بات میں مین میخ نکالنے کی عادت سے......میں بچی نہیں ہوں جو اپنی حدود میں رہوں۔ کبھی کبھی تم اتنے ہَٹ دھرم ہو جاتے ہو......''

بالآخر اُسے تحریر میں ایک ترتیب سی ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہر اختلاف کی زندگی اس شادی جتنی ہی پرانی تھی۔ اپنے آپ کو دُہراتا ہوا' مگر کبھی بہت زیادہ تبدیل نہ ہوتا ہوا' مسلسل آگے بڑھتا ہوا' جداگانہ' سانس لیتا' اپنی بقا کے لئے سرگرداں' مگر ایک غیر واضح اور مبہم انداز سے۔ اس لمبی اُکتا دینے والی تحریر میں جو ادھورے دلائل تھے، اُن پر ایک نظر ڈالنا اب فائدہ مند محسوس ہو رہا ہے۔ الفاظ کے نکتے' دائرے اور لکیریں ناقابل گریز لگتی ہیں۔ الفاظ زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے' واضح اور سامنے۔ وہ دونوں اب مشق سے تھکتے جا رہے ہیں، جو اَب کم از کم ایک کھیل تو ہرگز نہیں لگ رہا ہے۔ حالانکہ اس مشق نے کچھ کام دکھایا ہے۔ اُن دونوں کو مجبور تو کیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے اس سخت دھڑے کا سامنا کریں جو ان کی زندگی پر حکومت کرتا رہا ہے۔ اب زندگی کا یہ نظم یہ قرینہ یوں لگتا ہے کہ ناقابل تغیر ہے۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان دونوں نے یہ مشق کئی دن تک نہ کی پھر ایک رات' مرد کی بیالیسویں سالگرہ کے تین دن بعد انھوں نے دوبارہ مشق شروع کی۔

اُس رات کا ریکارڈ موجود ہے' یہ ریکارڈ بعد میں ان کی شادی کا اختتام بھی ثابت ہوا۔ کچھ دیر بعد مرد کاغذ کا آخری ٹکڑا اٹھاتا ہے اور عبارت کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے' گمشدہ سوالات یاد کرنے کی کوشش

کرتا ہے۔

پہلا جواب ہے' بہت برا۔

یہ 'اس' کی تحریر میں لکھا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ 'ٹ' بات کر رہا تھا۔ اُسے سوال یاد آیا جو یہ تھا ''تم کیا محسوس کر رہی ہو؟'' اگلا جواب یہ ہے۔ ''کاش میں اس سوال کا جواب دے سکتی۔ ہم دونوں دو مختلف سطحوں پر مختلف سفر کر رہے ہیں' ملاپ کہیں نہیں ہوگا۔''

وہاں سوال تھا: ''مسئلہ کیا ہے؟'' یوں وہ آگے بڑھتا جاتا ہے' خالی جگہوں کو حتی المقدور بہتر طریقے سے بھرتا ہوا (اس کی بیوی کچھ سوالات کو ذرا مختلف طرح سے یاد رکھتی ہے)

مرد: کیا تم بھی اس اندازِ گفتگو سے میری ہی طرح خوف زدہ ہو؟

عورت: ہاں۔ کیا یہی وجہ ہے کہ تم اس گفتگو سے بچنا چاہتے ہو۔

مرد: میں بات کرنا چاہتا ہوں۔

عورت: مجھے ابلاغ یا اظہارِ رائے کی اس مشق سے نفرت ہے۔ اس مشق نے ہمیں بحران میں مبتلا کر دیا ہے۔

مرد: میں تم سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتی ہو یا پھر صرف اس لئے اس شادی کو قائم رکھے ہوئے ہو کہ اس کا جو متبادل ہے وہ ناقابل برداشت ہے؟

یہاں مرد کو ایک مختصر وقفہ یاد آتا ہے، جو عورت نے لکھنے سے پہلے لیا تھا۔ اسے اپنے تحریر کردہ الفاظ دکھاتی ہے۔

''وجہ وہی دوسری والی ہے لیکن پھر بھی میں یہ یقین رکھتی ہوں کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔''

وہ کاغذ کو گھورتا رہتا ہے۔ اب اسے احساس ہوا کہ وہ جانتا ہے کہ عورت کیا چاہتی ہے۔

اب چاہے وہ یہ چاہے یا نہ چاہے اب یہ بات طے ہے۔

اچھا۔ تو پھر کہنے کیلئے کچھ اور بھی ہے۔

وہ عورت کے اُس حوصلے کا اقرار کرتا ہے جس کا مظاہرہ عورت نے جوابات دیتے وقت کیا۔ وہ یاد کرتا ہے کہ اُس وقت وہ دونوں وہاں بالکل ساکت اور خاموش بیٹھے تھے۔ اچانک مرد نے سسکیاں لے کر رونا شروع کر دیا' پہلے آہستگی سے پھر زور زور سے۔ عورت نے آگے بڑھ کر اسے دلاسا دیا۔ وہ کچھ دیر تک ایک دوسرے کو ایسے ہی تھامے رہے۔ شاید ایک منٹ یا اس سے بھی کم۔

شادی کے بعد سے مرد کبھی بھی یوں آنسو بہاتے ہوئے رویا نہیں تھا' بلکہ کبھی آنسو نہیں بہائے تھے۔ جہاں تک اسے یاد ہے' صرف ایک دن' چار یا پانچ برس پہلے' کچن میں اکیلے کھڑے ہوئے' اچانک اس نے وہ چھوٹے چھوٹے کام کرنا بند کر دیئے' جو وہ کر رہا تھا' بیٹھ گیا اور بے سبب رونا شروع کر دیا۔ وہ تقریباً بیس منٹ تک روتا رہا۔ پھر دوبارہ کچن کی صفائی میں لگ گیا اس دفعہ یہ بالکل مختلف تھا۔ اس دفعہ رونے کی وجہ بہت واضح تھی۔

جدائی:

مرد کے نزدیک یہ جدائی ایک ایسا تجربہ تھا جس کی پیش گوئی ناممکن تھی۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ ایسا ہوا۔ ایک دفعہ پہلے بھی، تقریباً ایک سال قبل، چھ ہفتوں کیلئے۔ مگر اس دفعہ یہ موقع پہلے سے مختلف لگ رہا ہے، نہ دانتوں کی کچکچاہٹ نہ کوئی ایسا اندازِ گفتگو جو اس کی سوچ بچار کو ظاہر کرے۔ یوں لگ رہا ہے تھا کہ چیزیں اب اپنی صحیح راہ پر گامزن ہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے سینے پر سے کوئی انتہائی وزنی بوجھ ہٹ گیا ہو یا جی بھر کے رونے سے جیسے اس کی روح کی صفائی ہو گئی ہو۔

اسی رات مرد نے پہلی منزل کے کمرے میں سوفا نما بیڈ کو کھول کر بستر بنانے کی کوشش کی۔ مرد کا خیال ہے کہ اب وہ کبھی بیوی کے ساتھ بستر پر دوبارہ نہ سوئے گا اور یہ خیال اسے کچھ عجیب بھی نہ لگا۔ شاید وہ اس سے بھی زیادہ غائب دماغ تھا جتنا کہ وہ اپنے آپ کو غائب دماغ قبول کرنے کے قابل تھا۔

اب یہ بات طے تھی کہ وہ اس گھر سے پندرہ دن کے بعد کہیں اور چلا جائے گا۔

سوفا ایک چوتھائی کھلا مگر پھر اس کا میکنزم پھنس گیا اور وہ اٹک گیا۔ ایسا اکثر ہوتا تھا۔ اُس نے سوفے سے کشتی کی اور شدید کوشش کی کہ وہ کھل جائے، جنونی انداز سے اُسے کھینچا یہاں تک کہ سوفا اُلٹتے اُلٹتے بچا۔ مرد غصے سے برانگیختہ ہو گیا، سوفے کا میکنزم، وقتی طور پر اس کی شادی میں بدل گیا، سخت، ٹھوس، پھنسا ہوا، بدعائیں دیتا ہوا، غیر حرکت پذیر، مرد نے سوفے پر ایک غصے بھری نظر ڈالی اور دوبارہ اس سے جھوجھنا شروع کر دیا مگر سوفا ٹس سے مس نہ ہوا۔ مرد کے منہ سے گالیوں کی ایک بوچھاڑ نکلی۔ اس نے سوفے کو دوبارہ بند کر کے رکھ دیا اور سوفے کے کشن زمین پر بچھا کر شکست زدہ انداز میں لیٹ گیا۔

اس نے زیرزمین دھماکے کے متعلق سوچا۔ زیرِ زمین تمام سسٹم، اندھیرے میں ڈوبا ہوا، جس کے اندر کئی سالوں سے دباؤ بڑھ رہا ہے، پھر اچانک ایک سوراخ ظاہر ہوتا ہے، پھر ایک اور سوراخ اور پھر تمام سسٹم ایک دھماکے سے اُڑ جاتا ہے اور آپ شرابور ہو جاتے ہیں۔ ایک دل دہلا دینے والا گیلا پن، شاید بہاؤ آپ کو بھی بہا کر لے جائے مگر اس سب میں بھی ایک سرمستی کی سی کیفیت ہے یہ احساس بہت تھوڑی سی دیر کیلئے تھا۔ تنہائی کی اس پہلی رات، اُسے اپنی ایک بچی کے رونے کی آواز آتی ہے۔ وہ زینے پر دوڑتا ہوا جاتا ہے کہ کہیں وہ بھوکی تو نہیں یا اُسے سردی تو نہیں لگ رہی یا پھر اُسے کوئی کھلونا چاہئے۔ آدھے راستے میں خیال آتا ہے کہ بچیوں میں سے کوئی نہیں بلکہ اُس کی بیوی بھی ہو سکتی ہے۔ وہ اندرونی ٹھنڈک سے خود کو بچانے کیلئے ایک منتر پڑھنے لگتا ہے۔

''حال ماضی میں ڈوب جائے گا۔ ہر چیز گزر جاتی ہے، چیزیں ضرور بدلیں گی۔ موت اور زندگی، موت اور زندگی موت اور زندگی۔''

وہ اپنے بچوں کو بستر میں گہرے سانس لیتے دیکھتا ہے وہ تصور کرتا ہے کہ ان بچوں کیلئے یہاں کوئی چیز کِرکِرچی ہو گئی ہے جس کو دوبارہ پانا محال ہے مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ٹوٹنے والی کوئی خراب شے ہو۔ دوبارہ کوئی اچھی شے بنا لی جائے گی جو شاید پرانی سے بہتر ہو۔ اُسے امید ہے کہ ایسا ہی ہوگا مگر وہ

اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ اُسے اپنے بچوں کے کھو دینے کا خوف آ گھیرتا ہے۔ اسے اور بہت ساری چیزوں کا ڈر محسوس ہوتا ہے لیکن اُسی وقت وہ اپنے آپ کو بہت بہادر بھی محسوس کرتا ہے کسی بھی خطا یا برائی کی طرف پلٹنے سے بہت دور۔

اگلے دن بے دھیانی میں وہ کسی اور کے ساتھ ''مستقبل میں کبھی'' زندگی گزارنے کے نفع اور نقصان کے متعلق سوچتا ہے............ ابھی سے! حالانکہ اُفق پر دور دور تک کوئی اور نہیں ہے۔ شادی کے تمام عرصے میں نہ تو شوہر اور نہ ہی بیوی نے ایک دوسرے سے بے وفائی کی، ہاں کبھی کبھار کی دل لگی الگ بات ہے۔ اُس کے امکانات کیا ہیں؟ وہ جوان نہیں ہے۔ بہت عام سی شکل وصورت کا مالک، فربہی مائل، پھر وہ پُراعتماد ہے۔ اسے ایک طاقت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ طاقت، وہ سمجھتا ہے کہ بے توجہی کی طاقت ہے۔ بچوں سے محبت کی قوّت اسے دوسری ضروریات سے مبّرا کر دیتی ہے۔ اس صورتِ حال میں دوسری طرف آگے بڑھنے کی طاقت سے اُسے ایسا لگتا ہے کہ راستہ چننے کی صلاحیت اُس کے اندر موجود ہے مگر اب پوشیدہ یا دبی ہوئی نہیں بلکہ ماتھے پر پھڑکتی رگ کی مانند ظاہر اور نمایاں۔ اب وہ مزید روتا بھی نہیں ہے سوائے ایک دفعہ کے جب اُس نے اپنے چھوٹے بھائی کو یہ سب بتلایا۔ ایک دفعہ پھر اس نے ہچکیوں کے ساتھ رونا شروع کر دیا۔ چھوٹے بھائی نے اپنے بازو اُس کی گردن میں حمائل کر دیئے جیسے وہ بڑا بھائی ہو اور اسے تھپکتا رہا، جب چھوٹے بھائی نے گرفت ڈھیلی کی تب 'ٹ' پرسکون ہوا۔

وہ اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ بچے بالکل ٹھیک رہیں گے، بچے سخت جان ہوتے ہیں وہ برداشت کر لیں گے۔

ایک سال پہلے وہ علیحدہ ہوئے تھے تو بڑی بیٹی پر دمے کا حملہ ہوا تھا، وہ انگوٹھا چوسنے لگی تھی اور اس نے بستر میں پیشاب کرنا بھی شروع کر دیا تھا بلکہ ایک دفعہ تو دیوار پر پاخانہ بھی لگا دیا تھا۔ یہ شاید اس کے خاموش مگر غصیلے احتجاج کا ایک انداز تھا ایک ڈر، جو اسے مستقبل کے ڈراؤنے انتشار سے تھا۔

دو راتوں کے بعد مرد کو تاریکی میں کوئی حرکت سی محسوس ہوتی ہے۔ وہ بڑی بیٹی کے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ وہ شدید نیند کی حالت میں بستر پر بیٹھی ہے۔ وہ صرف اتنا کہتی ہے۔ 'ڈیڈی' اس کے بعد خاموشی سے لیٹ جاتی ہے۔ اگلے دن چھوٹی بیٹی جسے ابھی کچھ بھی بتایا نہیں گیا ہے اور جو ابھی ایسی کوئی بھی بات سمجھ نہیں سکتی، کہتی ہے: ''ڈیڈی کا گھر کہاں ہے؟''

کوئی بھی اس کے سامنے رویا نہیں۔ اس کی عمر ڈھائی سال ہے۔ مرد تو ہم پرست نہیں ہے مگر وہ شیکسپیئر کی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ بدقسمتی اکیلے نہیں آتی۔ وہ اپنے اردگرد نظر ڈالتا ہے اور دیکھتا ہے کہ تعلقات ٹوٹ رہے ہیں، دوست جدا ہو رہے ہیں، موت بڑھی چلی آ رہی ہے، جوڑے ٹوٹ رہے ہیں، ایک طرف کے پڑوسی جوڑے کی طلاق ہونے والی ہے جبکہ دوسری جانب والوں میں اسی ہفتے علیحدگی ہوئی ہے۔ دو اور دوستوں نے بھی اپنے پارٹنرز کو چھوڑ دیا ہے یا یوں لگتا ہے کہ انحطاط اور عارضی جوش اور جذبے کے تحت رواں ہے۔ پانچویں دن اس کی بڑی بیٹی کو موت کی فکر شروع ہو گئی ''ڈیڈی

آپ مریں گے تو نہیں؟ مجھے امید ہے کہ ممی بھی نہیں مریں گی۔''

وہ رونا شروع کر دیتی ہے ''ڈیڈی مرنا کیسا لگتا ہے؟''

''جیسے نیند کرنا''۔ وہ جواباً کہتا ہے مگر وہ اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئی مگر پھر آپ اس نیند سے جاگتے تو نہیں......''

اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ مرد کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ وہ بیٹی کو کیسے سمجھائے کیونکہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے وہ بہت بھیانک اور صحیح ہے۔

ایک اور دفعہ وہ بولی ''مجھے میری اصلی ممی چاہئے۔''

یہ بیٹی کبھی کبھار اپنے والدین کو دو میں تقسیم کر دیتی ہے۔ جب ماں اس سے ناراض ہوتی ہے تو وہ کہتی ہے ''مجھے اچھی والی ممی چاہئے'' کیونکہ اس کے خیال میں یہ ممی خراب والی ہے۔ اب وہ اصلی ممی چاہتی ہے، بلکہ خوش رہنے والی ممی کہیں تو زیادہ صحیح ہوگا۔ کیا میں انہیں کھو بیٹھوں گا۔ سیکڑوں بار وہ یہ بات سوچ چکا ہے مگر ذہن میں کوئی جواب نہیں آتا بلکہ مزید خوف میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس نے اپنی احمقانہ زندگی میں اپنی ہی بچیوں سے زیادہ کسی چیز سے پیار نہیں کیا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یہ ایک کثیر دہرایا گیا معمولی سا جذبہ ہے مگر یہ حقیقی ہے۔ اتنا ہی حقیقی جتنی کوئی بھی شے ہو سکتی ہے۔

اگلی رات مرد کے ذہن میں اُن دوسری عورتوں کے متعلق خیال آیا جن کے ساتھ وہ شاید ہم بستری کرے۔ اس خیال نے نہ تو اس میں کوئی دلچسپی پیدا کی اور نہ ہی کوئی ہیجانی جذبہ۔ اسے اپنی بیوی ہمیشہ پُرکشش لگی تھی اور اس سے ہم بستری بے حد اچھی رہی تھی۔ مگر کسی اور کے ساتھ اتنی قربت کے خیال ہی سے وہ سُن سا ہو گیا۔ وہ ڈرا' سہما اور خوفزدہ ہے مگر اتنا نہیں جتنا اس نے سوچا تھا۔

ساتویں دن اس نے بینک بیلنس وغیرہ چیک کئے۔ دو ماہ کے اخراجات کے برابر رقم موجود ہے مگر وہ اس بات کی فکر اپنے ذہن سے جھٹک دیتا ہے۔ اب اسے یقین سا ہے کہ مستقبل یقیناً بہتر ہوگا۔ بے انتہا بہتری تو بہر حال نہیں ہوگی مگر پھر بھی بہتر ہی ہوگا' ہاں سخت ضرور ہوگا۔ پیسے ایک ایسی چیز ہیں جن کے متعلق اُن دونوں میں کبھی جھگڑا نہیں ہوا۔ ان کے زیادہ تر شکوے بہرے پن سے متعلق تھے' دونوں ایک دوسرے کو سننے سے قاصر تھے اور دوسرے اندھا پن' دونوں کی ایک دوسرے کو دیکھنے کی لاچاری' معذوری۔

آٹھواں دن: ان کی علیحدگی کی سرحدوں پر ابھی غلط فہمی منڈلا رہی تھی۔ کئی بار عورت نے مرد سے کہا۔ ''ہم اب بھی ایک ساتھ باہر گھومنے جا سکتے ہیں۔''

وہ سوچتا ہے مگر فوراً کہتا ہے۔ ''نہیں' ہم نہیں جا سکتے۔''

چیزیں تبدیل ہو چکی ہیں۔ اب معاملہ صرف علیحدہ علیحدہ جسمانی جگہ گھیرنے کا نہیں۔ وہ جگہ دے دی گئی تھی۔ اب ان کی خبر اخبار میں خالی جگہ کو پُر کرنے والے اندراج کے طور ایک معمولی پیراگراف رہ گئی ہے۔ اب وہ تازہ خبر نہیں رہے۔ لوگوں نے تو شاید اُن دونوں کو پچھلے برس ہی دفن کر دیا تھا جب وہ دنوں اپنے آپ کو دفن کرنے کے قابل نہ تھے۔ اب تو کوئی اداس بھی دکھائی نہیں

دیتا۔ اب کوئی بھی اس طرح اچنبھے سے نہیں کہتا جیسے وہ پہلے کہا کرتے تھے: ''کیا کہہ رہے ہو......؟ کیا واقعی......؟ بچوں کا کیا ہوگا؟''

اب لوگ یوں کندھے اُچکاتے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ لگتا ہے کہ اُس کے مرد دوستوں کو بھی زیادہ پروا نہیں ہے۔ اب وہ ملنے بھی نہیں آتے' فون بھی نہیں کرتے' شاید خفّت یا شرمندگی کے باعث مگر زیادہ امکان ہے کہ بوریت کے باعث۔ وہ مَردوں کی دوست کے متعلق ایک کتاب لکھ رہا ہے۔ وہ ادیب کی طرح سوچتا ہے۔ یہ دردناک دل جوئی بھی اچھا مسالا ہے کتاب کیلئے۔

جذبات کو سینسر کرنے کے نت نئے طریقے اسے سوجھتے ہیں۔ اگر وہ خوشی محسوس کرتا ہے تو اس کے اظہار سے ڈرتا ہے کہ مبادا عورت اسے اپنی توہین نہ سمجھے اور اسے غم میں کسی قسم کی کمی کا دوش دے۔ غم اور اداسی دوروں کی صورت میں آتے ہیں' لمحاتی' سائے جیسے بقیہ وقت میں سب کچھ نارمل رہتا ہے۔ وہ ابھی بھی ہنس نہیں سکتے ہیں۔ ایک ہفتے سے زیادہ گزر چکا ہے' وہ جلد ہی یہ گھر چھوڑ دے گا۔ بچوں کو بتایا ہی ہوگا اور مرد اور اس کی بیوی دونوں اسی بات سے خوفزدہ ہیں۔

بڑی بیٹی بہت پریشانی میں ہے۔ وہ اپنے بستر کی بجائے ماں باپ میں سے کسی ایک کے ساتھ لیٹنا چاہتی ہے۔ 'ٹ' اپنے ذہن میں بار بار اپنی زندگی کا بہت ہی بنیادی سبق دہراتا ہے کہ کوئی بھی چیز فی نفسہ' اچھی یا بری نہیں ہوتی۔ بدترین چیزوں کے بہترین نتائج بھی جلد یا بدیر ظاہر ہو سکتے ہیں اور اس کے برعکس بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی بھی اپنے اعمال کے نتائج کے متعلق نہیں جانتا اور نہ ہی بتا سکتا ہے کہ اگر وہ اعمال نہ کئے ہوتے تو کیا ہوتا۔ کوئی کچھ کر سکتا ہے تو صرف اتنا کہ لمحہ موجود کے تقاضوں پر لبیک کہے اور پھر جہاں اور جیسے نتائج برآمد ہوں انہیں قبول کر لے۔

بڑی بیٹی کہتی ہے۔ ''میں بڑی ہو کر نہ شادی کروں گی اور نہ بچے۔''

وہ کہتا ہے۔ ''اگر تم ایسا نہیں چاہتی تو کوئی بات نہیں۔ تمھیں کسی سے شادی کرنے اور پھر شادی شدہ رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

اس رات پڑوسیوں کے گھر سے چیخ پکار اور چیزیں پھینکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ اسے یاد آتا ہے کہ وہ خود کہہ رہا تھا۔ ''لعنت ہو تم پر، بھڑوی۔''

ابلاغ پر عبور رکھنے والا عظیم ادیب۔ وہ سوچتا ہے کہ کیا کروں۔ کیا ہم دونوں میں سے کسی کو آخری اظہار رائے کی امید ہے؟ تم محبت کیسے کرتے ہو؟ اور کیا محبت اور ابلاغ آخر میں دونوں ایک ہی چیز ہیں؟

کبھی کبھی خوف اس کے اندر ایک تیز جھکّڑ کی طرح چلتا محسوس ہوتا ہے۔

جب تم پاگل رہ چکے ہو جیسے کہ وہ ایک دفعہ تھا۔ پھر یہ خوف کبھی تمہاری جان نہیں چھوڑتا' نویں رات کو بڑی بیٹی اس کے کمرے میں آ گئی۔ ''آپ یہاں نیچے کیوں سو رہے ہیں؟''

''کیونکہ تمہاری ممی خراٹے لیتی ہے۔'' وہ ہنستی ہے اور واپس چلی جاتی ہے۔

اس کی صحت متاثر ہو رہی ہے' کمر میں شدید درد ہے۔ روزانہ رات کو وہ برف کی تھیلی سے کمر کی

سنکائی کرتا ہے‘ کبھی کبھی درد کی شدت سے اس کی چیخ نکل جاتی ہے جس سے راہ گیر تک سہم جاتے ہیں۔ شاید اس کا روحانی کرب اب کمر کے درد میں تبدیل ہوگیا ہے‘ اسے کھانسی رہنے لگی ہے۔ ایک دفعہ شدّت کی کھانسی اٹھی اور بلغم کے ساتھ سرخ خون بھی‘ چھوٹا سا ایک لوتھڑا جسے اس نے انگلی کی نوک پر رکھا اور معائنہ کیا اور روشنی کے ساتھ ساتھ اس کے رنگ بدلنے پر حیران بھی ہوا۔ اس کے پاؤں پر ایک پُراسرار دھبہ بھی نمودار ہوگیا ہے جو کسی طور غائب نہیں ہوتا۔

وہ اداس کتابیں پڑھتا ہے۔ ہولوکاسٹ کا ادب‘ ہیرولڈ بُروڈ کی کتاب ’وحشی اندھیرا‘ ایک ایسے ادیب کی کہانی جو ایڈز سے مر رہا تھا۔

ایک اور رات۔ عورت سو رہی ہے۔ مرد کو اس کے چہرے کو دیر تک تکنے سے احتراز کرنا چاہئے۔ وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتا ہے پھر نظر ہٹا لیتا ہے۔ عورت چوخانے دار کمبل اوڑھے ہوئے ہے بالکل ویسا جیسے بچپن میں مرد کے والدین اسے کار میں سفر کے دوران اوڑھاتے تھے۔ شاید وہی کمبل ہے۔ ٹھیک سے یاد نہیں کہ ماں نے یہ کمبل اسے دیا تھا یا نہیں۔ وہ خود کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیتی ہے شاید خواب دیکھ رہی ہے۔ وہ دوسری طرف دیکھنے لگتا ہے کیونکہ اسے ڈر ہے کہ اُداسی اسے اپنی گرفت میں لے لے گی۔ عورت کا چہرہ خوبصورت ہے۔ مرد کو اس کا چہرہ خوب صورت مگر اداس دکھائی دے رہا ہے۔ وہ متعجب ہے کہ یہ کون ہے۔ وہ فرض کر لیتا ہے کہ اسے کبھی پتا نہیں چلے گا مگر پھر بہت ہی دانشمندانہ مگر دفاعی انداز میں سوچتا ہے : اس سوال سے کیا مراد ہے؟

وہ سوچتا ہے : ہم دونوں سے ایک دوسرے کی باتوں کو سمجھنے اور ہم آہنگی کی تلاش میں فاش غلطی ہوئی۔ چیئرمین اکثر ایک بکھیڑا ثابت ہوئیں مگر ہمیشہ نہیں۔ ہم نے اچھا وقت بھی گزارا۔ کلیشے میں ہی سہی‘ بحر روم پر گزاری چھٹیاں‘ بچوں کے ساتھ پارک میں گزارا گیا دن۔
ٹی وی دیکھنا۔

اسے امریکی ادیب جان اپڈائک کے الفاظ یاد آتے ہیں۔ غیر طبعی افزائش بھی نقصان ہی ہے۔ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔

کافی عرصے تک اسے اپنی زندگی معمولی اور غیر حقیقی لگتی رہی اور اب اس کی خواہش ہے کہ یہ حقیقی زندگی کی خاصیت اختیار کر لے۔ ویسے ایسا ہو بھی رہا ہے۔ چیزیں آہستہ آہستہ واضح ہوتی جا رہی ہیں۔ اگر اس کے اندر کوئی چیز مر رہی ہے تو کوئی کونپل پھوٹ بھی رہی ہے۔ شاید یہی ہر لمحے کی خاصیت ہے۔

اگلی شام جب اس کے گھر چھوڑنے میں صرف دو دن رہ گئے ہیں، مرد اور عورت نے بچوں کو بتایا ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ ان دونوں کو اب ایک کہانی گھڑنی ہے جو صحیح بھی ہو مگر اتنی صحیح بھی نہیں کہ سمجھ سے بالاتر ہو جائے۔

جب مرد دفتر سے گھر پہنچتا ہے تو بچیاں سیمسن نامی کارٹون دیکھ رہی ہیں۔ ابتدائی دو تین منٹوں میں ہی عورت مرد ایک دوسرے سے تڑخ کر بولے ہیں۔ دونوں ہی نروس ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ جلد از جلد کوئی کہانی سنا کر جان چھڑائیں۔

وہ بچوں کو کارٹون دیکھتا چھوڑ کر زینے سے اترتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ کسی متفقہ بات پر راضی ہو جائیں۔ کتنا سچ بتایا جائے‘ کتنا روک لیا جائے۔ کتنی نرمی سے کچھ حقائق بتائے جا سکتے ہیں اور کس طرح کچھ نامہربان حقیقتیں لازماً آشکار کی جائیں۔ وہ کسی بات پر متفق نہ ہوئے نتیجتاً پھر تُو تُو میں میں۔ اصل میں یہ سب ان کے خوف کی وجہ سے ہے۔ دونوں والدین بچوں کے کمرے میں داخل ہوتے ہیں اور ویڈیو روک دیتے ہیں۔ مرد جلدی سے شروع ہو جاتا ہے، وہ انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ آئندہ سے ان کے ایک نہیں دو گھر ہوں گے وہ اس کی پردہ پوشی بطور ایک اضافے کرتا ہے نہ کہ بطور گھاٹے کے۔ وہ وضاحت کرتا ہے کہ ان کا باپ اب اس گھر میں رات نہیں گزارا کرے گا بلکہ ایک دوسری جگہ پر رہے گا۔ یہ دوسری جگہ وہ دونوں بچیوں کو کل دکھائے گا۔

وہ دونوں بچیوں کو اوپری منزل پر لے جاتا ہے جس عمارت میں وہ منتقل ہو رہا ہے وہ کمرے کی عقبی کھڑکی سے دکھائی دیتی ہے۔ وہ اشارے سے دونوں کو وہ فلیٹ دکھاتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ وہ دونوں اسے ہاتھ ہلا کر اشارہ بھی کر سکیں گی۔

بڑی بچی الجھن میں ہے، مگر لاتعلق سی دکھائی دیتی ہے جبکہ چھوٹی بچی کو ایک لفظ بھی سمجھ نہ آیا۔ سب سے تکلیف دہ لمحہ وہ ہے، جب بڑی بیٹی مرد کی طرف خوش دلی سے دیکھتی ہے اور کہتی ہے۔ ’’کیا آپ دوبارہ یہاں سونے کیلئے آئیں گے؟‘‘

ایسا کچل دینے والا تلخ لفظ بچی کہتی ہے ’اوہ‘ معمولی مایوسی جیسی کہ چاکلیٹ پا کر یا کمر پر بیٹھ کر گھوڑا چلانے سے منع کرنے پر ہوتی ہے۔ ایک نہایت ناخوشگوار مگر فیصلہ کن اندازہ مگر لگتا ہے کہ بچی نے بُرا نہیں مانا۔ مرد کو یہ فکر کھائے جا رہی ہے کہ وہ ناکام رہا ہے۔ وہ دونوں بچیوں پر واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس سلسلے میں روزمرہ دانش کے ذخیرے سے بھی مدد لیتا ہے کہ اس سب میں ان دونوں بچیوں کا کوئی قصور نہیں ہے۔

مگر ساتھ ساتھ یہ فکر بھی ہے کہ کہیں قصور جیسے الفاظ استعمال کرنے سے ان کے ذہن میں کوئی ایسا خیال جڑ نہ پکڑ لے جو پہلے وہاں موجود نہ تھا۔ اس کے علاوہ اس لفظ سے یوں بھی محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بہت بُری بات ہوگئی ہے اور تمام معاملات ویسے نہیں ہیں جیسے بتائے جا رہے ہیں۔

یہ سب کچھ اتنا نازک ہے جیسے چابی والی گھڑی کی اندرونی ساخت۔ مرد ہر ممکن کوشش کر رہا ہے کہ اس کے منہ سے غلط الفاظ نہ نکل جائیں‘ جو بچیوں کے ذہنوں میں ہمیشہ کیلئے کوئی غلط نقش نہ قائم کر دیں۔ آسیب تخلیق بھی کئے جا سکتے ہیں اور کرشماتی طور پر پیدا بھی کئے جا سکتے ہیں۔ یہاں اسی لمحے، اسی کمرے میں لہٰذا احتیاط، بہت احتیاط۔

کچھ دیر بعد لگتا ہے کہ کہنے کو کچھ بھی نہیں رہا۔ دونوں لڑکیاں بے چین ہو جاتی ہیں۔ ان کی توجہ دوبارہ کارٹونوں کی طرف مبذول ہو جاتی ہے۔ اُس کی بیوی مہربان لہجے میں کہتی ہے۔ ’’تم نے یہ سب بہت اچھی طرح کر لیا‘‘ وہ عورت کی اس مدد کیلئے شکر گزاری محسوس کرتا ہے اور فخر بھی کہ اس نے یہ کام احسن طریقے سے کر لیا۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ یہ ایک بہت چھوٹا سا پہلا قدم ہے اور ابھی بچوں کے لئے

آگے دکھ کے تاریک میدان ہیں جن کا انہیں ادراک ہے نہ خبر۔

رات کو سونے سے پہلے اسے تین بار بڑی لڑکی کو بتانا پڑا کہ وہ کل صبح اسے فلیٹ دکھانے ضرور لے کر جائے گا۔خوشی سے لڑکی کی نیند ہی اڑ گئی ہے۔

اگلے دن' جو کہ آخری دن ہے وہ بچیوں کو لے کر نئی رہائش گاہ جاتا ہے۔اس کا فلیٹ سب سے بالائی منزل پر واقع ہے۔ بڑی بڑی کھڑکیاں' سامنے مغربی لندن دور تک پھیلا ہوا بڑی بڑی کھڑکیوں سے آسمان بھی وسیع دکھائی دے رہا ہے جس کے سامنے سب کچھ بونا بونا سا لگ رہا ہے۔ بچیاں بہت پر جوش اور خوش ہیں۔ یہ اک چھوٹا سا مگر خوبصورت فرنشڈ فلیٹ ہے۔اس نے ایک کمرے کو بچیوں کیلئے مخصوص بھی کر دیا ہے اور فرش پر کھلونے جگہ جگہ بکھیر دیئے ہیں۔اسے یہ بھی فکر ہے کہ بچیاں بھاگ دوڑ میں لینڈ لیڈی کے فرنیچر سے ٹکرا نہ جائیں۔

اگلا دن: ایک واجبی سا سنیچر کا دن۔مرد صبح ہی سے بچیوں کو ایک ایڈونچر پارک گھمانے لے جاتا ہے۔ دوپہر میں عورت بچیوں کو ایک اور پارک لے جاتی ہے۔مرد اور عورت کی ایک ساتھ یہ آخری رات ہے۔

بچیوں کے سونے کے بعد وہ دونوں شمپین کی ایک بوتل کھول لیتے ہیں۔'س' نے رات کا کھانا بنایا ہے۔آخری کھانا۔شام آج اچھی اور آرام دہ گزرنی ہے۔وہ کوشش کرتے ہیں کہ اس بیتے وقت کو یاد کریں جو انہوں نے ساتھ گزارا' وہ وقت جو اختتام کے قریب ہے۔ کچھ ہی دیر میں باتیں ختم ہو جاتی ہیں۔خاموشی اب پہلے سے بھی زیادہ ناقابل برداشت ہے' بے انتہا تناؤ ہے۔مرد سوچتا ہے' جب تمہیں ایک بندھن میں باندھنے والے جھگڑے ہی ختم ہو جائیں تو پھر راستہ ہی ختم ہو جاتا ہے اور سفر کتنا مختصر ہو جاتا ہے۔

عورت کہتی: ''کیوں نہ اوپر خواب گاہ میں چلیں اور تاش کھیلیں؟'' اس خیال کو بے ضرر سمجھتے ہوئے دونوں اوپر کمرے میں چلے جاتے ہیں مگر انہیں تاش کے پتے نہیں ملتے۔نو بجے کا گھنٹہ بجتا ہے۔ عورت سونے کا ارادہ کرتی ہے۔مرد اپنے سوفے کو کھولنے کی تیاری کرتا ہے۔اس چھت کے نیچے آخری رات۔ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب وہ دونوں ہم بستری کے بالکل نزدیک پہنچ جاتے ہیں مگر ہر ایک جانتا ہے کہ ایسا کرنا صرف ماضی کی حسرت ناکی کو یاد کرنا ہوگا۔پھر بھی دونوں کمزور پڑتے ہیں مگر مختلف اوقات میں' لہٰذا ایسا کچھ نہیں ہو پاتا۔اس رات سوفے پر لیٹے مرد کو اچانک حیرت ہوتی ہے جب وہ اپنی روح کی گہرائیوں میں کوئی المیہ ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے مگر اسے ایسا کچھ نہیں ملتا۔ اسے جس رنج والم کی توقع تھی وہ وہاں موجود نہیں ہے۔اس کے برعکس اسے اپنے اندر واقعات نے جو رخ اختیار کیا اس کا واقعتاً صحیح ہونے کا ایک گہرا احساس ہے۔وہ غور کرتا ہے کہ یہ شادی اتنی بری بھی نہیں تھی۔دونوں نے کبھی ایک دوسرے سے بے وفائی نہیں کی' ان کے درمیان کبھی مار پیٹ کی نوبت نہیں آئی' انہیں ہمیشہ ایک دوسرے کی بھلائی کی فکر رہی۔

ابلاغ یا اظہار رائے اس کیلئے ایک ناقابل فراموش تصور ہے۔اعصابی بیماری کی حد تک پہنچا ہوا۔

اس کے بغیر اس کی سانس رک جاتی ہے' یوں لگتا ہے وہ مرنے کے قریب ہے۔عورت اس بات سے واقف ہے مگر اپنے خفیہ یقین یا اوہام کو چھوڑنا اسے تکلیف دہ معلوم ہوتا ہے۔عورت کا بچپن انتہائی ناخوش گوار گزرتا ہے۔

مرد سوچتا ہے: ہم میں سے ہر ایک کے پاس اپنی زندگی کی تنہائی دور کرنے کے مختلف حل تھے۔وہ ایک دوسرے سے انتہائی مختلف تھے۔میں نے دھمکی آمیز انداز میں اس کا دروازہ دھڑ دھڑایا' اس نے ایک اور قفل کا اضافہ کر لیا' پھر ایک اور قفل' اگلی صبح مرد نے بیگ پیک کرنا شروع کر دیئے۔اس میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگا۔صبح صبح دونوں میں ایک جھگڑا ہو چکا تھا۔ یہ جھگڑا کبھی ختم نہ ہونے والا اور بار بار ہونے والا جھگڑا تھا جس نے ان کی شادی شدہ زندگی کو ایک صحرا میں تبدیل کر دیا تھا۔زندگی کی ہر رمق چھین لی تھی۔ وہ خود کلامی کرتا ہے' جلد ہی ہم دونوں میں یہ جھگڑا اب کبھی نہیں ہوگا۔اس خیال سے اس کے جسم میں سکون کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے۔دن کا اختتام' بچیاں بستروں میں ہیں۔جونہی وہ سامان اٹھا کر باہر نکلنے کو تیار ہوتا ہے اسے بڑی لڑکی کی آواز آتی ہے جو اسے بلا رہی ہے۔ وہ سمجھا تھا کہ وہ سو چکی ہے' وہ اس کے کمرے میں جاتا ہے۔لڑکی جو اپنے بیڈ پر بیٹھی ہے۔دونوں ہاتھوں سے اس کا ہاتھ سختی سے بھینچ لیتی ہے۔وہ اس کی جانب دیکھتی ہے اور اس لمحے میں اسے اپنی بچی کے چہرے پر ایک ایسی اداسی دکھائی دی جو صرف بڑوں کے چہرے پر نظر آتی ہے' اس کی ننھی ننھی کلائیاں۔ وہ مرد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہی ہے اور کہتی ہے۔''میں آپ سے پیار کرتی ہوں ڈیڈی۔''

یہ ایک ایسا جملہ ہے جو چھوٹی بہن کے برعکس یہ بڑی بہن کبھی نہیں کہتی ہے۔میں آپ سے پیار کرتی ہوں۔مرد کو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی اس بچی کے ذریعے اس سے بات کر رہا ہے' اسے دلاسا دے رہا ہے ان تمام دلاسوں کے بعد جو وہ خود کو دینے کی کوشش کر رہا ہے۔

لڑکی اس کے ہاتھ چھوڑ دیتی ہے اور لیٹ کر اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے۔

فروری

نئے فلیٹ میں آج اتوار ہے وہ اب یہاں اکیلا رہتا ہے خاندان کے شور اور ہنگامے سے دور' روز روز کے جھگڑوں' چیخوں اور صبح سے شام تک پیار اور غصے کے بغیر۔

وہ سوچتا ہے' ہم نے شادی کیوں کی تھی؟

وہ جانتا تھا کہ لوگوں کے نزدیک وہ اور 'س' ایک دوسرے سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔شاید ان دونوں نے ایک دوسرے کی محبوب اشیا کا نقصان ہی کیا۔شاید یہ سب ایک حقیقی غلط فہمی رہی ہو' ایک حادثہ' مگر جو وضاحت اس کے نزدیک قابل قبول ہے وہ یہ ہے کہ ان دونوں نے کوئی غلطی نہیں کی۔وہ دونوں ایک ایسی راہ پر مل کر چلے تھے، جس کے اُداس اختتام کے بیج پہلے ہی بو دیئے گئے تھے۔مگر یہ بات ایک جیسی نہیں ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک ناکام شادی ایک غلطی ہو۔ان کے درمیان بہت سے اچھے خوش کن لمحات بھی تھے۔اگر دونوں نے ایک دوسرے کو نقصان پہنچایا تو ایک دوسرے کی مدد بھی کی۔وہ دونوں ایک تجربے سے بھی گزرے' انہوں نے زندگی گزاری اپنی اپنی بھی اور ایک دوسرے کی

بھی۔انھوں نے ایک دورے پر حملہ بھی کیا اپنے آپ کا دفاع بھی کیا' کبھی کبھار ایک دوسرے کا دفاع کیا اور اپنے آپ پر حملہ کیا۔ جسے دوسرے ناکامی سے تعبیر کرتے ہیں، وہ اس کے نزدیک زندگی کیلئے لازم گھانس پھونس ہے۔غذائی لحاظ سے کم تر مگر ریشوں کی وجہ سے آنتوں کے فعل میں مدد دینے والا۔ اس سب نے اسے تبدیل کر دیا۔ مرد سوچتا ہے' اس سب نے عورت کو تبدیل کر دیا' وہ امید کرتا ہے یقیناً یہ تبدیلی کبھی کبھار' بہت دردناک تھی مگر کیا یہ تبدیلی افسوسناک ہو سکتی ہے؟

ان کی دو بچیاں ہیں۔ محبت ان دونوں کے اندر فاسفورس کی روشنی کی مانند روشن ہے۔ وہ امید رکھتے ہیں کہ ان کا بالغوں والا پیار اب مراجعت کر کے کتنا ہی پیچھے نہ پلٹ جائے وہ دونوں اپنے اختلافات سے اپنے بچوں کو کوئی نقصان نہ پہنچنے دیں گے۔ مگر اس کے بعد وہ یہ جانتے ہیں کہ تمام تازہ تازہ علیحدہ ہوئے جوڑوں کو یہی خیال آتا ہوگا اور بہت سارے یہ خواہش کرتے پائے جائیں گے۔

ان دونوں کے درمیان کیا باقی بچا تھا سوائے ایک غیر حل پذیر گوند کے؟

ابھی ایک دوسرے کی فکر' اچانک سی رغبت' غصہ بھی' بلکہ غُصے کے دریا' سمندر اور بحرِ بے کراں' وہ ہمہ وقت موجود جوڑنے والا اور توڑنے والا غصہ۔ غصہ اُس کی سُستی پر' عورت کے شہادت کے رتبے پر فائز ہونے پر' اس کی خود غرضی پر' عورت کے خود اختیار کردہ جبر پر غصہ۔

بنیادی اور خاص وجہ وہی تھی، جو ہمیشہ ہوتی ہے مرد کے نزدیک۔

باہمی نارضامندی' سوچنے کے مخصوص طریقے اور ان مٹ طرزِ عمل چھوڑنے کی باہمی ضد، وہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ یہ سب انھیں اس چیز سے بچا لے گا جس سے وہ خوفزدہ ہیں۔ جس سے ہر کوئی خوفزدہ ہوتا ہے کہ وہ دونوں اچھے لوگ نہ تھے' ان کی ذات کو شدید ضرر کا خدشہ تھا' کوئی بھی چیز یقینی نہ تھی اور یہ کہ وہ معاملات کو سنبھالنے کی قدرت ہی نہیں رکھتے تھے۔

❁❁❁

ملن، کب اور کیسے

(2013 کی نوبل انعام یافتہ کینیڈین ادیبہ کی کہانی How I met my husband)

تخلیق کار: ایلس منرو تلخیص و ترجمہ: ڈاکٹر صابر بدر جعفری

دوپہر کا وقت تھا۔ ناگہاں ہوائی جہاز کا شور سنائی دیا۔ گھن گرج سے لگتا تھا ہمارے گھر پر ہی گرنے والا ہے۔ ہم سب باہر نکل کر صحن میں آ گئے۔ ہم نے دیکھا کہ سرخ دوپٹہ لپیٹے ایک کسرتی رو جسم درختوں کی پھننگوں پر منڈلا رہا ہے۔

''اتنے قریب سے جہاز میں نے پہلی بار دیکھا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے مسز پیپلس کی حیرت آمیز چیخ نکل گئی۔ ان کا چھوٹا بیٹا جوئے پکارا۔ ''کریش لینڈنگ... کریشن لینڈنگ۔''

''آپ لوگ پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔ پائلٹ اپنے کام میں ماہر ہوتے ہیں۔'' ڈاکٹر پیپلس نے ہمیں پریشان دیکھ کر کہا۔ ڈاکٹر موصوف تھے تو ڈنگر ڈاکٹر، مگر کسی بھی اور ڈاکٹر کی مانند انہیں شائستگی سے بات کرنے کا سلیقہ تھا۔ انہوں نے شہر سے پانچ میل کے فاصلے پر واقع ایک فارم پر بنا ہوا پرانا مکان خرید لیا تھا۔ ان دنوں شہر کے لوگوں میں شہر سے باہر فارموں پر رہائش اختیار کرنے کا رجحان فروغ پا رہا تھا۔

ہم نے جہاز کو سڑک کی دوسری طرف واقع میدان میں اترتے ہوئے دیکھا۔ اس میدان سے سارا ملبہ صاف کر کے اسے نہایت ہموار لینڈنگ پیڈ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

''چلو اندر چلو۔ یہاں گنواروں کی طرح کیا کھڑے ہو۔'' مسز پیپلس نے چیخ کر ہم سے کہا۔ ایسا لب ولہجہ وہ اسی وقت اختیار کرتی ہیں جب ان کے اعصاب جواب دے جاتے ہیں۔ میری عزت نفس مجروح کرنا ان کے پیش نظر نہیں تھا۔

سب کھانا کھا چکے تھے۔ میں میٹھا لگا رہی تھی کہ لوریٹا برڈ آ پہنچی۔ اس نے گھستے ہی کہا۔ ''میں تو سمجھی تھی یہ گھر پر ہی گرے گا۔'' وہ ڈاکٹر پیپلس کے گھر سے ذرا فاصلہ پر رہتی تھی، ڈاکٹر کا خیال تھا کہ وہ کاشتکار ہے۔ حالانکہ وہ یا اس کا شوہر کھیتی باڑی نہیں کرتے تھے۔ شوہر تو سڑکوں کی مرمت اور تعمیر کا کام کرتا تھا اور اپنی شراب نوشی کی وجہ سے بہت بدنام تھا۔ اس کی شہرت اتنی خراب تھی کہ ''ہائی وے

گراسری'' کی انتظامیہ بھی اسے سودا ادھار نہیں دیتی تھی۔ ڈاکٹر کو یہ سب باتیں معلوم نہیں تھیں۔ انھوں نے نہایت خوش دلی سے اسے خوش آمدید کہا اور مٹھائی پیش کی۔ اور یٹا نے مجھے آڑووں کے کین (Canned Peaches) لاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اس نے منہ بنا کر کہا۔'' معاف کرنا مجھے ڈبوں کی چیزیں ہضم نہیں ہوتیں۔ میں تو گھر کی بنی ہوئی چیزیں ہی کھاتی ہوں۔'' میرا جی چاہا کہ اسے ایک تھپڑ رسید کروں۔ میں شرطیہ کہہ سکتی ہوں اس نے زندگی میں کبھی پھل نہیں کھائے ہوں گے۔

'' مجھے معلوم ہے اس نے جہاز یہاں کیوں اتارا ہے۔'' لوریٹا نے کہا۔'' اس کے پاس یہاں جہاز اتارنے اور لوگوں کو تفریحاً جہاز میں گھمانے کا اجازت نامہ ہے۔ یہ ایک ڈالر فی کس لیتا ہے ۔پچھلے ہفتے یہ Palmerston میں تھا اور اس سے قبل Lakeshore میں۔''

'' میں تو موقع سے فوراً فائدہ اٹھاؤں گا۔ مجھے جہاز سے نیچے قرب و جوار کا منظر دیکھنے کا بڑا شوق ہے۔'' ڈاکٹر پیپلس نے کہا۔ مسز پیپلس بولیں۔'' میں تو زمین ہی سے نظارہ کرلوں گی۔'' البتہ جوئے اور ہیتھر نے جو علی الترتیب نو اور سات سال کے ہیں جہاز میں سوار ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔

'' ایڈی (Edie) تم چلو گی؟ ہیتھر نے پوچھا۔

'' معلوم نہیں۔'' میں نے مبہم سا جواب دے کر اسے ٹال دیا۔ دراصل مجھے ہوائی جہاز میں ڈر لگتا ہے مگر میں اس کا اظہار نہیں کرتی۔ خصوصاً ان بچوں کے سامنے جن کی نگرانی پر مامور ہوں۔

ڈاکٹر پیپلس اپنے کام پر چلے گئے اور بیگم نے ستانے کیلئے خواب گاہ کا رخ کیا۔ میں برتن دھونے لگ گئی۔ لوریٹا میرے اردگرد منڈلاتی رہی۔ وہ مسز پیپلس کے خلاف اپنے دل کا غبار نکال رہی تھی۔ بے شرم ان ہی کے گھر میں ان پر نکتہ چینی کر رہی تھی۔ اس نے مسز پیپلس پر طنز کرتے ہوئے کہا یہ اس طرح دن کے وقت آرام کرنے لیٹ سکتی تھیں اگر ان کے بھی میری طرح سات بچے ہوتے؟ پھر اس نے براہ راست مجھ سے سوال کیا۔'' یہ میاں بیوی لڑتے تو نہیں؟ وہ اپنی چیزیں ایک دوسرے سے چھپا کر تو نہیں رکھتے ہیں۔'' اور پھر خود ہی اپنی رائے دی'' ایسا کرتے ہیں تو بہت برا کرتے ہیں۔'' میں نے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا۔'' میں نہیں سمجھی تم کیا کہہ رہی ہو۔''

میری عمر پندرہ برس تھی جب میں نے پہلی بار گھر سے باہر قدم نکالا تھا۔ والدین نے مجھے سال بھر کیلئے ہائی اسکول بھیج دیا تھا۔ میں چلی تو گئی مگر مجھے یہ کام بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔ اجنبیوں سے میں شرماتی بھی تھی اور کام بھی دقت طلب تھا۔ سال کے اختتام پر جب اخبار میں ہماری کارکردگی کی اوسط شرح شائع ہوئی تو میری اوسط سب سے کم سطح پر یعنی 37% تھی۔ میں کسی نہ کسی طرح اسکول سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ لہٰذا جس دن میری شرمناک کارکردگی کا بھانڈا پھوٹا، میں نے اسی دن سے پڑھانا چھوڑ دیا۔

ہماری گائے کے یہاں بچہ ہونے والا تھا۔ اسے سنبھالنے کیلئے ڈاکٹر پیپلس ہمارے گھر آئے ہوئے تھے مجھے دیکھ کر کہنے لگے۔ بڑی اسمارٹ لگ رہی ہو میری بیوی کو ایک مددگار کی ضرورت ہے وہ

ہر وقت اپنے دو بچوں میں گھری رہتی ہے۔ مجھے اپنی والدہ کے چہرے سے اندازہ ہوا کہ وہ یہ سوچ رہی ہیں کہ محض دو بچوں کو سنبھالنے پر جب کہ انہیں کوئی اور کام بھی نہیں ہے وہ شاکی ہیں۔

کچھ دنوں بعد جب میں اپنے گھر گئی تو میں نے گھر والوں کو بتایا کہ مجھے ڈاکٹر کے گھر میں کیا کیا کام کرنا پڑتے ہیں، جسے سن کر سب ہنس دیئے۔ ڈاکٹر کے گھر میں خودکار واشر اور ڈرائر تھے جنھیں میں نے پہلی بار دیکھا تھا، اب تو میرے اپنے گھر میں بھی عرصے سے یہ چیزیں زیر استعمال ہیں۔ اب تو مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ کبھی میرے نزدیک خودکار مشین کے ذریعے کپڑوں کو نچوڑنا ایک معجزہ سے کم نہ تھا۔

مسز پیپلس کا کہنا تھا کہ وہ کچھ بھی بیک نہیں کرسکتیں۔ ایک خاتون کے منہ سے یہ سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ میں تو بسکٹ اور مختلف قسم کے کیک بنا لیتی ہوں مگر میرے گھر والے ان چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ وہ سب اپنے 'فیگر' کے بارے میں بہت حساس ہیں۔

ڈاکٹر کے گھر کام کرنے میں جو چیز میرے لئے تکلیف دہ تھی وہ یہ تھی کہ مجھے دیر تک بھوکا رہنا پڑتا تھا۔ اس لئے میں اپنے گھر سے 'ڈونٹ' کا ایک ڈبا لے آئی تھی جسے اپنے بستر میں چھپا دیا تھا۔ بچوں نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ میں نے ان سے وعدہ لے لیا کہ کسی سے اس کا ذکر نہیں کریں گے۔

مجھے گھر میں تنہا رہ کر آرام آرام سے کام کرنا اچھا لگتا تھا۔ روشن صاف ستھرا باورچی خانہ مجھے پسند تھا۔ میں ہر چیز خوب چمکا کر رکھتی تھی۔ میں ہفتے میں ایک بار نہایا کرتی تھی حالانکہ میرے نہانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ان کا غسل خانہ بھی خوب سجا بنا تھا۔ اس کا بیسن، ٹب اور کموڈ سب ہلکے گلابی رنگ کے تھے، بلب بھی گلابی تھا۔ ساری فضا خواب آور اور رومان پرور تھی۔ فٹ میٹ برف کے گالے کی مانند نرم اور فرحت افزا تھا مگر برف کے برعکس گرم تھا۔ ایک جانب سہ رخی قدِ آدم آئینہ لگا ہوا تھا میں کپڑے اتار کر اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی۔ تینوں رخ سے اپنے ننگے جسم کو دیکھا کرتی۔ یہ منظر مجھے بہت اچھا لگتا۔

اس دن میں نے جلدی سے اپنا کام ختم کرلیا تھا، شام کیلئے سبزی بھی کاٹ لی تھی۔ پھر میں مسز پیپلس کی خواہ گاہ میں گئی یہاں میں صفائی کے لئے آتی رہتی تھی۔ جب بھی آتی الماری میں ٹنگے ہوئے ان کپڑوں کو حسرت سے دیکھا کرتی۔ کچھ کپڑے تو وہ تھے جنھیں وہ اکثر پہنا کرتی تھیں' میں انھیں خوب پہچانتی تھی۔ کچھ اور کپڑے الماری کے اندر کی جانب ٹنگے ہوئے تھے جنھیں میں نے انھیں پہنے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ البتہ میں ان کی درازوں میں نہیں جھانکتی تھی۔ الماری کی بات اور تھی، وہ تو کھلی ہی رہتی تھی، اس لئے اس میں ٹنگے ہوئے پکڑوں پر تو نظر پڑ ہی جاتی تھی۔ الماری میں ٹنگے ہوئے کپڑوں میں ساٹن کا ایک لانگ ڈریس نظر آیا۔ اس کا رنگ ہلکا سبزی مائل تھا۔ میں نے اسے پہن لیا۔ کندھوں پر ساٹن کا نرم لمس مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے پیار سے ہاتھ رکھ دیا ہے۔ یہ لباس میری کمر پر بالکل فٹ آ گیا البتہ اس ڈریس کیلئے بغیر اسٹریپ کی انگیا درکار تھی جو میرے پاس نہیں تھی۔ میں نے اپنی انگیا کے بند کندھوں کے نیچے بغل کے اندر کر لئے۔ میں پندرہ برس کی نازک اندازکی نازک اندام لڑکی تھی

جواس لباس میں غضب کی لگ رہی تھی۔ پھر میں نے اپنے بالوں کو درست کیا۔ مسز پیبلس کی ڈریسنگ ٹیبل سے روج، لپ اسٹک اور آئی بروز لے کر میک اپ کیا۔ ساتھ ہی میں اپنے اور ان لوگوں کے معیار زندگی کے فرق پر غور کرتی رہی۔

ساٹن کے لمس اور جذبات کی آنچ سے میرا گلا خشک ہوگیا، جسے تر کرنے کیلئے میں نے باورچی خانہ کا رخ کیا۔ فریج سے آئس کیوب نکال کر جنجر کو ٹھنڈا کیا اور غٹا غٹ پی گئی۔ یہ لوگ دن بھر پانی کی جگہ جنجر یا پھلوں کا جوس پیتے رہتے تھے۔ گھر میں برف کی کوئی کمی نہیں تھی، میں دودھ میں آئس کیوب ڈال کر پیا کرتی تھی۔ فریج میں برف کی ٹرے واپس رکھ کر جب میں مڑی تو میری نظر ایک شخص پر پڑی جو اسکرین سے لگ کر کھڑا مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔

''میں تمہیں حیران کرنا نہیں چاہتا تھا، میں نے کھٹکا کیا تھا مگر تم فریج سے برف نکالنے میں اس قدر محو تھیں کہ تم نے سنا ہی نہیں۔'' میں نہیں دیکھ پائی کہ وہ کیسا تھا۔ اسکرین کے آگے کھڑا شخص جس کے پیچھے سورج چمک رہا ہو سانولا ہی نظر آ سکتا تھا۔ مجھے تو محض یہ لگا کہ وہ اس علاقے کا رہنے والا نہیں ہے۔

''میں ادھر جہاز سے آ رہا ہوں۔ میرا نام کرس واٹرس ہے۔ کیا میں آپ کا پمپ استعمال کر سکتا ہوں۔''

ہمارے صحن میں پمپ لگا ہوا تھا۔ لوگ اس سے اپنی ضرورت کا پانی نکالا کرتے تھے۔ اب میں نے غور کیا کہ اس کے ہاتھ میں بالٹی ہے۔

''ضرور'' میں نے کہا۔ ''میں نل سے بھر دیتی ہوں آپ کو پمپ سے نکالنے میں زحمت ہوگی۔'' میں اسے یہ جتانا چاہتی تھی کہ ہم نل کا پانی استعمال کرتے ہیں۔

''مجھے کوئی زحمت نہیں ہوگی۔'' اور پھر کہنے لگا ''کیا تم کسی ڈانس پارٹی میں جا رہی ہو؟ یا یہاں کی خواتین سہ پہر کو ایسا ہی لباس پہنتی ہیں؟''

میں یہ بھول ہی گئی تھی کہ میں کس لباس میں ہوں، اس کے سوال پر گھبرا گئی۔ مجھ سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔

''تم یہیں رہتی ہو؟ کیا تم گھر کی بیگم ہو؟''

''نہیں میں ملازمہ ہوں۔'' یہ جان کر کچھ لوگوں کا رویہ بدل جاتا ہے۔ ان کی بات چیت کے انداز میں فرق آ جاتا ہے، مگر اس کے رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ''تم بہت اچھی ہو۔ پہلی ہی نظر میں مجھے بہت اچھی بہت خوبصورت لگیں۔''

اس کے منہ سے اپنی تعریف سن کر میں تو گھبرا گئی۔ میں تو چاہ رہی تھی کہ اب وہ چلا جائے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ مجھے ناپسند تھا بلکہ اس کا سامنا کرتے ہوئے مجھے شرم آ رہی تھی۔ اس نے غالباً میرے دل کی بات بھانپ لی۔ اس نے شکریہ ادا کیا' خدا حافظ کہا اور پمپ سے اپنی بالٹی بھرنے چلا گیا۔ میں ڈائننگ روم میں چلمن کے پاس کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ جب وہ چلا گیا تو میں واپس خواب گاہ میں گئی

اور وہ لباس اتا کر اپنے کپڑے پہن لئے اور منہ دھو کر میک اپ بھی اتار لیا اور اپنے بالوں کو بھی کھول لیا۔

ڈاکٹر میاں بیوی نے اس کے بارے میں مجھ سے سوال جواب شروع کر دیئے۔ ''جوان تھا یا ادھیڑ عمر؟ پستہ قد تھا یا قد آور؟'' ڈاکٹر نے مجھے چھیڑا۔ ''اچھا لگ رہا تھا'' میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ وہ پانی لینے پھر آئے گا۔ ڈاکٹر اور ان کی بیگم سے اس کی دوستی ہو جائے گی اور وہ انہیں مجھ سے پہلی ملاقات کا احوال سنائے گا' خاص طور پر میرے لباس کا ذکر کرے گا۔ ایسا ہوا تو میرے لئے کتنی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

سپر (Supper) سے فارغ ہو کر ڈاکٹر بیگم کو لے کے مووی دیکھنے شہر چلے گئے۔ بیگم صاحبہ نے بال ترشوائے تھے۔ دکھانے کیلئے انہیں کہیں تو جانا تھا۔ میں باورچی خانہ میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ جب مسز پیبلس کو (میرا) ان کا لباس پہننے کے بارے میں علم ہوگا تو وہ مجھے نکال تو نہیں دیں گی۔ اس سے میرے بارے میں ان کے خیالات بدل بھی سکتے ہیں۔ جب آپ کسی کی ملازمت کریں تو ایسا تو ہوتا ہے، اس سے یہ مراد نہیں تھی کہ ڈاکٹر میاں بیوی کا سلوک میرے ساتھ اچھا نہیں تھا۔ حقیقتاً ان کا سلوک بہت اچھا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ بٹھا کے کھانا کھلاتے تھے۔ کبھی کبھی اپنے ساتھ کار میں بھی لے جاتے تھے۔

میں نے اوپر جا کر دیکھا بچے سو چکے تھے۔ میں باہر نکل گئی۔ سڑک پار کر کے اس میدان میں پہنچ گئی جہاں جہاز کھڑا تھا۔ میدان کے ایک سرے پر جھاڑیوں کے قریب مجھے اس کا خیمہ نظر آ گیا۔ وہ باہر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے مجھے آتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

''ہیلو' کیا جہاز میں بیٹھنے آئی ہو؟ میں کل سے پہلے سواریاں لینا شروع نہیں کروں گا۔'' اس نے پھر مجھ پر ایک نظر ڈالی اور کہا کہ ''آؤ، یہ تم ہو، بغیر اس لانگ ڈریس کے میں تمہارا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ زبان خشک ہوگئی، میں کچھ بولنا چاہتی تھی مگر بول نہیں پا رہی تھی، حلق سوکھ گیا، میں گونگے بہروں کی طرح کھڑی اسے دیکھتی رہی۔

''ہوائی جہاز میں سواری کرنے آئی ہو؟ آؤ بیٹھو۔ سگریٹ پیو۔''

میں انکار میں سر تک نہیں ہلا سکی۔ لہٰذا اس نے ایک سگریٹ میری طرف بڑھا دی۔ ''اسے ہونٹوں میں دباؤ تاکہ میں اسے سلگا دوں۔ مجھے شرمیلی خواتین پسند ہیں۔''

میں نے سگریٹ منہ سے لگا لیا۔ میں پہلی بار سگریٹ نہیں پی رہی تھی' میری دوست مورل لوئز اپنے بھائی کی سگریٹیں چرا لیا کرتی تھی اور پھر ہم دونوں انہیں پھونکتے تھے۔

''تم یونہی باتیں کرنے آئی تھی یا کچھ اور کام تھا؟''

میں نے ایک سانس میں کہہ دیا۔ ''میں چاہتی ہوں آپ لباس کے بارے میں کوئی بات نہ کریں۔''

"کون سا لباس؟ اوہ وہ لانگ ڈریس۔"

"وہ مسز پیپلس کا تھا۔"

"کون مسز پیپلس؟ اوہ وہ خاتون جن کے گھر آپ کام کرتی ہیں۔ وہ گھر میں نہیں ہوں گی تو تم نے ان کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھا کر ان کا لباس پہن لیا۔ بالکل ملکہ لگ رہی تھی۔ تم سگریٹ صحیح طرح نہیں پی رہی ہو۔ پھونکیں مت مارو، اندر کی طرف کھینچو۔ کسی نے تمہیں نہیں سکھایا کہ سگریٹ کا کش کیسے لگاتے ہیں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ دیکھو" پھر اس نے کہا "اس لباس کا اب میں کبھی ذکر نہیں کروں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔"

یہ دیکھ کر کہ میں سہمی سمٹی بیٹھی ہوں اور اس کے وعدے پر اس کا شکریہ بھی ادا نہیں کر پا رہی ہوں' اس نے گفتگو کا موضوع بدل دیا۔

"اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" اس نے بورڈ کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے پوچھا جو نیچے میرے پاؤں کے پاس ہی رکھا تھا جس پر لکھا تھا۔ 'آسمان کی بلندی سے زمین کا نظارہ کرو۔ کرایہ ایک ڈالر فی کس۔ بچوں کا پچاس سینٹ۔ سند یافتہ پائلٹ!"

پرانے بورڈ کی تحریر ماند پڑتی جا رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ نیا بنا لوں صبح سے یہی کر رہا تھا۔

"میں بورڈ پر لکھنے کا ماہر نہیں ہوں۔"

"اچھا تو ہے۔" میں نے کہا۔

تشہیر کیلئے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ زبانی چرچا ہی کافی ہوتا ہے، رات ہی کو دو گاڑیاں بھر کر لوگ آئے تھے جنھیں لوٹانا پڑا۔

ناگہاں مجھے بچے یاد آئے۔ اس خیال ہی سے میں پریشان ہوگئی کہ اگر ان کی آنکھ کھل گئی اور انہیں میں نظر آ نہیں آئی تو کیا ہوگا۔

کیا تمہیں واپس جانے کی جلدی ہے؟

ایک دم مجھے معاشرتی آداب یاد آئے۔ لہٰذا میں نے کہا۔ "سگریٹ پلانے کا شکریہ۔"

میں نے ابھی میدان ہی عبور کیا تھا کہ مجھے شہر کی طرف سے گھر کی جانب آتی ہوئی کار نظر آئی مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دیر باہر رہی تھی۔ میں نے قدم بڑھائے اور گھر پہنچ گئی۔ بچے ابھی تک سو رہے تھے۔ میں بھی اپنے بستر میں دبک گئی۔ یہ سوچ کر کہ آج کے دن کا اختتام کتنا خوشگوار تھا مجھ پر سرور کی کیفیت طاری ہوگئی۔

اس دن کے بعد میں پھر اس کی طرف نہیں گئی۔ البتہ جب وہ پانی لینے آتا تو ملاقات ہو جاتی تھی۔ باہر سیڑھیوں پر بیٹھ کر میں کچھ بیٹھے بیٹھے کرنے کے کام کرنے لگی، مثلاً سبزی ہی کاٹتی۔

ایک دن مجھے بیٹھا دیکھ کر وہ میرے پاس آیا "تم آتی کیوں نہیں۔ آؤ۔ میں تمہیں جہاز کی سیر کراؤں۔"

"میں آج کل پیسے جمع کر رہی ہوں۔" مجھے کوئی اور جواب نہیں سوجھا۔

"کس لئے پیسے جمع کر رہی ہو۔ شادی کیلئے۔"

میں نے گردن ہلا دی۔ مطلب تھا۔ "یہی سمجھ لو۔"

"تم اس وقت آؤ جب رش کم ہو میں تمھیں فری لے چلوں گا۔ میں تو سمجھتا تھا تم پھر آؤ گی۔ کچھ اور نہیں تو سگریٹ ہی پینے۔"

اتوار کو جہاز کی سواری کرنے والوں کا بڑا رش تھا۔ ہم باہر بیٹھے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ جوئے اور ہیتھر جھاڑی کے قریب چڑیا کے بچوں سے کھیل رہے تھے۔ اتنے میں ایک کار تیزی سے آئی اور سیدھی جہاز کے قریب آ کر رک گئی۔ اس سے لوریٹا برڈ اتری۔ ڈرائیور کی سیٹ کی طرف سے ایک اور خاتون گاڑی سے باہر آئی۔ اس نے دھوپ کا چشمہ لگا رکھا تھا۔

"یہ خاتون جہاز کے پائلٹ سے ملنے آئی ہے۔ میں نے ہوٹل کی کافی شاپ میں انھیں پائلٹ کی بابت دریافت کرتے ہوئے سنا تو ساتھ لے آئی۔"

"میں زحمت کیلئے معذرت خواہ ہوں۔" اس خاتون نے کہا۔ "میرا نام ایلس کیلنگ ہے۔ میں مسٹر واٹرس کی منگیتر ہوں۔" یہ خاتون سفید اور براؤن رنگ کا چوخانے کا "سلیک" زیب تن کئے ہوئے تھی۔ اس کی چھاتیاں بڑی اور ڈھلکی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ وہ ذرا بھی قبول صورت نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے اپنا، مسز کا اور میرا اس سے تعارف کرایا اور اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔

"اس وقت وہ پرواز کر رہا ہے۔ آپ انتظار کریں۔ وہ پانی لینے یہاں آتا ہے۔ غالباً پانچ بجے کے قریب آئے گا۔"

"اس نے کبھی اپنی منگنی کا ذکر نہیں کیا۔" مسز پیپلس نے اپنے شک کا اظہار کیا۔

"جب میں نے پہلی بار اس کافی شاپ میں تمھارا ذکر سنا تھا تو تم نرس تھیں۔"

"آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا؟"

"کیا تم نرسنگ کے دوران اس سے نہیں ملی تھی؟" مسز پیپلس نے اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"کس سے۔ کرائس سے؟"

"جی ہاں۔"

"کیا تم ملک سے باہر تھیں۔"

"نہیں۔ یہ اس کے ملک سے باہر جانے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ میں نے اس وقت اس کی نرسنگ کی تھی جب وہ Centralia میں تھا اور اس کا اپینڈکس برسٹ ہو گیا تھا۔ ہماری منگنی ہوگئی تھی۔ پھر وہ ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ عرصے کے بعد میں آج اس سے ملوں گی۔"

"تم سے مل کر یقیناً اسے خوشی ہوگی۔" ڈاکٹر پیپلس نے کہا۔ "یہ خانہ بدوشوں کی سی زندگی ہے جس میں زیادہ دن ایک جگہ نہیں ٹکا جاتا۔"

’’تمہاری منگنی بہت دن رہی؟‘‘ لوریٹا نے پوچھا۔

ایلس نے لوریٹا کی بات سنی ان سنی کردی اور اپنی بات جاری رکھی۔ ’’میں ہوٹل میں کمرہ لے رہی تھی اور اس سے فون پر بات کرتی لیکن جب رہنمائی ملی تو یہاں آ گئی۔‘‘

’’کیا ضرورت تھی۔ ہوٹل میں تم اس سے پانچ میل کے فاصلہ پر ہوتیں۔ یہاں تمھارے اس کے درمیان بس ایک سڑک ہے۔ ہمارے پاس ٹھہرو۔ دیکھو یہ کتنا بڑا گھر ہے۔ اس میں کمرے ہی کمرے ہیں۔‘‘

اس طرح لوگوں کو ٹھہرانے کی پیش کش کرنا شاید ڈاکٹر کے نزدیک مناسب ہو، مگر جس طرح مسز پیپلس نے کہا کہ یہاں ہمارے پاس کمروں کی بہتات ہے اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس پیش کش کو مناسب نہیں سمجھتی تھیں۔ ایلس کو بھی اس پیش کش کا فائدہ اٹھانے میں تامل تھا مگر آخر مان گئی۔ غالبًا کرائس کے اتنے قریب رہنے کا خیال اس کیلئے بھی پر کشش تھا۔‘‘

ڈاکٹر پیپلس کے اندازے کے مطابق کرائس شام ڈھلے پانی لینے آیا۔ غالبًا اس نے ایلس کی کار کو دور سے ہی پہچان لیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے داخل ہوا۔

’’میں تمہارا پیچھا کرتے ہوئے یہ جاننے کیلئے کہ تمہارے ارادے کیا ہیں یہاں تک آ گئی ہوں۔‘‘ ایلس نے اٹھتے ہوئے کہا اور پھر اس نے اور کرائس نے ایک دوسرے کو kiss کیا۔ ہم لوگوں کی موجودگی کا احساس کرتے ہوئے انہوں نے بس ایک دوسرے کو ہونٹوں سے چھوا جس میں گرم جوشی کا قطعی کوئی شائبہ نہیں تھا۔

’’تم نے بڑا پیٹرول پھونکا ہوگا۔‘‘ کرائس نے ایلس کو مخاطب کر کے کہا۔

ڈاکٹر نے کرائس کو سپر کیلئے روک لیا۔ کرائس کو کوئی تامل نہیں تھا کیونکہ اس نے پہلے ہی نوٹس لگا دیا تھا کہ سات بجے تک جہاز پر سواری بند ہے۔ مسز پیپلس کی خواہش تھی کہ کھانا پینا صحن ہی میں ہو حالانکہ وہاں کیڑے مکوڑوں کی بہتات تھی۔ میں نے آلو کا سلاد، مسز پیپلس نے جیلی ملا کر سلاد بنایا تھا‘ وہ یہی بنا سکتی تھی۔ کچھ گوشت کے پارچے، کھیرے، قتلے، اور سلاد کے پتے بھی شامل تھے، ان چیزوں کو اب باہر صحن میں لانا تھا، لوریٹا برڈ جو پاس ہی منڈلا رہی تھی‘ کہنے لگی۔ ’’یہاں بیٹھنا اچھا تو لگ رہا ہے مگر مجھے گھر جا کر کتوں کو سنبھالنا ہے۔‘‘ کسی نے اس سے رکنے کیلئے نہیں کہا۔ آخر وہ چلی گئی تو میں نے بھی سکون کا سانس لیا۔

اس رات جب جہاز میں سواری کا سلسلہ ختم ہوگیا اور ایلس اور کرائس ایلس کی کار میں کہیں چلے گئے۔ جب تک وہ نہیں آ گئے میں جاگتی رہی، جب کار کی روشنیاں نظر آئیں تو میں کھڑکی کے پاس جا کے کھڑی ہوگئی اور پردے کے پیچھے سے انہیں دیکھنے لگی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کیا دیکھنا چاہتی تھی۔ کرائس گاڑی کے ایک طرف سے اترا اور ایلس دوسری طرف سے اور دونوں مختلف سمتوں میں روانہ ہوگئے۔ کرائس میدان کی سمت اور ایلس گھر کی جانب۔ میں واپس بستر پر لیٹ گئی اور سوچنے لگی کہ میں اس کی جگہ ہوتی تو اس طرح رخصت نہیں ہوتی۔

صبح ایلس دیر سے سو کر اٹھی۔ میں نے اس کیلئے چکوترے کا جوس بنایا تھا۔ مسز پیپلس اس کے پاس بیٹھی کافی سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ ایلس چاہتی تھی کہ وہ ایک دن اور رہے اور کرائس کی سرگرمیوں پر نظر رکھے جب کہ مسز پیپلس اس کے ساتھ کار میں جھیل پر پکنک منانے جانا چاہتی تھیں۔ جھیل صرف پچیس میل دور ہی تو تھی اور آج پکنک کیا ہی مزہ دیتی۔ ایلس نے طوعاً کرہاً مسز پیپلس کی تجویز سے اتفاق کیا۔ گیارہ بجتے بجتے وہ پکنک پر روانہ ہوگئیں۔ جوئے اور ہیتھر کو انہوں نے ساتھ لیا اور میں نے لنچ کیلئے جو سینڈوچ بنائے تھے وہ ساتھ رکھ لئے۔ کرائس اس وقت تک نہیں آیا تھا۔ ایلس کو اس کا انتظار تھا تا کہ اسے بتا سکے کہ کہاں جا رہی ہے۔

’’کوئی مسئلہ نہیں‘ ایڈی اسے بتا دے گی۔‘‘ مسز پیپلس نے مشورہ دیا۔ ایلس کی پیشانی پر بل تو پڑے مگر اسے اتفاق کرنا ہی پڑا۔

’’دیکھو اسے ضرور بتا دینا اور کہہ دینا کہ ہم شام پانچ بجے تک واپس آ جائیں گے۔‘‘

میرا خیال تھا کہ اسے ان کے پروگرام سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی اور وہ اپنے کیمپ میں اپنا پکایا ہوا کھانا کھانے میں مصروف ہوگا۔ میں اپنے کاموں میں لگ گئی۔ میں نے ایک کیک بنایا۔ جب وہ ٹھنڈا ہوگیا تو اسے ’’ٹی ٹاول‘‘ میں لپیٹا۔ ایپرن پہنا، بال درست کئے۔ میں کچھ میک اپ بھی کرنا چاہتی تھی مگر پھر خیال آیا کہ اس طرح مجھے دیکھ کر اسے پہلے دن کا مجھے دیکھنا یاد آ جائے گا اور میں اپنی نظروں میں اک بار پھر گر جاؤں گی۔

اس نے نوٹس لگا دیا تھا کہ آج کوئی ’رائڈ‘ نہیں ہوگی۔ مجھے فکر ہوئی کہ وہ کہیں بیمار نہ ہوگیا ہو۔ اس کے خیمہ کا پردہ گرا ہوا تھا۔ میں نے کھمبے پر کھٹکا کیا۔

’’آ جاؤ‘‘ اس نے کہا۔ اس کے لہجے میں بیزاری عیاں تھی۔

میں نے پردہ اٹھایا ’’اوہ! یہ تم ہو۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم ہوگی۔‘‘ وہ بستر کے سرے پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

’’تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ میں تمہارے لئے کیک لائی تھی۔‘‘

’’کیوں مجھے کیا ہوا؟ اچھا وہ نوٹس۔ میں لوگوں کے سوالوں کا جواب دیتے دیتے عاجز آ گیا ہوں۔ میری مراد تم سے نہیں ہے‘ آؤ بیٹھو۔‘‘ اس نے خیمے کے پردے کو اٹھا کے پن لگا دیا۔ ’’کچھ تازہ ہوا آئے گی۔‘‘

میں بستر کے کنارے پر ٹک گئی۔ پھر میں نے اسے اس کی منگیتر کا پیغام دیا۔ اس نے کیک کا ایک ٹکڑا کھایا۔ ’’اچھا ہے۔‘‘

’’باقی بھی رکھ لیجئے۔ جب بھوک لگے کھا لیجئے گا۔‘‘

’’مجھے تمہیں ایک بات بتانی ہے۔ میں یہاں سے جا رہا ہوں۔‘‘

’’کیا شادی کرنے؟‘‘

اس نے ٹھٹھا لگایا۔ اور پوچھا ’’تم نے ان کی واپسی کا کیا وقت بتایا تھا۔‘‘

''پانچ بجے۔''

''اس وقت تک میں جا چکا ہوں گا۔ اور تم تو جانتی ہو جہاز کی رفتار گاڑی سے تیز ہوتی ہے۔'' اس نے کیک کا ایک اور پیس کھایا۔

''اب تمہیں پیاس لگ رہی ہوگی؟''

''بالٹی میں کچھ پانی ہے۔''

''یہ گرم ہو گیا ہوگا۔ میں کچھ تازہ پانی لاتی ہوں۔ فریج سے کچھ برف بھی لیتی آؤں گی۔''

''نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ تم جاؤ۔ میں جانے سے پہلے تمھارے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔''

اس نے کیک ایک طرف رکھا اور بستر پر میرے پاس بیٹھ کر مجھے سینہ سے چمٹا کر میرے بوسے لینا شروع کر دیئے۔ اس کے چہرے سے محبت ٹپک رہی تھی اور اس کے بوسوں میں بڑی مٹھاس تھی۔ اس نے میری پلکوں پر، گردن پر، کانوں پر، جگہ جگہ بوسوں کی بارش کر دی۔ پھر ہم بستر پر ایک دوسرے سے چمٹ کر لیٹ گئے۔ اس نے اور بھی دست درازی کی۔

''میں تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔'' اس نے زیر لب مجھ سے کان میں کہا۔ وہ مجھ پر چڑھا ہوا تھا اور ہم باری باری ایک دوسرے کے اوپر نیچے ہو رہے تھے کہ وہ ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جذبات میں تپ رہا تھا اس نے بالٹی سے پانی لے کر اپنے چہرہ اور گردن پر چھینٹے مارے اور جو تھوڑا پانی بچ رہا تھا اسے مجھ لیٹی ہوئی پر ڈال دیا۔ ''یہ ہماری آنچ کو سرد کر دے گا۔''

جب ہم ایک دوسرے سے رخصت ہونے لگے، اس نے میرا چہرہ اٹھا کر کہا کہ میں تمھیں خط لکھوں گا' بتاؤں گا کہ میں کہاں ہوں' تم وہاں مجھ سے ملنے آ جانا' اچھا خدا حافظ۔ میں خوش خوش گھر آ گئی۔ اس کا جہاز روانہ ہو گیا' لوگ سمجھے کہ معمول کی پرواز پر ہے میں نے بھی کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ ڈاکٹر پیبلس نے فون پر اطلاع دی کہ اسے کہیں جانا ہے۔ لہٰذا سپر پر ہم تینوں ہی رہ گئے۔ ناگہاں لوریٹا برڈ نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔ ''وہ گیا۔''

''کیا؟'' ایلس نے چونک کر کہا۔

''بچے کہہ رہے تھے کہ وہ اپنا خیمہ اکھاڑ رہا تھا۔

تمھیں بتائے بغیر ہی چلا گیا؟''

''غالباً؟ وہ رات کو مجھ سے فون پر بات کرے گا۔'' ایلس نے پھیکی سی ہنسی ہنس کے جواب میں کہا۔

مسز پیبلس نے مجھ سے پوچھا۔ ''ایڈی' تم جب پیغام لے کر گئی تھی تو اس نے تمھیں کچھ نہیں بتایا تھا؟''

''بتایا تھا۔''

''پھر تم نے ہمیں کیوں نہیں بتایا؟''

سب کی نظریں میری جانب اٹھ گئیں۔ ''اس نے بتایا تھا کہ کہاں جا رہا ہے۔''

''بے فیلڈ۔'' میں نے بغیر ارادہ یہ غلط بات کہہ دی۔

ایلس نے پوچھا ''بے فیلڈ کتنی دور ہے؟''

''یہی کوئی تیس پینتیس میل۔'' مسز پیبلس نے جواب دیا۔

''یہ جگہ بہت دور تو نہیں ہے۔ جھیل بھی وہیں ہے ناں؟''

آپ لوگ سوچیں گے کہ مجھے شرم آنی چاہئے کہ میں نے جان بوجھ کر اسے غلط راستے پر لگا دیا۔ دراصل میں نے یہ اس لئے کہا کہ کرس کو اپنی منزل پر پہنچنے کیلئے کچھ وقت مل جائے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے اس کیلئے اور خود اپنے لئے بھی جھوٹ بولا۔ ایلس نے مجھ پر سے نظریں نہیں ہٹائیں۔ اسے شک تھا کہ میں نے غلط بیانی کی ہے۔

''اس نے تمہیں کب بتایا تھا؟''

''کچھ دیر پہلے۔''

''جب تم جہاز پر گئی تھیں؟''

''ہاں۔''

''تم وہاں کچھ دیر ٹھہری بھی ہوگی۔ کچھ باتیں بھی کی ہوں گی۔''

''میں ایک کیک لے گئی تھی۔'' میں نے سوچا کہ تھوڑا سا سچ بھی بول دوں تا کہ مزید کچھ اور نہ بتانا پڑے۔

''ہمارے ہاں کیک تو نہیں تھا۔'' مسز پیبلس نے تلخی سے کہا۔

''میں نے بنایا تھا۔''

''تم نے دوستی کا اظہار اچھا کیا تھا۔'' ایلس کے لہجے کا طنز صاف محسوس ہو رہا تھا۔

''تم نے اجازت لی تھی؟'' لوریٹا برڈ نے سوال کیا۔ ''کون جانے یہ لڑکیاں اور کیا گل کھلائیں۔''

مسز پیبلس غصے سے بولیں۔ ''ایڈی' مجھے نہیں پتا کہ تم کرس کے اتنے قریب ہو۔''

میں کیا جواب دیتی' خاموش رہی۔

''مجھے بالکل حیرت نہیں ہے۔'' ایلس زور سے بولی۔ ''میں اسے دیکھتے ہی اس کی نظروں سے پہچان گئی تھی۔ ہمیں ایسی لڑکیوں سے اسپتال میں اکثر واسطہ پڑتا ہے۔'' اس نے میری طرف غضب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ بچے جنتی ہیں۔ ان کی بیماریوں کی وجہ سے ہم انہیں علیحدہ وارڈ میں رکھتے ہیں۔ چودہ پندرہ برس کی یہ آبرو باختہ لڑکیاں۔ اس کے بھی بچہ ہو تو کیا معلوم۔''

''یہاں ایک فاحشہ عورت رہتی تھی۔ جس کے بچے کی آنکھوں سے پیپ بہتی رہتی تھی۔'' لوریٹا برڈ نے گفتگو میں اپنا حصہ ڈالا۔

''ایک منٹ۔'' مسز پیبلس نے غصے سے کہا۔ ''ایڈی! یہ سب کیا ہے۔ تمہارا اور مسٹر کرس کا کیا قصہ ہے، کیا تم اس سے بہت بے تکلف تھیں؟''

''ہاں۔'' مجھے اس کے ساتھ بستر میں لیٹنے اور چوما چاٹی کرنے کا خیال آیا۔ کیا یہ بے تکلفی نہیں تھی؟ میں کبھی اس سے انکار نہیں کروں گی۔ سب کو ایک دم چپ لگ گئی۔ لوریٹا برڈ کو بھی جیسے سانپ سونگھ گیا۔

''حیرت ہے۔'' مسز پیپلس نے کہا۔ اس نے پہلی بار ایسی حرکت کی۔ وہ ایلس کیلنگ سے مخاطب تھی۔ ایلس مجھے بدستور گھور رہی تھی۔

''اوباش کتیا۔'' یہ کہتے کہتے اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ ''آوارہ کتیا۔ میں نے تجھے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔ مرد تجھ جیسی لڑکیوں سے نفرت کرتے ہیں۔ اس نے تجھے استعمال کیا اور چلا گیا۔ تجھ جیسی لڑکیاں لوگوں کی نجاست سمیٹنے کیلئے ہوتی ہیں' غلیظ موری کا کیڑا۔''

''تم پریشان کیوں ہوتی ہو۔'' لوریٹا برڈ نے کہا۔ وہ مجھے ذلیل ہوتا دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

''کون مرد ایسا موقع چھوڑتا ہے۔''

اس نے مجھ پر ایک اور وار کیا۔

''ایڈی! مجھے حیرت ہے۔ میرا خیال تھا کہ تمھارے ماں باپ تم پر نظر رکھتے ہوں گے۔ تم بچہ تو پیدا کرنا نہیں چاہتی۔'' مسز پیپلس جو منہ میں آیا کہے جا رہی تھی۔ میں شرم سے گڑی جا رہی تھی۔ مجھے اپنے اوپر قابو نہیں رہا۔ میں نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

مسز پیپلس نے میرا بازو پکڑ کر ہلایا۔ ''چپ ہو جاؤ۔ ہسٹریا کے مریض کی طرح چیخو چلاؤ مت۔ رونا دھونا بند کرو۔ میری بات غور سے سنو، تم بے تکلفی کسے سمجھتی ہو۔ مجھے بتاؤ تمھارے نزدیک بے تکلف ہونے کا کیا مطلب ہے؟''

''بوس و کنار۔'' میں نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

''چلو۔ اب چپ ہو جاؤ۔ تم غلط سمجھی۔ بے تکلفی بوسوں سے بہت آگے کی چیز ہے۔''

''یہ چیخ چلا کر خود کو معصوم ثابت کرنا چاہ رہی ہے۔''

ایلس نے کہا۔ ''یہ بے وقوف نہیں ہے۔ اسے اندازہ ہو گیا ہے کہ بات بگڑ رہی ہے۔''

''مجھے اس پر بھروسا ہے۔'' مسز پیپلس نے کہا۔

''حقیقت جاننے کا ایک اور بھی طریقہ ہے۔ آخر تو میں نرس ہوں۔'' ایلس نے کہا۔

''نہیں' اس کی ضرورت نہیں۔ ایڈی تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ یہ چیخنا چلانا بند کر دو، کیا گند مچا رکھی ہے۔'' مسز پیپلس نے کہا۔ میں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کی اور آخر سسکیاں بھرتی ہوئی بستر پر جا پڑی۔

مسز پیپلس نے میرے کمرے کے دروازے پر کھڑے کھڑے کہا ''وہ... بڑھ بھی گئی۔ تمھیں کِرس کے اتنے قریب جانا نہیں چاہئے تھا۔ یہ سب کچھ اسی وجہ سے ہوا ہے اٹھو۔ ٹھنڈے پانی کے چھپکے منہ پر مارو۔ اب اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہو گی۔''

مسز پیپلس کا میرے ساتھ رویہ اب دوستانہ نہیں رہا تھا۔ وہ کبھی بھی مجھ سے فرینڈلی تو نہیں رہی

تھیں۔ اب فرق یہ ہو گیا کہ وہ مجھ پر ہر وقت نظر رکھنے لگیں۔ کسی حد تک میرا معاملہ اب ان کے اعصاب پر سوار ہو گیا تھا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے ایک بھیانک خواب کی طرح سارے قصے کو اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اب میں نے خط کے انتظار پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر دی۔ ڈاک اتوار کے علاوہ ہر دن دوپہر ڈیڑھ دو کے درمیان آتی تھی۔ یہ وقت بہت مناسب تھا اس لئے اس وقت مسز پیپلس سو رہی ہوتی تھیں۔ میں اس وقت تک باورچی خانے کی صفائی وغیرہ سے فارغ ہو جاتی تھی اور باہر میل بکس کے قریب گھاس پر بیٹھ کر خط کا انتظار کیا کرتی۔ میں انتظار کی لذت سے سرشار تھی۔ ایلس کیلنگ کی تکلیف، اس کی دل آزار گفتگو، مسز پیپلس کی سرد مہری اور یہ خوف کہ وہ ڈاکٹر پیپلس سے ساری بات کہہ دیں گی اور لوریٹا کی چبھتی ہوئی نظریں، غرض میں سب کچھ فراموش کر چکی تھی۔ میں ڈاکیے کو دیکھ کر مسکراتی اور اس وقت بھی مسکراتی رہتی جب وہ ڈاک میرے حوالے کرتا جب کہ اس میں وہ خط نہیں ہوتا تھا جس کا مجھے انتظار تھا۔ پوسٹ مین ایک شرمیلا مہذب نوجوان تھا۔ وہ مجھ سے خاصا مانوس ہو گیا تھا۔ وہ کہتا تھا۔ ''تمھاری مسکراہٹ کا میں سارا دن انتظار کرتا ہوں۔''

بہت دنوں تک مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ وہ خط جس کا مجھے بے چینی سے انتظار ہے کبھی نہیں آئے گا۔ مجھے اس کے آنے کا اتنا یقین تھا جتنا صبح سورج نکلنے کا۔ ایک دن جب میں پانی کا بل ہاتھ میں لئے میدان (جس میں اس کا خیمہ نصب تھا) کی طرف نظریں کئے گھر جا رہی تھی تو میرے دل نے ایک دم مجھ سے کہا۔ ''کوئی خط نہیں آئے گا۔'' مگر جب کرس کا چہرہ میرے سامنا آتا تو مجھے یقین ہو جاتا تھا کہ خط ضرور آئے گا۔ لیکن جب میں حقیقت سے آنکھیں چار کرتی تو یہی صحیح معلوم ہوتا کہ خط نہیں آئے گا۔

میں پوسٹ مین سے ملتی رہی۔ اس کی خاطر مسکراتی بھی رہی، لیکن میرے دل کا بوجھ ہلکا نہیں ہو پا رہا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے میرے دل کی جگہ سیسے کا ڈلا رکھا ہو۔ میں پوسٹ مین کو دیکھ کر صرف اس لئے مسکراتی تھی کہ مجھے معلوم تھا کہ میری مسکراہٹ کی اس کیلئے کیا اہمیت ہے۔ اس کی زندگی پہلے ہی بہت کٹھن تھی اور آنے والی سردیاں اس کیلئے بڑا چیلنج تھیں۔ اس لئے یہ چھوٹی سے خوشی میں اس سے چھیننا نہیں چاہتی تھی۔

ایک دن میں نے سوچا کہ دنیا میں ایسی عورتیں بھی ہوتی ہیں جو ساری ساری عمر کسی کا انتظار کرتی ہیں۔ کیا میں بھی اسی طرح سالہا سال انتظار کروں گی' میرے بالوں میں چاندنی چمکنے لگے گی۔ پھر میں نے عزم کیا کہ میں ہرگز اس عذاب میں مبتلا نہیں ہونگی' لہٰذا میں نے پوسٹ مین سے ملنا چھوڑ دیا۔ آخر ایسی عورتیں بھی تو ہوتی ہیں جو زندگی کی رنگینیوں میں مصروف رہتی ہیں اور انتظار کا روگ نہیں پالتیں۔

مجھے حیرت ہوئی کہ ایک دن پوسٹ مین نے پیپلس کے گھر فون کر کے مجھ سے کہا کہ وہ میری کمی محسوس کرتا ہے اور کیا میں گارڈرچ آجاؤں گی، جہاں ایک مشہور زمانہ فلم چل رہی ہے۔ میں نے ہامی بھر لی اور پھر اس کے ساتھ اکثر باہر آتی جاتی رہی۔ ایک دن اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''مجھ سے شادی

کروگی؟'' میں نے سرگوشی میں ہاں کردی۔ ہماری منگنی ہوگئی اور پھر ایک دن شادی بھی۔ وہ ہمارے بچوں کو اکثر یہ سناتا کہ میں کس طرح ہر روز اس کے انتظار میں میل باکس کے پاس بیٹھا کرتی تھی۔ یہ سن کر میں بھی ہنس دیتی' اگر وہ یہ کہانی سنا کر خوش ہوتا ہے تو مجھے بھی اسے خوش کرنے میں کوئی عار نہیں۔

❁❁❁

ہمارا عہد تیز گامیوں اور برق رفتار تبدیلیوں کا عہد ہے۔ دنیا کے مہذب اور غیر مہذب سب ہی معاشروں میں ایک غیر معمولی انقلابی کیفیت طاری ہے۔ ماضی اور حال پر جدید ذہن کا تنقیدی رویہ کہیں تاسف اور کہیں تشدد آمیز رجائیت کے ساتھ بلند ہوتا نظر آ رہا ہے۔ جدید ذہن مستقبل سے یا غیر انسانی قوتوں سے خوف زدہ ہونے کے بجائے آئندہ پر فتح پانے کی لگن میں اپنی رفتار بڑھاتا چلا جا رہا ہے۔ جب کہ ذاتی سہولتوں کی حصول یابی اور خواہشوں کی روز افزوں یلغار نے ہمارے ادیب و شاعر اور فنون لطیفہ سے جڑے افراد کو محض بے بس ہی نہیں کیا، بلکہ بصارت اور بصیرت سے بھی جدا کر دیا ہے۔ گویا ہوس زر اور طلب شہرت کی دو دھاری تلوار نے پورے ادبی سماج اور ہمارے معاشرے کے سر کو تن سے کاٹ کر الگ پھینک دیا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب نیکی اور بدی، سچ اور جھوٹ، دن اور رات میں امتیاز کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے، کلچر، تہذیب و تمدن کے تمام روایتی رنگ ناپید ہو رہے ہیں، منافقانہ رویوں، خود غرضی اور ذاتی نمود و نمائش کا الاؤ ہر طرف دہک رہا ہے، ہمیں اپنے اجتماعی تخلیقی وجود کو بچانے کی فکر کرنی چاہیے۔

(احسن سلیم)

مفرور

(سندھی ادب سے)

تخلیق کار: حلیم بروہی ترجمہ: ننگر چنا

میں نے روپوشوں کی لسٹ پر نظر دوڑائی۔ دوسو سے بھی زیادہ نام تھے لسٹ میں، میرا ٹمپریچر لُوز ہونے لگا۔ جس ضلع میں دوسو روپوش ہوں اس ضلع کے پولیس افسران رشوت خور تھے یا پھر نا اہل۔ میں اٹھا اور لسٹ لے کر کانفرنس روم کی طرف روانہ ہوا۔ میری رفتار تیز تھی اس لیے اردلی بھاگتا ہوا میرے آگے آگے چلا۔

اردلی نے سرعت کے ساتھ کانفرنس روم کا دروازہ کھولا اور میں نے اندر داخل ہوتے ہی تھانے داروں پر ایک درشت نظر دوڑائی، جو اس وقت کرسیوں سے اچھل کر کھڑے ہوگئے تھے۔ میں نے فہرست ٹیبل پر رکھی اور اس پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، دیگر باتوں پر میں کسی اور میٹنگ میں بات کروں گا۔ اس لسٹ میں میرے پاس ان مفروروں کے نام ہیں جو ضلع حیدر آباد کے مختلف تھانوں کو مقدمات میں مطلوب ہیں۔ اس لسٹ میں دوسو نام ہیں دوسو نام کم نہیں ہیں، بہت زیادہ ہیں، جس ضلع میں دوسو اَبسکانڈر ہوں، اس ضلع کے پولیس افسران رشوت خور ہوں گے یا پھر نا اہل، اگر آپ رشوت خور نہیں ہیں اور نا اہل بھی نہیں، تو پھر یہ دوسو مفرور کیوں ابھی تک اس لسٹ میں موجود ہیں؟ یہ اَبسکانڈر کی لسٹ ہر تھانے میں موجود ہوتی ہے، ہر تھانے پر ان مفروروں کی تصاویر ہوتی ہیں۔ میں ڈائریکٹ ایس پی بھرتی نہیں ہوا ہوں۔ میں تھانے دار سے ترقی کر کے ایس پی بنا ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ تھانے داروں کو خبر ہوتی ہے کہ ان کے علاقے میں کون کون روپوش ہیں اور کیا کرتے ہیں؟ میں کسی کی بھی وضاحت سننے کے لئے تیار نہیں ہوں، میں خود بھی رشوت نہیں لیتا۔

مجھے صاف اور کلین ایڈمنسٹریشن چاہئے۔ مفروروں کی پشت پناہی بند کرو، اس لسٹ میں بھی جو لوگ ہیں، وہ ایک ماہ کے اندر گرفتار ہونے چاہئیں۔ اس لسٹ کی طوالت آپ کی اور میری افسری پر داغ ہے، آئندہ ماہ جو میٹنگ ہوگی، اس میں بھی اس لسٹ کو دیکھوں گا، کوئی بھی مفرور آزاد نہیں رہنا چاہئے، ہر ایک گرفتار ہونا چاہئے، آئندہ ماہ کی میٹنگ سے پہلے ہی یہ لسٹ ختم ہونی چاہئے۔ کوتاہی

کرنے پر میں آپ کو رورٹ بھی کروں گا اور سسپنڈ بھی، آج میں کسی اور کام کے متعلق بات نہیں کرتا، آئندہ ماہ سے پہلے یہ اَبسکانڈرز لسٹ ختم ہونی چاہئے۔

میں لسٹ ہاتھ میں اٹھا کر اپنے دفتر لوٹ آیا۔ اب یہ ٹمپریچر آہستہ آہستہ بحال ہونے لگا۔ میں نے اپنے آپ کو ٹھنڈا کرنے کیلئے کچھ نہ کچھ کرنے کے بہانے لسٹ پر یوں ہی نظر دوڑانی شروع کی۔ دوصد ناموں کی لسٹ میں سب سے اوپر، اول نمبر پر تھانہ ٹنڈو جام کے بیس سال سے مفرور اللہ دتہ کا نام تحریر تھا۔ اللہ دتہ ولد رحیم دتہ کاٹھیر، بیس برسوں سے مفرور، تھانہ ٹنڈ جام کو ایف آئی آر نمبر 322/1930 اور 401/1930 میں مطلوب تھا، یہ وہی اللہ دتہ تھا، جس کا نام بیس برسوں کے بعد بھی اَبسکانڈرز لسٹ میں موجود تھا۔

میں بیس برس قبل تھانہ ٹنڈ و جام میں بطور تھانہ دار تعینات تھا، جہاں کچھ لوگوں نے اللہ دتہ کاٹھیر کو پکڑ کر ہمارے حوالے کیا اور مقدمہ درج کرایا کہ اللہ دتہ اور اس کا ایک ساتھی کسی گھر میں سینڈھ لگا رہے تھے کہ مکین جاگ گئے، اس کا ساتھی بھاگ گیا، لیکن اللہ دتہ پکڑا گیا۔ یہ مقدمہ میں نے ایف آئی آر بک میں درج کیا اور پھر اللہ دتہ کاٹھیر پر محنت کرنے لگا کہ اپنے ساتھی کا نام بتائے۔ پہلے تو میں نے اللہ دتہ کے ساتھ یونہی گپ شپ لڑائی، لیکن اللہ دتہ نے نام نہیں بتایا۔ پھر میں نے اللہ دتہ کو یقین دلایا کہ میں اس کے ساتھی کو گرفتار نہیں کروں گا۔ باوجود اس کے اللہ دتہ نے منہ نہیں کھولا، میں نے اللہ دتہ کے ساتھ وعدہ کیا کہ میں مقدمے سے اس کی جان چھڑا لوں گا، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا، پھر میں نے چھترول سے کام لیا۔ پہلے اس پر لاتوں، مکوں اور ٹھڈوں کی بوچھاڑ کردی، وہ یہ بھی برداشت کرگیا، اس کے بعد بید لاٹھی بھی برداشت کرگیا، لیکن اپنے ساتھی کا نام نہ بتانے کی ضد پر اڑا رہا۔ میں بھی ضدی تھا اس لئے لگاتار تین دن تک صبح شام اس کی پٹائی کرتا رہا۔ اس نے اپنے ساتھی کا نام تو نہیں بتایا بلکہ اچانک خود ہی چل بسا۔ میری پٹائی مشہور تھی لیکن یہ پہلی مرتبہ تھا کہ کوئی قیدی تشدد کے باعث تھانے کے لاک اپ میں مرگیا تھا۔ لاش پورا ایک دن لاک اپ میں پڑی رہی اور میں تھانے میں بیٹھا رہا۔ شام آئی، رات ہوئی اور پھر صبح ہوئی لیکن اس درمیان رات کی تاریکی میں، میں اور میرے عملے نے اللہ دتہ کی لاش تھانے کے عقب میں گڑھا کھود کر دفن کردی تھی۔

اگلے دن صبح سویرے میرا ہیڈ کانسٹیبل ایک دو سنتری لے کر سامنے والے ہوٹل میں جا بیٹھا اور چائے پیتے ہوئے ایک شوشہ چھوڑ آیا کہ آج شام ملزم اللہ دتہ کو حیدر آباد لے جائیں گے، جہاں اگلے دن صبح اسے عدالت میں پیش کرنا ہے۔ بیس برس قبل ٹنڈ و جام چھوٹا سا گاؤں تھا، جس میں ایک دو چھوٹے ہوٹل تھے۔ وہ ہیڈ کانسٹیبل والا شوشہ کافی تھا اور شام تک یہ بات عام ہوگئی کہ آج اللہ دتہ کو حیدر آباد لے کر جائیں گے۔

شام کے وقت سورج غروب ہونے سے آدھا گھنٹہ پہلے چار پانچ سپاہی وردی میں گھوڑوں پر سوار ہوئے اور ان کے درمیان ایک گھوڑے پر ایک سپاہی اجرک لپیٹے ہوئے اپنا چہرہ اور وردی یوں چھپا کر بیٹھ گیا کہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ اللہ دتہ کو پولیس حیدر آباد لے جارہی ہے۔ گھڑ سوار پولیس

والے جوں ہی تھانے کے احاطے سے نکل کر سڑک پر آئے، تب سامنے والے ہوٹل میں موجود ہمارے ایک سپاہی نے باتوں باتوں میں گھڑ سواروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ پولیس اللہ دتہ کو کل عدالت میں پیش کرنے کیلئے لے جارہی ہے۔

اجرک والے سپاہی نے تھوڑی دور جا کر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور اسے بھگانا شروع کردیا اور دیگر سواروں سے آگے نکل گیا دیگر گھڑ سوار سپاہیوں نے اللہ دتہ بھاگ رہا ہے، دوڑو، پکڑو کہہ کر اپنے گھوڑے اس کے تعاقب میں دوڑا دیئے، ہوٹل میں بیٹھے لوگوں نے بھی یہی جانا کہ اللہ دتہ فرار ہوگیا ہے وہ بھی اٹھ کر لوگوں کو پکارنے لگے کہ اللہ دتہ کو پکڑنے میں پولیس کی مدد کریں۔

اجرک والے سپاہی نے درختوں کے جھنڈ کے عقب میں جا کر اجرک اتاری اور گھوڑے کی زین میں چھپا دی اور خود بھی اللہ دتہ کی تلاش میں شامل ہوگیا۔ تاریکی چھا جانے پر سپاہی تھانے لوٹ آئے اور میں نے ایف آئی آر بک میں درج کردیا کہ ملزم اللہ دتہ کاٹھیر پولیس کی حراست سے فرار ہوگیا۔ یوں اللہ دتہ کا نام مفروروں کی لسٹ میں آگیا اور پھر سال بہ سال جو نئی لسٹ بنتی اس میں اس کا نام آہستہ آہستہ اوپر ہوتا چلا گیا۔

یہ وہی اللہ دتہ کاٹھیر تھا جس کا نام میرے سامنے پڑی لسٹ میں پہلے نمبر پر تھا۔ میں نے سرخ سیاہی والے قلم سے لسٹ میں تحریر اللہ دتہ کے نام کو کاٹ کر اس پر اپنے دستخط کئے اور پھر کسی بھی دوسری میٹنگ میں، میں نے روپوش لسٹ کا نام بھی نہیں لیا۔ میں کیوں کر اعتبار کرسکتا تھا کہ اس فراری لسٹ میں سے کوئی ایک بھی روپوش زندہ ہوگا۔

❁❁❁

جے کرشنا مورتی کے جیون کتھا کا ایک باب

مصنفہ: پوپل جیا کار　　ترجمہ: ابوالفرح ہمایوں

وہی خوش نصیب ہے جس کے پاس کچھ نہیں ہے

1948 اور 1960 کے دوران کرشنا جی ہر ایک کے لئے قابل رسائی تھے' چنانچہ لوگ جوق در جوق ان کے پاس آتے رہے۔ چہل قدمی کے دوران' ذاتی ملاقاتوں اور خطوط کے ذریعے ہر شخص ان سے فیض یاب ہوتا رہا۔ انہوں نے مندرجہ ذیل خطوط اپنے ایک نوجوان مرید کو لکھے جس کا ذہن اور جسم بیمار تھا۔ یہ خطوط جون 1948 اور مارچ 1960 کے عرصے پر محیط ہیں۔ انھوں نے اپنے مرید کے زخموں پر پھایا رکھنے کی بھرپور کوشش کی اور شاید کامیاب بھی رہے۔

اپنے اندر ملائمت اور نرمی پیدا کرو۔ اصل طاقت سخت رویے اور تلخ کلامی میں نہیں، بلکہ لچک دار رویے میں پوشیدہ ہے۔ نرم درخت طوفانی ہواؤں میں بھی ثابت رہتے ہیں۔ ذہنی حالت کو اعتدال پر رکھو اور ارادے مضبوط رکھو۔ زندگی ایک عجیب کھیل ہے۔ اس میں ہزاروں مقامات ایسے آتے ہیں جن کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں جاتا۔ گہرا گھاؤ معمولی طریقے سے مندمل نہیں ہوتا۔ انسان کو چاہئے کہ فراخ دلی اور شیریں سخنی اختیار کرے۔ زندگی تلوار کی دھار کی طرح ہے' اس پر احتیاط سے اور ذہن کو بیدار رکھ کر چلنا ہوگا۔

زندگی میں قدم قدم پر خزانے بھرے ہوئے ہیں لیکن ہم ان کو حاصل کرنے کے طریقہ کار سے نابلد ہیں۔ ہم اندر سے بزدل ہیں اور جب یہ خوشیاں اور خزانے ہمارے قدموں میں لوٹنے لگتے ہیں تو ہم انہیں ٹھکرا دیتے ہیں۔ یعنی اپنی لاعلمی کی وجہ سے اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ محبت کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ یہ اس وقت کارآمد ہے، جب پوری طرح انقلاب لے آئے۔ چنانچہ بہت کم لوگ ہیں جو محبت کی صحیح قدر جانتے ہیں۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ محبت ہم اپنی مرضی کے مطابق حاصل کریں۔ ہمارا ذہن کاروباری انداز کا حامل ہے اور محبت کوئی بکاؤ چیز نہیں ہے' یہ ایک ایسا لطیف جذبہ

ہے جو انسان کو ہر غم سے بیگانہ کر دیتا ہے۔ ہم کنویں میں سے صرف ایک ڈول حاصل کرنا جانتے ہیں لیکن محبت کا سمندر کس قدر عمیق' وسیع و عریض ہے یہ نہیں جانتے۔

دنیا ہمارے لئے جنت بن سکتی ہے۔ اس دنیا میں خوبصورتی کے لازوال خزانے پوشیدہ ہیں، مگر ہم یہ خوشیاں کشید کرنے کے بجائے اپنے اپنے غم اور دکھ وآلام کو لے کر بیٹھ گئے ہیں اور پھر چاہتے ہیں کہ کوئی دوسرا ہمارے دکھ درد کا مداوا کرے۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ محبت ایک عظیم جذبہ ہے اور اس بات میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں۔ محبت کا یہ خزانہ ہر ایک کے دل میں اس طرح موجزن ہے کہ وہ دوسروں پر جتنا بھی لٹائے' خزانے میں کمی نہیں آئے گی۔ محبت ایک بہتا ہوا دریا ہے جو ہر قسم کی گندگی اور برگ وبار کو اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے۔ محبت ہمیشہ زندہ رہتی ہے اور تمام کدورتوں کو صاف کر دیتی ہے۔ محبت کی پاکیزگی کا کوئی اور چیز مقابلہ نہیں کر سکتی۔

درختوں کا قد وقامت اور ان کی مضبوطی انسان کے ظرف کی نشانیاں ہیں۔ ان کی جڑیں زمین میں گہری پیوست ہیں اور ان کی بلندی آسمان کو چھو رہی ہے۔ ہماری جڑیں بھی زمین سے ہی وابستہ ہیں اور ہمیں اسی سے ہمیشہ جڑے رہنا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بلند پروازی کی کوشش بھی کرتے رہنا ہے۔ ایسے ہی افراد تخلیق اور مسرت سے بھرپور زندگی گزارتے ہیں۔ فراخ دلی اور کشادہ دلی ایک اعلیٰ وصف ہے۔ ماضی کو بھی یاد کرتے رہو مگر اس میں گم ہو کر مت رہ جاؤ۔ گزشتہ سالوں میں جو کچھ تم پر گزری اچھی یا بری' یہ سب تمھاری تقدیر کا حصہ ہیں اور زندگی کی خوبصورتی بھی ان ہی یادوں سے وابستہ ہے۔ تمھاری قسمت میں ہر بات لکھ دی گئی ہے۔

اپنے خیالات اور احساسات کو اپنے قابو میں رکھو اور ہوشیاری سے کام کرو۔ ہوش اور جوش کا امتزاج ہی عقل مندی ہے۔ ایک دریا کی راہ میں اگر کوئی رکاوٹ نہ آئے تو وہ کہیں بھی کھڑا نہ ہوگا۔ اپنی روانی اور تیزی کی وجہ سے رکاوٹوں کو ہٹاتا چلا جائے گا۔ ذہانت کیا ہے؟ اپنی جدوجہد اور عقل مندی سے کسی راز کو پالینا اور اپنی غلطیوں سے سبق حاصل کرنا۔ جس طرح دریا ہمیشہ حرکت میں رہتا ہے اسی طرح اپنے آپ کو حرکت میں رکھو اور تیزی سے آگے بڑھو۔ انقلاب ہر پہلو سے آنا چاہئے' خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی پیچھے کی طرف مڑ کر مت دیکھو۔

اپنے آپ سے ایماندار رہو' ہر چیز درست سمت میں چلنے لگے گی یہ بات بھی ذہن میں رکھو کہ ہر وہ بات جو تم چاہتے ہو ضروری نہیں کہ پوری بھی ہو جائے۔ ہم محبت کے بارے میں کیا جانتے ہیں اور کیا اس کی طاقت کا اندازہ ہے؟ یہ لفظ تو ہم بڑی آسانی سے بول جاتے ہیں لیکن اس کی گہرائی اور گیرائی کا اندازہ کرنا مشکل ہے' محبت کبھی فنا ہو ہی نہیں سکتی۔

رشتہ داری اور ناتا داری نبھانا بھی ایک فن ہے' لیکن ہم اس کی اصلیت سے واقف نہیں۔ یہ جذبہ خدا کا بخشا ہوا ایک عطیہ ہے اور اس سے انکار کرنا کفر ہے۔ اگر ہم ذرا توجہ سے دیکھیں تو یہ کرشمہ کہلائے گا۔ زندگی میں بے شمار مسائل ہیں لیکن ہمیں ان سب کو درگزر کر کے رشتہ داری کو مضبوط بنانا ہوگا۔ نقصانات اور فوائد یہ سب کچھ ایک خوبصورتی اور حسن ہے' اگر کسی وقت کوئی ناگوار جذبہ دل میں

امنڈ آئے تو پھر بھی دوستی اور رشتہ داری کو قائم رکھنا ہے۔ قطع تعلق کے بارے میں کبھی سوچنا بھی نہیں چاہئے۔

اب ہم مزید آگے بڑھتے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ حال کو چھوڑ کر مستقبل کے بارے میں سوچیں۔ اپنے عزم پر ثابت قدم رہو اور تم دیکھو گے کہ ہر کام خود بخود آگے بڑھتا چلا جائے گا۔ اپنے خیالات میں نئی نئی جوت جگاؤ اور ان کی آبیاری کرتے رہو' جلد ہی پھل تمہاری جھولی میں آن گرے گا۔ مشکل یہ ہے کہ ہم صرف اوپر کی چھوٹی موٹی چیزوں کی کاشت کرتے ہیں اور ان پر توجہ دیتے ہیں لیکن اس کیڑے کو مارنے کی کوشش نہیں کرتے جو سیب کے اندر پرورش پا رہا ہے۔

مرد اور عورت دونوں کیلئے ایک دوسرے کو بھول جانا آسان نہیں ہے۔ وہ نہ ساتھ رہ سکتے ہیں اور نہ ایک دوسرے کے لئے قربانی دے سکتے ہیں۔ زندگی کا سب سے مشکل کام تعلقات کو نبھانا ہے۔ ان کاموں کے لئے ایک دوستانہ رویے کی ضرورت ہے اور تب ہی ہم اس کی شیرینی سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ایسا ماحول بہت کم لوگوں کو میسر آتا ہے' چنانچہ وہ لوگ جسمانی یا نفسیاتی طور پر ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ تم ان تمام مشکلات سے کس طرح مقابلہ کر رہے ہو۔ ایسی حالت میں تم کو تو موت آ جانی چاہئے تھی۔ مگر یہ تمہاری ہمت ہے جس نے تم کو اب تک زندہ رکھا ہوا ہے۔ اب جب کہ تم اندر سے زندہ ہو اور مقابلے کی صلاحیت رکھتے ہو تو ضرور آئندہ بھی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے رہو گے۔

متبادل راستے جلد مٹ جاتے ہیں' ہمیشہ کم لیکن اصولی بات پر قائم رہنا چاہئے۔ اقتدار کی خواہش اور دولت کی خواہش تو ہر ایک کو ہوتی ہے لیکن ایک وقت آتا ہے جب یہ سب دھوکا دے جاتے ہیں۔ انکساری اور عاجزی کو اپنا شیوہ بناؤ کہ یہیں چیزیں زندہ رہتی ہیں اور انسان کو انسان بناتی ہیں۔

اپنے اندر کیا تبدیلی آ رہی ہے' اس بات کا ادراک بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔ صدمہ' اختلافات اور منفی سوچ کیوں کر جنم لے رہی ہے' اس کے بارے میں کبھی کبھی غور و فکر بھی کرنی چاہئے اور اگر ایسا کچھ ہے تو ان سے نجات حاصل کر لینا چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ تم ایسا کر سکتے ہو۔ اشتعال اور جذبات میں آئے بغیر اس طرف بھی توجہ دینی چاہئے۔ تمہاری زندگی میں ایک حقیقی انقلاب آ رہا ہے لہٰذا تمہیں اپنے خیالات' جوش و جذبات سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے مگر ان پر کوئی پابندی مت لگاؤ۔ جو ہو رہا ہے ہونے دو' گرد خود بخود بیٹھ جائے گی لیکن ہر بات پر نگاہ بھی رکھو۔

تمہاری ساری خواہشات ایک طرف' لیکن یہ حقیقت ہے کہ دنیا ایک خوبصورت جگہ ہے۔ عبادت و ریاضت' محبت' نفرت' ڈر اور خوف ہر چیز وافر مقدار میں مل سکتی ہے۔ ہم خود اس بات سے بے خبر ہیں کہ ہم امیر ہیں یا غریب' ہمیں چاہئے کہ اپنی تلاش خود کریں اور خوب دور تک نکل جائیں۔ ہم ابھی تک اوپر کی سطح پر ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوشی سے نہال ہوئے جا رہے ہیں۔ ہم محبت کے سمندر میں گم ہونا نہیں چاہتے اور اگر کچھ کوشش بھی کرتے ہیں تو ڈر' خوف اور انتشار کا شکار ہو جاتے ہیں۔

میں سوچ رہا تھا کہ معصومیت بھی کتنی بڑی نعمت ہے۔ لیکن بالآخر اس نتیجے پر پہنچا کہ تجربات کا کوئی مول نہیں' خواہ وہ تلخ ہی کیوں نہ ہوں۔ زندگی تجربات کا ہی نام ہے مگر ذہن کے مطالبات کچھ اور ہوتے ہیں۔ ہر تجربے کے بعد دماغ اس کو مٹا کر دوبارہ معصوم بن سکتا ہے۔ یہ ایک طرح سے ضروری بھی ہے ورنہ دماغ تازہ دم کیسے رہے گا۔ اس کو لچک دار اور نرم رکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے' بس کوئی سلیقہ ہونا چاہئے۔ لیکن خالی ہونے کے بجائے کچھ نہ کچھ تخلیقی سوچ جاری رکھے گا۔

نام و نمود اور فخر و غرور بھی ایک عجیب جذبہ ہے۔ ان کا حصول ہر جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اپنے پیشے میں' اپنی کامیابی میں' اپنے حسن و سیرت' خاندانی وقار اور علم و ذہانت میں۔ یہ سب باتیں ہمارے لئے باعث فخر ہیں اور ہمیں یہ بھی چاہئے کہ دوسرے بھی اس کا اعتراف کریں۔ ہمارا دماغ ہر وقت اسی کشمکش میں مبتلا رہتا ہے۔

پہاڑ تنہائی کا شکار ہیں' لیکن وہ نظارہ قابل دید ہوتا ہے جب موسلا دھار بارش ہو رہی ہوتی ہے او ر پانی جھیل یا چشمے کا روپ اختیار کر لیتا ہے۔ بارش کے بعد دھلی ہوئی زمین کی خوشبو کس قدر سوندھی ہوتی ہے اور اوپر سے مینڈکوں کا ٹرانا کانوں کو بھلا معلوم دیتا ہے۔ زمین دھل دھلا کر بالکل صاف ہو جاتی ہے اور پتوں کے گرد و غبار صاف ہو جاتے ہیں۔ دریا میں طغیانی آ جاتی ہے اور تیز رفتاری سے بہتے ہوئے پانی کا شور دل میں ایک جوت جگانے لگتا ہے۔ درختوں پر بہار آ جاتی ہے' اور ان کے سبز رنگ اور لہلہانے لگتے ہیں۔

زمین جو پہلے بنجر تھی' اب وہاں خس و خاشاک اگ آئے ہیں اور ان کے اندر ہزاروں کیڑے مکوڑے اپنی غذا تلاش کر رہے ہیں۔ سورج کی تمازت دھیمی پڑ گئی ہے اور زمین پر سبزہ بکھرا دکھائی دے رہا ہے۔ خوبصورتی اور فطرت کا حسن یہاں زوروں پر دکھائی دے رہا ہے۔ ہوا خوشگوار ہو گئی ہے اور انسان کی صحت اور تندرستی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

حیرت اور تعجب کا مقام ہے کہ لوگ اپنی حیثیت کو منوانا کس قدر اہم سمجھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ دنیا ان کو ایک عظیم شاعر' مصنف' دانشور یا اس قسم کا کوئی لاجواب ہیرو سمجھے۔ یہ جذبہ ان کی خودی کو تسکین دیتا ہے۔ اگرچہ یہ ایک معمولی سی بات ہے مگر ان کے نزدیک یہ نہایت اہم ہے۔ اگر کوئی واقعی حق دار ہے تو اس کی اہمیت کو تسلیم کرنا بھی اس کا حق ہے۔ لیکن پھر اس کے بعد؟ اس کی کوئی وجوہات ہو سکتی ہیں بعض لوگ خواہ مخواہ ہی اس خبط میں مبتلا رہتے ہیں۔ کامیابی یا ناکامی دونوں حقیقت ہیں۔ آغاز ہی سے اچھا نتیجہ نکلنے کی امید نہیں رکھنی چاہئے' اس کیلئے کافی محنت اور ہمت کی ضرورت ہے۔ محبت اس کام کو بہ آسانی مکمل کر سکتی ہے۔ اور یہی چیز بالکل سامنے کی ہے جس کو لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔

ہم اپنے اطراف میں اور اپنی ذات پر کتنی کم توجہ دیتے ہیں۔ جس کام میں کوئی فائدہ دکھائی دیتا ہے' صرف اسی میں ہاتھ ڈالتے ہیں۔ دوسروں کے مسائل سے ہمیں کوئی دلچسپی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم روز بروز کاہل اور سست ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر طرف ایک اندھی دوڑ مچی ہوئی ہے۔

ذرا دریاؤں کے حسین مناظر پر نظر ڈالو۔ جس ملک میں دریا نہیں ہیں وہ بڑا ہی بدنصیب ملک

ہے۔ساحل پر بیٹھ کر دریا کا نظارہ اٹھاؤ۔آس پاس بچے اچھل کود کر رہے ہیں‘ شور مچا رہے ہیں‘ کوئی گا رہا ہے اور کوئی بانسری بجا رہا ہے۔ پانی کس قدر صاف شفاف اور میٹھا ہے۔ یہ پانی پی کر جی چاہتا ہے کہ زندگی یہیں بسر ہو جائے۔ ہمارا دماغ بھی ایک بہتا ہوا دریا ہے۔اس میں طرح طرح کے پھول کھل رہے ہیں۔لیکن کبھی کبھی کسی جوہڑ کی طرح ایک جگہ ٹھہر بھی جاتا ہے۔ دماغ کو مستقل استعمال میں رکھو اور اس کے پانی کو مسلسل بہنے دو تاکہ دریا کی طرح وہ بھی ہر قسم کی غلاظت‘ گندگی اور بدصورتی کو بہا لے جائے۔

سوچ اور خیال اگرچہ خود ایک قسم کی جڑیں ہیں لیکن ان کی اصل جڑیں بہت دور اندر تک پھیلی ہوئی ہیں۔ردعمل کے طور پر مرجھی سکتی ہیں۔خیالات میں ابھرنے کی طاقت موجود ہے لہٰذا اس کو دبا کر رکھنا ضروری ہے۔اگر زیادہ سوچو گے اور اسے پھلنے پھولنے کا موقع دو گے تو اس کی جڑیں اور مضبوطی سے اندر تک پیوست ہوتی چلی جائیں گی۔ یہ بات غور کرنے کی ہے کہ دماغ کس طرح سوچتا ہے اور حقیقت پر ردعمل کس طرح ظاہر کرتا ہے۔

ذہن ہر دم صاف ستھرا ہونا چاہئے‘ یہ بے حد ضروری ہے۔ جب تک دماغ میں کوئی خوف یا ڈر سمایا رہے گا‘ تم فہم و فراست سے کام نہیں لے سکتے‘ اپنے مسائل کو حل کرنا سیکھو‘ گھبراہٹ اور کم ہمتی آگے بڑھنے کے راستے مسدود کر دیتی ہے۔ان باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔اب تمہارے لئے آگے بڑھنا آسان ہے۔مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ تم آغاز ہی میں کامیابی حاصل کر لو۔تھوڑا سا انتظار کرنا ہوگا اور تب تمہارا ذہن روشن ہوتا چلا جائے گا۔سچ کی تلاش میں کافی جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔

یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ایک انسان کس طرح مختلف میدانوں میں اپنے آپ کو منوا لیتا ہے‘ دوستی اور تعلقات‘ رسم و رواج‘ مذہب اور دیگر فنون یہ سب ایک ساتھ چلتے ہیں اور انسان ان سب کو بخوبی نبھاتا چلا جاتا ہے۔اگر آدمی کے پاس کتاب نہیں ہے‘ اس کا کوئی راہبر نہیں ہے‘ ایسا کوئی ہیرو نہیں ہے جس کے نقش قدم پر وہ چل سکے‘ تو اپنی تمام تر قابلیت اور ذہانت کے باوجود وہ اندھیرے ہی میں رہے گا۔اسے ایک بار پھر سے اپنے کام کا آغاز کرنا ہوگا ورنہ ایک دن وہ پاگل ہو جائے گا۔دنیا کو ساتھ ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے‘ جس میں آرٹ بھی ہے‘ موسیقی بھی اور سیاست بھی۔یہی خدا ہے‘ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اسی کے حکم سے ہو رہا ہے۔

ایک کسان کے پاس ایک بہت خوبصورت خرگوش تھا۔ایک دن اس کی بیوی نے کہا کہ مجھے یہ ذرا بھی پسند نہیں ہے۔کسان نے فوراً خرگوش کو مار ڈالا۔لیکن چند ہی لمحے بعد وہ زندہ ہو کر ان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔اس کی آنکھوں میں ایک انجانی سی چمک تھی اور اس کے جسم سے کھال غائب تھی۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ دنیا کے کئی حصوں میں جانوروں کو انتہائی بے دردی سے قتل کر دیا جاتا ہے۔بعض مذاہب میں اس کی اجازت ہے۔

ہندوستان میں صدیوں سے بچوں کو سمجھایا جاتا ہے‘ خاص طور پر برہمنوں کو کہ جانوروں کو مارنا گناہ ہے۔قتل ایک سفاکانہ فعل ہے مگر بے شمار بچے ایسے ہیں کہ جب وہ جوانی کی حدود میں قدم رکھتے ہیں تو

یادوں اور پریشانیوں کو بھول جاؤ‘ اب تمہارا ذہن بالکل خالی اور آزاد ہے۔تحریر کی طرف توجہ دو۔ ایک ایک لمحے کو کاغذ پر منتقل کر دو۔اصل آزادیٔ اظہار اسی کا نام ہے۔جیسا کہ تم نے کہا مزاحمت کی قوت ہی مسائل پیدا کرتی ہے‘ ان باتوں پر غور کرو اور کوئی حل تلاش کرو۔دماغ کو فضول خیالات میں مصروف رکھو گے تو اس کا نتیجہ یہی ہوگا۔

میں نے ایک شخص کو مرتے ہوئے دیکھا۔اس کی آنکھوں میں کتنی حسرت تھی اور موت کی دہشت اس کے چہرے پر عیاں تھی۔ دراصل ہم یہ جانتے ہی نہیں ہیں کہ زندہ رہنے کا فن کیا ہے۔ہم سب یہی سمجھتے ہیں کہ زندگی میں ہر دم پریشان رہا جائے اور جب موت آئے تو بے دلی سے اس کا استقبال کیا جائے۔ ہم نے زندگی اور موت کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ایسی صورت میں موت کو گلے لگانا بہادری کا کام ہرگز نہیں۔زندگی اور موت دنوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔زندگی بھی موت ہے اور موت تو پھر موت ہی ہے جو کہ ہر چیز کو نیست و نابود کر دیتی ہے‘ یہ محض ایک علمی بیان نہیں ہے۔

آج کی صبح بے حد صاف و شفاف ہے۔آسمان بالکل صاف ہے اور نیلا رنگ اس کے حسن میں مزید اضافہ کر رہا ہے۔ بادل تو نہیں ہیں مگر کسی وقت بھی آسکتے ہیں۔موسم میں تھوڑی سی خنکی ہے اور بارش کا بھی امکان ہے۔موسم بہار آنے کو ہے اور پتے اور کلیاں جلد ہی کھل جائیں گی۔ یہ زمین بھی کتنی خوبصورت جگہ ہے جہاں جگہ جگہ رعنائیاں بکھری پڑی ہیں۔ پہاڑ‘ درخت‘ خس و خاشاک‘ پھل پھول وغیرہ وغیرہ۔قدرت نے ہر نعمت سے ہمیں نوازا ہے اور اس کی قدر صرف انسان ہی کر سکتے ہیں۔مگر ان چیزوں کی تباہی بھی انسان کے ہاتھوں سے ہوتی ہے۔خوبصورت یادگاریں‘ چرچ‘ مندر اور مسجد ہونے کے باوجود انسان بے چین سا رہتا ہے۔انسان بذات خود بے حد سفاک بھی ہے اور بے حد مہربان بھی۔وہ اپنے غم و آلام اور اپنی محبتوں اور چاہتوں کی دنیا میں گم رہتا ہے۔اگر یہ خرابیاں نہ ہوتیں تو ہم یہاں جنت ارضی تعمیر کر سکتے تھے‘ مگر اب خیالی محل بنانے سے کیا فائدہ۔

انسان کی بے چینی ہی اسے پریشان رکھتی ہے۔امیر آدمی کو اپنی دولت لٹ جانے کا خطرہ ہوتا ہے اور غریب کو روٹی کی فکر ستاتی رہتی ہے۔وہ پوری زندگی بس اسی فکر میں مبتلا رہتا ہے۔جب آدمی خالی ہاتھ ہوتا ہے تو وہ اپنی زندگی کو بنانے پر قادر ہوتا ہے۔اب وہ چاہے دولت کے حصول کی کوشش کرے یا کوئی کارنامہ کر کے دنیا میں نام پیدا کرے۔کسی انسان کو اگر زمین کا ایک قطعہ دے دیا جائے تو وہ اس کو خوبصورت اور زرخیز بنانے کی لگن میں جدوجہد کرتا رہے گا لیکن دوسرا شخص ایسا بھی ہوگا جو اس زمین سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے گا اور اس کو بنجر اور ناکارہ ہونے کیلئے چھوڑ دے گا۔ہمیں ہر فیصلے کی آزادی ہے‘ دنیا میں نام کمائیں یا جہنم جانے کا راستہ تلاش کریں۔کوشش اور جدوجہد ہی انسان کو عزت عطا کرتی ہے۔

زندگی ایسی بھی گزرتی ہے جس میں نہ کوئی جوش ہو اور نہ جذبہ۔ایسی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ سب پڑھ کر تم نے برا نہیں منایا ہوگا۔اگر میرا خیال صحیح ہے تو میری تحریر کو سوچ سمجھ کر اور ہنسی خوشی پڑھتے جاؤ۔

حالات کے تحت ان کی تہذیب اور روایات میں تبدیلی آ جاتی ہے۔ وہ گوشت کھانے لگتے ہیں، فوج میں بھرتی ہوجاتے ہیں، خود بھی موت کو گلے لگا لیتے ہیں اور دشمن کے خون سے بھی ہاتھ رنگ لیتے ہیں۔ ایک رات میں ان کی کایا پلٹ ہوجاتی ہے۔ پرانی تہذیب آن واحد میں ختم ہوجاتی ہے اور اس کی جگہ نئی تہذیب جنم لے لیتی ہے۔ اپنے تحفظ کی خواہش، خواہ کسی بھی شکل میں ہو، ایک قدرتی خواہش ہے لیکن اس کے باوجود وہ محفوظ نہیں ہے۔ زندگی کے راز کو سمجھنا ہمارے لئے ناممکن ہے۔

زندگی میں اس قدر حسین مناظر ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں کہ جن کا شمار ممکن نہیں۔ ایک شخص اگر انتخاب کرنے لگ جائے کہ زمین کا حسن کہاں کہاں پوشیدہ ہے تو اس کی سٹّی گم ہو جائے۔ قدرت نے تمام عطیات ہمیں بخشے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہم کسی مقام پر یہ شکایت نہیں کر سکتے کہ ہمیں فلاں چیز نہیں ملی یا ہم فلاں چیز سے محروم رہ گئے۔ اپنے آپ میں صلاحیت پیدا کرو کہ ان عطیات سے فائدہ اٹھا سکو۔

تعلیم سے کیا مراد ہے؟ یہ ہمیں لکھنا اور پڑھنا سکھاتی ہے، روزی کمانے کے گر سکھاتی ہے اور اس طرح ہم دنیا کے بکھیڑوں میں شامل ہوجاتے ہیں۔ بچپن سے ہمیں سکھایا جاتا ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور سماج میں کون سا رویہ اختیار کرنا ہے۔ میں اسی غور و فکر میں مبتلا ہوں کہ کیا انسان کو صرف اوپر سے مہذب ہونا چاہئے اور اندر سے وہ آزاد رہے۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ مستقل اس آزادی سے ہمکنار ہوتا رہے گا۔ اس کی شرط صرف یہی ہے کہ وہ تخلیقی ذہن کا مالک ہو تب ہی وہ خوش و خرم رہ سکتا ہے۔ ورنہ زندگی تو دکھوں اور مسائل کا ایک جنگل ہے۔ آزادی سے سوچ و بچار کے لئے بھی ایک حیرت انگیز دانش کی ضرورت ہے۔ تخلیق کی صلاحیت بہت کم لوگ استعمال کرتے ہیں اور سب سے بڑی ضرورت اس بات کی طرف توجہ دینے کی ہے۔

تعظیم اور تکریم ایک نادر و نایاب شے ہے۔ کوئی اعلیٰ صلاحیت والا ہی اس کا حق دار ہوسکتا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کسی چیز پر قلعی کردی جائے یا اس کے عہدے میں چار چاند ٹانک دیئے جائیں۔ ایسے افراد دنیا میں شاذ و نادر ہی پائے جاتے ہیں۔ چالاک، ذہین، فہم و فراست سے بھرپور، بے انتہا دولت مند، سادھو یا بزرگ، یا وہ لوگ جو معاشرے میں نیک نام ہیں وہی لوگ اس اعزاز کے مستحق ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو نہ کسی سے چھینی جاسکتی ہے نہ کسی پر زبردستی لادی جاسکتی ہے۔

دولت کی فراوانی انسان کی تباہی کا باعث بھی بن سکتی ہے۔ دنیا میں دولت مندی کے بھی کئی معیار ہیں۔ دولت والے کبھی کبھی اپنے علاقے کے خدا بھی بن جاتے ہیں اور اپنے آپ کو دوسروں سے علیحدہ سمجھنے لگتے ہیں۔ اس طرح ان کے احساس برتری کو اور تقویت ملتی ہے۔

نیند انسانی صحت کیلئے بے حد سودمند ہے۔ نیند کی حالت میں انسان کا دماغ تیزی سے نت نئے سفر طے کرتا ہے اور کئی تجربات حاصل کرتا ہے۔ شعور اور لاشعور کے درمیان دماغ کو سکون مہیا کرنے کے کئی مراحل آتے ہیں۔ اگرچہ بعض خواب دھندلے بھی ہوتے ہیں لیکن قابل غور ہوتے ہیں۔ تمہارے معاملے میں یہ ضروری ہے کہ اپنے جسم کو بیماری سے محفوظ رکھو۔ یہ بہ آسانی ہوسکتا ہے۔ اپنی

اچھی ورزش کا طریقہ کار کیا ہے۔ ایک بھرپور نیند اور بامعنی دن۔ مگر لوگ بہت جلد اس عمل سے روگردانی کرنے لگ جاتے ہیں اور آسانیاں ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ یہ طرز عمل یقیناً ناگوار ہے۔ خوشگوار دن وہ کہلائے گا جب کوئی پریشانی، بے دلی اور لڑائی جھگڑا نہیں ہوگا۔ مگر ایسی فراغت ہمیں کم ہی نصیب ہوتی ہے کیونکہ پرانی یادیں کبھی کبھی ستانے لگتی ہیں اور اول فول خیالات کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ سستی اور کاہلی ہمیں ڈسنے لگتی ہے اور زندگی کا مزہ جاتا رہتا ہے۔ ایسے میں اگر تم قدرت کے دلفریب مناظر پر اپنی توجہ لگا دو تو تمہارے دل میں روشنی کی کرن جاگ سکتی ہے۔ زیادہ سادگی پسند اور چپ چاپ رہنے کی عادت مت ڈالو۔ ذہن کی الجھنوں کو پس پشت ڈال دو۔

ایک شخص سیر و سیاحت میں وقت گزارتا ہے، ممکن ہے اس نے دنیا کے بہترین مدرسوں میں تعلیم بھی پائی ہو، دنیا بھر کے جغرافیے اور تاریخ سے واقف ہو مگر سب کچھ حاصل کرنا اپنی اپنی ذہانت پر منحصر ہے۔ کتنے ہی ایسے ہیں جو تمام سہولتوں کے باوجود آگے بڑھنے میں ناکام رہتے ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ جواب یہ ہے کہ تجربات ہی وہ سیڑھیاں ہیں جو انسان کے آگے بڑھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ تم بھی آگے بڑھو۔

انسان اشتعال میں بھی آ سکتا ہے، جذبہ تجسس بھڑک جاتا ہے اور کسی وقت اس کی ہمت بھی پست ہوجاتی ہے۔ یہ سب انسانی فطرت ہے اور زندگی کے معمولات ہیں۔ زندگی ایک ابر آلود دن کی طرح ہے۔ آج مطلع صاف ہے تو دوسرے دن بارش بھی ہوسکتی ہے۔ یہی تبدیلیاں زندگی میں حسن پیدا کرتی ہیں۔ کبھی کبھی مایوسی اور پریشانی کا سامنا بھی کرنا پڑسکتا ہے۔ یہ حملہ کسی بھی وقت ہوسکتا ہے۔ انسان چاہے تو اپنی قوتِ ارادی سے کام لے کر ان کی وجہ دریافت کرسکتا ہے۔ مگر ضروری چیز یہ ہے کہ آدمی ہر دم ہوشیار رہے اور جب بھی ایسا وقت آئے تو وہ اس کے تدارک کیلئے تیار رہے۔ ایسے منفی خیالات کو اس وقت راستہ ملتا ہے جب کہ انسان کا ذہنی توازن بگڑا ہوا ہو۔ ذہن میں کوئی پراگندگی نہیں رہنی چاہئے۔ زندگی ایک بہتا ہوا دریا ہے، تمام الجھنوں کو تنکے کی طرح بہا دیا کرو۔ ان باتوں کو یاد رکھو گے تو تم اپنی زندگی میں ایک اچھی تبدیلی محسوس کرو گے۔

کیا تم نے استغراق اور غور و فکر کی عادت اپنا لی ہے؟ مجھے امید ہے کہ تم نے اس طرف بھی توجہ ضرور دی ہوگی۔ تمام احساسات اور خیالات کو ایک طرف رکھ دو اور پرسکون رہنے کی کوشش کرو۔ یہ سب کچھ کرنے کیلئے تھوڑی سی محنت کرنی ہوگی اور پھر خود بخود عادی ہوجاؤ گے۔ مگر اپنے آپ کو عام حالات میں رکھنا ہوگا۔ اچھی خوراک وقت پر کھاؤ، آرام کرو اور اپنے آپ کو حالات کا غلام مت بناؤ اور ہر دم جاگتے رہو۔

❁ ✡ ❁

(نظمیں)

شام کی سیر

محمود احمد قاضی

پیرس شام کی
آدھے گھنٹے کی سیر میں
دو بازار
اور میری اپنی گلی سمیت
دو گلیاں آتی ہیں
وہ نوجوان پولیو زدہ لڑکی
اپنے گھر کے بیرونی دروازے میں
مجھے وِھیل چیئر پر بیٹھی نظر آتی ہے
میں اس کو
اپنے ساتھ سیر پر لے جانا چاہتا ہوں
لیکن میں ایسا نہیں کر پاتا
ہر روز
غیر متعلق سا ہو کر
اس کے قریب سے گزر جاتا ہوں
شاید ہر روز ایسے ہی گزرتا رہوں گا

☆☆☆

مٹی پاؤ

محمود احمد قاضی

گاؤں حسین والا
کرموں والی حویلی
گاؤں کے دو سو چھیاسی بچوں کی
کچلی ہوئی، مسلی ہوئی معصومیت
اندھیرا کمرہ' نشے کے انجکشن
خوف کی علامت ایک کنواں'
میڈیا' وڈیو مناظر
سارے کے سارے ثبوت موجود ہیں
لیکن ہمیشہ کی طرح
ٹال مٹول سے کام لیتے ہوئے
انہوں نے
سانحہ ماڈل ٹاؤن جیسی
جے آئی ٹی بنادی ہے
ایک دن کہہ دیا جائے گا
چلو مٹی پاؤ!

☆☆☆

ملاقات ہوتی نہیں

جلیل عالی

کس قدر بے ثمر ہیں یہ دن
دل کی بیٹھک میں
جیسے زمانوں سے بیٹھا ہوا
منتظر ہوں کسی کا
کوئی تازہ جھونکا ہوا کا بھی آتا نہیں
کھڑکیوں سے نکل کر
نگہ دور تک گھوم آتی ہے
لیکن کسی شاخ پر
ایک بھی ثانیہ مسکراتا نہیں
چارسو بانجھ خاموشیوں کا
گھنا شور ہے
کیا سخن ہو کسی دوست دیوار سے
خود سے بھی بات ہوتی نہیں
سرخرو سوچ کی گھات ہوتی نہیں
عکس و معنی کی برسات ہوتی نہیں
شاعری سے ملاقات ہوتی نہیں

☆☆☆☆

دمِ انکار

(دانیال طریر کے لئے)

سید ایاز محمود

ہمیں افلاک کی رونق بڑھانی ہے
ستارے جھلملاہٹ سے کوئی پیغام دیتے ہیں
خموشی بے کرانی کی نئی وسعت کا مظہر ہے
ہمیں اندوہ کو الفاظ کی حرمت میں رکھنا ہے
تمنّا بے کلی کی آزمائش ہے
گماں خواہش کا پھندا ہے
سو برگِ آرزو بھٹکی ہوئی آواز کی مانند
ہوا کے دوش پر معدومیت کے پار نکلے گا
یہاں ہر منجمد ہوتی فضا کو خواب کے پہلو میں رکھنا ہے
ہمیں درکار ہیں آنکھیں
جو اِس دھندلے سے قہر آلود منظر کو جگا ڈالیں
یہیں پر خاک کی کروٹ سے اک پیکر بنانا ہے
یہیں پر زندگی کا استعارہ موسموں کی چال بدلے گا
کسی موہوم آہٹ سے
دمِ انکار نکلے گا

☆☆☆

آپ کا کھیل

عذرا عباس

آپ اس کھیل میں مجھے بھی شامل کر لیجیے
جو کھیل آپ کھیل رہے ہیں
خدارا، اس سے پہلے کہ میں آپ کا نشانہ بنوں
میں بھی وہی کھیل کھیلوں
جو آپ کھیل رہے ہیں
وہی کھیل جسے میں موت کہتی ہوں
اور آپ لذت
جن لاشوں پر آپ چہل قدمی کرتے ہیں روز
آپ کی گنتی میں اضافے کے باعث
زمین تنگ ہو رہی ہے
لوگوں کے گھر چھوٹے ہو رہے ہیں
یہ الگ بات ہے کہ
جب میں آپ کے کھیل میں شریک ہوں گی
تو میں کس کو نشانہ بناؤں گی؟
یہ کچھ نہیں کہا جا سکتا
ہو سکتا ہے کہ نشانہ آپ ہی ہوں

☆☆☆

ایک آواز زمین پر گرتی ہے

عذرا عباس

ایک آواز زمین پر گرتی ہے
پھر پرسہ دیتی ہیں عورتیں
پرسہ دیتے ہیں مرد
پرسہ دیتے ہیں بچے
جو بیٹھے ہیں خاک پر
رات کو دن سے ملاتے ہیں اور دن کو رات سے
ایک آواز پھر گرتی ہے زمین پر
اب پرسہ دینے والا کوئی نہیں
سوائے اس خاک کے جس پر وہ بیٹھے تھے

☆☆☆

سمندر غیظ میں ہے

عذرا عباس

سمندر نہیں دے رہا ہے
پانی ان بادلوں کو
جو لے کے جاتے ہیں پانی ان زمینوں پر
جہاں بسنے والے لوگ
ظلم کے سامنے سر جھکا رہے ہیں
جو بھوک اور نا انصافی
ایک دن کی غذا کے عوض
اپنے کشکول میں ڈال رہے ہیں
سمندر غیظ میں ہے

☆☆☆

تو آیا تھا

نسیم سیّد

بھور کرن
نوبت باجی تھی
دھوپ شگن
گھنگھرو چھنکے تھے
انگنائی میں
اس کونے سے اس کونے تک
پون کی پائل چھک رہی تھی
تو آیا تھا
تو آیا تو
بھوبل میں دبکی چنگاری
سرک کے تھوڑا باہر آئی
ہم دونوں کے ہونٹوں پر
سرشاری چپ کو
جوڑ جوڑ کے
چنگاری نے آگ بنائی
آگ کی ترچھی سی بوچھار میں
بھیگتی خوشیاں
پنکھ چھپکتی ناچ رہی تھیں
تو آیا تھا....
تو آیا تو
عشق کی گبرو چھاؤں سے ٹک کے
خوابوں کے سوندھے کلھڑ میں
ہم دونوں نے
گھونٹ گھونٹ اپنے کو پیا تھا
اپنا جیون ذائقہ
ہونٹوں نے چکھا تھا
وقت کی اک چھوٹی سی موج نے
اک گہرا کش لے کے ہمارا
سارا جیون
ایک سانس میں جی ڈالا تھا
تو آیا تھا

☆☆☆

یہ موسم نیاز ہے

نسیم سیّد

برستے رنگ
اور بھیگتے یہ سبز پیرہن
غزال دشت جاں دلاں!
یہ کیسا اہتمام ہے؟
کنار چشم نم جو یہ سجا ہے
کوئی خواب ہے؟
کہ خواب کا سراب ہے؟
غزال دشت رائیگاں
بتا یہ آج کیا ہوا؟
کہ سبز بخت ہجر کے سحاب
اپنے راستے بدل گئے
زمیں پہ سرخ، سبز، کاسنی بھنور کے رقص میں
دمکتی پتیوں کے جسم گھل گئے

ہوانے شاخ شاخ سے
گلاب توڑ توڑ کے
وہ راستے سجادئے
جوانتظار کی ملول دھول سے خراب تھے
شفق پگھل کے
چمپئی شہاب رنگ دھڑکنوں میں ڈھل گئی
دلاں سنا؟
یہ موسم نیاز ہے
لہو میں اک سنہری آگ جل گئی
تو کیا ہوا؟
جو وقت اپنے بحرِ بے کنار میں اتر گیا
سو کیا کریں؟ جو مہلتوں کے بادبان کھل گئے
غزالِ دشتِ رائیگاں
تجھے اس ایک سانس کی نوید ہو
یہ ایک گھونٹ ساعتِ مراد
بانصیب ہو
یہ موسم نیاز ہے
دلاں!! تجھے نوید ہو...

☆☆☆

ایک دعا

طاہر مسعود

نہیں سمجھ سکا میں اُن باتوں کو
جو کہی گئیں مجھ سے
اشاروں اور کنایوں میں
نہیں پا سکا میں اُن بھیدوں کو
جو خود مجھ میں چھپے تھے
نہیں جان سکا
خود اپنے آپ کو
حالاں کہ اپنے ساتھ رہتے سہتے
زندگی کے تقریباً انسٹھ سال گزار دیے
نہیں بھانپ سکا میں
اُن نیتوں کو
جو خوش نما وعدوں اور یقین دہانیوں کا
لباس پہن کر آئیں
اور میں نے اعتبار کیا
اور اب میرے دامن میں پچھتاوے کے سوا
کچھ بھی نہیں
پتا ہی نہیں چلتا
کسی بھی ایسے آدمی کا
جو کسی بھی کام، کسی بھی ضرورت کے لیے

آتا ہے میرے پاس
اس کی سنائی ہوئی
جھوٹی سچی کہانی کو
ہمیشہ سچ جانا ہے میں نے
آخر میں ہوتا یہ ہے کہ
میں احمق، سادہ لوح، سادگی کا مارا
ٹھہرتا ہوں اپنی بیوی بچوں کی نگاہ میں
دنیا کے بازار میں
جن جھوٹے سکّوں کا راج ہے
سمجھا ہے میں نے انھیں ہمیشہ کھرا
دھوکا کھایا ہے میں نے بار بار
لیکن نہ سیکھ سکا
کیسے پہچانتے ہیں کسی آدمی کو
اس کے اوڑھے ہوئے لبادے کو
اس کی چھپی ہوئی نیت کو
اے خدا!
کیا تو مجھے وہ چشم باطن
کچھ دنوں کے لیے مستعار نہیں دے سکتا
تاکہ میں پہچان سکوں
گرد وپیش کے سب لوگوں کو
جب میرا کام ہو جائے گا
وعدہ کرتا ہوں
کہ لوٹا دوں گا
وہ آنکھیں جو آدمی کو جھانک کر
اندر تک دیکھ لیتی ہیں

میں نہیں رکھنا چاہتا
اپنے پاس ایسے چشمِ باطن کو
جو دوسروں کو بنا کوشش کے بے نقاب کر دے
اس لیے کہ میرا دل بہت حسّاس اور
اعصاب میرے کمزور ہیں
میں بہت دنوں تک
برداشت نہیں کر سکتا
اُس آگہی کو
جو چشمِ باطن عطا کرتی ہے
مجھے سارے ہی لوگ اچھے لگتے ہیں
میں سبھوں کا اعتبار کرتا ہوں
میں ان کی دھوکا دہی کو بھی آسانی سے
سہہ لیتا ہوں
جب حقیقت ہر روز
برہنہ ہو کر سامنے آنے لگے گی
جینا دوبھر ہو جائے گا میرا
اچھا نہیں لگتا پھر بھی
کہ میرے دوست
مجھے احمق جانیں
بیوی بچے سادہ لوح سمجھیں

☆☆☆

ایک ضرورت

طاہر مسعود

سگریٹ کی راکھ
جھٹکتے ہوئے
ایش ٹرے میں
نہیں خیال آتا کہ
تمناؤں کی راکھ کے لئے بھی
چاہیے ایک
ایش ٹرے!

☆☆☆

اندیشہ

تسنیم کوثر

ہمیں تم سے ملے اب تو نجانے کتنے جگ بیتے
تمہیں بھی گردش حالات نے بدلا تو کچھ ہوگا
کئی چرکے دلِ نازک پہ اپنوں سے لگے ہوں گے
وفا کی راہ میں شاید کئی دھوکے ملے ہوں گے
لکیروں نے عجب اک جال چہرے پر بُنا ہوگا
زمانے بھر کی فکروں نے تمہیں کملا دیا ہوگا
تمہاری سرمئی آنکھوں پہ اب عینک دھری ہوگی
میری تصویر بھی تو اس میں دھندلی پڑ گئی ہوگی
اچانک آئینے میں جب سے میں نے خود کو دیکھا ہے
اسی پل سے یہی اندیشہ میرے دل میں اٹکا ہے
تمہیں بھی گردش حالات نے بدلا تو کچھ ہوگا

☆☆☆

دستک

ثروت زہرا

سورج کی باتی کھول کے کرنیں
دھوپ پہننے نکل پڑی ہیں
ہستی کے سب دروازوں پر
دستک کی پازیب بجی ہے
خواب سرا کے اندھیارے میں
خون کی خوشبو جاگ گئی ہے
آدم بو.......آدم بو
آواز پڑی ہے
ماس.........اور ہڈی
جسم کے ریشے بننے والی
روح کی کھڈی
مجھ کو سات بسنتوں والا
بن کر ایک سراپا دیدے
اوج فلک سے شام کی رُت کا
تھوڑا سا ہی غازہ دیدے
سرمئی لب کو وقت طلوع پہ
کھلنے کا دروازہ دیدے
شوق سفر کو.....
دھڑکن کا آوازہ دے دے
آنکھوں کی ان گیلی رتوں کو
سرمئی ہو جو غازہ دے دے
زادِ سفر کو ہستیِ جاں کا
تھوڑا سا شیرازہ دے دے

☆☆☆

کہکشائے شوق

ثروت زہرا

کہکشائے شوق
کائناتی کوکھ کا راستہ پا گئی ہے
اور تمہارے وفور کی کوائف بیلی میں مرے خواب کا
سبز بیج رکھ چکی ہے
کہکشائے شوق
مجھے اک بار پھر جنم دینے جا رہی ہے
شرابِ معنی میں ہولے ہولے تیرتے ہوئے میرا وجود
کتنا بامعنی اور ہلکا لگ رہا ہے
جذب وجنون کی رگِ نال میں سے
رینگتا ہوا لہو مجھے کسی ارادے اور تردّد کے بغیر
سیراب کرتا جا رہا ہے
میرے پور سے پور تک اعضا کی تجسیم کرتا جا رہا ہے
کوائف بیلی کے ارد گرد کی ریشمی جھلیاں
مجھے زمان کی ساری کائناتوں سے کاٹ کر
نشو ونما کا پورا ذائقہ دیتی جا رہی ہیں
اور میں اسی ذائقے کے نشے میں
اپنی پرانی نیندیں پوری کرتی جا رہی ہوں

☆☆☆

مگر میں ذکر کرتا ہوں

ظریف احسن

سبھی اظہار کرتے ہیں محبت کا
چاہت، انسیت، الفت کا
محبت سچا جذبہ ہے
کبھی ظاہر، کبھی باطن
چاہت کا دم بھرتے ہیں
کبھی خوابیدہ
اور کبھی نیم خوابیدہ
کہتے ہیں انسیت ہے
کبھی نگاہوں کی زباں سے
اظہار الفت ہے
مگر میں ذکر کرتا ہوں، ظریف احسن
کتابوں، پھولوں، ستاروں، رنگوں کا
حوالوں اور نسبتوں کا
کتابوں سے محبت ہے
پھول چاہت کا جذبہ ہے
ستاروں کی طرح جگمگ
یہی ہے انس کا رشتہ
رنگوں سے جو الفت ہے
سبب تم ہو
حوالے نسبتوں کے سارے تجھ سے ہیں
جبھی تو معتبر ٹھہرے

☆☆☆

بن کہے

ظریف احسن

مجھے ایک بات کہنی تھی
مگر کہہ نہ سکا
اس لئے کہہ نہ سکا
کہ وہ بات اب تک
خود سے بھی کہی نہیں ہے
تو پھر تم سے کیسے کہتا
تمہاری طرح ظریف احسن
کوئی غیر نہیں
اور تم میری ذات ہو
جو بات تم نے سنی نہیں
بن کہے وہ بات
تم تک پہنچ گئی ہے
یعنی اب ظریف احسن نے
وہ بات خود سے بھی کہہ دی

☆☆☆

بھارت کے محکمہ سیاحت کی دنیا کو اطلاع

محمد عثمان جامعی

اے ماسکو، واشنگٹن والو!
پیرس والو، لندن والو!
امن و انصاف کے متوالو!
انسانی حقوق کے رکھوالو!
تم شوق سیاحت رکھتے ہو
فطرت کے نظاروں کے عاشق
تم حسن کی چاہت رکھتے ہو
کچھ روز، یہی بس اک دو ماہ
ٹھہرو، پھر لطف اٹھانے کو
آنکھوں کی پیاس بجھانے کو
ڈل جھیل میں کشتی چلانے کو
سبزے سے، پھولوں کلیوں سے
لکڑی کے حسین گھروں والی
ان بستیوں سے ان گلیوں سے
دل کش شاداب چناروں سے
چاندی سے ڈھکے کہساروں سے
آنکھیں ٹھنڈی کرنے آنا
کشمیر کی ارضی جنت میں
سیر و تفریح کرنے آنا
تم نہ آئے تو یہ منظر
یہ جادو جیسے روپ نگر
روپ اپنا کسے دکھائیں گے
کہ اس جنت کے کشمیری
بس کچھ دن میں، بس چند ماہ میں
بھارت سے آنکھیں نُچوا کر
وہ آنکھیں جن میں خواب ہے اک
ان میں سیدھی گولی کھا کر
سارے اندھے ہو جائیں گے
یہ اندھے کشمیری اپنے کشمیر کو دیکھ نہ پائیں گے

☆☆☆

مسئلے کا حل

محمد عثمان جامعی

جو ہونا ہے ہو جانے دو
کیوں ہو دل میں ہونے کا ڈر
کھونے کا ڈر
کھو جانے دو
اپنے پاس ہے جو بھی اپنا
اپنا کیا ہے
بدن لباس سے
آنکھ میں آ کر رہتے بستے سب سپنوں تک
جو ہیں اپنے
سب اپنوں تک
سبھی پرایا
اِدھر سے آیا
اُدھر سے آیا
کسی کو چھینا، کوئی چُرایا
چھن جانے سے ڈرنا کیا ہے
اپنا کیا ہے

ہونے کا احساس ہے بس
ہیں جس کے دم سے
خوف اندھیرے
خوشی کی چاہت
اور سارے امید سویرے
ہونے کا احساس مٹا دیں
آئینہ دیکھیں
اور کہیں
تم کوئی نہیں ہو، کہیں نہیں ہو
کبھی نہیں تھے، کبھی نہ ہو گے
پانے کی ہر ایک تمنا
ہونے کا احساس مٹا دیں
کھونے کا احساس مٹا دیں

☆☆☆

تنہا لوگوں کا ہجوم

رفیع اللہ میاں

سرخ رنگ
اُن کے چہروں پر نہیں جھلکتا'
ہاتھوں میں جام ہیں'
کوئی بھرا ہے خون سے'
کسی میں چند قطرے ہیں...
یہ اکسیر ہے'
پتا نہیں کس نے تجویز کی...
ہاتھ تو اپنے ہیں
جام پکڑنے کے لیے
لرزش میں آئے ہوئے'
ہوش میں آنا چاہتے ہیں تو پی لیتے ہیں...
سرخ رنگ کا زندگی سے غائب ہو جانا
کاینات کا بڑا المیہ ہے'
یہ کھوجتے ہیں اپنے دریدہ بدن میں'
شوریدہ ذہنوں میں'
ہمیشہ کے بگڑے ارادوں میں'
اور بے سمت نیک خواہشات میں...
ان کے سبز مائل چہرے
درد کی ملمع کاری سے نا قابل شناخت ہیں...
یہ اور ہم مل کر
پیالوں میں ''سرخ'' کی مقدار دیکھتے ہوئے

ہر بار خود کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں'
اور بھول جاتے ہیں...
بھول جاتے ہیں کہ ہم ہجوم ہیں'
بھول جاتے ہیں
کہ ہمارے ہونٹ سرخ ہیں'
اور ہماری پوریں اب نہیں رہیں...
ہجوم تو اب'
اذیتوں سے بھی ماورا ہو چکا ہے!

☆☆☆

برف کا بوجھ

رفیع اللہ میاں

تنکے ڈھونڈتے ڈھونڈتے
تمھاری آنکھوں سے پانی بہہ پڑا ہے'
بے کار کاموں میں سے ایک کام
میری آنکھوں میں انھیں تلاش کرنا ہے...
تم کتنی مشکل میں ہو'
یہ زحمت تمھارے وقت کو زائل نہ کر دے...
نہ لفظ ٹوٹ کر گرتے ہیں
نہ معنٰی ہوا میں معلق ہو جاتا ہے...
مصالحت کر لو تو
ہم لباسِ معنٰی اُتار دیں'
ایک دوسرے کے کہساروں اور صحراؤں پر
لمس کی نرم روی چھوڑ دیں'
تمام زخم قبول کر لیں...
کشادہ' خوبصورت سڑکوں پر
دور تک دوڑتے جائیں'
دو فٹ کی برف میں
دلہن بنے درختوں کا گیت سنیں'
اور بھول جائیں کہ
بوجھ تلے خمیدہ بدن
زندگی کی کشاکش کا بدیہی حسن ہے...
لیکن بس کچھ دیر کے لیے
اتنی دیر
کہ میری آنکھوں میں گڑے شہتیر
تمھیں دکھا سکوں!

☆☆☆

جب ہم جڑتے ہیں!

رفیع اللہ میاں

اُجاڑ موسموں میں
درخت سناٹوں کا پھل دیتے ہیں'
تلووں پر سرد پتوں کا لمس
وجود میں
غارت گر لمحے اُگاتا ہے'
کالی چادروں میں لپٹے جھونکے
سینے کی دیواروں سے
زندگی گھسیٹ کر
مٹی پر ٹھٹھرنے کے لیے
چھوڑ دیتے ہیں...
یہ لہریں کھائی ہوئی ریت'
جو جنسی ابھاروں کی تشبیہ بن گئی ہے
یہ دور تک پھسلتا آسمان'
جو زندہ رکھ کر جینے نہیں دیتا...

اور سینے کے دروازے کھلتے ہیں تو
جنگل بہتا ہوا
اس کے اندر بس جاتا ہے
یہ روح کاٹتی اُداسی
یہ خلا در خلا
سب کچھ اکائی میں ڈھلتا ہے...
بکھرے وجود کی اکائیوں میں
کچھ زندگی
کچھ مسرت
اور کچھ کمینگی
سینے کے دروازے پر
دستک دیتی ہے!

☆☆☆

آئی نیڈ یو!

رفیع اللہ میاں

میں اک اُداس گیت ہوں
گنگناؤ مجھے!
درختوں سے نغمے پھوٹ سکتے ہیں...
اپنے آنسو شاخوں سے کیسے اُتاروں...
بصارت کی خوشبو
آنکھوں سے نچوڑ کر لے جا چکے ہیں...
اب نظارے قہقہے لگاتے ہیں!
تم نے میرے ہونٹوں پر کچھ ڈھونڈا؟
وہ تادیر کھیلی تھی
پھر پھسل کر کہیں گر گئی...
میں تم سے
سوکھے جھیلوں میں اُتر کر
ملنا چاہتا ہوں
کیا میری وارفتگی محسوس ہوتی ہے؟
گردوپیش تھما ہوا ہے
اس کا سارا تحرک
میرے اندر جذب ہو چکا ہے
اور میں بھی تمھیں تھم کر دیکھتا ہوں!
میرے سارے جذبے تھم چکے ہیں
ہوا کی سرسراہٹ بھی نہیں...
میں کچھ کھو چکا ہوں
کیا میں اسے تمھارے وجود میں تلاش کر لوں؟
تم میری انگلیوں کو تھرکنے دو!
تمھارے پہلو کے نرم گوشت میں
گڑھا بناتے ہوئے
میری انگلیوں میں
اُداسی کو لوٹ آنے دو!

☆☆☆

یہ بچھڑنا عجیب عادت ہے

کرامت بخاری

یہ بچھڑنا عجیب عادت ہے
جان والے جہان سے جائیں
یا وہ جلدی میں جان سے جائیں

جانے والے چلے ہی جاتے ہیں
زندگی حادثے کی صورت ہے
حادثے سوچ کر نہیں ہوتے
بس یہ ہوتے ہیں اور ہوتے ہیں
جو بچھڑتے ہیں راہ گزاروں پر
اُن پہ یہ راستے بھی روتے ہیں
جس سے ملنا مری ضرورت تھی
جن سے ملنا مری ضرورت ہے
اُن سے کیسے کہوں کے اے جاناں
بس یونہی بے سبب بچھڑ جانا
اور پھر دوریوں کو اپنانا
کس قدر ظلم ہے اذیت ہے
یہ بچھڑنا عجیب عادت ہے

☆☆☆

یہ مرے خواب

کرامت بخاری

یہ مرے خواب خریدے ہوئے خودساختہ خواب
ان سے شیون کی شب و روز صدا آتی ہے
یہی شیون کی صدا!
جب سرِ شام سکوں زار سے ٹکراتی ہے
تو یہ بڑھتی ہی چلی جاتی ہے
یہ مرے خواب، یہ روٹھی ہوئی راہیں میری
جن پہ ناکام تمناؤں کا بے تاب ہجوم
لمحہ لمحہ کسی جانب نگراں رہتا ہے
کون جانے کہ یہ کس سمت رواں رہتا ہے
یہ مرے خواب!
خریدے ہوئے خودساختہ خواب
جن سے شیون کی شب و روز صدا آتی ہے
ان کی تعبیر بہت دور نظر آتی ہے

☆☆☆

جیون کا پنّا

رفعت ناہید

چوکھٹ سے گھر کی یوں پاؤں نکالا ہے
تھوڑا دوپٹے کو ماتھے پہ کھینچا ہے
پلّو سنبھالا ہے
سانسوں میں نرمی ہے
کاجل دہکتا ہے
آنکھیں سلگتی ہیں
چہرے پر گرمی ہے
موسم کے سُرمے میں، تھوڑی سی زردی ہے
آدھا اندھیرا ہے
ہلکی سی سردی ہے
چوکھٹ سے گھر کی جو پاؤں نکالا ہے
پاؤں پہ شبنم کی ابرق اترتی ہے
نازک ہے پھر بھی محبت تو کرتی ہے
محبت کا ہی اپنا بکھیڑا ہے
یادوں نے گھیرا ہے
گھیرے کے اندر سے رستہ نکلتا ہے
رستے میں الجھن ہے
پتوں کا گہرا ہرا کالا پن ہے
بن میں سے پتلی سے پگڈنڈی چلتی ہے
جو ایک بستی میں جا کر اترتی ہے
(میں پھر ٹھٹکتی ہوں)
ہاتھوں کو پیشانی ابرو پہ رکھتی ہوں
رستہ تو تھوڑا ہے
آدھے سے آدھا ہے
لگتا زیادہ ہے
دو چار گلیوں میں
آگے پڑاؤ ہے
بازو میں بیٹھک ہے
روشن الاؤ ہے
ملنے کا وعدہ ہے
کیسا ارادہ ہے
جیون کا پنا تو سادے کا سادہ ہے

☆☆☆

آخری ستون کے ساتھ

رفعت ناہید

رات کے نو بجے
تین سو کوس دور تم
جس ریلوے پلیٹ فارم پر اتر رہے ہو
ہے یہاں سے وہاں تک
تمہارے گھونگریالے بالوں سے لے کر
تمہارے جوتوں کے تسموں تک
میں تمہیں دیکھ سکتی ہوں
تمہاری تھکی ہوئی گلابی آنکھیں بتا رہی ہیں
تم کو بھی میں نظر آ رہی ہوں
ایک نیم تاریک اور نم آلود
پرانے ورانڈے کے آخری ستون کے ساتھ
جہاں سلائی مشین رکھی ہے
تمہاری قمیض کے گریبان پر بٹن ٹانکتی ہوئی
جو کل میرے بالوں میں الجھ کر ٹوٹ گیا تھا

☆☆☆

کفر آشنا دل

تبسم فاطمہ

کفر آشنا دل کے ساتھ
میں جنت کی طرف جانے والے راستوں سے
لوٹ آئی تھی
اب میں واپس ہو رہی تھی
سنگ وخشت سے تعمیر ہونے والے بت
چوراہوں پر ایستادہ تھے
میں نے انہیں گھر میں بھی دیکھا تھا
شوہر اور بچوں کی شکلوں میں
حیران ہوئی تھی
مردوں کے چہروں میں اتنی یکسانیت کیوں ہوتی ہے
عورتوں کے چہرے تو جدا جدا ہوتے ہیں

یہاں جنت کی طرف جانے والے راستوں کے لیے
سنگ وخشت سے تعمیر شدہ بت بھی ڈراتے ہیں
میں گھر میں بھی ان بتوں کی آہٹ سنتی ہوئی بڑی
ہوئی تھی
میں نے جسم کے سجدے کو انکار کیا
فرعونیت کے مجازی ہاتھوں کو جھٹکا دیا
اور سہم گئی تھی
بڑے ہوتے بچوں کے چہرے بھی تبدیل ہو رہے تھے

اذان کی آوازیں پہاڑیوں کے عقب میں اتر گئی
تھیں
شریعت کی وزنی کتابوں کے درمیان
گھٹن بھرے قید خانے میں،
مردانے بوٹ ہماری پشت پر چبھ رہے تھے
مجازی خداؤں نے ہاتھوں میں چابک تھام رکھے تھے

اس پار سمندر سے آتی ہوئی ہوائیں تیز تھیں
لہولہان گھوڑے تیز تھپیڑوں میں گر رہے تھے
میں مجازی ناخداؤں کی بت پرستی سے انکار کی
مجرم تھی
اور فرعونیت سے بغاوت کی گنہگار

اس پار سے آتی سمندر کی تیز ہوائیں مجھے بلا رہی
تھیں
میں نے جنت کی طرف کھلنے والی کھڑکی بند کر لی،
چراغ بجھا دیئے
چوراہوں پر ایستادہ بتوں کے قہقہے خاموش تھے

میں آتش پرست نہیں تھی مگر میں نے اپنے لیے
آگ چنی
میں دعاؤں میں جلی اور انجانے خوابوں سے
معاہدہ کیا
مٹھیوں میں دوزخ کی دہکتی ہوئی آگ تھی
میں بتوں کے شناسا ہجوم سے باہر نکلی
اور آگ کی بارش میں سما گئی

☆☆☆

نئے سال کے لئے کچھ نظمیں

تبسم فاطمہ

(1)

نیا سال
تم ایک خوفزدہ کرنے والے کے چہرے کے ساتھ
آئے ہو
افسوس، میں تمہارا استقبال نہیں کرسکتی
تمہارے ہاتھ میں گزشتہ سال کا ایک پالنا ہے
جس میں پشاور کے معصوم بچوں کے خون کے داغ
اب بھی دکھائی دے رہے ہیں
تم نے مذہب کو سیاست سے جوڑا
اور وقت کو ایسے دوراہے پر لے آئے
جہاں انسانیت، ترشول اور شمشیر کا فرق ہی مٹ
گیا
تم فلک شگاف چیخ اور کراہوں کے ساتھ آئے
افسوس،
ان دردناک چیخوں کی زد میں
میں تمہارا استقبال نہیں کرسکتی

(2)

ایک بے ہنگم وقت کے صدمے
درد اور الاپ کے گھنے کہروں کے درمیان
میں ابھی
رومانیت کے بوسیدہ لحاف میں
کچھ تلاش کرنے کی کوشش میں خالی ہاتھ ہوں
ماضی کے کہروں میں بورسی پر ہاتھ تاپتے ہوئے
صفحات تو ہیں
مگر وقت کے آتشدان پر رومانیت جل رہی ہے

ایک بے حس سیاست، مذہب کو فرقہ واریت سے
جوڑ کر
جلتے ہوئے انسانی لاشوں کی کراہیں سنا رہی ہے
نیا سال
ایک انتہائی المناک اور افسردہ ماحول میں
ہم تیار نہیں ہیں تمہارا جشن منانے کے لئے

(3)

نیا سال! گھبراؤ مت
ہم جئیں گے اس ایک محبت کے لئے
جو لامتناہی چیخوں اور کراہوں کی راکھ میں کہیں
باقی ہے
جو ڈری ہوئی، روح کے سات پردوں کے اندر
کہیں بے جان پڑی ہے
ادب کے صفحات پر عرصہ پہلے جس کی موت کا
اعلان کر دیا گیا
مگر گھبراؤ مت
ہم ڈھونڈ لائیں گے اسے
راکھ سے، روح سے، سات پردوں کے اندر سے
اور دل سے
ہم رکھ دیں گے اسے صفر سے سونامی
اور تاریخ کے بوسیدہ صفحات تک
گھبراؤ مت
ابھی ایک جشن کا وعدہ ہے
نئی تاریخ کی تیاری تک
ہم محبت کو زندہ کر دیں گے

☆☆☆

جنم بھومی میں ایک دن

طالب انصاری

دریچے میں رکھی آنکھیں
نہ جانے جا بسی ہیں کون سے انجان قریے میں
کواڑوں سے کسی کے گنگنانے کی صدا آتی نہیں
نقشین دروازوں کی ڈیوڑھی میں وہ سیلی سیلی سی خوش بو
کہیں ڈھونڈے نہیں ملتی
یہاں اونچی چھتوں کے چوبی چوبارے تھے
جن میں بھینی بھینی ٹھنڈکیں ستایا کرتی تھیں
سویرا ممٹیوں پر شبنمی چھڑکاؤ کرتا تھا
کئی بھیدوں بھرے زینے تھے
جو دن میں بھی اندھیرے میں ڈوبے رہتے تھے
سرگوشیاں سنتے تھے، افسانے بناتے تھے
نہ کوئی ریشمی پردہ ہی اب تو سرسراتا ہے
نہ کوئی کھلکھلاتا ہے
نہ منڈیروں پہ نیلے پیلے آنچل لہلہاتے ہیں
نہ لوہے کی سلاخوں والی کھڑکی سے گلی میں جھانکنے
والا رہا باقی
نہ صبحِ جاں فزا باقی
نہ شامِ دل ربا باقی
مرے دل چل
فقط اجڑے زمانوں کی یہاں پر دھول اڑتی ہے
یہاں کچھ بھی نہیں اس کے سوا باقی

☆☆☆

ماں

ریاض ندیم نیازی

آغوش ماں کی خُلد ہے رُوئے زمین پر
لکھا ہوا ہے وقت کا یہ بھی زمین پر
جنت ہے ماں کے پاؤں کے نیچے، ہے سچ خبر
حق میں ہے اس خیال کے ہر صاحب نظر
ماں سی حسین شے کا نہیں ہے کوئی جواب
خوش بخت ہیں جو ماں کی نظر سے ہیں فیض یاب
بچوں کو دیر ہو تو وہ ہوجائے بے قرار
کرتی رہے سحر سے جو تا شام انتظار
ملنے لگی وہ عرش کی زنجیر دیکھئے
اس کی دعا میں کتنی ہے تاثیر دیکھئے
ہے ماں کا پیار جیسے ہو جھونکا بہار کا
اترا کسی سے قرض کہاں ماں کے پیار کا
ماں کی دعا سے راز کھلا مجھ پہ یہ ندیم
ہے صرف یہ علاج دلِ بے قرار کا
اخلاص حرف نہ سہی تصویر ہے درست
میں نے کیا ندیم جو تحریر، ہے درست

☆☆☆

درزی

ہدایت سائر

مجھے للکارنے والو!
کرو کیا بات کرنی ہے؟
برہنہ سر سے پیروں تک، شکستہ سا بدن لے کر
تمہارے روبرو ہوں میں
بتاؤ کیا سزا دو گے؟
مجھے تم کیا بتاؤ گے؟
میں اپنے آپ سے الجھا ہوا وہ سرپھرا ہوں جو
کسی بھی دائرے میں رہ نہیں سکتا
مگر یہ جان لو تم
تمہارے دائروں کی سرحدوں سے خوب واقف
ہوں
مجھے للکارنے والو سنو!
اب تم سنو میری
برہنہ جسم ہوں لیکن، شکستہ میرے ہاتھوں سے
ابھرتا یہ قلم دیکھو
یہ وہ درزی ہے جو تم کو لباسِ زیست دیتا ہے
مجھے للکارنے والو، لباسِ زیست مت پھاڑو

☆☆☆

بھیک

ہدایت سائر

یہ کیسا چاند ہے جو آسماں کی گود میں بیٹھا
کسی شاعر کی سوچوں کو نئی پرواز دیتا ہے
کبھی ماضی کے دروازوں سے بھولی یاد کے سکے
اٹھا کر
ہجر کے کشکول میں یوں ڈال دیتا ہے
کہ جیسے راہ چلتا آدمی کوئی
بھکاری کے کٹورے میں
کوئی سکہ گراتا ہے

☆☆☆

تخیل

ہدایت سائر

تخیل جب گماں سے بھی
کہیں آگے کی دنیا سے یقیں کو ڈھونڈ لاتا ہے
تو میرا ہر ارادہ بے یقینی کو یقیں کے راستے پر ڈال
دیتا ہے
جہاں پھر فکر کے آگے
زمیں اور آسماں کی وسعتیں بھی کچھ نہیں لگتیں
اے میری جستجو مجھ کو
نئی کچھ وسعتیں لا دے

☆☆☆

وفا

شازلی

جنگ کے سناٹے
ویرانوں کی وحشتیں
اور
دشت کی تنہائیاں
سنو!
سب میرے ہمدم ہیں
کیونکہ انہوں نے
آج بھی میرا دامن
تھام رکھا ہے
تمہاری یادوں کی طرح

☆☆☆

ماضی

شازلی

اُداس لمحوں کے
اُجاڑ رستوں کے
بیتی رُتوں کے
پیغام جب ہوا کے رتھ پر
سوار آتے ہیں
تو سنو ہم نشین!
ہم انہیں مڑ کر دیکھتے ہیں
اور
پتھر کے ہو جاتے ہیں!

☆☆☆

بہانہ

روحان دانش

دور، بہت دور جانا
دھول بن کر راہوں میں بکھر جانا ہے
شوقِ آوارگی ہے شاید
یا پھر
خود سے بھاگنے کا بہانہ ہے

☆☆☆

ان کہی

روحان دانش

کئی نظمیں ادھوری ہیں
ان باتوں کی طرح
جو تم سے
کہنا چاہتا تھا
مگر کبھی کہہ نہ سکا

☆☆☆

(یادیں، خاکے، مضامین، مشاہیر کے خطوط)

خوابیدہ خطوط......ادیبوں کے

ترتیب و تحشیر نگاری: انور سدید

ڈاکٹر وزیر آغا کا خط......ایم سلیم صاحب کے نام

58 سول لائنز، سرگودھا
13 جون 1991ء
مکرّمی ایم سلیم صاحب......السلام علیکم

میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اپنی کتاب پراسرار کائنات کا معمّہ بھجوائی جسے میں نے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالا۔ میں حیران ہوں کہ آپ نے طبیعیات کے موضوع پر لکھی ہوئی یہ کتاب مجھے کیوں بھجوائی؟ ممکن ہے کہ میرے علاوہ دیگر جرائد کے مدیران کو بھی بھجوائی ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کو طبیعیات سے میری دلچسپی کا علم ہو اور آپ نے بطور خاص مجھے بھجوائی ہو، کائنات کے معمّے کی طرح اس معمّے کو بھی حل کریں۔

میں سائنس کا باقاعدہ طالب علم کبھی نہیں رہا اور نہ ہی میں نے اس مضمون میں کوئی ڈگری لی ہے مگر ساری عمر ادب، عمرانیات، حیاتیات وغیرہ کے ساتھ طبیعیات بھی میری توجہ کا محور رہی ہے اور میں پچھلے چالیس برس سے اس کا برابر مطالعہ کرتا رہا ہوں لہٰذا آپ سے ڈائیلاگ ہو سکتے ہیں۔

مگر اس سے قبل کہ ڈائیلاگ ہو، مجھے آپ تک اپنی مسرت کے اس احساس کو پہنچانا ہے جو آپ کی کتاب پڑھ کر مجھے حاصل ہوا۔ خوشی اس بات کی ہوئی کہ آپ نے اپنے طور پر اس اسرار پر نظر دوڑائی ہے اور اپنے منفرد ردِ عمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ نظریے آتے اور جاتے رہتے ہیں اور کوئی بات بھی شاید حتمی نہیں ہے۔ مگر جب کوئی شخص حیرت زدہ ہوتا ہے، اس سے سوال اٹھاتا ہے اور پھر اس سوال کا اپنے طور پر جواب مہیا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو میں اسے سلام کرتا ہوں۔ آپ کی اس مختصر سی کتاب کے مطالعے کے بعد آپ کو بھی سلام کرتا ہوں۔ آپ نے اپنی اس کتاب میں SPACE کو حقیقتِ عظمیٰ

کی صفات کا حامل قرار دیا ہے، ممکن ہے میں اس طرح سوچوں کہ SPACE کو ABSOLUTE نہیں کہا جا سکتا، حتیٰ کہ Time کے بغیر Space کے ہونے کا ادراک ناممکن ہے۔ دوسری طرف TIME بھی ABSOLUTE نہیں ہے، دونوں ایک دوسرے سے مشروط ہیں۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ حقیقتِ عظمیٰ کا شانت روپ Space ہے اور فعال روپ Time ہے اور حقیقتِ عظمیٰ ٹائم اور اسپیس کی حاصل جمع سے زیادہ ہے۔ آپ نے BIG BANG کے مقابلے میں STEADY STATE THEORY کے حق میں آواز بلند کی ہے۔ اس کی آواز اب سائنس کی دنیا سے ہی آ رہی ہے اور دلچسپ ہے کہ اس کے ساتھ ہاکنگ کے حوالے سے Super String کے نظریات اور چھ مختلف Dimensions کا نظریہ بھی خاصا زرخیز ہے مگر اس پر ہم بعد میں باتیں کریں گے، فی الحال میں چاہتا ہوں کہ آپ 'اوراق' کے دسمبر 1990 کے شمارے میں میرا مضمون 'دمادم صدائے کن فیکون' پڑھ لیں جس میں میں نے ان بیشتر سوالوں کا احاطہ کیا ہے جو آپ نے اٹھائے ہیں۔ 'اوراق' آپ کو سیالکوٹ یا لاہور سے مل جائے گا۔ ایک بار پھر شکریہ کہ آپ نے مجھے اپنی قیمتی تصنیف بھجوائی، والسلام، مخلص وزیر آغا

حاشیے
مکتوب

مکتوب نگار، ڈاکٹر وزیر آغا کسی تعارف کے محتاج نہیں، خوابیدہ خطوط کے سلسلے میں ان کا تذکرہ سابقہ اقساط میں ہو چکا ہے۔ انہوں نے اپنی ادبی زندگی میں نظم جدید کو فروغ دیا اور انشائیہ کی تحریک برپا کی۔ اردو تنقید کو نئے نظریات سے جدت آشنا کیا۔ اپنے رسالہ 'اوراق' کے ذریعے قارئین کی ذہنی آبیاری کی اور اردو ادب کو مختلف المضامین متعدد نئے مباحث سے متعارف کرایا۔ وزیر آغا 18 مئی 1922 کو سرگودھا کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئے، 7 ستمبر 2010ء کو وفات پا گئے۔ ان کے فکر و فن پر پاکستان اور ہندوستان میں پی ایچ ڈی کے متعدد مقالات لکھے جا چکے ہیں اور اب کتابیں تالیف کی جا رہی ہیں۔ وزیر آغا کی ساٹھویں سالگرہ پر راقم انور سدید نے 'وزیر آغا ایک مطالعہ' کے عنوان سے ان کی خدمت میں ایک ضخیم کتاب پیش کی تھی۔

مکتوب الیہ......ایم سلیم، 10 دسمبر 1935 کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ادبی کتابوں کے مطالعے کا شوق بچپن میں ہی پیدا ہو گیا تھا۔ گورکی، منٹو، کرشن چندر اور بیدی کی کتابوں نے ان کی سوچ کو ترقی کی ڈگر پر ڈال دیا۔ گھر کے نامساعد حالات کی وجہ سے ایم اے او کالج لاہور میں اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے اور تلاش روزگار میں وطن چھوڑ کر ملک سے باہر جانا پڑا۔ اس دوران انہوں نے مطالعے کا سلسلہ جاری رکھا اور کائنات کا اسرار معلوم کرنے کے لئے 'کاسمالوجی' کی کتابوں میں دلچسپی لینے لگے۔ ایم سلیم صاحب نے اپنی زندگی خود بنائی اور اپنے ذہن میں ابھرنے والے سوالات کو بھی خود حل کرنے کی کوشش کی۔ اب وطن واپس آ گئے ہیں اور ریٹائرمنٹ کی زندگی کتابوں کی معیت میں

بسر کر رہے ہیں۔ دیارِ غیر میں وطن سے خط و کتابت کرنا ان کا شوق ہے۔ ان کی کتاب 'پراسرار کائنات کا معمّہ' پر علی عباس جلال پوری، جوگندر پال، وزیر آغا، ائیر مارشل (ر) محمد احمد چوہدری، ڈاکٹر خیال امروہی، شوکت علی صدیقی، ڈاکٹر مبشر اور رشیدہ ملک وغیرہ کی آراء ماہنامہ الحمرا کی جنوری 2012 کی اشاعت میں چھپ چکی ہیں۔

1۔ پراسرار کائنات کا معمّہ صرف 52 صفحات پر مشتمل مختصر سی کتاب ہے جو سیالکوٹ سے ستمبر 1990ء میں شائع ہوئی تھی۔ ایم سلیم صاحب نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ سائنس میں کوئی بھی نظریہ حتمی اور حرفِ آخر نہیں ہوتا اور سائنس کی اس وسیع القلبی کی وجہ سے سائنسی میدان میں نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے ہیں۔ اپنی اس کتاب کو بھی انہوں نے اس سلسلے میں ایک کڑی شمار کیا ہے۔ چند ابواب کے عنوانات یہ ہیں:

☆ نظریہ بگ بینگ کی حقیقت ☆ کہکشاؤں کی کثافت ☆ ہائیڈروجن کہاں سے آتی ہے؟
☆ مادے کی پیدائش ☆ کہکشاؤں کی عمر وغیرہ وغیرہ

یہ کتاب مزید مطالعے کے شوق کو مہمیز کرتی ہے تو دوسری طرف ایم سلیم صاحب کے اخذ کئے ہوئے نتائج پر تحیر کی افزائش بھی کرتی ہے۔

2۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے یہ بات اپنے فطری انکسار کے تحت لکھی ہے، بلاشبہ انہوں نے ایم اے کی ڈگری اقتصادیات میں حاصل کی لیکن عملی زندگی میں ان کے مکالمے کا مدار پھیلتا چلا گیا اور اس میں سائنس بالخصوص طبیعیات کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔ ان کے کثیر الجہات مطالعے کے نقوش ان کی متعدد کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں اور وہ داعیانِ علم سے ڈائیلاگ کرتے ہوئے خوشی محسوس کرتے ہیں۔

3 ۔ ڈاکٹر وزیر آغا سوال کو زرخیز دماغ کا قیمتی حاصل قرار دیا کرتے تھے ۔ انہوں نے رسالہ 'اوراق' جاری کیا تو اس میں بھی ایک مستقل عنوان 'سوال یہ ہے' قائم کیا۔ اس عنوان کے تحت ادب کے کسی اہم موضوع پر کوئی ممتاز ادیب سوال اٹھاتے اور پھر ہندوپاک کے چند نامور ادبا اس سوال کی روشنی میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔ اس میں ایک خیال انگیز 'مذاکرہ' صورت پذیر ہو جاتا۔ اوراق کے یہ مذاکرے (سوال یہ ہے) کتابی صورت میں چھپ چکے ہیں۔

3۔ Big Bang تخلیق کائنات کی ایک بنیادی نظریاتی اصطلاح ہے۔ اس نظریے کے مطابق یہ کائنات ایک بہت بڑے دھماکے سے وجود میں آئی تھی۔ اس دھماکے سے ہماری زمین کا چھوٹا سا ٹکرا وسیع تر کائنات کے وجود میں الگ ہو گیا تھا اور پھر اس زمینی خطے پر انسانی وجود کی افزائش ہوئی تھی لیکن اب کہا جا رہا ہے کہ کائنات کسی ایک نقطے یعنی Point of Simulation سے وجود میں نہیں آئی تھی بلکہ دو ابعادی Quantum Fluctuation پیدا ہوئی تھی۔

وزیر آغا نے کائنات کے اس اسرار پر 'اوراق' دسمبر 1990 کے اداریے میں خیال انگیز بحث کی ۔ان کی رائے میں کائنات کو بے نقاب کرنے کیلئے تا حال انسان نے تین تجربات کیے ہیں:

اوّل: منطقی تجربہ
دوئم: عارفانہ تجربہ
سوم: جمالیاتی تجربہ

منطقی اور جمالیاتی تجربے کو تو جدید دور کے اذہان نے قبول کرنے میں تاخیر نہیں کی لیکن عارفانہ تجربے پر سیکولر ذہن کے لوگوں اور بالخصوص ان لوگوں نے جن کی تربیت مارکسزم کے گہوارے میں ہوئی' نے اعتراض بھی اٹھایا ہے کہ اس تجربے کے ڈانڈے روحانیت سے جا ملتے ہیں جو مشرق کا مزاج ہے اور حقیقتِ عظمیٰ میں یقین کامل رکھتا ہے۔

سیّد علی عبّاس جلال پوری کا خط ڈاکٹر وزیر آغا کے نام
نسیم پارک، ساندافورڈ
ساندافورڈ، لاہور
(تاریخ درج نہیں)
مکرّمی آغا صاحب! دعائے سلامتی

آپ کا خط ملا۔ میں سکون و فراغت کی تلاش میں گاؤں جا رہا ہوں، اب لاہور میں میرے لئے کشش کا کوئی سامان نہیں رہا، ذہنی فکری لحاظ سے یہ شہر بانجھ ہو چکا ہے، قیل و قال کی مجالس تو بہت ہیں لیکن صاحب بصیرت اور اربابِ فکر کا فقدان محسوس ہوتا ہے۔ مشاعروں اور کم سواد عطائیوں نے قیامت برپا کر رکھی ہے، ایک دوسرے کی تعریفیں کر کے اپنا اپنا 'امیج' بنانے کی فکر میں ہیں اور تھوڑی بہت Recognition کم نظروں سے مل جاتی ہے تو اس 'امیج' کو ریڈیو، ٹیلی ویژن پر بیچنا شروع کر دیتے ہیں۔ مطالعے اور تفکّر سے عاری محض ہیں اور ہر شخص کو اپنی ہی سطح پر کھینچ لانا چاہتے ہیں۔

یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ نے اقبال کی کتاب لکھی ہے۔ اس کا موضوع تو بتایا ہی نہیں۔ مجھے بھی کہلوایا گیا تھا کہ اقبال پر کوئی کتاب لکھوں لیکن میں نے انکار کر دیا۔ اقبال کی فکر کے بارے میں جو کچھ مجھے کہنا تھا وہ میں نے اقبال کے علم الکلام میں کہہ دیا ہے۔ رہی اس کی شاعرانہ عظمت تو اس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن مجھے فرصت نہیں ہے۔ اب پنجابی کتاب کا موضوع 'پنجابی کے صوفی شاعر اور وحدت الوجود' چنا گیا ہے۔ دو ایک ماہ میں چھپ گئی تو آپ کو بھیجوں گا۔ اس میں میں نے اپنی ماں بولی کا قرض اتارنے کی کوشش کی ہے۔

'اردو زبان' کے تازہ شمارے میں محمد احسن فاروقی کا مضمون 'ادب اور تحریک' نظر سے گزرا۔ اس میں فرماتے ہیں کہ ''بقراط کا یہ خیال تھا کہ کائنات تمام حرکت میں ہے۔'' ان صاحب کو معلوم نہیں کہ بقراط طبیب تھا فلسفی نہیں (اصل میں ہپا کریٹس)۔ اسے طبِ یونان کا بابا آدم مانا گیا ہے فلاسفہ میں اس کا شمار نہیں ہوتا۔ یہ خیال کہ تمام کائنات حرکت میں ہے' ہیراکلیٹس کا ہے۔

میں شاید چھ ماہ (یا) برس بھر یہاں قیام کروں۔ میرے چھوٹے بیٹے نے بی اے فائنل کا امتحان

دینا ہے اور وہ سیاسی آشوب کی وجہ سے التوا میں پڑ گیا ہے۔ اس کی فراغت تک گاؤں نہیں جا سکوں گا۔ جب آپ یہاں تشریف لائیں گے تو ملاقات کی کوئی سبیل پیدا ہو جائے گی۔

(نوٹ: ڈاک لفافے پر لگی ہوئی مہر پڑھی نہیں گئی۔ یہ خط غالباً مئی 1977ء میں لکھا گیا تھا) فقیر علی عباس جلالپوری۔

حاشیے:

مکتوب نگار: علی عباس جلال پوری اردو کے ممتاز ادیب، مفکرّ اور دانشور تھے۔ 1914ء میں ضلع جہلم کے ایک دور افتادہ شہر نما قصبہ جلال پور جٹاں میں پیدا ہوئے۔ ان کا فطری رجحان فلسفے کی طرف تھا اور ان کا ذہن فطرت کے اسرار کو کھولنے کیلئے نئے نئے سوالات کو جنم دیتا رہتا تھا۔ انہوں نے فلسفے میں ایم اے کی ڈگری پنجاب یونیورسٹی سے لی۔ اس کے علاوہ اردو اور فارسی میں بھی ایم اے کی سند افتخار حاصل کی۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کے لئے تدریس کا شعبہ اختیار کیا اور زندگی کے اخری لمحات تک کتاب کے ساتھ رشتہ قائم رکھا اور فلسفیانہ موضوعات پر کتابیں تالیف کرتے رہے۔ ان کی معروف کتابوں میں 'روح عصر، روایات فلسفہ، تمام فکری مغالطے، کائنات اور انسان، روایات تمدن قدیم، جینیاتی مطالعے، مقالاتِ جلال پوری اور خرد نامہ جلال پوری' شامل ہیں۔ علی عباس جلال پوری کے ادبی موضوعات میں اقبالیات کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ اقبال کا علم الکلام ان کی مشہور اور بے حد متنازعہ کتاب ہے۔ علی عباس جلال پوری کی ماں بولی پنجابی تھی۔ عمر کے آخری حصے میں انہوں نے 'وحدالوجود تے پنجابی تے دی' کے عنوان سے پنجابی میں کتاب میں لکھ کر اپنی ماں کا حق ادا کرنے کی کوشش کی۔ ان کی پیشہ ورانہ زندگی سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور میں طلبا کو رموز تعلیم سکھانے اور تدریس کا سبق دینے میں گزری۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اپنے گاؤں جلال پور شریف چلے گئے تھے۔ زندگی کے آخری برسوں میں ان پر فالج کا حملہ ہوا لیکن قابل کام صحت دوبارہ نصیب نہ ہو سکی۔ 7 دسمبر 1997ء کو وفات پا گئے۔

1۔ سید علی عباس جلال پوری سے ڈاکٹر وزیر آغا کا رابطہ و تعلق رسالہ ''ادبی دنیا'' کے دور پنجم میں شریک مدیر ہونے کی حیثیت میں قائم ہوا اور یہ زندگی بھر قائم رہا۔ دونوں کا آپس میں معاملہ بالعموم ادب اور عمرانیات کے اختلافی مسائل پر ہوتا تھا۔ اتفاق رائے کبھی نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اختلاف رائے تہذیبی دائرے میں ہوتی اور اگلی ملاقات کی تشنگی برقرار رہتی۔ سید صاحب ایک ادبی رسالے کے دفتر میں مدیر کے دوستوں کی منڈلی میں باقاعدگی سے سر شام بیٹھتے تھے لیکن شرکائے محفل کی بصیرت کے فقدان اور لطیفہ گوئی میں غیر معمولی دلچسپی پر ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم کی مثال بنے بیٹھے رہتے۔ وہ شہرت گریز مزاج کے علم دوست ادیب تھے اور اپنے بلند ادبی مقام کی نہ صرف پاسبانی کرتے بلکہ اہل محفل کو اپنے نئے مطالعوں سے منور کرنے کی کوشش بھی کرتے۔ ان کی باتیں سننے والوں کے سروں کے اوپر سے گزر جاتیں تو کبھی کبھی مایوس بھی ہو جاتے۔ ڈاکٹر وزیر آغا سے ملاقات ہوتی تو خوش سے کھل اٹھتے اور آغا صاحب کی زبان سے نئی کتابوں اور مغرب کے نئے فلسفوں کا تذکرہ سن کے ان کی

آنکھیں مسرت سے چمک اٹھتیں لیکن اپنا نقطہ اختلاف اٹھانے سے گریز نہ کرتے اور محفل میں شامل لوگ دونوں کی بحث سے خوب استفادہ کرتے۔ علی عباس جلال پوری ان ادیبوں سے یکسر مختلف تھے جو ادب کے اختلاف کو ذاتی اختلاف قرار دے کر قطع تعلق کر لیتے تھے۔ اس خط میں قیل و قال کی مجالس سے ان کی مراد حلقہ ارباب ذوق' حلقہ ارباب علم اور ترقی پسند مصنفین کی ہفتہ وار ادبی محفلیں نہیں بلکہ ادبی رسائل کے دفاتر میں سر شام منعقد ہونے والی محفلیں ہیں جن میں شریک ہونے والے رسالے کے مدیر کی تخلیقات پر تعریفوں کے ڈھونگرے برساتے اور ان سے اختلاف کرنے والوں کو بے تحاشا لتاڑتے تھے۔ علی عباس جلال پوری کیلئے یہ سب کچھ سوہان روح تھا۔ آخر ایک دن کسی ناہنجار نے انہیں بھی ذاتی طنز کا ہدف بنا لیا اور وہ اتنے دل برداشتہ ہوئے کہ پہلے محفل سے اٹھ گئے اور پھر لاہور کو ہی خیر باد کہہ دیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان پر فالج کے حملے کا باعث یہ ذاتی ناروا دشنام آلود طنز تھا۔ ان کا ملال یہ تھا کہ ادب کی عاشقی میں عزت سادات بھی سلامت نہ رہ سکی تھی۔

2۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر اپنا امیج بیچنے والے ادیب ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے مسترد ہوتے ہی گمنامی میں گم ہو گئے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ دہلی کی ایک ادبی محفل میں چائے کی میز پر بھارتی ادیبوں نے بتایا کہ پاکستان ٹی وی پر جب فلاں عنوان کا ڈراما ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے تو بازار بند ہو جاتے ہیں اور لوگ یہ ڈراما دیکھنے کیلئے ٹیلی ویژن کے گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ لیکن اب پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ گیا ہے۔ یہ ڈراما اور اس کے مصنف قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔ بظاہر زندہ ہیں لیکن ٹی وی کی زبان میں زندوں میں شمار نہیں ہوتے۔ اس کے برعکس ساہی وال کے دور افتادہ مقام پر وفات پانے والے شاعر مجید امجد جو کبھی سلور اسکرین پر نہیں دیکھے گئے' اپنی خلوت میں محو سخن آرائی رہے اور اب ان کے نئے نئے گوشے دریافت کئے جا رہے ہیں۔

3۔ وزیر آغا کی اس کتاب کا عنوان 'تصورات عشق و خرد، اقبال کی نظر میں' ہے۔ یہ کتاب اقبال اکیڈمی لاہور نے لکھوائی تھی اور اس وقت تک اقبال کے فلسفہ و فکر پر لکھی جانے والی چند بہترین کتابوں میں شمار کی گئی تھی۔ بھارت کے ممتاز ماہر اقبالیات جگت ناتھ آزاد نے اس کتاب پر رائے دیتے ہوئے لکھا:

''اس کتاب (تصورات عشق و خرد' اقبال کی نظر میں) میں اوّل سے آخر تک وزیر آغا نے جس مسئلے پر بحث کی ہے، کھلے دل سے کی ہے اور کہیں بھی پہلے سے اخذ کئے ہوئے نتائج کے ثبوت میں دلائل پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ مہاتما بدھ کے فلسفہ نروان کا ذکر ہو یا ابن سینا کے مقولات کا' ابن عربی کے نظریے وحدت الوجود کی بات ہو یا جلال الدین رومی کے تصورات تصوف کی' حضرت امام ربّانی کے مکتوب پر بحث ہو یا اسپنگلر کے زوال مغرب پر' کہیں بھی وزیر آغا نے بندھے ٹکے نظریات پیش نہیں کیے بلکہ انہیں فکر زندگی کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی۔''

اس کتاب کے پاکستان اور ہندوستان میں کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔

ممتاز مفتی کا خط انور سدید کے نام
مکان نمبر 24، گلی نمبر 32
ایف 16، اسلام آباد
22 دسمبر 1986

انور سدید' آج میں تمہارا مضمون پڑھتا رہا اور شرمندہ ہوتا رہا کہ گولیور Gulliever بالشتیے کی بات کرتا ہے ویسے اندر اندر، چوری چوری، خوشی سے غبارے کی طرح پھولتا بھی رہا، انسان بھی کیا شے ہے جو بہ یک وقت ہنستا بھی ہے، روتا بھی ہے۔ اس شام میں نے کیا حماقت کی۔ مچ ایڈو اباؤٹ نتھنگ، کہہ کر سب کچھ ملیا میٹ کر دیا۔ ان اصحاب کا شکریہ تک ادا نہیں کیا جنہوں نے اپنا وقت ضائع کر کے ایسے اچھے مضامین لکھے تھے۔

اب تم مجھے اجازت دو کہ تمہارے دونوں مضامین ''اوکھے لوگ'' کی دوسری ایڈیشن میں شامل کرلوں۔ ایک یہ جو تم نے مجھ پر لکھا ہے' ایک وہ جو میں نے تم پر لکھا تھا۔ میرے لیے دعا کرو کہ اللہ مجھے توفیق دے، ایلی کا دوسرا حصہ 'الکھ نگری' لکھ لوں اور اسے تاثیر بخشے۔

مکتوب نگار: ممتاز مفتی اردو ادب کے نامور افسانہ نگار، خاکہ نگار اور سفر نامہ نویس تھے۔ ان کی آپ بیتی ''علی پور کا ایلی'' اور ''الکھ نگری'' کے عنوانات سے چھپ چکی ہے۔ 1905ء میں بٹالہ ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے۔ 1929ء میں اسلامیہ کالج لاہور سے بی اے کیا۔ تدریس کی تربیت سینٹر ٹریننگ کالج لاہور سے حاصل کی اور عملی زندگی محکمہ تعلیم سے شروع کی۔ ممتاز مفتی فطری کہانی نگار تھے، ان کا پہلا افسانہ جھکی جھکی آنکھیں رسالہ 'ادبی دنیا' میں شائع ہوا۔ قدرت اللہ شہاب وفاقی سیکریٹری بنے تو ممتاز مفتی کو وزارت اطلاعات میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ اس دوران وہ بمبئی میں فلمی دنیا کا چکر بھی لگا چکے تھے اور 'ادب لطیف' کے علاوہ رسالہ استقلال کی ادارت بھی کر چکے تھے۔ ان کہی چپ، اسمارائیں، گہما گہمی، گڑیا گھر، غبارے، روغنی پتلے وغیرہ ممتاز مفتی کے افسانوں کی مشہور کتابیں ہیں۔ 'لبیک' ان کا حج نامہ ہے اور 'ہند یاترا' بھارت کا سفر نامہ۔ اس پر مستزاد خاکوں کے مجموعے 'پیاز کے چھلکے، اوکھے لوگ'۔ ممتاز مفتی کی آخری کتاب ''تلاش'' تھی۔ ممتاز مفتی 27 اکتوبر 1995ء کو اس دنیا سے اٹھ گئے۔

1۔ ممتاز مفتی پر میرا مضمون ڈاکٹر وزیر آغا کے رسالہ ''اوراق'' میں شائع ہوا اور مفتی صاحب نے اپنی کتاب ''اوکھے لوگ'' میں بھی شامل کیا تھا۔

2۔ ممتاز مفتی کی علی پور کا ایلی جو پہلے ایک ناول سمجھا گیا تھا لیکن پھر یہ حقیقت کھلی کہ یہ مفتی صاحب کی خودنوشت سوانح عمری تھی اور کرداروں کے نام بدل دیئے گئے تھے۔ الکھ نگری اس کا دوسرا حصہ ہے۔

۞۞۞

عشقی صاحب

(بیگم الیاس عشقی اور روزی الیاس کے تعاون سے مرتب کردہ شخصی خاکہ)

حسن منظر

الیاس عشقی صاحب کی زبانی جھپٹ ادبی ذوق رکھنے والے افراد سے زندگی میں ان گنت بار ہوئی ہوگی لیکن اس میں شک ہے کہ ان میں سے کوئی بھی ان سے بعد میں نفرت کرنے لگا ہوگا۔ وہ خود بھی چند گھڑی بعد اس جھپٹ کو بھول جاتے تھے اور جب وہ دوبارہ اس شخص سے ملتے تو اس طرح جیسے دونوں کے مابین کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ عشقی صاحب یوسف زئی پٹھان تھے۔

محمد الیاس خان یعنی الیاس عشقی کے والد محمد اسماعیل رزی تخلص کرتے تھے۔ جے پور میں رہ بسنے والے خاندان سے تھے۔ اردو، فارسی، عربی کے عالم تھے اور پیشے کے لحاظ سے استاد جو اپنی داستان گوئی کیلئے بھی بچوں اور ملنے والوں میں پہچانے جاتے تھے۔ ایک زمانے میں ریڈیو پاکستان حیدرآباد سے ان کا پروگرام قرآن حکیم اور ہماری زندگی نشر ہوتا تھا۔ یہ بیسویں صدی کی ساتویں آٹھویں دہائی کی بات ہے، اچھے شاعر تھے لیکن افسوس اپنے پیچھے انہوں نے کوئی دیوان نہیں چھوڑا، جو اس دور کے بیشتر شعر گویّوں کی روش تھی۔

عشقی صاحب کی والدہ کا نام حافظہ تھا۔

استاد اسماعیل رزیؔ صاحب کے چار چھوٹے بھائی تھے۔ سب نے ریلوے کی ملازمت کی، ان میں سے محمد اسحٰق خان مہدیؔ شاعر تھے۔ ان کی بیٹی ہیں بیگم صبیحہ الیاس۔ یہ بھی غنیمت ہے کہ اسحٰق خان کے بیٹے محمد شریف گو خود شاعر نہیں ہیں لیکن اپنے والد اور تایا کے کلام کو پریس بھیجنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

نانا، دادا اور والد کے صاحبان کلام ہونے کا کچھ بھی اثر عشقی صاحب کی اولاد میں نہیں آیا اور کیسے آتا، گھر میں شعر گوئی، شعر خوانی کا چرچا کب تھا! بچوں میں سے کسی نے انہیں فکر سخن میں غرق کبھی نہ پایا، نہ اس حالت میں جس سے شاعر غزل کہہ لینے اور نظم کے پورا ہو جانے کے بعد گزرتا ہے۔ اغلب یہی ہے کہ عشقی صاحب کھانے کی میز پر بھی کبھی بیوی بچوں سے یہ نہیں کہہ بیٹھتے ہوں گے کہ شعر ہوا ہے

سنو، یا جس طرح میں نے بعض سخنوروں کو ادیبوں، شاعروں کی محفل میں کہتے سنا ہے ”میرا ایک شعر ہے......“ یہ وصف ان میں ان کے والد سے آیا ہوگا‘ اس کا قوی امکان ہے۔

انہوں نے تو کسی ادبی محفل میں اپنے والد بزرگوار کا بھی کوئی شعر، مشاعروں کی ناقابل اصلاح لت لگ جانے والوں کی زبان میں سننے والوں کو کبھی عنایت نہیں کیا۔

تلک چاڑی حیدرآباد کے ماڈرن پولی کلینک کے ایک کمرے میں ایک مختصر اور محدود شعری نشست تھی۔ میزبان نے رزمیؔ صاحب مرحوم سے صدر محفل بننے کی درخواست کی۔ عشقیؔ صاحب ان کے سامنے نیچے فرش پر بیٹھے تھے۔ صاحب صدر کے منہ میں گلوری تھی۔ شعر ہوتے رہے، لوگ داد دیتے رہے۔ پھر ایک لمحہ ایسا آیا کہ عشقیؔ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور مسند کے پاس کھڑے ہو کر انہوں نے اپنے ہاتھ کو اگالدان بنا کر صاحب صدر کے منہ سے لگا دیا کہ وہ اپنی شکل آسان کریں۔

رزمیؔ صاحب اپنا کلام پیش کر چکے تو حاضرین کی فرمائش عشقیؔ صاحب سے مزید کلام سننے کی ہوئی۔ عشقیؔ صاحب نے دوٹوک کہا کہ صاحب صدر کے بعد کسی اور کے کلام پڑھنے کے کیا معنی۔

میں نے کہا ان کے یہاں کھانے کی میز پر اپنے شعر نہ استاد رزمیؔ پڑھتے تھے نہ ان کے پسر الیاس عشقیؔ، میر اور مرزا کے بھی نہیں۔ لیکن یہ نہیں تھا کہ وہاں علمی بحث بھی نہیں چھڑتی تھی۔ چھڑتی تھی جیسا کہ ان کی سب سے بڑی بیٹی روزی نے کہا اور اس میں دونوں ایک دوسرے سے رورعایت نہیں کرتے تھے۔ میرا قیاس ہے اس میں عشقیؔ صاحب جلبلا جاتے ہوں گے۔ اس وقت بیگم الیاس اور بچے انہیں روکتے کہ ابا میاں سے بحث نہ کریں۔

ابا میاں کے انتقال کے کچھ دن بعد ایک شام وہ اور میں، میرے یہاں اندھیرے میں ڈوبے ہوئے لان میں بیٹھے تھے۔ میں ان کے چہرے کو پوری طرح نہیں دیکھ سکتا تھا، لیکن آواز سے پتا چل رہا تھا کہ رو رہے ہیں، میں نے سمجھانے کی کوشش کی۔ بولے میں نے ان کیلئے کیا کیا، کچھ نہیں، سب کچھ انہوں نے ہی میرے لئے کیا۔

عشقیؔ صاحب بڑی صفات کے آدمی تھے۔ والد کی پہلی اولاد تو تھے ہی، ان کے بعد تین بہنیں تھیں، چچاؤں کی اولاد میں بھی سب سے بڑے تھے اس لئے ان کا سلوک سب بہن بھائیوں سے پدرانہ شفقت جیسا تھا، بدلے میں انہیں بھی سب سے محبت اور اطاعت ملی، آ کا میاں کہلائے۔ بڑے بھائی سے جب روزی نے سن کر یہ لقب دہرانا چاہا تو وہ کاکا بن گیا۔ اس طرح پہلے گھر، پھر خاندان اور بعد میں ملنے والوں کے قریبی حلقے میں وہ کاکا کہلانے لگے، یہ کچھ ویسا ہی عمل تھا جیسا گزرے ہوئے زمانے میں، جب خاندان تتر بتر نہیں ہوئے تھے، اکثر گھروں میں دیکھنے میں آتا تھا کہ جس نو بیاہتا کو ساس سسر نے بہو کہنا شروع کیا وہ تاعمر ہر ایک کی بہو ہی رہی۔

عشقیؔ صاحب کا تعلق ایسے خوش قسمت خاندان سے تھا جس کے تمام افراد ایک دوسرے سے ایک خوبصورت پیرہن کے دھاگوں کی طرح آپس میں ملے تھے۔ وہ جسے Joint Family (مربوط خاندان) کہتے ہیں اور میں جس نے زندگی کا بڑا وقت ان کے گاؤں والوں سے نزدیکی میں

گزارا ہے اسے Giant Joint Family کہتا ہوں (جناتی مربوط خاندان)۔ لق ودق خاندان کے افراد ان کے دکھ اور روگ کی ذمہ داری 1990 میں اپنے والد کی زندگانی میں عشقیؔ صاحب نے سنبھال رکھی تھی۔ کوئی بیمار پڑتا تو اُسے بلا کر اپنے پاس رکھتے، دوادارو، جراحت کراتے، ضرورت ہوتی تو مالی مدد بھی کرتے۔ ان کا یہ رویہ ان کی فطرت کا حصہ تھا‘ نمائش کی چیز نہ تھا۔ اپنے اسٹاف کا بھی اتنا ہی خیال رکھتے تھے، دوستوں اور ملنے والوں کی عیادت اور تعزیت سنت ہے، ان کے لئے فرض تھے۔ تعلیم کے زمانے سے عشقیؔ صاحب خاموش طبیعت تھے لیکن متعدد دوست رکھتے تھے۔ جے پور میں اور پاکستان میں بھی، جہاں جہاں رہے لیکن ساتھی اگر تھیں تو کتابیں، ریٹائرمنٹ کے دور میں ان کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ ان کی نیند بھی ریٹائر ہو چکی ہے، کیسے رہتی؟ پوری رات ساٹھ یا سو کے بلب روشن رکھتے تھے جس کی شکایت مجھے مسز عشقیؔ سے سننی پڑتی تھی۔

زمانہ طالبعلمی میں شعر کہنے لگے تھے اور کالم رسالوں میں چھپتا تھا، لیکن مشاعروں میں شریک ہونے کا شوق تھا نہ کھیلوں میں دلچسپی، سائیکل پر تعلیم گاہ جاتے، گھر آتے، کتابوں میں کھوئے رہنے کی وجہ سے خاندان میں مغرور سمجھے جانے لگے تھے اور اسکول کالج میں بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔

روزی الیاس لکھتی ہیں‘ کاکا کی تعلیم ابتدائی سے اعلیٰ تک جے پور کی ہے، مڈل اور اس سے پہلے کے اسکولوں کے نام مجھے معلوم نہیں، مگر میٹرک اور انٹر مہاراجہ ہائی اسکول اور کالج سے کئے، یونیورسٹی کی تعلیم بھی جے پور کی ہے البتہ ڈگری انہیں آگرہ یونیورسٹی سے ملی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ وہاں اس وقت تک اس کا انتظام نہیں ہوا تھا پھر کچھ عرصہ بطور لیکچرر جے پور میں کام کیا لیکن نتیجہ آنے اور ڈگری عطا ہونے سے پہلے تقسیم ہند کا واقعہ پیش آیا اور آدھا خاندان ہجرت کر کے کوٹری پاکستان آ گیا۔

جب کاکا کے گھر والے پاکستان کیلئے روانہ ہوئے تو وہ ریلوے اسٹیشن پر اپنی والدہ اور بہنوں کو ٹرین میں سوار کرا کے خود اتر گئے۔ اس پر ان کی والدہ بھی چھوٹی بیٹی کے ساتھ اتر گئیں باقی لوگ پاکستان روانہ ہو گئے، پاکستان پہنچنے کے کچھ عرصے بعد ان کے والد کا ذہنی توازن بگڑ گیا، حیدرآباد کے سائیکاٹرسٹ ڈاکٹر ابراہیم خلیل جو خود شاعر تھے انہیں پہلے سے شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے، ان کے علاج سے ابا میاں ٹھیک ہوئے۔

بیماری کی اطلاع ملنے پر کاکا اپنی ملازمت چھوڑ کر پاکستان آ گئے، ایم اے کی سند بھی مل چکی تھی۔

بعد میں سننے میں آیا جے پور کے راجا اور رانی گیاتری دیوی ان کے اس طرح نوکری کو لات مار کر چل دینے پر خوش نہیں ہوئے اور اس کا گلہ انہوں نے ان کے وہاں رہ جانے والے بڑوں اور ساتھیوں سے کیا۔

نئے ملک میں وہ ریڈیو پاکستان کی ملازمت کے ساتھ ساتھ اسناد اور کتابیں جمع کرنے میں لگ گئے۔

صبیحہ دختر عم سے شادی ان کیلئے وہ سکون لائی جو شاید کسی جنت کی حور سے بھی نہ ملتا۔ بیوی ان کی فطرت سے پہلے سے واقف تھیں۔ انہوں نے انہیں گھر کی جھنجھٹوں سے ہمیشہ کیلئے فارغ خطی دے دی، بہت سی سمجھ دار بیویاں جن کا تھوڑا بھی زور شوہر پر چلتا ہو، شروع میں ہی اسے باورچی خانے سے

بے دخل کر دیتی ہیں، بیگم عشقی نے انہیں خود اپنے ظاہر سے نشچنت کر دیا، ان کے کپڑے درزی کو گھر بلا کر وہ سلنے کو دیتی تھیں کہ اتنے انگلی ڈھیلا، اتنے انگلی لمبا، کپڑا ابھی خود ہی پسند کرتی تھیں۔ پہلے جوتے خود ٹرائی کرنے جاتے ہوں گے جب بیٹے صاحب، ادیب، جوان ہو گئے تو جوتا ان کے ناپ کا آنے لگا، یعنی کپڑوں، جوتوں کیلئے بازار جانے سے بچ نکلے۔

صبح وشام انہیں آفس جانے کیلئے کپڑے دے دیئے جاتے، موسم کے لحاظ سے صبح آٹھ یا نو بجے ریڈیو اسٹیشن جاتے، دو اور تین کے درمیان واپسی ہوتی، کھانا ہمیشہ گھر پر کھاتے، جو بھی پکا ہو، اس کے بعد کتابوں کی صحبت میں آرام، چھ بجے دوبارہ دفتر جہاں سے دس گیارہ بجے لوٹتے تھے۔ ظاہر ہے جیسا بستر ملے اس پر پڑے رہتے ہونگے۔ مجاز کا کہنا تھا کہ انہیں والدین سعادت مند ملے تھے۔ میرا خیال ہے کہ صبیحہ الیاس کو شوہر سعادت مند ملے تھے۔

عشقی صاحب کیلئے میں غلط محاورہ استعمال نہیں کرونگا کہ پرلے درجے کے مہمان نواز تھے، وہ اعلیٰ درجے کے مہمان نواز بھی تھے اور میزبان نواز بھی۔ گھر میں جو بھی پکا ہو اس کیلئے انہیں روکا جا سکتا تھا۔ اپنے گھر میں بھی ہر چیز شوق سے کھاتے تھے لیکن جو سامنے ہو، اگر کھانے کا ڈونگا ذرا دور رکھا ہو اور کوئی نکال کر نہ دے تو ہاتھ بڑھا کر نہیں لیتے تھے۔ روسی سنے میٹوگرفر، پڈوفکن V.I PUDOVKIN کی کتاب فلم ایکٹنگ میں ایک سین کا ذکر آتا ہے کہ چنگیز خان یا (کسی اور منگول جنگجو) سے دستر خوان پر روسٹ دور تھا اس نے تلوار نکالی اور اس میں گھونپ کر اپنے سامنے کر لیا۔ یہ ٹکڑا انہوں نے مجھے کئی بار سنایا تھا، ان کا دور رکھی ہوئی قاب کی طرف ہاتھ نہ بڑھانے کا تعلق اس ناگواری سے لگتا ہے کہ جو انہیں پڈوفکن کی تحریر پڑھتے ہوئے محسوس ہوئی ہوگی، یا دستر خوان کی تہذیب شناسی اور ناشناسی ہو سکتا ہے، ان میں ماں باپ کے گھر کی دین ہو۔

غالباً 1904 میں بیگم عشقی کے کہنے کے مطابق آخری دنوں میں جب وہ اپنی کتابوں کا ذخیرہ ملتان منتقل کرانے پر آمادہ تھے پڈوفکن کی دونوں کتابیں باوجود خواہش کے میں ان سے نہ مانگ سکا، ان کی خواہش کئی کتابوں کے بارے میں تھی کہ میں لے لوں۔

ذکر تھا کھانے میں ان کی پسند ناپسند کا، بیگم عشقی اور روزی کا کہنا ہے وہ چاہتے تھے کہ روٹی اس وقت توے پر ڈالی جائے جب سب کھانے کی میز پر آ بیٹھیں۔ اچھی روٹی، وہ کہتے تھے آدمی پانی اور چٹنی سے کھا سکتا ہے۔ ان کے یہاں زیادہ افراد کے کنبوں کی طرح روٹی گیارہ بجے تک پک چکتی تھی، لٰہذا بڑی بیٹی نے روٹی پکانی سیکھی۔

جانداروں میں جبلت ہوتی ہے، بچوں کو سمیٹ کر اپنے (پروں میں) پاس رکھنے کی، وہ عشقی صاحب میں قدرت نے کچھ زیادہ ہی رکھی تھی۔ اس حد تک کہ چاہتے تھے کہ شادی کے بعد بیٹوں کے مکان، ان کے نزدیک پاس پاس ہوں، دور نہ ہونے پائیں۔ گھر میں وہ مطالعے میں مصروف اور بیوی بچے آس پاس ہوں، بڑے ہونے کے بعد بھی مغرب کے بعد بچوں کو کہیں جانا ان کی مرضی کے خلاف ہوتا تھا۔ ریٹائرمنٹ سے پہلے کے دنوں میں اگر ان میں سے کسی کو کہیں جانا ہو اور وہ ماں سے اجازت

طلب کرے تو وہ کہتیں کا کا سے پوچھو، اور بات اتنے ہی پر ختم ہو جاتی تھی۔

میں نئے ملنے والوں کی طبیعت کا اندازہ اس سے لگا لیتا ہوں کہ وہ جہاں گئے ہیں وہاں کا بچہ، یا جو بچہ ماں باپ کے ساتھ ان کے گھر آئے، اگر ان کی طرف بڑھے تو اس سے کس طرح پیش آتے ہیں، کچھ کھسیانے سے، جھوٹے منہ بچے کو پچکارتے ہوئے پیچھے ہٹتے جاتے ہیں، ڈر رہے ہوتے ہیں بچہ پتلون کی کریز خراب نہ کر دے، یا ان کے گھٹنوں کو پکڑ کر کھڑے ہونے کی کوشش میں سفید کپڑے پر داغ نہ لگا دے، اچھا اچھا کہہ رہے ہوتے ہیں لیکن بچہ بڑا فطرت شناس ہوتا ہے، اسے یہ بھانپ لینے میں ایک لمحہ نہیں لگتا کہ یہ صاحب بے مروت ہیں۔

عشقی صاحب میں بچوں کیلئے مقناطیس لگے تھے، اس سے فرق نہیں پڑتا تھا کہ اپنے ہیں یا محلے کے۔ ان کا' کتابوں پر قلم سے چیل کوے بنانا بھی انہیں ناگوار نہیں ہوتا تھا، لیکن یہی کام اگر کوئی بڑا کرتا تو؟

ویسے کتابیں مستعار دینے میں دریا دلی دکھاتے تھے اور دوسروں سے جو کتابیں لیتے تھے کیا مجال ہے جو ادھر ادھر ہو جائیں۔ بیگم عشقی کو حیدر آباد کی مٹی اور ہوا سے الرجی ہے اور بقول روزی صفائی کا میراق۔ کا کا کو ان کی صفائی کی عادت سے چڑ تھی، کیونکہ اس سے کتابوں کی ترتیب بگڑ جاتی تھی، اکثر یہ وجہ ان کی ناراضگی کی ہوتی تھی۔

بڑے ہونے کے بعد بچوں کی سمجھ میں آیا کہ کا کا کو ہوّا بنانے میں امی کا بڑا ہاتھ ہے، ورنہ وہ ہر ایک بیٹی سے اتنی محبت کرتے تھے کہ ایک ہر ایک نے یہی سمجھا کہ انہیں سب سے زیادہ اسی سے محبت ہے۔

سالوں انہوں نے بچیوں کے نام رسالے جاری کرائے، ایم اے کے زمانے میں روزی کو انگلش پڑھائی اور مطالعے کیلئے کتابیں نکال نکال کر دیتے تھے۔

عشقی صاحب نے زندگی میں بس دو ملازمتیں کیں۔ جے پور میں تعلیم کے شعبے میں' پاکستان آ کر ریڈیو پاکستان کی۔ دوسری زیادہ تنخواہوں والی نوکریوں کی طرف نہیں دوڑے، پاکستان سے باہر اس لئے نہیں گئے۔ 1982 میں ملازمت سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد مزاج میں کچھ تبدیلیاں آ گئی تھیں، ٹیلی ویژن دیکھتے، بیوی بچوں کے ساتھ رشتے داروں سے ملنے والوں کے گھر جانے لگے، ریسٹورنٹ بھی، ملازمت کے دوران ملک سے باہر جانے کی خواہش نہیں ہوئی کیونکہ گھر والوں سے دوری پسند نہیں تھی، بعد میں جے پور بھی گئے اور بیوی کے ساتھ بیٹے کے پاس آئرلینڈ اور سعودی عرب بھی، حج بھی کیا۔

ان کے مزاج میں مذہبی شدت پسندی نہیں تھی، بزرگوں کے مزار پر حاضری دیتے تھے، ان میں حضرت شمس تبریزی اور حضرت بہاؤالدین ذکریا کے مزاروں پر گھر کے افراد کے ساتھ حاضر ہونا شامل ہے، شاہ عبداللطیف کے مزار پر بھٹ شاہ بھی گہری عقیدت کے ساتھ حاضر ہوتے تھے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان مرحوم ان پر بہت مہربان تھے، سندھ یونیورسٹی اولڈ کیمپس سے وہ لطیف

آباد نمبر 9 کے قبرستان بیوی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاتے تھے، راستے میں عشقی صاحب کا گھر بھی پڑتا تھا، کبھی کبھی ان کی خیریت معلوم کرنے کیلئے رک جاتے تھے، عشقی صاحب ان کی بہت عزت کرتے تھے، لیکن مرید کسی کے نہیں تھے۔ غلام مصطفیٰ خانصاحب ٹونک کے رہنے والے تھے جہاں کی روزی کی نانی بھی تھیں، رشتے میں ان کی پھوپھی ہوئی۔

ذہین شاہ تاجی عشقی صاحب کے دوستوں میں سے تھے ڈاکٹر مالویہ، پروفیسر سلویسٹر وغیرہ ان کے جے پور کے دوستوں میں سے تھے۔

عشقی صاحب جے پور سے صرف ایم اے کی سند لے کر آئے تھے۔ باقی دو ایم اے اور ڈاکٹریٹ کی اسناد انہوں نے پاکستان میں چلتے پھرتے بٹور لیں۔ انہیں ان کے کثرت مطالعہ کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔ 1940 میں جے پور میں Certificate of Honour ملا تھا، 1965 کی جنگ کے دور کی خدمات پر انہیں Certificate of Merit سے نوازا گیا، HISTORICAL A CAVALCADE: MEHRAN THROUGH AGES پیش کرنے پر حسن کارکردگی کی سند ملی اور جب 2001 میں ستارہ امتیاز انہیں دیا گیا تو بیشتر ادیبوں نے ایک ادبی جلسے میں، جو اُن کے اعزاز میں منعقد کیا گیا تھا یہی کہا، یہ انعام تو بہت پہلے انہیں دیا جانا چاہئے تھا۔

عشقی صاحب سیاست کے کسی شہ سوار سے متاثر نہیں تھے لیکن جب بجلی جاتی تھی تو ان کی سوئی ہوئی سیاست کی رگ پھڑک جاتی تھی۔ ایوب خان سے لے کر وقت حاضر تک کے ہر سلطان کو انہوں نے ہمیشہ خوب صلواتیں سنائیں، ایک بجلی کا انتظام ٹھیک نہیں کرسکتے، حکومت کیا خاک کریں گے، سیاست سے ان کا بس اتنا تعلق تھا اور میرا خیال ہے اس تلخی کے پیچھے یہ گلہ چھپا ہوتا تھا کہ پڑھنے کا وقت نکلا جارہا ہے۔

عشقی صاحب میں بڑا وصف یہ تھا کہ وہ محبت کرنے والے انسان تھے، سب پر مہربان، سب کی خدمت پر کمربستہ۔

سید نورالحسن بلگرامی، ڈاکٹر سید حامد حسین بلگرامی مترجم قرآن کے چھوٹے بھائی، دماغی مریض تھے اور مرض بھی وہ جس میں آدمی کچھ مہینوں گہری افسردگی کے سیاہ بے موج پانی میں ڈوبا رہتا ہے کبھی جب اس کیفیت سے باہر نکلتا ہے تو ہر قسم کی رکاوٹوں کو پھاندجاتا ہے، وہ عشقی صاحب کے مداحوں میں سے تھے اور عشقی صاحب دوستی بنانے میں کبھی ان سے دوقدم پیچھے نہیں رہے۔ ایک دن عشقی صاحب کے گھر افسردگی کے دور میں گئے، ان کے یہاں ایک بڑے دل نشین بھرت کے کٹورے میں ڈگڈگا کے پانی پیا اور کٹورے کی پانی سے زیادہ نہیں تو کم تعریف بھی نہیں کی۔ وہ کٹورا شاید عشقی صاحب کے خاندان میں چلا آتا تھا، عشقی صاحب نے اسے فوری صاحب کی نذر کردیا۔

سندھ یونیورسٹی میں تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر احمد بشیر ان کے دوست بھی تھے اور جھڑپ میں ان کی خفگی بھی سہہ جاتے تھے، ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے، 1973 کے بعد کے دنوں میں جب میں نے انہیں دیال داس کلب حیدرآباد کی ادبی نشستوں میں دیکھنا شروع کیا وہ اپنی تحریر مشکل سے پڑھ پاتے

تھے، بیوی کا انتقال ہوچکا تھا، ساتھ دینے کو ایک بیٹا رہ گیا تھا جو زیادہ سمجھدار نہیں تھا، نابینا ہوجانے پر اپنے شہر قصور لوٹ گئے۔ پھر ایک وقت آیا کہ ان کی شدید بیماری کی خبر آئی، عشقی صاحب ریٹائرڈ ہوچکے تھے اور ان کی مکمل صحت کا زمانہ بھی کہیں پیچھے رہ گیا تھا، لیکن ڈوگر صاحب کو دیکھنے قصور پہنچے۔

ادبی نشستوں میں یا جب ادیب شاعروں کے ساتھ بیٹھے ہوں کسی کے ادبی کام کے بارے میں جو دل میں ہوتا کہتے تھے، یہی روش غالبؔ اور مومن کے ساتھ تھی دوسرے کے کام پر رشک کرتے انہیں دیکھا جاسکتا تھا، اس سے حسد نہیں کرتے تھے، جس سے تعلقات منقطع ہوچکے ہوں اس تک کی اگر نئی کتاب آئے تو خرید کر پڑھتے تھے اور سراہے جانے کے لائق ہو تو سراہتے بھی تھے۔ یہ وصف بہت کم لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر ان سے صغیر سپنو کے مسودوں کو پڑھنے اور درستی کا کام بھی لیا جاسکتا تھا اور ترجمہ کرنے کا بھی۔

آخری بات، عشقی صاحب جاگنے کا بڑا وقت مطالعے پر صرف کرنے اور فکر میں ڈوبے رہنے والے آدمی تھے، تبادلہ خیال میں حصہ لینے والے نہیں، اگر ملاقات میں کوئی بحث اٹھ کھڑی ہوتی تو وہ ہتھے سے اُکھڑ جاتے تھے، یا گفتگو میں ایسی بات کے آجانے پر جو دوسرے نے وثوق سے کہی ہو اور انہیں بحث طلب نظر آئے۔ میرا خیال ہے کہ کثرت مطالعہ نے اس کیلئے انہیں تیار ہی نہیں ہونے دیا تھا، بحث چھڑ جانے پر وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا ذہن چاہتا تھا کہ مدمقابل کسی طرح فوراً خاموش ہوجائے، تاکہ اس مشکل سے جسے بحث کہتے ہیں وہ نکل سکیں، بحث کے شہ اور مات ہوجانے کے بعد وہ ایسے ہوجاتے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے، کچھ ویسا ہی حال ہوتا تھا، جو بجلی کے جانے اور کھانے کی میز پر ابا میاں سے بچنے کے دوران ہوتا ہوگا، مگر ٹوکنے کیلئے ہر جگہ تو بیٹیاں ساتھ نہیں ہوتی تھیں۔

دریا کو نہیں خیال اپنا
پانی میں اک آسمان بھی ہے
(منجمد پیاس۔ احسن سلیم)

فکرِ اقبال: مغرب سے تصادم کا الزام

(دسواں حصہ)

انیس اکرام فطرت

کیا سناتا ہے مجھے ترک و عرب کی داستاں
مجھ سے کچھ پنہاں نہیں اسلامیوں کا سوزوساز
لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیل
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز
(طلوع اسلام)

مسلمانوں سے میراثِ خلیل کے ''چھن جانے'' سے متعلق مصنف کی منطق بے معنی اور نا قابل فہم ہے۔ کیونکہ درج بالا اشعار میں ''چھن جانے'' کا کوئی اشارہ تک موجود نہیں ہے۔ ''لے گئے'' یا ''لے جانے'' اور چھن جانے میں فرق کو ایک عام تھوڑا بہت پڑھا لکھا شخص بھی سمجھتا ہے۔ دراصل ''چھن جانے'' کہنے میں تصادم اور مخاصمت کی تہمت فکرِ اقبال پر آسانی سے لگائی جاسکتی ہے' اسی لئے مصنف نے جان بوجھ کر یہ الفاظ اشعار کی تشریح میں شامل کئے ہیں۔

اس میراث کے وارث ترک و عرب مسلمان تھے کہ جنہوں نے مادی علوم وفنون میں زبردست ترقی کی اور اقوام عالم میں ممتاز ہوئے اور انسانیت کو نسخہ ہائے کیمیا عطا کئے۔ اس میراث پر مغربی تمدن نے اپنی بنیادیں استوار کیں مصنف کہتے ہیں:

''یہاں اس سے مراد اس کے سوا کیا ہے کہ وہ اپنے عہد کا جدید ترین مادی تمدن' مسلمانوں کے جن سائنسی' سماجی اور معاشی علوم کی بنیاد پر قائم ہوا تھا، اب وہی علوم مغربی مادی تمدن کی آبیاری کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ اقبال کی مغرب سے مخاصمت نہیں تو اور کیا ہے مسلمان اگر مادی سطح پر دنیا میں ترقی کریں اور سرفراز ہوں تو سبحان اللہ! اگر مغربی اقوام کریں تو لعنت اللہ! یہ کہاں کا انصاف ہے۔
(صفحہ نمبر 173-172)

اس گوہر افشانی کے بعد دیکھئے ''دانشور'' آگے فرماتے ہیں کہ

''اقبال اگر اپنی فکر میں نسلی' قومی' مذہبی اور تہذیبی بنیادوں پر مغرب سے تصادم نہیں چاہتے تو پھر کیا چاہتے ہیں۔''
(صفحہ نمبر 173)

مصنف کے یہ بیانات اُن کی علم دشمنی' کم فہمی اور فکری بد دیانتی کی ایک اور مثال ہیں۔ تاریخِ عالم کے اٹل حقائق اور تسلسل کی روشنی میں قدیم یونانی تہذیب (ق م) اور اس کے بعد اسلامی تہذیب وتمدن کی ترقی اور ترویج اور پھر مغرب کے عروج میں مزید ترقی اور تمدن کی تعمیر کی بدولت تمام بنی نوع انسان کی علمی وادبی اور فکری میراث میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ نہ تو رومن اور نہ ہی مسلمانوں نے اپنے پیش رووں سے کچھ چھینا اور نہ ہی مغرب نے مسلمانوں کے علوم پر ڈاکا ڈالا۔ یہ تو چراغ سے چراغ جلنے کی روایت کا نتیجہ ہے۔ اس تاریخی حقیقت کو ''لے گئے تثلیث'' کے فرزند ''میراثِ خلیل'' کہنا اور ''خاک حجاز'' کی خشتِ بنیاد کہنا کیا غلط ہے۔ اس حوالے سے چھیننے کا لفظ نہایت غیر علمی اور غیر ادبی ہے۔ اقبال کے شعر میں کسی قسم کی مخاصمت یا تصادم کا کوئی اشارہ نہیں ہے۔

اقبال کے ان اشعار پر کچھ تھوڑی سی بات ہم بعد میں کریں گے یہاں ذرا 'مخاصمت' اور 'تصادم' کی بات پہلے کر لیتے ہیں۔

مسلمانوں کی بلا جواز مخالفت ونفرت' دشمنی اور تصادم کی روایت اور چلن ہمیشہ سے رہا ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے ایسا رویہ عموماً نہیں رہا۔ مصنف کی ایسی لایعنی اور بے بنیاد غلط بیانیوں کا تاریخی حوالوں سے ثبوت ہم یہاں پیش کرتے ہیں جبکہ مصنف ایسی باتوں کا کوئی ایک ثبوت بھی پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ ایک مغربی مفکر ایڈورڈ ڈبلیو سعید کی کتاب ''ORIENTALISM'' مغرب کی اسلام' عربوں اور دیگر مسلمانوں سے نفرت' دشمنی' مخاصمت اور تصادم کے لاتعداد حوالوں اور تفصیلات کا بہترین ثبوت ہے۔ ایسے لاتعداد حوالوں' کتابوں' مقالات کی تفصیلات کا خلاصہ پیش کرنا بھی بہت زیادہ طوالت کا باعث ہوگا۔ یہاں صرف چند حوالوں کا ذکر کرتا ہوں۔

ایڈورڈ ڈبلیو سعید لکھتے ہیں:

''عربوں اور اسلام پر کتابیں اور مضامین متواتر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ جن میں ماضی کے دور میں ہونے والے اسلام کے خلاف زہر آلود مباحثوں اور مناظروں کی تفصیل ہوتی ہے۔''

ایڈورڈ ڈبلیو سعید عربوں اور اسلام کے بارے میں نفرت پھیلانے کی لاتعداد مثالیں پیش کرتا ہے اور لکھتا ہے:

''یہ مثالیں اور ایسی کئی دیگر مثالیں مغرب میں عربوں سے نفرت پھیلانے کے لئے تھیں''۔

ہمارے مصنف کی کم علمی اور پست ذہنی استعداد کیلئے ایڈورڈ سعید کی کتاب سے ایک اور اقتباس:

''فلموں اور ٹیلی ویژن میں عربوں کو شہوت پرست اور بد اخلاق اور بد یانت دکھایا جاتا ہے۔ انہیں شدید جنسی' ذلیل' فریب کار' سازشی' دوسروں کو اذیت دے کر خوش ہونے والا' دھوکے باز اور نہایت گیا گزرا دکھایا گیا۔ غلاموں کا تاجر' اونٹ ہانکنے والا' زرمبادلہ کا تاجر' بنا ٹھنا بدمعاش۔ یہ سب

عربوں کے روایتی کردار تھے جو فلموں کے ذریعے لوگوں کو سنیماؤں میں دکھائے جاتے تھے۔ عرب رہنماؤں کو فلموں میں اکثر ڈاکوؤں' بحری قزاقوں کی صورت میں دکھایا جاتا تھا۔ زیادہ تر تصویروں میں اجتماعی غصہ اور کمینگی' غربت یا بے تحاشا احمقانہ حرکات دکھائی جاتی تھیں۔ ان تمام تصاویر کے پیچھے 'جہاد' کا خطرہ منڈلاتا ہوا دکھایا جاتا۔ نتیجے میں خوف پیدا کیا جاتا کہ مسلمان یا عرب دنیا پر قبضہ کر لیں گے۔''

''پیٹرول پمپ کے پیچھے ایک عرب شیخ کھڑا دکھایا گیا جس کو لمبی نوکیلی ناک اور کانوں تک لمبی مونچھیں سمیت خوفناک چہرے کی صورت میں دکھایا گیا۔ اس کے ذریعے یہ دکھایا گیا کہ یہ مغرب کیلئے مصیبتوں کی جڑ ہے جو دنیا میں تیل کا بحران پیدا کرنے کا باعث ہے۔''

ایڈورڈ سعید ایک اور فلم کا ذکر کرتا ہے جس میں عرب شیخ کی تذلیل کی گئی ہے:

''ایک مغربی فلمی ہیرو اور خوبصورت اور سنہرے بالوں والی لڑکی کو پکڑنے کے بعد ان پر دانت نکالتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ''میرے آدمی تم کو قتل کریں گے لیکن اس سے پہلے وہ تم سے اپنا دل خوش کریں گے''۔

مغرب کی اسلام' مسلمانوں اور عرب کے مسلمانوں سے نفرت' دشمنی کی روایت اور چلن ایک مسلسل تاریخی عمل ہے جو ہنوز جاری ہے۔ تاریخی تناظر میں ایڈورڈ سعید نے بے شمار تفصیلات دی ہیں۔ جس میں کتابوں' فلموں' ٹیلی ویژن پروگراموں' مقالات' مغربی تنظیموں اور سرکاری و نجی اداروں اور ان کو فنڈز مہیا کرنے والی کمپنیوں کا تفصیلی ثبوت فراہم کیا ہے۔ مصنف جیسے کنوئیں کے مینڈکوں کو ایسی کتابوں اور مصنفین کا قطعاً کوئی علم نہیں۔ اسی لئے میں بالکل مختصراً ایڈورڈ سعید کی کتاب میں سے چند مزید حوالوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ اگر مصنف کو یہ کتاب سمجھ نہ آئے تو اس کتاب کا اردو ترجمہ دیکھا جا سکتا ہے۔ (اردو ترجمہ: محمد عباس ''شرق شناسی'') چند حوالے ملاحظہ فرمائیے۔

ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب میں مغربی ملوکیت اور مغربی سامراجی توسیع پسندی کا پردہ تاریخی حقائق کی روشنی میں چاک کیا ہے۔ اپنی مفادات کے پیش نظر مغرب نے مشرق شناسی (ORIENTALISM) جیسا علم ایجاد کیا۔ مشرق شناسی کے ماہرین کے نظریات و افکار کو غلام قوموں کو غلام رکھنے اور مشرق پر اپنے قبضے اور غلبے کو دوام بخشنے کی خاطر استعمال کیا۔ مشرق شناس مفکرین کو عہدوں سے نوازا' فنڈز مہیا کئے اور ان کے نظریات و افکار کے ذریعے مشرقی اقوام خصوصاً عرب مسلم اور دیگر مسلمانوں کو حیاتیاتی حوالے سے کمتر اور پست ذہن قرار دیا۔ انہی افکار کے ذریعے ایک طرف تو مشرقی اقوام اور مسلمانوں میں احساسِ کمتری اور غلامانہ ذہنیت کا احساس پختہ کیا جبکہ دوسری طرف مغرب کی اقوام میں بھی اسلام' عربوں اور مسلمانوں سے نفرت' حقارت' دشمنی اور فکری و عملی تصادم کے جذبات پیدا کئے۔ ایسی ہی جھوٹی تحریروں کے ذریعے مغرب میں اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں منفی افکار و نظریات پھیلے جو پختہ بنیادوں پر آج تک موجود ہیں جو انہی مسخ شدہ تصویروں پر مشتمل ہیں جو ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کی نشاندہی کرتی ہیں۔ مغرب کی علمی بددیانتی اور ناانصافی کا تذکرہ صرف ایڈورڈ سعید نے ہی نہیں کیا ہے مذکورہ کتاب ایسے لاتعداد حوالوں پر مشتمل

ہے۔ جن میں سے چند کا مختصراً ذکر یہاں پیش کرتا ہوں۔

ایڈورڈ سعید نے دیگر لاتعداد حوالوں کے علاوہ جیکس وارڈن کی اہم ترین کتاب'' L, Islam dans le miroire de I occident'' کا حوالہ دیا ہے جس میں پانچ اہم مشرق شناسوں کا ذکر کیا ہے جن کے افکار مغرب میں اسلام کی نفرت انگیز تصویر کشی کا باعث بنے۔ ان مشہور مشرق شناسوں کی تمام تحریریں کسی نہ کسی منفی سوچ یا اسلام دشمنی پر مبنی ہیں۔

1۔ گولڈز ہر: یہ مصنف اسلام کے بارے میں منفی اور نفرت انگیز خیالات کے باوجود دیگر مذاہب سے اسلام کی رواداری کی تعریف و تحسین کرنے پر مجبور ہے۔

2۔ میکڈانلڈ: اس مصنف کی اسلام سے دشمنی صرف اس لئے ختم ہوگئی کہ یہ ایک قدامت پسند مذہب ہے۔

3۔ کارل بیکر: اس کے مطابق جس طرح اس نے اسلامی تہذیب کو سمجھا ہے اس کے مطابق یہ ایک پسماندہ تہذیب ہے۔

4۔ سنی سنوک ہرگرونجے: یہ مفکر تصوف کو اسلام کا لازمی حصہ سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کی حدود و قیود کی بِنا پر وہ اسلام کے بارے میں سخت اور مخالفانہ خیالات اور آرا کا اظہار کرتا ہے۔

5۔ میسکنان: یہ مصنف مسلمانوں کی مذہبیت کے جذبات، تصوف اور اسلام میں شاعری کے فن سے غیر معمولی رغبت کی وجہ سے اسلام کی مخالفت کرتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ انسان کی شکل میں خدا کے ظہور کے تصور کے خلاف اسلام کی ناقابل اصلاح مخالفت و بغاوت کی وجہ سے اسلام کی مخالفت کرتا ہے۔

ایڈرورڈ سعید لکھتے ہیں کہ ان پانچوں شرق شناسوں نے مشترکہ طور پر اسلام سے متعلق ایک مجموعی نقشہ بھی تیار کیا تھا جس کے مغرب میں سرکاری شعبوں اور حلقوں میں بہت گہرے اور وسیع اثرات مرتب ہوئے۔ ایڈورڈ سعید کے مطابق سنوک ہرگرونجے کو انڈونیشیا میں میکڈانلڈ اور میسکنان کو افریقہ سے پاکستان تک کی نوآبادیات میں حکومتی مشیر مقرر کیا گیا۔

جدید دور کے بارے میں ایڈورڈ سعید لکھتے ہیں کہ مغربی نوآبادیاتی توسیع پسندی اور دیگر ممالک پر قبضے اور غلبے کے حوالے سے برطانیہ اور فرانس کی عالمی سطح پر مرکزی حیثیت و اہمیت (یعنی HEGEMONY) ختم ہونے کے بعد اب یہ حیثیت امریکہ کو حاصل ہے۔ سابقہ نوآبادیوں سے منسلک تمام مفادات اب امریکہ سے وابستہ ہو چکے ہیں۔ امریکی مفادات کی بنیادیں بھی پرانے مشرق شناسوں کی کتابوں اور مواد پر رکھی گئی ہیں لیکن ان میں نیا موادنئی رپورٹیں' تجزیاتی مواد اور تحقیقات شامل ہوگئی ہیں۔ یہ مواد زیادہ تر ہندچینی' چین' جاپان' بھارت اور پاکستان کے بارے میں ہے۔ مغرب کی جانب سے اسلام اور مسلمانوں سے حقارت' نفرت' دشمنی اور تصادم اور منفی جھوٹے پروپیگنڈہ پر مشتمل جتنے حوالے ایڈورڈ سعید کی مذکورہ کتاب میں دیئے گئے ہیں ان کا خلاصہ بھی کافی طویل ہوگا جس سے یہاں صرفِ نظر کرنا پڑے گا۔ یہ کتاب 1976ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد

اورخصوصاً 9/11 کے بعد سے لاتعداد مقالات، کتابیں، ٹیلی ویژن پروگرام وغیرہ میں ماضی سے کہیں زیادہ شدت اور نفرت کے ساتھ مغربی منفی پروپیگنڈہ ہورہا ہے۔لیکن مصنف اپنی کم علمی اور پست ترین ذہنی سطح کی وجہ سے نفرت اور تصادم کا الزام مسلمانوں اور اقبال پر عائد کرتے ہیں جبکہ اس کا کوئی ایک ثبوت بھی پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ لاتعداد مغربی مفکرین کی طرف سے دیگر مذاہب سے اسلام کی رواداری کی اعلیٰ ترین خصوصیت (جو عملی صورت میں دیگر مذاہب کے پیروکاروں میں موجود نہیں ہے) تسلیم کئے جانے کے باوجود دین اسلام کے ''بڑے حوالوں'' (یعنی قرآن وسنت) پر دیگر مذاہب کے پیروکاروں سے نفرت وحقارت کا الزام عائد کرتے ہیں۔ مغرب کی اسلام دشمنی اور تصادم کی ایک طویل تاریخ ہے جس کا ناقابلِ تردید ثبوت مغربی مفکر ایڈورڈ ڈبلیو سعید نے پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں اسلام دشمنی سے متعلق لاتعداد مغربی مفکرین، ان کی کتابوں اور عملی اقدامات کی تفصیلات موجود ہیں ایسی کتابیں اور مصنفین کی تعداد ایک دو نہیں یہ لاتعداد ہیں۔ کیا مصنف ''دانشور'' حقارت ونفرت کی اس طویل تاریخ کو بھی مغرب کا ''وقتی یا عارضی'' بحران قرار دیں گے۔

اقبال کی شاعری اور مجموعی فکر میں مغرب سے مخاصمت یا تصادم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

علمی وادبی معیارات کے تحت تنقید اور مخاصمت وتصادم میں فرق اردو ادب کے 'استاذ' کو تو معلوم ہونا چاہئے۔ اب ہم دوبارہ مذکورہ اشعار کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

علمی میراث بہ وجوہ مسلمانوں سے مغرب والے لے گئے۔ اگرچہ تاریخی تناظر اور عمل میں مغرب والے مسلمانوں کی لائبریریاں اور کتابیں بھی اٹھا کر لے گئے تھے اور اس اقدام میں چھین لینے کا عنصر بھی شامل کیا جاسکتا ہے لیکن اقبال نے ایسا نہیں کیا۔ جب ایک تہذیب زوال پذیر اور ضعیف وکمزور ہوتی ہے تو دوسری توانا اور دانا تہذیب کے فرزند زوال پذیر تہذیب کے دامن میں اگر کچھ علمی اثاثہ موجود ہے تو وہ اسے بھی اپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں اور یہ کوئی قابل مذمت عمل نہیں ہوتا۔

اقبال کے ان اشعار میں اپنی میراثِ خلیل کے کھو جانے پر افسوس اور دکھ کے جذبات مضمر تو ہیں مخاصمت اور تصادم کا شائبہ تک نہیں ہے۔ مسلمانوں کی اپنی اس میراث سے محرومی کی ذمہ داری بنیادی طور پر تو خود مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے اور علامہ اقبال اس حقیقت سے پوری طرح آشنا تھے۔ اسی لئے اپنی شاعری میں مسلمانوں اور خصوصاً مسلمانانِ ہند کو ان کے آباؤ اجداد کے شاندار علمی وادبی اور عملی کارناموں کی یاد دلاتے ہیں اور کارزارِ زیست میں سرگرم عمل ہونے کی ترغیب دیتے ہیں۔

؎ تھے تو آباوہ تمہارے ہی مگر تم کیا ہو
؎ مسلم خوابیدہ اٹھ ہنگامہ آرا تو بھی ہو
؎ وسعتِ عالم میں رہ پیما ہو مثل آفتاب

اور اسی طرح سرگرمِ ستیز اور گرم تقاضا ہونے، متحرک ہونے اور عمل پر آمادہ ہونے، ستاروں پر کمندیں ڈالنے اور ایسے ہی موضوعات پر سینکڑوں اشعار میں ایک ہی پیغام دیا ہے یعنی ماضی کے

احساس تفاخر کے ساتھ غلامی سے چھٹکارا اور دین ودنیا میں سرفرازی، جسے مصنف بہ تکرار مغرب سے تصادم، مخاصمت، دشمنی اور نہ جانے کیا کیا نام دیتے ہیں۔ اقبال نے صرف مغرب کی تہذیب وتمدن کی خامیوں اور خرابیوں کی نشاندہی کی اور ان پر تنقید کی ہے جسے خود مغربی مفکرین بھی تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ مسلمانوں کو اپنی مخصوص شناخت کے دفاع کرنے کیلئے ان خرابیوں سے بچنے کی ترغیب وتحریک دیتے ہیں اور یہ ہر قوم کا بنیادی حق ہے جو مصنف مسلمانوں سے چھین لیا چاہتے ہیں۔ مغربی اقوام کے حوالے سے 'لعنت اللہ' کے الفاظ مصنف نے قارئین کے دل میں فکر اقبال اور بالواسطہ طور پر مذہب کے خلاف حقارت اور نفرت کے جذبات پیدا کرنے کی غرض سے استعمال کئے ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ اسی طرح نسلی، قومی، مذہبی اور تہذیبی بنیادوں پر مغرب سے تصادم کی بات بھی بالکل لغو اور بے بنیاد ہے۔ نسلی، قومی، مذہبی اور تہذیبی بنیادوں کی شناخت پر فخر کرنے کا حق مغرب سمیت سب کو حاصل ہے۔ ان پہلوؤں کی بنیادوں پر مخاصمت اور تصادم قابل نفرت اور قابل مذمت ہے۔ مذہب اسلام کے بنیادی ماخذات اور تعلیمات وافکار میں ایسی نفرتوں کی سختی سے ممانعت ہے۔ اسلامی تاریخ اس کی گواہ ہے کہ زیادہ تر ادوار میں مسلمانوں اور مسلم حکمرانوں نے رواداری کا عملی مظاہرہ کیا۔ ایسے تعصّبات اور نفرتوں کے مظاہرے رواداری کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ لیکن خود انہی نفرتوں کا مظاہرہ کرنے والی اقوام کے افراد نے اور اجتماعی سطح پر بھی مسلمانوں اور اسلام کے خلاف نفرت پھیلانے کی غرض سے ان چند واقعات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا۔ اس گھٹیا منفی پروپیگنڈے کا شکار کئی مسلمان دانشور بھی ہوئے ہیں۔ ہمارے مصنف صاحب نے بھی کچھ ایسے ہی افکار عالیہ کا اظہار اس کتاب کے دوسرے حصے میں کیا ہے۔ ان مذکورہ بیانات میں بھی ایسا ہی رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ تہذیبوں کے تصادم کی باتیں، اسلامی عسکریت وغیرہ کی باتیں قطع نظر ماضی کے، آج بھی مغرب کی طرف سے ہوتی رہتی ہیں۔

اس حوالے سے ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ ایک زوال پذیر، غلام، علمی، سماجی اور معاشی طور پر پسماندہ قوم، فکری اعتبار سے کشمکش کا شکار لوگ ایک عسکری اور تہذیبی غالب طاقت سے نسلی، قومی، مذہبی اور تہذیبی اعتبار سے تصادم میں مبتلا کیسے ہوسکتی ہے۔ ایسی قوم ان حوالوں سے دفاعی طرزِ عمل تو اختیار کرسکتی ہے تصادم کی راہ کیسے اختیار کرسکتی ہے۔ یا پھر اُس غالب قوت سے متاثر ومرعوب ہو کر اس کے رنگ میں رنگ جاتی ہے اور اپنی شناخت، اپنے کلچر کے تمام پہلوؤں کو کمتر سمجھنے لگتی ہے۔ مخاصمت اور تصادم کی راہ غیر ملکی حکمرانوں سے آزادی وحریت کی تحریکوں کے ذریعے اختیار کی جاسکتی ہے۔ اقبال کے ان اشعار میں ایک اور پہلو قابل توجہ ہے کہ میراثِ خلیل جو مسلمانوں اور اقبال کیلئے بے انتہا فکر اور سرفرازی کا باعث ہے، وہی میراث جدید مغربی مادی علوم وفنون اور ترقی وخوشحالی کا باعث بنی، یہ بات بھی اقبال کے لئے فخر کا باعث ہے کہ خاکِ حجاز خشتِ بنیادِ کلیسا ہوئی۔ اب مصنف جیسے کمتر ذہنی سطح کے لوگ یہاں یہ فرمائیں گے کہ پھر اقبال کی مغرب پر شدید تنقید کیا معنی رکھتی ہے؟

اہل فکر ودانش ہی یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ اقبال جب یہ کہتے ہیں کہ میراثِ خلیل اور خاکِ حجاز

خشتِ بنیاد کلیسا بن گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مغربی مادی علوم وفنون کی مخالفت نہیں کر سکتے بلکہ وہ اُن علوم کی تحسین وتوصیف کر رہے ہیں کہ جو علوم مغرب کی ترقی کی بنیاد ہیں وہ مسلمانوں کی میراث ہیں۔

ے جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

لہٰذا اس تناظر میں بھی مصنف کا یہ جھوٹ کہ اقبال مادی علوم وفنون کے دشمن ہیں بہ آسانی غلط ثابت ہوجاتا ہے۔ اقبال کے خیال میں تو مغرب کی مے کا تہہ جُرعہ بھی ناصاف نہیں ہے۔ اسی جھوٹ اور غلط بیانی یا مصنف کی ناسمجھی کی بنیاد پر ہی مصنف کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ایک جھوٹ کے ساتھ کئی اور جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ اسی لئے وہ آگے کہتے ہیں کہ ''اب وہی علوم'' (یعنی مسلمانوں کی میراث) ''مغربی مادی تمدن کی آبیاری کرنے میں مصروف ہیں اور مسلمان مادی سطح پر دنیا میں ترقی کریں اور سرفراز ہوں تو سبحان اللہ اگر مغربی اقوام کریں تو لعنت اللہ۔''

اس گوہر افشانی میں ''دانشور مصنف'' نے یہ بات خود ہی تسلیم کر لی ہے کہ اقبال یہ مانتے ہیں کہ یہ مغربی علوم ''وہی علوم'' (مسلمانوں کی میراث) ہیں آگے پھر جھوٹ یعنی ان ہی علوم کی بنیاد پر مغرب ترقی کرے تو اقبال کی طرف سے ''لعنت اللہ''۔ مصنف نے اقبال کے بارے میں ایسا جھوٹ بار بار بولا ہے مگر مادی علوم کی مخالفت یا دشمنی کے حوالے سے اقبال کا ایک شعر بھی ثبوت کے طور پر پیش نہیں کیا۔ مصنف کی یہ کتاب ایسے ہی تضادات اور غلط بیانیوں کا ایک ملغوبہ ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ ان اشعار میں اقبال کے کلام سے ایسی بات سرزد ہوجاتی ہے کہ جو ''اُن کے پورے فکری ڈھانچے کو گرا دینے کیلئے کافی ہے۔'' ذرا ملاحظہ کیجئے کہ سرزد ہونے والی بات کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ بقول مصنف' میراثِ خلیل مسلمانوں سے ''چھن گئی'' ہے اس لئے فکرِ اقبال کا سارا ڈھانچا زمین بوس ہوگیا ہے۔ یہ بات میں عرض کر چکا ہوں کہ ان اشعار میں میراث کے چھن جانے کی کوئی بات نہیں ہے اگر مصنف کی یہ فرضی تشریح وقتی طور پر تسلیم کر لی جائے تو میراثِ خلیل سے مصنف صرف مادی علوم وفنون مراد لیتے ہیں یعنی علمی، فکری اور فنی میراث پر مغربی تمدن نے اپنی بنیادیں استوار کر لیں۔ ظاہر ہے کہ مغرب کو مسلمانوں سے مذہب اور روحانیت کی میراث چھیننے کی ضرورت تو نہیں تھی اس لئے ایسا معاملہ صرف مادی علوم سے متعلق ہے اور بقول مصنف اقبال مادی علوم وفنون اور مادی تمدن کے سب سے بڑے ''دشمن'' اور مذہب وروحانیت کے حمایتی ہیں۔ لہٰذا فکرِ اقبال کے دام میں یہ میراث (مذہب وروحانیت) تو محفوظ ہے' مغرب کو اس کی ضرورت نہیں تھی اس لئے اس نے اسے چھوڑ دیا اور مادی میراث چھین لی۔ پھر ایسی صورت میں تو اقبال کا سارا فکری ڈھانچا وہیں کا وہیں کھڑا ہے بلکہ معاملہ یہ ہوا ہے کہ مصنف خود اپنی دانشوری میں الجھ کر اپنے ''اعلیٰ افکار'' کو زمین بوس کرنے کا باعث ہوئے ہیں اور وہ اس طرح کے جب اقبال مادی علوم کے دشمن ہیں (بمطابق مصنف) تو مسلمانوں کی ''اس میراث'' کے ''چھن'' جانے سے تو اقبال کو خوش ہونا چاہئے تھا کہ خس کم جہاں پاک اور ایسی صورت حال میں پھر اقبال کی مغرب سے مخاصمت اور تصادم کیا معنی رکھتا ہے۔ لہٰذا مغرب کی مخاصمت اور تصادم

کی جو وجوہات بھی اس کتاب میں جا بجا فرض کی گئیں ہیں وہ بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ذرا غور کرنے سے یہ معلوم پڑے گا کہ کس کا فکری ڈھانچا زمین بوس ہوا ہے؟

اب ذرا خواجگی کے بنائے ہوئے مسکِرات کی طرف توجہ کرتے ہیں کہ مغرب کے خواجہ تاش اس کے بارے میں کیا فرماتے ہیں۔

''لیکن وہ خود (اقبال) اپنے فکری حوالوں میں نسل' قومیت' حرم' سلطنت' تہذیب اور رنگ کی خواجگی میں پیش پیش ہیں۔'' (صفحہ نمبر ۱۷۳) پہلے ذرا اس حوالے سے درج شعر بھی پیش نظر رکھیں۔

نسل' قومیت' کلیسا' سلطنت' تہذیب' رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مُسکِرات

پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ ان حوالوں سے ''اقبال خود فکری سطح پر خواجگی میں کتنے پیش پیش ہیں۔'' یہ اشعار دیکھتے ہیں:

ے یوں تو سیّد بھی ہو مرزا بھی ہو' افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو' بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

ے منفعت ایک ہے اس قوم کا نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبی' دین بھی ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی' اللہ بھی قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

ے فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

ے پاک ہے گردِ وطن سے سرِ داماں تیرا
تو وہ یوسف ہے کہ ہر مصر ہے کنعاں تیرا

ے تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے

ے درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی' نہ صفاہاں' نہ سمر قند

ے ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر

ے رہے گا راوی و نیل وفرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کیلئے

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
اِقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
اِقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیت ِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

درجِ بالا اشعار اور اسی نوع کے اور انہی موضوعات پر مبنی لاتعداد اشعار کلیاتِ اقبال میں موجود ہیں جن کا مطالعہ کرنے سے مصنف کے درج بالا بیان کی علمی غلط بیانی اور شعوری جھوٹ کا پردہ بہ آسانی فاش ہوجاتا ہے کہ اقبال خود مذکورہ مسکرات کی خواجگی میں کتنے پیش پیش ہیں۔

نسل، قومیت، حرم، سلطنت، تہذیب اور رنگ، عرب، ترک، افغان بنیادوں پر نسل پرستی، مذہبی بنیادوں پر احساسِ قومیت، حرم کی پاسبانی، سلطنت کا عروج، تہذیبی فتح اور طاقت کے غرور جیسے نسلی، سیاسی، تہذیبی اور مذہبی پہلوؤں کے مباحث، تاریخی، نظریاتی اور عملی حوالوں سے طویل مباحث ہیں جن کی یہاں گنجائش اور ضرورت نہیں، یہاں صرف فکرِ اقبال اور اس سے متعلقہ مذہبی افکار اور ان کو ٹارگٹ کر کے مصنف کے افکار ہی پیش نظر رکھے گئے ہیں۔

اقبال کے شارحین کے حوالے سے مصنف کے درج ذیل ارشادات مدنظر ہیں:

''اقبال کے شارحین بھی فکر اقبال کے تعصّبات سے ہم آہنگ ہیں اس نوع کے سوالات کا جواب بھی ان کے ذہنی دائرے کی تشکیل سے باہر ہے۔'' (صفحہ 173)

ہمارے 'عظیم مفکر' اور 'بلند پایہ' دانشور مصنف کے وسیع و بلند ترین ذہنی دائرے کی تشکیل' اس درجہ بلند ہے کہ ان کے مقابل مجدد الف ثانیؒ، امام غزالی، عبدالحلیم شرر، ڈپٹی نظیر احمد، علامہ راشد الخیری، اکبرالہ آبادی، علی عباس جلالپوری، (مادیت پسند اشتراکی دانشور اور مفکر) عزیز احمد اور خلیفہ عبدالحکیم اور ایسے دیگر ہزاروں مفکرین اور شارحینِ اقبال کے نظریات و افکار سب ہیچ ہیں۔

۞۞۞

منٹو کا تخلیقی وفور

غلام حسین ساجد

معلوم نہیں اسے حسن اتفاق کہا جائے یا شامتِ اعمال کہ 1967ء تک نسیم حجازی، صادق حسین سردھنوی، رئیس جعفری اور امیر الفاسقین امتوں کی خاک چھاننے کے بعد مجھ جیسے ادیب کو پڑھنے کی سہولت میسّر آئی، وہ زندگی اور افسانوی ہنر میں ایک اور ہی اسلوب کے خالق سعادت حسن منٹو تھے۔ اس وقت میرے ہاتھ لگنے والی کتاب لذت سنگ تھی اور اس کے ذریعے میں نے منٹو کے افسانوں اور مضامین میں سے جو اثر قبول کیا تھا وہ پینتالیس برس گزرنے کے باوجود اب تک زائل نہیں ہوا اور میری زندگی اور طرزِ فکر کو بدلنے میں اس کتاب کا کردار بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔

میں اِس کتاب سے ساہیوال میں متعارف ہوا تھا اور کسی دوست یا استاد کے مشورے کے بغیر یہ تعارف سراسر اتفاقی تھا مگر مجھے ادب اور خصوصاً فکشن کا ان تھک قاری بنانے میں اس کتاب کی حیثیت بنیادی ہے۔ اس سے پہلے میں نے نصابی سطح پر پریم چند، سید سجاد حیدر یلدرم اور غلام عباس کی ایک ایک افسانوی تحریر ضروری پڑھی تھی مگر انہوں نے میری زندگی کا رُخ بدلنے میں کوئی خاص کردار ادا نہیں کیا تھا اور منٹو نے ایک ادبی دھماکے کی طرح ملیا میٹ کر کے رکھ دیا۔

ایک برس سے بھی کم مدت کے دوران میں نے اس وقت تک دستیاب منٹو کی ساری کتابیں جمع کیں اور پڑھ ڈالیں اور انہیں سے مجھے اردو کے دوسرے افسانہ نگاروں کی طرف مراجعت کا راستہ ملا مگر یہ تفصیل اس وقت میرے موضوع سے متعلق نہیں، سو میں اسے کسی اور وقت کیلئے اُٹھا رکھنا لازم سمجھ کر واپس اپنے موضوع کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ منٹو مجھے پینتالیس برس پہلے بھی خوش آیا تھا اور آج بھی اُسے ناپسند نہیں کرتا۔ اس استقامت اور مستقل مزاج پسندیدگی کا تعلق میرے ادبی سفر اور ذوق مطالعہ کے جمود سے نہیں، منٹو کے فنی متنوع کیفیات اور سرّی پہلوؤں سے ہے۔ اس کا سبب ان کے فن کی وہ قوت حیات ہے جو پچاس برس سے زیادہ کا عرصہ گزرنے پر بھی کمزور نہیں پڑی اور اُن کے فن کو ابدیت اور ہمیشگی کے درجے تک لے آئی ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ منٹو کے افسانوں میں معیار کے لحاظ سے یکسانیت نہیں اور ان کی تخلیقی وراثت کی درجہ بندی میں کچھ اُونچ نیچ ہے جس کی جڑیں منٹو کی زندگی اور طرزِ حیات میں پیوست ہیں۔ پھر بھی بحیثیت مجموعی انکی اہمیت اور عظمت شک وشبہ سے بالاتر ہے اور اس کا سبب صرف اور صرف منٹو کا تخلیقی وفور ہے۔

'آتش پارے' سے برقعے تک منٹو کا تخلیقی زمانہ بیس برسوں پر محیط ہے۔ اس زمانے کو ان کے تراجم تک پیچھے کھینچ لے جائیں' تب بھی اس کا دورانیہ پچیس برس سے زیادہ نہیں اور اسی دوران انہوں نے اپنی چونتیس کتابوں کو زیورِ طبع سے آراستہ دیکھا' جن میں نصف سے زیادہ ان کے افسانوی مجموعے تھے۔ زندگی اور اظہار کے تال میل کی اس قدر توانائیاں اگر کہیں اور ہے تو وہ صرف میراجی میں ہے تاہم فکر اور طرزِ حیات کے اعتبار سے دونوں میں کچھ زیادہ ہم آہنگی نہیں اور شاید ہو بھی نہیں سکتی تھی۔

منٹو اُن لوگوں میں سے ایک تھے' جن کے وجود میں اُن کے قد کے برابر آگ بھری ہوئی ہوتی ہے۔ یہ آگ اُنہیں کسی کل چین نہیں آنے دیتی ہے نہ ہی اُنہیں زندگی کی یکسانیت سے آمیختہ ہونے کی اجازت دیتی ہے۔ سو سعادت حسین منٹو بھی اپنے عصر اور اپنے وجود کیلئے ایک اجنبی تھے۔ ایک تخلیقی عفریت جو موجود میسر کی ندرت اور یکسانیت کو پوری حقانیت کے ساتھ سمیٹنے پر مامور تھا اور جس سے کسی کردار کے ظاہر و باطن کا مخفی رہنا ممکن نہ تھا۔

یہی وجہ ہے کہ منٹو کا کوئی افسانہ ان کی اپنی ذات کی شمولیت کے بغیر پروان نہیں چڑھتا۔ کہیں یہ شمولیت صریحاً ظاہری اور کہیں افسانے کے دروبست میں در پردہ گندھی ہوئی ہوتی ہے مگر منٹو کے افسانے ان کی موجودگی کے بغیر مکمل نہیں ہوتے کیوں کہ منٹو کی موجودگی کے بغیر عالم اضداد کی جہتوں کا اِس طرح بیٹھنا ممکن نہیں اور منٹو کا ہنر زیست کے متصادم روّیوں کو یک جان کر کے انسانی فکر کے کُنہ تک پہنچنے کا ہے۔

زندگی اور زندگی کو بھوگنے والے لوگ اِس قدر متنوع ہیں کہ اس دنیا میں بسنے والے ہر شخص پر کم از کم ایک افسانہ ضرور لکھا جا سکتا ہے کیوں کہ ہر فرد اپنی ذات میں منفرد اور اپنے جیسے کسی دوسرے سے مختلف ہے مگر اس فرق کو جاننے' اسے سمجھنے اور بیان کرنے کی صلاحیت ہر کسی کے پاس نہیں۔ ہو بھی نہیں سکتی کہ کسی بھی ادبی نابغ کے ظہور میں ہزاروں طرح کے عوامل اساس بنتے ہیں اور اس پر فطری صلاحیت اور طبیعت کا گداز مستزاد۔ یہ ایک ایسا اسرار ہے جس کا کیمیائی تجزیہ کرنا ممکن نہیں مگر جس معجزے کو وقوع پذیر ہونا ہو' وہ ہو کر رہتا ہے' اور اس کے ہونے کا سوالیہ نشان ہمیشہ دمکتا رہتا ہے۔ سعادت حسن منٹو کا ظہور بھی تاریخ ادب کا ایک معجزہ ہے' جو موجود کی حقّانیت اور سیرت کو سمیٹنے کیلئے وجود میں آیا اور نجمِ سحر کی طرح کچھ دیر کو دمک کر بہت جلد ابدیت کے سمندر کا حصہ بن گیا۔

منٹو نے زندگی کو جس طرح بسر کیا یا زندگی نے منٹو کو جس طرح برتا اس کی تفصیل میں گئے بغیر یہ امر منٹو کے ہر ناقد اور سنجیدہ قاری پر واضح ہے کہ اُس کی تخلیقی زندگی پر ایک خاص طرح کے جبر کا سایہ رہا

ہے۔ کہیں جوہرِ حیات کی حفاظت کیلئے اور کہیں اُس سے نجات کیلئے۔ اُس نے اپنی تخلیقی صلاحیت کو بارہا آزمائش اور انعام کی سان پر چڑھایا ہے اور اپنے تخلیقی وفور کی بنیاد پر اس نے کچھ نہ کچھ پایا بھی ہے۔ اِس حال کا معیار اس کے تخلیقی وفور کی حقانیت کا مظہر ہے۔ سو اس کے افسانوں میں جبر اور آسائش کی سبھی کیفیتیں موجود ہیں جو خالق اور تخلیق کے وجودی اتصال کی مظہر ہیں۔

تخلیقی عمل کے ساختیاتی پہلو کو ایک طرف رکھتے ہوئے منٹو نے کہا تھا کہ ''افسانہ مجھے لکھتا ہے'' اس بیان سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا منٹو اپنی تخلیقی اُپج کے ہاتھوں بے بس تھے یا وہ موضوع کے ظہور اور کرداروں کی پیش قدمی کے سامنے مجبورِ محض تھے؟ نہیں اس بیان میں منٹو اپنے تخلیقی وفور کی خبر دے رہے ہیں جو خالق کو اپنی لپیٹ میں لے کر ایک معمول بنا دیتا ہے اور تخلیقی عمل کا سلسلہ ایک باطنی تکمیل بن کر رہ جاتا ہے' جس سے باہر آ کر بھی خالق پر اپنے اور اپنی تخلیق کے مابین موجود سرّی رشتے کا بھید کھل نہیں پاتا اور وہ تخلیقی عمل کو خودکار اور خود پر غالب محسوس کرتا ہے۔

اپنی اس بات کی تائید میں' میں منٹو کے کئی افسانے بطور حوالہ پیش کر سکتا ہوں' مگر اس کارزیاں میں پڑے بغیر میں اپنی بات کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے اس امر پر اصرار کروں گا کہ خالق اور تخلیق کے مابین فاصلے کا سمٹ جانا ہی تخلیقی عمل کی معراج اور اس کی حقانیت کا مظہر ہے اور سعادت حسن منٹو اس حوالے میں یکتا تھے۔

منٹو مترجم' افسانہ نگار' ڈراما نگار' مضمون نگار اور خاکہ نگار تھے مگر ان کی اولین پہچان ایک افسانہ نگار کی ہے۔ انہوں نے اور ان کے ساتھیوں نے اُردو افسانے کے ایام طفلی میں لکھنا شروع کیا مگر آج اُن کے عہد کو اُردو افسانے کا دورِ زرّیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ فکشن کا عروج انتشار اور بے اطمینانی کی بنیاد پر ہوتا ہے اور بڑی پیچیدگیاں بڑی آسانیوں کا سبب بنتی ہیں۔ منٹو اور اس کے ہم عصر افسانہ نگاروں کے تناظر میں یہ بات بڑی حد تک سچ دکھائی دیتی ہے مگر اس سے بھی بڑا سچ وہ تخلیقی وفور اور اُپج ہے جس کا مرقع منٹو اور اس کے کچھ اور ہم عصر تھے تاہم اُن میں سے کسی کی تخلیقی صلاحیت کا موازنہ منٹو سے کیا جا سکتا ہے نہ کرنا چاہئے کہ منٹو کا طرزِ حیات سب سے منفرد اور اس کا اسلوب سب سے الگ ہے جس میں حقیقت اور حقانیت کی شرح غیر معمولی طور پر بلند ہے' سو اس کے افسانے زندگی سے تراشی ہوئی وہ قاشیں ہیں جن کو جوڑ دینے سے ایک مکمل عہد ایک جیتے جاگتے میورل کی شکل میں سانس لینے لگتا ہے اور کارگاہِ حیات کے سبھی پہلو اُجاگر ہو جاتے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند میں قومی زبانوں کے ادیب کیلئے معیاری ادب تخلیق کرتے ہوئے قلم کے ذریعے روزی کمانا بڑی حد تک ناممکن ہے۔ ساٹھ ستر برس قبل صورتحال کس قدر مخدوش ہوگی اس کا اندازہ آج نہیں کیا جا سکتا۔ منٹو نے سانس کے بندھن کو برقرار رکھنے کیلئے کیا کیا رنج نہیں کھینچا اور وہ کس کس محاذ پر پسپا نہیں ہوا؟ پھر بھی اس کی تخلیقی دمک آخری سانس تک برقرار رہی ہے کیونکہ لکھنا اس کے لئے سانس لینے کی طرح تھا۔ وہ اٹک اٹک کر لکھنے والوں میں سے نہیں تھا اور اس کی تخلیقی صلاحیت ایک سائے کی طرح اس کے ہم رکاب رہتی تھی اور اس کے تخلیقی وفور کو بڑھاتی تھی۔

آج جب منٹو کی پیدائش کو سو اور اس کی وفات کو ستاون برس بیت چلے ہیں سب سے بڑی ضرورتِ منٹو کی ذات اور تخلیق پر زیادہ سے زیادہ تحقیق اور تنقیدی کام کرنے کی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ خدائے سخن میر کی طرح (کہ جن پر اڑھائی سو برس میں صرف چودہ کتابیں لکھی گئی ہیں) ہم منٹو کے سلسلے میں بھی اغماض سے کام لیں اور اس کی شگفتہ تخلیقی وفور ایک گھنایا ہوا چاند بنا کر دم لیں۔

۞۞۞

غالب اور اقبال

نجیب عمر

عمِّ غالب نے ڈیوٹی پر موجود فرشتے سے پوچھا ”اقبال کہاں ہے اور کیا کر رہے ہیں؟“

فرشتے نے مہلت مانگی ”ابھی حاضر ہوتا ہوں۔“

فرشتے نے آ کر بتایا ”وہ احتجاج کر رہے ہیں۔“

عمِّ غالب نے حیرت سے پوچھا ”وہ کیوں اور کس لیے؟“

”ان کا کہنا ہے کہ جہنم میں موجود مسلمانوں کو فوری جنت میں لایا جائے، بہت ہو گئی سزا و جزا۔“

”اقبال تو پھر اقبال ہیں کبھی شکوہ، کبھی اعتراض۔ وہ اللہ تعالیٰ سے لڑنے کا کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ نکال لیتے ہیں۔“

فرشتے نے ٹوکا ”جنت میں ایسا ہوتا نہیں۔“

”چلو خیر یہ ہمارا معاملہ ہے۔ اشرف المخلوقات کا، تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم اقبال سے ہماری ملاقات کا بندوبست کراؤ۔ میں بالمشافہ گفتگو کروں گا۔“

☆☆☆

”قبلہ و کعبہ آپ نے کیوں زحمت کی مجھے بلا لیا ہوتا۔“

”چھوڑو ان دنیوی القاب کو اور زحمت بھی خوب کہی، بھئی جنت میں زحمت کیسی؟“

”خیر چھوڑیں میں ایسا نہیں سمجھتا۔“

”برخوردار تم نے دنیا میں اتنے شوق پورے کر لیے۔ میری مراد شکوہ، نالہ و شیون وغیرہ وغیرہ۔ اب احتجاج چہ معنی دارد؟“

”آپ نے بھی کم صفحات کالے نہیں کیے۔ قاطعِ برہان اور برہانِ قاطع، صدیوں بعد بھی آپ کا کلام پڑھ پڑھ کر دنیا سر دھنتی رہی۔“

’’پر غالب غالب رہا، اقبال نہ بن سکا، اب یہ احتجاج کیوں؟ فرشتے حیرت میں غوطے لگا رہے ہیں؟‘‘

’’انہیں دریائے حیرت میں ڈوبے رہنے دیجئے۔ مجھے تو چین نہیں آتا، ہم جنت کی بہاروں میں اور ہمارے بھائی بادِ سموم میں۔ ہمیں کچھ تو کرنا چاہئے۔‘‘

’’دکھ تو مجھے بھی ہے لیکن رب کریم کا کتنا کرم اور احسان ہے کہ ہم جنت میں‘ وگرنہ ہمارے اعمال اور بہشت؟‘‘

’’اس سے کسے انکار۔ اس ردائے رحیمی کو ہم چاہتے ہیں اور وسیع ہونا چاہئے کہ ڈھانپ لے ان لپکتے شعلوں کو۔‘‘

’’لیکن ایک واقعہ میرے ساتھ بھی گزرا۔ تمہارے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’ارشاد‘‘

’’ایک روز میں گھوڑے پر سوار، جنت کی آخری حدوں پر فرشتوں نے باخبر کیا۔ سعیر یہاں سے قریب ہے۔ میں ٹھٹک گیا۔ باگیں تھام لیں۔ اسپ تیز رو ساکت کہ اچانک مدھر موسیقی، پائل کی چھم چھم، کسی مغنیہ کی لوچ دار آواز۔ سوالیہ نگاہیں فرشتوں کی جانب۔ جواب آیا اتنے قریب ہیں خود ہی دریافت کرلیں۔ میں نے آواز لگائی۔ یا اہل النار، کیا ماجرا ہے؟ ہم جنت میں بھی ایسی محفلوں کو ترسیں اور آپ کے یہ مزے۔ جواب آیا، آجائیں ہماری محفل میں راگ ورنگ میں شریک ہوجائیں۔ میں بڑا اترا یا لیکن فرشتوں نے حقیقت حال سے آگاہ کیا تو میں نے ایڑ لگائی اور اسپ تازی ہمیں جہنم سے دور لیتا گیا۔‘‘

’’ہمیں بتائیں فرشتوں نے کیا بتایا؟‘‘

’’بھئی جہنمی پھر جہنمی ہیں اپنی حرکتوں سے باز آنے والے کہاں۔ یہ ان کا پروپیگنڈہ مشن تھا کہ جنت کے باسیوں کو ادھر بلایا جائے، جو گیا اس کا لوٹنا اس کے اختیار میں کہاں۔‘‘

’’یعنی وہ بھی چین سے بیٹھنے والے نہیں۔‘‘

’’میں نے پہلی مرتبہ فرشتوں کا شکریہ ادا کیا اور اپنی عاقبت نااندیشی پر کڑھتا رہا۔‘‘

’’بحیثیت انسان ہمیں ان سے ہمدردی ہے انہیں اس عذاب سے چھٹکارا ملے ہمارا یہ مشن ہونا چاہیے۔‘‘

’’لیکن اقبال ربّ کریم کے عدل وانصاف کے تقاضے کچھ اور ہیں۔‘‘

’’خود پروردگار عالم فرما چکے ہیں کہ میرے قہر کو عفوو درگزر کی ردا نے ڈھانپ رکھا ہے۔‘‘

’’اس قسم کا اعتراض ہمیں مشکل میں نہ ڈال دے۔‘‘

’’قبلہ، میں حق سے گریز نہیں کرسکتا۔‘‘

’’اقبالؔ تمہاری کیا بات ہے۔ تم نے کوئی دقیقہ فروگزاشت چھوڑا ہے۔ مثلاً تمہارا ایک شعر مجھے بہت پسند ہے۔ تمہیں بھی یقیناً پسند ہوگا۔

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا ۔۔۔ یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

’’آپ نے بھی کوئی کم غضب نہیں ڈھایا مثلاً۔

ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

’’خوب یاد دلایا تم نے لیکن اس خیال سے اب بھی صد فیصد اتفاق کرتا ہوں۔‘‘

’’یہ یقین ہی آپ کو جنت میں لے آیا ہے۔‘‘

’’میں تو تسلیم کرتا ہوں کہ اس ذاتِ بے ہمتا کی نوازش عظیم، وگرنہ مجھ جیسا ناہنجار اور بہشت۔‘‘

’’خیر آپ کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں۔‘‘

’’میں تمہارے احتجاج کے بارے میں ابھی تک الجھا ہوا ہوں۔ ہمیں اس پر کافی غور وخوض کی ضرورت ہے۔‘‘

’’تاہم میں آپ سے حمایت چاہتا ہوں۔‘‘

’’اقبال‘ جنت کی بجائے اگر دنیا ہوتی تو ایک دھواں دھار بڑا جلسہ کرکے مطالبات پیش کئے جاسکتے تھے۔ لیکن یہاں ممکن نہیں، فرشتے ہرگز ساتھ نہیں دیں گے۔‘‘

’’آپ فکر نہ کریں میں اس کے لئے اکیلا ہی کافی ہوں۔‘‘

’’اقبالؔ انسان کو خوش فہم ہونا چاہئے لیکن اتنا بھی نہیں۔‘‘

’’چلیں فی الحال میں آپ کی بات مان لیتا ہوں۔‘‘

’’میرے پاس سنانے کیلئے کچھ ہے تمہارا جی خوش ہوجائے گا۔‘‘

’’ارشاد! میں ہمہ تن گوش ہوں۔‘‘

’’تمہارے ایک چاہنے والے نے تمہاری کیا ستائش کی ہے، بھئی میں نے بے ساختہ داد دی ہے۔‘‘

’’سنائیں فوری۔ آپ کیوں میرا تجسس بڑھا رہے ہیں۔‘‘

’’بھئی سناتا ہوں۔ تمہاری مدح ہے، کیوں جی چھوڑتے ہو۔ لو سنو اور سر دھنو۔‘‘

لکھا وہ شکوہ بصد اضطراب اردو میں ۔۔۔ خدا سے اس نے کیا تھا خطاب اردو میں
یہ معجزہ نہیں اقبالؔ کا تو پھر کیا ہے؟ ۔۔۔ کہ عرش سے ہوا نازل جواب اردو میں

’’واقعی حضرت جی خوش ہوگیا۔‘‘

’’تمہارے ’شکوہ‘ نے اردو دنیا میں ایک ہلچل مچادی تھی۔ کہیں کفر کے فتوے، کہیں چھوٹا منہ اور بڑی بات، کہیں تمہاری دماغی حالت پر شک۔‘‘

’’حضرت آپ تو اس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔ یہ سب آپ نے کیسے جانا۔‘‘

’’وہ چھوڑو برخوردار۔ یہ سوچو یہ قطعہ مجھ تک کیسے پہنچا؟‘‘

’’ہاں یہ بھی حیران کن ہے اور اردو کے اس عاشق زار کا نام کیا ہے؟‘‘

’’تمہاری حیرانی بجا‘ لیکن اس راز پر سے پھر کبھی پردہ اٹھاؤں گا البتہ موصوف کا نام بتائے دیتا ہوں‘ شکور کے بیٹے عبدالقوی اور ادبی نام تشنہؔ بریلوی۔‘‘

''چوتھے مصرعے کی صداقت کی گواہی میں خود دیتا ہوں کہ جواب شکوہ واقعتاً مجھ پر جستہ جستہ نازل ہوتا رہا۔''

''لیکن اقبال! زبانِ اردو کی توصیف کا جو پہلو دریافت کیا گیا ہے وہ اصل الاصیل ہے۔''

''حضرت! اگرچہ ہم سب زبان شیریں کے دلدادہ رہے ہیں تاہم اردو میں بڑی صلاحیتیں ہیں۔''

''ریختہ کو اردو بنانے میں اس مقام تک لانے میں لوگوں نے بڑی محنت کی البتہ اب جمود طاری ہے جو کسی زبان کی حیات کیلئے ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔''

''قبلہ آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ کنیا کماری سے راس کماری تک اردو رابطے کی زبان ہے لیکن اس کی جیسی قدر ہونی چاہیے، نہیں ہو رہی۔''

''اس ناقدری کی وجہ؟''

''مرعوبیت''

''کس سے؟''

''انگریزوں کی 90 سالہ غلامی کا شاخسانہ، غلامانہ ذہنیت سے اور کیا توقع کی جاسکتی ہے۔''

''برخوردار اردو بولنے والوں کا یہ وتیرہ تو نہیں ہونا چاہئے۔''

''حضرت نہ جانے آپ کے علم میں ہے یا نہیں کہ مسلمانان ہند نے اپنے لیے علیحدہ ملک بنالیا جو پاکستان کے نام سے موسوم ہے۔''

''بڑا خوبصورت نام ہے۔''

''مملکتِ خداداد پاکستان میں اردو کو میری معلومات کے مطابق ابھی تک سرکاری زبان کا درجہ نہیں ملا جبکہ اردو نے قیام پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔''

''اس منافقت کی وجہ؟''

''وہی غلامانہ ذہنیت۔''

''اقبال! کیا کوئی انہیں راہ دکھانے والا نہیں۔''

''میں نے تو اپنی قوم کو خودی کا سبق پڑھایا تھا لیکن اس کا کوئی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا۔''

''اچھا اگر تمہارے احتجاج کے جواب میں باری تعالیٰ نے تمہارا ہی شعر پیش کر دیا تو کیا کرو گے۔''

''کون سا شعر؟''

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

''یاد آیا!''

''اچھی طرح یاد ہے لیکن بزرگوار! اگر ربِّ ذوالجلال کے حضور پیشی ہوئی تو جواب میں یہ عرض کروں گا۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

''تو حضرت آپ میرا ساتھ کیوں کر دیں گے؟''

''اس کے لیے کوئی راہ نکالی جائے گی تاکہ نقصان نہ ہو اور مقصد برآری ہو سکے۔''

''لیکن میں مصلحت بیں نہیں ہوں میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں''۔

یہ جنت مبارک رہے زاہدوں کو
کہ میں آپ کا سامنا چاہتا ہوں

''تمہاری اسی ادا سے تو خوف آتا ہے۔''

''اعتراضات تو آپ کے بھی بے شمار ہیں البتہ بہشت میں آ کر روش بدل ڈالی۔ آپ ہی کا شعر ہے:

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

''خیر میری چھوڑو دنیا کی باتیں۔ جنت پا کر کیوں کر زبان کھولوں لیکن تمہاری بلند خیالی تو مشیت ایزدی میں مخل ہو رہی تھی۔

تو نے یہ کیا غضب کیا، مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

اور بچت کی ایک راہ بھی نکال لی۔

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل
آپ بھی شرمسار ہو، مجھ کو بھی شرمسار کر

''لیکن قبلہ غور کریں میں تو بندہ ناچیز ہوں۔ میرا کیا مجھے تو ربِّ ذوالجلال کی شرمساری کا دکھ ہے۔''

''لیکن اقبال میرے خیال کی پرواز اتنی بلند نہیں۔ میں ایک عاجز بندہ ہوں، مجھے تو جو کچھ عطا کیا گیا اس کا بھی سزاوار نہیں جانتا، البتہ میرا احتجاج بس اتنا ہوا کرتا تھا:

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرّر نہیں ہوں میں

''قبلہ احتجاج پھر احتجاج ہوتا ہے خواہ کسی بھی درجے کا ہو۔''

''میں کب انکاری ہوں۔''

''لیکن قبلہ! میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں''۔

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں بلند

''اقبال! اس کا تو میں بھی قائل ہوں، آخر کو دستِ قدرت نے ہمیں اشرف المخلوقات بنایا ہے اور دلیل میں تمہارا ہی ایک شعر پیش کرتا ہوں''۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

''بہت بہت شکریہ خان صاحب قبلہ! میرے اشعار آپ کو پسند ہیں اور یاد بھی میں آپ کا ایک شعر اکثر گنگناتا ہوں۔ کیا نغمگی ہے۔ شعریت میں رچا ہوا۔''

''کون سا شعر؟''

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

''اس شعر کے نزول کے وقت میرا جسم زمین پر تھا اور میری روح آسمانوں کی سیر کر رہی تھی۔''

''جی ہاں اس شعر کا تقاضا کچھ ایسا ہی ہے۔''

’’لیکن اقبال جس جرأتِ رندانہ کا اظہار تم کرتے ہو میں تو سوچ بھی نہیں سکتا، مثلاً

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا   یا اپنا گریباں چاک یا دامن یزداں چاک

’’تمہارا یہ شعر دہراتے میں کانپ جاتا ہوں۔‘‘

’’لیکن مجھے تو شاباش دیں، جب ہی تو احتجاج کر رہا ہوں۔‘‘

’’میرا دوست، میرا محسن رام گوپال تمہیں یاد ہے۔‘‘

’’ہاں ہاں وہ خوب سیرت انسان جس نے کڑے وقت میں آپ کا ساتھ دیا۔‘‘

’’اقبال! خدا کرے تمہارا مشن کامیاب ہو تو دوسرے مرحلے میں ہم ان نیک سیرت انسانوں کو جو دوسرے انسانوں کے غم خوار تھے انہیں بھی جنت میں لا سکیں۔‘‘

’’قبلہ! آپ تو مجھ سے بھی آگے کا سوچ رہے ہیں۔‘‘

’’اقبال میں تو تفتہ کو یہاں دیکھنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’کاش ایسا ہو جائے۔‘‘

’’میرے دل میں ایک خیال اور ہے، تمہاری رائے جاننا چاہوں گا۔‘‘

’’فرمائیے۔‘‘

’’فردوس میں ہمارے نبی آخرالزماں ہیں۔ کیوں نہ ان سے رابطہ کیا جائے۔‘‘

یہ سنتے ہی اقبالؔ ہوش و حواس کھو بیٹھے اور ان پر سکتہ طاری ہو گیا، مرزا سخت پریشان۔ فرشتوں کی جانب سوالیہ نگاہیں۔

فرشتوں نے جواب دیا ’’اسد اللہ خان غالبؔ! آپ نہیں جانتے، اقبالؔ کے سامنے جب کبھی سیّد المرسلینؐ کا نام لیا جاتا ہے ان کی یہی کیفیت ہوتی ہے ہم جانتے ہیں اب کیا کرنا ہے۔ آپ تو اپنے محل سرا کی جانب کوچ کریں۔‘‘

یہ سنتے ہی مرزا فرشتوں کے جلو میں اپنی رہائش کی جانب رواں۔

☆

چند روز گزرے، مرزا از حد پریشان اور اقبال کی خیریت کو بے چین، فرشتوں کو حکم دیا کہ اقبال کی خبر لاؤ۔

فرشتوں نے بتایا کہ اب بخیر ہیں اور کسی لمحے آپ کے محل سرا میں حاضر ہونے والے ہیں۔

مرزا نے خاطر مدارت کا حکم جاری کیا اور خود دروازے تک آئے کہ اقبال کا استقبال کیا جائے۔

کیا دیکھتے ہیں کہ اقبال کا سفید گھوڑا دلکی چال چلتے ان کی جانب بڑھتا آ رہا ہے۔ مرزا آگے بڑھ کر تھام لیتے ہیں اور کہتے ہیں ’’چشمِ ما روشن دلِ ما شاد‘‘

’’بہت بہت شکریہ، نوازش‘‘ اندر تشریف لاتے ہیں۔

’’قبلہ، آپ جانتے ہیں ایک ہی فکر دامن گیر ہے، کسی چیز میں دل نہیں لگتا۔‘‘

’’صبر، برخوردار، ہر کام اپنے وقت پر ہی ہوتا ہے۔‘‘

’’آج آپ سے دل کی بات کہنے آیا ہوں۔‘‘

میری میں، فقیری میں، شاہی میں غلامی میں   کچھ کام نہیں بنتا بے جرأتِ رندانہ

’’ہاں، ہاں کہو۔‘‘

’’اگر ہماری بات نہیں مانی جاتی تو ہم بھی اپنے غمزدہ بھائیوں کے ساتھ وہیں جا رہتے ہیں۔‘‘

’’اقبال، کیا جنت تج دینا چاہتے ہو۔‘‘

’’آپ بالکل صحیح سمجھے۔‘‘

’’ہاتھ آئی جنت سے دستبردار ہونا کون سی عقلمندی ہے۔‘‘

’’عقل و دانش، قبلہ! بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ اب تو کچھ کر گزرنے کا وقت ہے۔ میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔‘‘

نہیں جنسِ ثوابِ آخرت کی آرزو مجھ کو   وہ سوداگر ہوں، میں نے نفع دیکھا ہے خسارے میں

’’اقبال، یہ تو جانتے ہو، واپسی ناممکن ہے۔‘‘

’’واپسی کے لیے فکرمند یہ کام نہیں کر سکتے۔ بس آپ میرے لیے دعا کریں۔‘‘

’’اقبال! تم مجھے اتنا خودغرض جانتے ہو کیا میں تمہیں اکیلے جانے دوں گا۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘

’’ہاں میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔‘‘

’’آپ نے قبلہ، جی خوش کر دیا۔‘‘

رضوان کو کیا خبر ہوئی کہ دو دیوانے جنت چھوڑ جاتے ہیں۔ ہر طرف دھوم مچ گئی۔ جنتی حیران و پریشان اور فرشتے انسان کی بغاوت پر ششدر کہ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا   مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

غالب اپنے شعر دہراتے جائیں اور اقبال ان کے ہم نوا۔ آگے آگے رضوان، ان کے پیچھے دو شاعر، اپنی عافیت سے بے خبر نارِ سموم کی جانب۔ ان کے بعد فرشتوں کا جمِ غفیر جنہیں خبر ہے کہ مرزا اور علامہ ایسا کیوں کر رہے ہیں۔ ان کا بس چلے تو وہ انہیں روک لیں لیکن وہ قلبِ صمیم سے ایک فیصلہ کر کے چل پڑے ہیں۔

رضوان اپنی رفتار کم کر کے غالب کے قریب ہو جاتے ہیں اور دبی زبان میں عرض کرتے ہیں:

’’بجائے اس کے کہ آپ محمد اقبال کو اس حرکت سے باز رکھتے، آپ اس کا ساتھ دے رہے ہیں، آپ لوگوں نے جہنم کا نام سنا ہے آپ کو خبر نہیں وہ کیسی جگہ ہے الامان، الحفیظ۔‘‘

’’لیکن آپ اقبالؔ کو نہیں جانتے۔‘‘

اقبالؔ بھی اقبالؔ سے آگاہ نہیں ہے   کچھ اس میں تمسخر نہیں واللہ نہیں ہے

’’اس کی بے باکی اور جرأت کی کچھ داستانیں سن رکھی ہیں لیکن یہ تو نرا پاگل پن ہے۔‘‘

’’خیر اب ہمیں انجام کی پروا نہیں ہے۔‘‘

رضوان نے دوبارہ فاصلہ بڑھالیا، ان کے پیچھے آنے والے جنتیوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے، انہیں غالبؔ اور اقبالؔ سے ہمدردی ہے لیکن وہ ان کا ساتھ دینے کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتے۔

غالبؔ اقبال کی دلجوئی کے لئے شعر سناتے ہیں۔

غم آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو ۔۔۔ چراغِ روشن اپنا قلزم صرصر کا مرجاں ہے

''قبلہ آپ نے صحیح فرمایا۔

عقل عیار ہے سو بھیس بنالیتی ہے ۔۔۔ عشق بے چارہ نہ ملّا ہے نہ زاہد نہ حکیم

اور یہی عشق کی قوت ہمیں کامیاب کرے گی انشاءاللہ تعالیٰ۔''

رضوان چلتے چلتے رک گئے اور پلٹ کر غالبؔ اور اقبالؔ سے مخاطب ہوئے ''اب آگے جانے کی ضرورت نہیں۔''

غالبؔ سے پہلے اقبالؔ بول اٹھے ''آپ ہمیں روک نہیں سکتے۔''

رضوان نے برملا کہا ''جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ مرزا آپ ہی انہیں سمجھائیں کوئی تو وجہ ہوگی جو روک رہا ہوں۔''

''چلیں جلدی سے وضاحت کردیں۔'' اقبال بول پڑے

رضوان نے مجمع کو مخاطب کیا:

''باری تعالیٰ نے مرزا اسداللہ خان اور محمد اقبال کی درخواست منظور کی اور ان کو اس نیکی کے عوض کہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کیلئے جنت تک سے دستبردار ہونے لگے تھے، مجھے بتایا گیا ہے کہ ان دونوں کی سپاس میں فی کس ایک ایک لاکھ سزا یافتہ جہنمی جو ہمارے کمپیوٹر میں چھٹکارے کیلئے سرفہرست تھے انہیں شامل کیا گیا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ کسی لمحے آنے والے ہیں جائیں ان کے استقبال کی تیاری کریں۔''

غالب اقبال سے بغل گیر ہوئے اور کان میں کہا ''برخوردار مبارک ہو۔''

اقبال نے پوچھا ''مرزا باقی کا کیا ہوگا۔''

چھری کے نیچے دم لو۔ پروردگار کا احسان جانو، ابتدا تو ہوئی۔''

❁ ❁ ❁

شاعری میں چراغ جلتے ہیں
دل میں ایسا جمال ہے کوئی
(مجموعہ پیاس۔ احسن سلیم)

نامور محقق اور ہمدرد انسان......ڈاکٹر نبی بخش بلوچ

(خطوط مشاہیر کی روشنی میں)

جاوید اختر بھٹی

ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ مرحوم ادب اور تحقیق کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔ انہیں اردو اور سندھی کے ادبی و علمی حلقوں میں یکساں احترام حاصل تھا۔ ڈاکٹر صاحب 1919ء میں قریہ جعفر خان لغاری (ضلع سانگھڑ) میں پیدا ہوئے۔ وہ چھ ماہ کے ہوئے تو ان کے والد گرامی علی محمد خان 25 برس کی نوجوانی میں انتقال کر گئے۔ ان کے والد کی ایک ہی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا تعلیم حاصل کرے۔ والد کے بعد ان کے چچا ولی محمد خان نے ان کی پرورش کی اور مرحوم بھائی کی خواہش کے مطابق ان کی تعلیم کا مناسب انتظام کیا۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ 1924ء میں قریہ پیلو خان لغاری کے پرائمری اسکول میں داخلہ لیا۔ مارچ 1924ء میں نوشہرو فیروز مدرسہ وہائی اسکول میں داخلہ لیا اور 1936ء میں اس ادارے سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور سندھ میں اوّل نمبر پر آئے۔ اس کے بعد آپ نے ڈی جے کالج کراچی میں داخلہ لیا۔ لیکن مالی مشکلات کی بنا پر یہاں تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔

نبی بخش بلوچ 1937ء تا 1941ء میں بہاؤالدین کالج جونا گڑھ کے طالب علم رہے۔ 1941ء میں ہی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ آئے اور ایم اے عربی میں داخلہ لیا۔ علی گڑھ میں انہوں نے چھ سال قیام کیا۔ ان دنوں علامہ عبدالعزیز میمن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں صدر شعبہ عربی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو ان کی رفاقت میسر آئی۔ انہی دنوں اس یونیورسٹی میں ڈاکٹر ہادی حسن فارسی، ڈاکٹر سید ظفر الحسن فلسفہ، پروفیسر محمد مجیب تاریخ اور پروفیسر رشید احمد صدیقی اردو کے نامور استاد تھے۔ ان تمام اساتذہ سے ڈاکٹر صاحب کے اچھے مراسم تھے۔ انہوں نے 1943ء میں مسلم یونیورسٹی سے ایم اے عربی میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے تصنیف و تالیف کا آغاز علی گڑھ کے قیام کے دوران میں کیا۔ ان کا پہلا تحقیقی مقالہ حیدرآباد دکن کے معروف تحقیقی رسالے Islamic Culture میں

شائع ہوا۔ وہ علامہ میمن کی زیرنگرانی السند سیطرہ العرب (سندھ تحت عرب) پر پی ایچ ڈی کیلئے مقالہ لکھ رہے تھے لیکن پیر الٰہی بخش (جو خود بھی علی گڑھ کے سابق طالب علم تھے) کی کوششوں سے سندھ میں مسلمانوں کا پہلا کالج قائم ہوا اور اس میں ڈاکٹر صاحب کا تقرر ہوا۔ 1946ء میں وہ علی گڑھ چھوڑ کر کراچی آ گئے۔ اس کے بعد مرکزی حکومت کے وظیفہ پر وہ کولمبیا یونیورسٹی گئے اور A Program Of Teacher Education for the New State of Pakistan کے موضوع پر 1949 میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کر لی۔

نیویارک میں یوم پاکستان کی پہلی تقریب میں انہوں نے شرکت کی۔ پاکستان واپس آ کر 1950 تا 1951ء افسر بکارخاص (OSD) وزارت اطلاعات ونشریات کراچی رہے۔ 1951ء میں سندھ یونیورسٹی میں ان کا تقرر بحیثیت پروفیسر آف ایجوکیشن ہوا۔ 1973ء تا 1976ء وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی' 1976ء تا 1979ء افسر بکار خاص' 1980ء تا 1983ء اولین وائس چانسلر بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، 1983ء تا 1989ء مشیر ہجرہ کونسل اسلام آباد 1990ء تا مارچ 1994ء اولین چیئرمین سندھ زبان کا بااختیار ادارہ حیدر آباد (سندھ) رہے۔ ڈاکٹر صاحب 6 اپریل 2011ء کو علی الصبح حیدر آباد (سندھ) میں وفات پا گئے۔ ان کی عمر 94 برس تھی وہ 90 برس کی عمر تک کام کرتے رہے۔ ڈاکٹر نبی بخش نے جو تحقیقی کام کئے اس کی فہرست کافی طویل ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو کام ڈاکٹر صاحب نے کئے وہ شاید کسی دوسرے محقق کیلئے ممکن نہیں تھے۔

یہ تمہید اس لئے ہے کہ اس وقت میرے سامنے محمد راشد شیخ کی مرتبہ کتاب ''خطوط مشاہیر ڈاکٹر نبی بخش بلوچ'' ہے اس سے پہلے بھی راشد صاحب ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے کام کر چکے ہیں' انہوں نے ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے اردو مقالات اور خطبات کا پہلا مجموعہ ''گلشن اردو'' (2009) خطوط ڈاکٹر نبی بخش بلوچ (2011) مرتب کئے' ڈاکٹر صاحب پر ایک کتاب ''ڈاکٹر نبی بخش بلوچ شخصیت وفن'' 2007ء میں تالیف کی اور اس کے بعد دوسری کتاب ''ڈاکٹر نبی بخش بلوچ سوانح حیات اور علمی وعملی خدمات'' 2014ء میں تالیف کی۔

زیر نظر کتاب میں ڈاکٹر نبی بخش کے نام 70 مشاہیر کے خطوط ہیں۔ پاکستان کے ان اہم ادیبوں کے خطوط پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کیلئے ان کے دل میں کتنا احترام تھا۔ وہ مختلف عہدوں پر رہے اور لوگ انہیں بلا تکلف خط لکھ کر مدد کی درخواست کرتے تھے۔ مسلسل ایسے خط آنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ لوگوں کے کام آتے تھے اور نامور شاعر' ادیب اور محقق ان کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔

علامہ عبدالعزیز میمن' ڈاکٹر صاحب کے استاد تھے۔ انہوں نے اپنے استاد کا ساری زندگی احترام کیا۔ بڑے آدمی بہت سادہ ہوتے ہیں۔ اس کا یقین مجھے علامہ صاحب کے خطوط پڑھ کر ہوا۔ ان

خطوط میں جہاں علمی گفتگو ہے وہاں نہایت سادہ اور معصوم فرمائشیں بھی نظر آتی ہیں۔ انہیں گھی اور تمبا کو کی زیادہ فکر رہتی تھی۔ اس کے لئے وہ ڈاکٹر صاحب کو لکھا کرتے تھے اور یقیناً وہ اپنے استاد کی فرمائش کو بصد احترام پورا کرتے ہوں گے۔ یہ دوسری عالمی جنگ کے فوراً بعد کا زمانہ ہے جب راشن کی تنگی تھی اور ہر شخص پریشان تھا۔

چند اقتباسات دیکھئے:

''اگر کوئی انتظام نہ ہو سکے تو میرا مہمان خانہ آپ کیلئے حاضر ہے' فکر نہ کریں۔ گھی یہاں اچھا نہیں مل سکے گا' لیتے آئیں' ملازم کی رفاقت مزید خرچ کا باعث ہوگی۔ خیر اس کو آپ بہتر سمجھ سکتے ہیں' یہاں گیہوں فی کس روزانہ 2 چھٹانک ہے' چاول' چنا' جو' باجرہ' بہ افراط مل سکتا ہے۔ میرے لیے دو سیر تمبا کو' 5 سیر کھجور اور چیزیں' علی گڑھ کے مقابلہ میں اچھی یا ارزاں ہوں لیتے آئیں۔ کپڑے کا رنگ وہی ہے جو آپ کے سامنے تھا'' (25 فروری 1946)

''میں نے یہاں آتے ہی آپ کو خط لکھا تھا' ملا ہوگا۔ یہاں راشن میں تقریباً یکساں حساب ہے' البتہ گھی' ایندھن اور تمبا کو بہت گراں ہے اگر ہو سکے تو کسی آتے جاتے کے ہاتھ ساڑھے 4 سیر کے دو گھی کے کنستر (کل 9 سیر) اور دو سیر تمبا کو جس میں زیادہ ڈنٹھل نہ ہو میرے لئے بھیج دیں یہاں کپڑا 12 روپیہ' چاول 14,25 روپیہ ہے۔ گھی 5-6 روپیہ سیر ہے۔'' (26 جون 1946ء)

اب زمانہ تبدیل ہوتا ہے۔ تقسیم کا عمل قریب ہے فسادات شروع ہو گئے ہیں۔ اب خطوط میں ان واقعات کا ذکر آتا ہے اور علامہ صاحب پریشانی اور بے یقینی کا اظہار کرتے ہوئے فکر مند ہوتے ہیں۔ وہ حالات کو تبدیل ہوتے دیکھتے ہیں۔

علامہ عبدالعزیز میمن لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کی گرم بازاری ہے' انہی کی وجہ سے یونیورسٹی بجائے یکم ستمبر کے یکم اکتوبر کو کھلی'' (20 نومبر 1946) ''ہندوستان نے 5-6 کروڑ مسلمانوں کو فنا کر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ریلوں میں سکھ مسلمانوں کو چن چن کر مار ڈالتے ہیں' سکندرہ میں اوسی ایکسپریس نے 2-3-4 سو مسلمانوں کو مار کر پھینک دیا۔ جس میں خود 8 روز پیشتر آیا تھا۔ راتیں جاگتے گزرتی ہیں۔ علی گڑھ کے مضافات کے گاؤں کے مسلمانوں کو ختم کر دیا۔ بچے کھچے شہروں میں بھاگ آئے۔ ہندو گورنمنٹ پولیس' فوج یہ مظالم بلا چوں وچراں پوری دلی خوشی سے دیکھتے ہیں۔ علی گڑھ سے اجمیر آمد ورفت محال ہے۔ بیوی راجکوٹ میں پھنس گئی۔ جونا گڑھ پاکستان میں آ گیا ہے۔ انڈین یونین نے اس کو بری طرح گھیرا اور دبایا ہے۔ کل نواب اسماعیل وائس چانسلر ہو گئے۔ یوپی اور دہلی کی گرانٹ بند ہے۔ علی گڑھ انڈین یونیورسٹی ہوگی مسلم نہیں رہے گی۔ نصف ہندو ہوں گے۔ پنجابی اور سرحدی طلبہ وہیں لاہور میں داخل ہوں گے۔ دہلی میں ہزاروں مسلمان ختم کر دیئے گئے اور لاکھوں بے خان وبان ہیں' لوٹ لئے گئے۔ ہزاروں پاکستان آ رہے ہیں۔ علی گڑھ وغیرہ کی باری ہے۔ مولوی ثناء اللہ اور ان کا خاندان ختم کر دیئے گئے۔ اطراف 4-5 سو میل امید نہیں کہ کوئی مسلمان رہنے دیا جائے۔ مشرقی

پنجاب اسلام سے خالی ہوگیا۔

آپ کا وطن قلب پاکستان بنا ہے' خواہ مخواہ نصیب میں سندھی بننا ہی لکھا ہے۔ ہندو کی اندرونی ذہنیت بے نقاب ہوگئی ہے پاکستان کے تصور سے 30 برس پیشتر سے یہ لوگ رام راج قائم کرنا چاہتے تھے۔ آگے پیچھے مسلمانوں کے نصیب میں جلاء تھا۔ پاکستان کی تاریخ محض بہانہ بنی ہے'' (22 ستمبر 1947)

''ابھی تو یکم نومبر کو علی گڑھ میں حاضری ہے پھر آئندہ یہاں یا کراچی میں راجکوٹ یا علی گڑھ کے مکان کے تبادلے کی سوچوں گا۔ حکومت ہند پاکستان میں تنخواہیں نہیں بھیجنا چاہتی' یہاں ہندوستانی مہاجروں کی کثرت سے اردو مادری سی بنی جا رہی ہے اور اب ہندوستان و پاکستان ہے' کوئی نئی بات نہیں البتہ محمد علی جناح کے بعد کوئی لیڈر نظر نہیں آتا خدا خیر کرے۔ چاہتا ہوں علی گڑھ کے قیام کیلئے اتنی مدت ملے کہ وہاں کے سامان وغیرہ کا تیا پانچا کرسکوں اسی طرح راجکوٹ کا' مگر پہلے سندھ کے قیام کا سامان ضروری ہے۔ حکومت ہند مسلمانوں کو نہ عزت سے ادھر آنے دیتی ہے نہ وہاں خیریت سے رہنے دیتی ہے۔ اب تو آنے جانے پر بھی پابندیاں بڑھتی جا رہی ہیں اور حیدر آباد کے سلسلے میں جملہ مسلمان موردِ تہمت بنتے جا رہے ہیں (13 جولائی 1948ء)

علامہ عبدالعزیز میمن مزید چند برس علی گڑھ میں رہے' کراچی پہنچ کر پہلے سے انداز میں گھی کی فرمائش ہوئی۔

''ہاں اب وقت ہے' 15-20 روز میں گھی کا ایک کنستر منگا دیجئے ضرور! پہنچانے کی دردسری بھی اپنے سر ہی لیجئے (26 مارچ 1955)'' پونے پانچ سیر گھی ختم' قیمت سعید کو دے دی تھی۔ یہاں ساڑھے 4 روپیہ سیر کا بھاؤ ہے...... قاضی سے معلوم ہوا کہ آپ نے میرے لئے کنستر منگوایا ہے مجھے بھی اشد ضرورت ہے۔ اللہ کرے کوئی لانے والا مل جائے۔''

علامہ صاحب کے خطوط کی ایک خوبی ہے کہ اس میں کتابوں کا مسلسل ذکر آتا ہے۔ ان کا علم بہت زیادہ تھا۔ کتابوں کا ذکر وہ آخری زمانے تک کرتے رہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''سرائیکی ترجمہ جو سابق ہیں بڑی تقطیع پر بہاولپور میں چھپا ہے' وہ میرے پاس ہے۔ غالباً اس کا عکسی ایڈیشن آپ کے ہاں نکالا گیا ہے۔ معلوم نہیں پنجابی میں کس کا ترجمہ آپ نے انتخاب فرمایا؟ کاش آپ کاشمیری پر توجہ فرماسکیں۔ مولانا مقبول سبحانی کا ترجمہ جو میں نے پیش کیا تھا صدر محترم ضیاء الحق صاحب نے تاج کمپنی کو بھیجا کہ وہ اسے چھاپے۔ کمپنی کے مہتمم صاحب کا انتقال ہوگیا۔ معلوم نہیں اس ترجمے کا اب کیا حشر ہوگا۔ اس کی اشاعت میں عظیم سیاسی مصلحت بھی اظہر من الشمس ہے' واللہ المستعان'' (21 اگست 1985ء)

ڈاکٹر سید عبداللہ کے خطوط سے اقتباس:

''غور فرمایئے' برصغیر میں جس میں چچ نامہ اور البیرونی کی تواریخ کے بعد تاریخ نگاری کا ایک

بھرپور سلسلہ انگریزوں کی آمد تک قائم رہا' جدید تعلیم کے شروع ہوتے ہی منقطع ہوگیا۔ تاریخ نگاری کا کام انگریزوں نے سنبھال لیا اور ہماری تاریخ کی ایسی تعبیریں کرڈالیں جن سے ہمیں اپنے اوپر ندامت ہونے لگی۔ ہندوؤں نے ہند کی مناسبت سے کچھ بہتر کام کیا مگر ان سے بھی پیچھے رہے۔ ہم نے شبلی کے سوا کوئی بڑا مؤرخ پیدا نہیں کیا اور اب بھی تقریباً صفر ہیں۔ میں نے کچھ عرصہ پہلے ایک کتابچہ ''کلچر کا مسئلہ'' مرتب کر کے ایک ناشر کو دیا تھا' اس نے اس کا ناس مار دیا۔ بہر حال جس حال میں ہے' ایک نسخہ ارسال ہے تاکہ میرا رسالہ آپ کے کتب خانہ میں محفوظ ہوجائے۔ کبھی فرصت ملے تو ایک آدھ باب پڑھ ڈالئے۔ بڑی ہی مجبوری سے لکھ رہا ہوں۔ اس کی مضمرات کسی وقت میں زبانی پیش کروں گا۔ کاغذ بعض باتوں کا متحمل نہیں ہوسکتا۔

''خلاصہ احوال یہ ہے کہ میری بیٹی پروفیسر عطیہ سید ایم اے (فلسفہ وغیرہ) لاہور کالج برائے خواتین میں پڑھا رہی ہیں تیرہ چودہ برس کا تجربہ ہے' لکھتی بھی رہتی ہیں اب وہ امریکہ کی کسی یونیورسٹی (نیویارک' واشنگٹن' شگاگو' براؤن) وغیرہ جا کر مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہیں لیکن مالی وسائل بالکل موجود نہیں کیونکہ میں عمر بھر جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ''فضول'' کاموں میں وقت صرف کرتا رہا اور دنیاداری بالکل نہیں کی لہٰذا خالی ہاتھ ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے وہاں کوئی نوکری (مکمل یا جز وقتی) مل جائے تاکہ وہ اپنا خرچ ادا کرسکے اور تعلیم بھی حاصل کرلے۔ وہ یونیورسٹیاں پہلے سال میں کوئی مالی امداد نہیں دیتیں۔'' (2 فروری 1980)

نور احمد خان فریدی کا تعلق ملتان سے تھا۔ ان کے خطوط دلچسپ بھی ہیں اور تکلیف کا باعث بھی ایک تو انہیں ہمیشہ مالی امداد کی ضرورت رہی۔ وہ اپنے ہم عصروں سے ناراض رہے اور اپنی صحت کیلئے فکرمند رہے۔ اپنی کتابوں کی فروخت بھی انہیں پریشان کرتی رہی۔

ان کے چند خطوط سے اقتباس

''سرائیکی ادب (فریدی صاحب کی زیر ادارت شائع ہونے والا ماہنامہ) کی مالی پوزیشن مضبوط کی جائے۔ آپ کے حلقہ اثر میں یقیناً سرائیکی سمجھنے والوں کی کافی تعداد ہوگی۔ ان میں سے ایسے حضرات کے پتے واپسی ڈاک سے ارسال کریں جواب رسالہ ہذا کا وی پی وصول کرسکیں۔ سندھ یونیورسٹی کو کتنے اور کس پتے پر وی پی کئے جائیں۔ یہ ماہنامہ خط نسخ میں لکھا گیا ہے۔ تاریخ ملتان کی جلد اول عہدِ قدیم سے عہد قریشی (مخدوم محمد یوسف فرماں روائے ملتان) تک طبع ہوکر جلد بندی کے مراحل طے کررہی ہے۔ دوسری جلد کے 280 صفحات کتابت ہوچکے ہیں۔ میری صحت پہلے سے بہتر ہے مگر جس شخص کا پتّہ نہ ہو اس کا کیا جینا' نہ گھی استعمال کرنے کی اجازت ہے اور نہ دودھ وروغنیات ہر قسم کی۔ محض رحمت الٰہی کے بھروسے پر جی رہا ہوں۔'' (20 جون 1971) اکادمی ادبیات سے وظیفہ مل رہا ہے اور یہ سب خداوند کریم کی عنایت اور آپ کی شفقت سے ہوا ہے۔ جس کیلئے بندہ اپنے رب کریم کا شکرگزار اور آپ کا احسان مند ہے۔ اب احقر نے ملتان پر ایک تحقیقی تنقید کی ہے۔ آپ ہسٹاریکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے سربراہ ہیں۔ آپ نے لاتعداد ادیبوں اور دانشوروں کو نوازا ہے۔ خاکسار آپ

کا احسان مند ہے کہ آپ اپنے احباب کو میری سفارش فرماتے رہتے ہیں لیکن درخواست یہ ہے کہ زیر طبع کتاب کیلئے مالی امداد مرحمت فرمائیں۔ یہ کتاب مدون ہو کر کتابت بھی ہو چکی ہے۔ اب صرف طباعت کا مرحلہ درپیش ہے اور ایک ہزار کی تعداد پر 20,000 روپے خرچ آنے کا اندازہ ہے مگر میرے پاس اس وقت صرف 9320 روپے ہیں۔ جناب کو احقر کی تصانیف دیکھنے کا کئی بار اتفاق ہوا ہوگا۔ نیاز مند کی تمام مطبوعات معیاری ہیں۔ ان کی فہرست لیٹر ہیڈ پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ ازراہ کرم خصوصی مالی معاونت سے نوازیں تا کہ یہ کتاب طبع ہو سکے۔'' (22 جنوری 1982)

ملتان میں ایک صاحب مہر عبدالحق رہتے ہیں۔ انہوں نے قرآن مجید کے ترجمے کا پنجابی ترجمہ کر کے آپ کی وساطت سے ایک لاکھ روپے کی طباعتی امداد حاصل کی۔ حالانکہ یہ شاہ عبدالقادر کے اردو ترجمے کا پنجابی ترجمہ ہے اور دو ماہ کا کام ہے۔ عتیق فکری نے ملتان کی تاریخ پر قلم اٹھایا ہے' حالانکہ اس سے پہلے ہی علی گیلانی' مخدوم یوسف قریشی' منشی عبدالرحمٰن' شیخ اکرام الحق ایڈووکیٹ اور احقر کی لکھی ہوئی ملتان کی تاریخیں موجود ہیں۔ اتنی کتابوں کو سامنے رکھ کر ملتان کی تاریخ کو ازسرِنو مرتب کرنا کوئی مشکل بات نہیں مگر اسے بھی جناب نے گورنمنٹ سے معقول گرانٹ دلائی۔ لیکن بندہ جو کہ مستقل مریض ہے جس کا نہ پتہ ہے نہ بایاں گردہ...... پانچ بار آپریشن ہوئے۔ اب پھر اسی ہفتے میرا پراسٹیٹ کا آپریشن ہونا ہے۔ جولائی میں کوئٹہ جا کر بائیں آنکھ کا آپریشن کرانا ہے۔ خاکسار کو یہ فخر حاصل ہے کہ بندہ کی مطبوعات میں آج تک کسی مخالف نے بھی غلطی کی نشان دہی نہیں کی۔ اور پھر ''سندھ کے تالپور حکمران'' تو ایک ایسی کتاب ہے جس کی ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ میں نے 250 صفحات میں اس کی کتابت کرالی ہے۔ اس کا فوٹو اسٹیٹ آپ کے لئے کرایا ہے' آپ سے استدعا ہے کہ مجھے اجازت دیں تا کہ یہ کتابت شدہ مسودہ جناب کو بھیجوں تا کہ آپ خود ملاحظہ فرمائیں اور تاریخ وثقافت کے ذمہ دار حضرات بھی دیکھ لیں۔ اگر پسند آئے تو اس کی طباعت کیلئے گورنمنٹ سے مالی امداد دلائیں ورنہ جلا دیں۔ بندہ ضعیف العمر بوڑھا آدمی ہے۔ مجھے نہ ناموری کی ضرورت ہے اور نہ روپے کی ہوس ہے۔ اللہ خاتمہ ایمان پر کردے' آمین۔'' (2۔جون 1982)

بندہ نے مسلسل آپریشنوں اور بیماریوں کے باوجود درج ذیل کتابوں کو مدون کیا' کیا تاریخ وثقافت کی وزارت ان کی طباعت میں احقر کی مدد کر سکتی ہے؟ (23 جون 1983) اس کے ساتھ فریدی صاحب نے اپنی پانچ زیرِ طبع کتب کا تعارف دیا ہے۔

جناب کی مسلسل سفارش سے ہی اکادمی ادبیات پاکستان نے احقر کو 70 روپے ماہوار بطور الاؤنس دیئے تھے۔ جواب مل رہے ہیں لیکن ہر سال جون میں نئے مالی سال کیلئے تجدید ہوتی ہے اور سوائے آپ کے نہ اس ماحول میں میرا کوئی واقف ہے نہ سفارشی' ملتان رائٹرز گلڈ کے سیکریٹری سید اصغر علی شاہ' ایم اے نے اطلاع دی ہے کہ ملتان کی گلڈ نے اکادمی ادبیات کو آپ کیلئے پرزور سفارش کی ہے کہ ان کا الاؤنس جاری رکھا جائے لیکن اسلام آباد کے ماحول کا علم نہیں اور نہ ہی آپ کے سوا کوئی شناسا ہے' ایک شخص جو پتہ' گردہ نہ ہونے اور دونوں آنکھوں پر موتیا چھا جانے کے باوجود برابر

تصنیف وتالیف میں مصروف ہے...... جناب عالی! آپ ملتان اور خاکسار سے بخوبی واقف ہیں' اگر زندگی اور موت انسان کے اپنے بس میں ہوتی تو خاکسار کبھی کا رخصت ہو چکا ہوتا مگر بے بسی کا عالم ہے اور 400 روپے ماہوار پنشن کے سوا گزر اوقات کا کوئی ذریعہ نہیں۔'' (1983ء)

''دعا گو نے جناب کو ڈاکٹر غلام ربانی آگرو ڈائریکٹر ادبیات پاکستان کے خلاف شکایت کی تھی کہ اس نے احقر کو اہل قلم کانفرنس میں شمولیت کی دعوت نہیں دی۔ گویا دو درجن ضخیم کتابیں لکھنے کے باوجود احقر ان کے نزدیک اہل قلم نہیں ہے۔ ساتھ ہی معلوم ایسا ہوتا ہے کہ 700 ماہوار جو وظیفہ ملتا تھا وہ بھی اس نے بند کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں اسے اور ڈاکٹر شفیق الرحمٰن کو کئی نیاز نامے لکھے ہیں مگر دونوں نے جواب نہیں دیا۔ 80 برس کے پیر مرد جو دس سال آپریشنوں کی زد میں رہا ہے جو پتہ اور بایاں گردہ سے محروم ہے۔ جس کی دونوں آنکھوں کے بیرونی خول اتارے جا چکے ہیں جو نصف بصارت کے سبب چلنے پھرنے سے عاجز ہے مگر اس کا قلم برابر تصنیف وتالیف میں مصروف ہے۔ اسے محکمہ ادبیات اہل قلم میں شمار نہیں کرتا۔ اس سال جو بڑا لشکر اہل قلم کانفرنس میں شریک ہوا ہے آپ ہی انصاف کریں ان میں خاکسار کے پائے کے کتنے ادیب اور مصنف ہیں۔ اگر وہ بندہ کو ادبی وظیفہ سے محروم کرنا چاہتا ہے تو کم از کم احقر کو یہ تو بتائے کہ کس جرم میں احقر کو یہ سزا ملی ہے۔ اپنی مخلوقات کا رازق خود خدا ہے۔ وہ پتھروں میں کیڑوں کو بھی رزق پہنچاتا ہے۔ جب تک بندہ کو زندہ رکھنا مقصود ہے ضرور رزق مہیا کرے گا میری بیماری اور بوڑھی بیوی کو بھی خدا کا سہارا کافی ہے لیکن وجہ سے مطلع کیا جائے...... کیا محکمہ ادبیات کو مجھ سے زیادہ کوئی مستحق ادیب مل گیا ہے تو اس کی نشاندہی کرے اگر واقعی وہ مجھ سے زیادہ مستحق ہوگا تو بندہ اپنے تن کے تمام کپڑے بھی اسے اتار کر دے گا۔ مگر اللہ کی مخلوق سے بے انصافی نہیں ہونی چاہئے۔ آپ کو اللہ جل شانہ نے صاحب اختیار بنایا ہے...... آپ سے یقیناً پرسش ہوگی۔'' (3 اگست 1985ء)

''میری گزر اوقات کتابوں کی فروخت پر ہوتی ہے' پہلے ذی اقتدار صاحبان سے رابطہ کر کے چند اسکولوں کی لائبریری میں لگوا دیتا تھا اب گورنمنٹ کی کتابیں سپلائی کرنے کا کام نیشنل بک فاؤنڈیشن کو دے دیا ہے۔ میں نے اپنی بساط سے بڑھ کر 33 فیصد ڈسکاؤنٹ دینے کی پیش کش کی ہے مگر یہ لوگ یہودی صفت ناشرین فیروز سنز' شیخ غلام علی' شیخ مہر دین وغیرہ سے معاملہ کر رہے ہیں وہ کتابوں کا ٹائٹل اتار کر نیا ٹائٹل چسپاں کر دیں گے اور قیمت دس گنا زیادہ بڑھا دیں گے۔ اس طرح نیشنل بک فاؤنڈیشن کو 70 فیصد ڈسکاؤنٹ دیں تو پھر بھی نفع میں رہتے ہیں (تاریخ درج نہیں)

احمد ندیم قاسمی کے خطوط سے اقتباس:

ہماری کوشش ہے کہ محکمہ ڈاک حافظ محمد شیرانی ایسے اعلیٰ درجے کے محقق کی یاد میں اکتوبر تک ایک یادگاری ٹکٹ جاری کرے' کیا آپ اس ضمن میں کچھ امداد فرما سکیں گے' مشورہ عنایت کر سکیں گے؟...... مجلس ترقی ادب کا سا ادارہ جس نے سرکاری گرانٹ سے چلنے والے سب ہی اداروں کے مقابلے میں قابل رشک کام کیا ہے' اور جس نے دنیا بھر میں پاکستان کی نیک نامی کا سامان کیا ہے۔ آج

کل زیر عتاب ہے۔ اس کی جو گرانٹ (دو لاکھ روپے) گزشتہ جون میں منظور ہوئی تھی وہ آج تک Release نہیں ہوئی اور کتابوں کی فروخت یا بینک سے O/D حاصل کر کے ادارے کے مشاہرے ادا کر رہا ہوں۔ ایک ماہ بعد یہ گرانٹ Lapse ہو جائے گی اور نئے بجٹ میں شاید ہی اس منصوبے کیلئے کچھ رقم مخصوص ہو سکے' مجلس پر اس عتاب کا سبب صرف صوبائی سیکریٹری اطلاعات وثقافت ہیں جو فرماتے ہیں کہ اس ادارے کی کتابیں تو بکتی نہیں ہیں پھر اسے گرانٹ کیوں دی جائے۔ جب کہ یہ ادارہ قائم ہی اس لئے ہوا ہے کہ جو کتابیں عام ناشرین نہیں چھاپتے وہ یہ ادارہ سستی قیمت پر چھاپتا رہے تا کہ علم کا خلا نہ پیدا ہو۔ کیا آپ اس ضمن میں فوری طور پر ہماری امداد فرما سکتے ہیں کہ یہ گرانٹ Release ہو اور آئندہ سال کی منظور ہو؟'' (26 مئی 1980ء)

''دو نہایت اہم امور کی طرف آپ کی توجہ فوری طور پر مبذول کرنا چاہتا ہوں۔ ادیبوں کے مسائل کے ضمن میں ادبی رسائل کیلئے کاغذ کا مطالبہ بھی شامل تھا کہ اس پر پچاس فیصد کسٹم ڈیوٹی کی چھوٹ دی جائے' یہاں آ کر معلوم ہوا کہ روزنامہ اور ہفت روزوں کو اخبار کے کاغذ کیلئے یہ چھوٹ پہلے ہی حاصل ہے' چنانچہ ادیبوں کے اس مطالبے میں تبدیلی فرما لیجئے کہ ادبی رسائل تصاویر بھی شائع کرتے ہیں اور بعض اوقات سفید کاغذ پر بلاک کی طباعت بھی کرائی جاتی ہے اس لئے ادبی رسائل کو ہر قسم کے سفید کاغذ کے سلسلے میں پچاس فیصد کسٹم ڈیوٹی کی چھوٹ دی جائے۔ دوسری گزارش یہ ہے کہ ثقہ اطلاع کے مطابق کالجوں اور اسکولوں کی لائبریریوں کیلئے صوبہ پنجاب کے محکمہ تعلیم کی طرف سے حکم جاری ہوا ہے کہ شاعری اور فکشن کی کتابیں خریدنے سے اجتناب کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تخلیقی فنکاروں کی نگارشات کو پرکاہ کی حیثیت دی جائے۔ تخلیقی سطح پر شاعری اور فکشن ہی تو اردو' پنجابی' سندھی' پشتو اور بلوچی کا سرمایہ تہذیب ہے۔ اسے لائبریریوں سے خارج کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ طلبا کو ملکی مسائل ومعاملات پر سوچنے سے محفوظ رکھا جائے۔ خدارا اس سلسلے میں کچھ کیجئے او رمرکزی حکومت کی طرف سے صوبائی محکمہ تعلیم کو احکام جاری کرائیے کہ اس جہالت اور حماقت سے باز رہیں۔'' (2 دسمبر 1980)

اعجاز الحق قدوسی لکھتے ہیں:

''آپ کے بے پایاں الطاف وکرم جو اس فقیر کے شامل حال رہے ہیں' اس کی بنا پر یہ عرض کرنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ غالباً مارچ میں ٹیکسٹ بک کمیٹیاں منعقد ہوتی ہیں۔ اگر اس مرتبہ آپ کی توجہ خصوصی سے ''سندھ کی تاریخی کہانیاں'' کا مسئلہ بھی پیش ہو جائے جو تقریباً دو سال سے رجسٹرار سندھ یونیورسٹی کے دفتر میں پڑا ہوا ہے تو آپ کے اس کرم کو کبھی فراموش نہ کر سکوں گا (25 فروری 1960)

''امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ میں نے مجلس ترقی ادب لاہور کیلئے لکھا تھا اگر میری سوانح حیات کیلئے احمد ندیم قاسمی سے سفارش فرمائیں تو بے حد کرم ہوگا۔ آپ نے ازراہ کرم اس کا وعدہ بھی فرمایا تھا کہ میں لاہور جاؤں گا تو مجلس ادب والوں سے بات کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے بات

کر لی ہوگی۔ براہ کرم اگر اس گفتگو سے مطلع فرمایا جائے تو میں شکر گزار ہوں گا (21 مارچ 1982ء)

آپ نے قاسمی صاحب کے خط میں ادیبوں کے بارے میں زوردار موقف پڑھا۔ اب دیکھیں یہ کتاب قاسمی صاحب نے شائع نہیں کی۔ بالآخر 1988ء میں اسے مکتبہ اسلوب کراچی نے شائع کیا اس پر کیا تبصرہ کیا جائے۔ شاید وہ ڈاکٹر صاحب سے خوش نہیں تھے۔

عین الحق فریدکوٹی کے ایک خط سے اقتباس

''اب اگر آپ سے نیم ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے تو خود اپنی کتاب ''اردو زبان کی قدیم تاریخ'' کے بارے میں کچھ عرض کر دوں کہ جو بڑی حد تک خود آپ کی اپنی ہی کتاب ہے کیونکہ اس کی ابتدا بھی آپ کے پرمغز مقالے سے ہوتی ہے اور انتہا آپ کے ترتیب دیئے ہوئے صحت نامہ سے۔ تو یہ کتاب ادھار سدھار لے کر چھاپ تو لی ہے لیکن اس کے نکاس کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہو رہا۔ اسکول اور کالجوں کی لائبریریوں کا کہنا ہے کہ وہ کتابیں بک فاؤنڈیشن کے ذریعے ہی لے سکتے ہیں اور بک فاؤنڈیشن والے کہ جنہوں نے بعض مصنفین کے ہزار ہزار اور ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار کے پورے کے پورے ایڈیشن نقد قیمت پر خرید رکھے ہیں میں باوجود انتہائی کوشش کے انہیں دس کتابیں خریدنے کیلئے آمادہ نہیں کر سکا۔ معلوم ہوا ہے کہ 'اکادمی آف لیٹرز' کے زیر غور بھی کچھ اس قسم کے منصوبے ہیں کہ وہ مصنفین کی معیاری کتابیں خرید کر لائبریریوں کو مہیا کرے گی۔ اب معلوم نہیں کہ اس کے معیار کا کیا ہوگا بہرحال اگر آپ ایسا انتظام فرما سکیں کہ نیشنل بک فاؤنڈیشن یا بک بینک یا اکادمی آف لیٹرز میں سے کوئی ایک یا پھر تینوں مل کر میری کتاب کی کوئی ڈھائی سو کاپیاں نقد قیمت پر اور مناسب ڈسکاؤنٹ پر خرید لیں تو مجھے اس طرح سے قرض خواہوں کے تقاضوں سے نجات مل جائے گی اور میں سکون سے اپنی تحقیق کو جاری رکھ سکوں گا۔'' (3 فروری 1981)

(اسی انداز کا ایک خط نور احمد خان فریدی نے بھی لکھا ہے)

اب آخر میں ڈاکٹر احمد بشیر سابق صدر شعبہ تاریخ سندھ یونیورسٹی کے ایک خط سے اقتباس پیش کرتا ہوں' کتاب سے محبت رکھنے والوں کو ایسے مراحل سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

''بشیر' ڈاکٹر احمد شعبہ جنرل ہسٹری' سندھ یونیورسٹی یہ عریضہ لکھ رہا ہوں
بلوچ بھائی'

ساری عمر کتابیں خریدنے اور پڑھنے کے سوا کوئی اور شوق نہیں رہا۔ لندن سے لایا' آکسفورڈ سے منگاتا رہا اور دلی' لکھنؤ اور جگہوں سے' رجسٹروں میں درج کی ہیں تو یہ کل 6 ہزار سے زائد ہوئیں۔ تین ہزار چار سو ایک انگریزی کی کتابیں اور تین ہزار سے اوپر اردو کی (ان میں سے ایک سو ستر فارسی کی ہیں) انگریزی کتابیں تاریخ اور ادب پر ہیں اور اردو کتابیں شعروادب اور تاریخ پر۔ فارسی کتابیں' تاریخ ہند کے ماخذ اور دیوان وکلیات ہیں۔ تاریخ میرا ذوق اور ذریعہ معاش بھی تھی اور شعرادب تفریح' میری نظر اب بہت کمزور ہوگئی ہے۔ بچوں کا اردو' فارسی سے شغف نہیں' اس لئے میں نے انہیں سائنس کی طرف ڈال دیا ہے۔

ان حالات میں اس ذخیرہ کتب کو بیچ دینا چاہتا ہوں۔ انگریزی کتابیں اکثر نئی ہیں اور اردو کتابیں بھی نئی ہیں... آپ بھی میری طرح کتابوں کے دل دادہ رہے ہیں اور اس کے ساتھ یونیورسٹیوں اور علمی اداروں سے پتہ لگاتے ہوئے کہیں نہ کہیں اس علمی ذخیرہ کتب فروخت میں مدد فرمائیں۔ یہ ادھر ادھر سے خریدی ہوئی کتابیں نہیں بلکہ نہایت سوچ سمجھ کر علمی وادبی کتابیں میں نے جمع کیں۔ بیچنے کیلئے نہ خریدی تھیں بلکہ ذاتی اور خاندانی کتب خانے کیلئے' افسوس کے حالات پلٹ گئے' مذاق پلٹ گئے۔'' (6جون1988)

ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نامور محقق اور ہمدرد انسان تھے۔ ادیب اور شاعر اپنے معاملات ان کے گوش گزار کرتے تھے ڈاکٹر صاحب کیونکہ مختلف عہدوں پر رہے تھے اس لئے صاحب علم لوگ ان سے مدد کی توقع رکھتے تھے۔ ان خطوں میں مسلسل اس انداز کی باتیں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب لوگوں کی مدد کر کے خوشی محسوس کرتے تھے۔ ان اقتباسات کو پیش کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہمارے بڑے ادیب' شاعر اور محقق کیسی زندگی بسر کرتے ہیں۔ بظاہر یہ معمولی باتیں ہیں لیکن ان کیلئے کتنی ضروری ہیں۔

نور احمد فریدی اور عین الحق فرید کوٹی اس کوشش میں ہیں کہ ان کی کتابیں معقول تعداد میں خریدی جائیں۔ نور احمد فریدی کا 7 سو روپے کا وظیفہ بند ہونا' اہل قلم کانفرنس میں انہیں نظر انداز کرنا افسوسناک واقعہ ہے' اس کانفرنس میں نوجوان بہت جوش اور جذبے سے شریک ہوتے ہیں۔ حیرت ہے کہ اکادمی ادبیات نے فریدی صاحب جیسے بزرگ کو نظر انداز کر دیا' اس کانفرنس پر بھی سازشیں ہوا کرتی تھیں۔ غالباً وہ کسی ایسی ہی سازش کا شکار ہوئے۔

اس کے ساتھ ہی ایک اور وضاحت کرنا چاہتا ہوں ملتان میں فریدی صاحب کے ہم عصر دو نہایت اہم محقق تھے۔ ایک ڈاکٹر مہر عبدالحق اور دوسرے عتیق فکری' فریدی صاحب ان سے خوش نہیں تھے۔ اس لئے انہوں نے ڈاکٹر مہر عبدالحق کے ترجمے کے بارے میں مناسب رائے نہیں دی اور سرائیکی ترجمے کو جان بوجھ کر پنجابی ترجمہ لکھا ہے۔ وہ اس لئے ناراض تھے کہ انہیں گرانٹ نہیں ملتی اور ڈاکٹر مہر عبدالحق نے لاکھوں روپے وصول کئے۔ انہوں نے اس ترجمے کے بارے میں ایک اور جگہ بھی لکھا ہے۔

عتیق فکری نہایت دور اندیش انسان تھے۔ ملتان میں تحقیق کے حوالے سے ان کا کام انفرادیت رکھتا ہے' یہاں ان کی شخصیت کو کمتر انداز میں پیش کیا گیا ہے جو کہ مناسب نہیں ہے وہ کئی کتابوں کے مصنف اور مؤلف تھے۔ اب یہ تینوں بزرگ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اس لئے ہم ان کی مغفرت کیلئے دعا کر سکتے ہیں۔ میری ان بزرگوں سے نیاز مندی رہی میرے لئے یہ تمام بزرگ قابل احترام ہیں۔

عین الحق فرید کوٹی اور ڈاکٹر احمد بشیر کے خطوط پڑھ کر میں اداس ہوا اور میں سوچنے لگا کہ جو لوگ کتابوں سے دل لگاتے ہیں وہ آخری دور میں کتنے پریشان ہوتے ہیں اور جو مصنف خود کتابیں چھاپ

لیتے ہیں وہ کس مرحلے سے گزرتے ہیں۔

چند ادیبوں کا میں نے ذکر کر دیا لیکن چند نام اور پیش کرنا چاہتا ہوں کہ جنہوں نے نبی بخش بلوچ کو خط لکھے اور وہ اپنے مقام اور مرتبے کے اعتبار سے بلند مرتبے پر فائز رہے۔ ان میں ڈاکٹر حمید اللہ' ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان' ممتاز حسن' قاضی احمد میاں اختر جونا گڑھی' حکیم محمد سعید' ڈاکٹر مختار الدین احمد' ڈاکٹر وحید قریشی' ڈاکٹر عبداللہ چغتائی' ڈاکٹر رفیع الدین' اشفاق احمد کے علاوہ بہت سے نام شامل ہیں۔ اس کتاب میں 70 لوگوں کے خطوط شامل ہیں۔

ان خطوط کے جو اقتباسات پیش کئے گئے ہیں ان سے ادیبوں کے مسائل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جو تا حال اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ آج بھی موقع پرست فائدے اٹھاتے ہیں اور مستحق ادیب پریشان حال رہتے ہیں۔

محمد راشد شیخ صاحب نے اس کتاب کو بہت محنت اور توجہ کے ساتھ ترتیب دیا ہے اس کے حواشی بھی تحریر کئے ہیں اس سے پہلے بھی وہ کوئی اعلیٰ تحقیقی کام کر چکے ہیں ان کی کتابوں میں ایک خاص سلیقہ اور قرینہ دکھائی دیتا ہے اس کتاب کا انہوں نے معیاری مقدمہ لکھا ہے جس نے اس کتاب کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

''الحمدللہ' ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے حوالے سے یہ راقم کی پانچویں کتاب اب شائع ہونے والی ہے' انشاءاللہ ان کی سندھی اور انگریزی کتب اور مقالات کے اردو تراجم کرنے کا ارادہ ہے۔''

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ راشد صاحب کو اپنے ارادے میں کامیاب و کامران کرے اور ان کی تحقیق معیاری ادب پڑھنے والوں کیلئے تسکین کا باعث ہوگی۔ ان کا خلوص اور محنت ان کیلئے عزت اور توقیر کا باعث بنے (آمین)

۞۞۞

ادب انسانی فطرت کی سفاکی کو قابو میں لاتا ہے۔ بے رحمی کو رحم کی قبا پہناتا ہے۔ نامکمل کو تکمیل کی راہ دکھاتا ہے، تاریخ کے جبر کو اعمال کی آزادی میں تبدیل کرتا ہے۔

(احسن سلیم)

میں آپے رانجھا ہوئی

فہیم شناس کاظمی

بندے دی لاچاری تے مجبوری اُتّے
تڑفن والی،
جس دے سینے دے وچ دھڑکے، اک دل ایسا
جس سے وچ درداں دے انبار
انساناں دے سکھ دی خاطر
دن نوں دن نہ جانیا ایہنے
راتاں نوں وی چین نہ لتّا
ایہد یاں نظماں دے وچ جاگے
ہجر ازل دا، دکھ بندے دا

5 جنوری 2016ء کی صبح آغا خان اسپتال میں ربّ کریم و عظیم نے مجھے اپنی رحمت خاص یعنی بیٹی سے نوازا تھا۔ میں فون پر سب کو اطلاع دے رہا تھا کہ فہمیدہ ریاض نے فیس بک پر خبر دی، نسرین انجم آغا خان میں داخل ہیں۔ میں اپنے سارے کام بھول گیا اور ان کی تلاش میں ایک کاؤنٹر سے دوسرے کاؤنٹر تک بھاگنے لگا۔ بہت تلاش و جستجو کے بعد میں نے ان کا وارڈ تلاش کر لیا مگر ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ دوسرے دن شام 6 بجے ملاقات کا وقت شروع ہوا تو ان کے وارڈ میں داخل ہونے والا پہلا آدمی میں تھا۔ تلاش کرتے کرتے ان کے روم تک پہنچا تو پہلے نسرین کی بہن پروین سے ان کے ساتھ نسرین انجم تک پہنچا' وہ اسپتال کے بستر پر آنکھیں بند کئے دراز تھیں۔ تکلیف کی گھٹتی بڑھتی شدت سے ان کے چہرے کا رنگ بار بار تبدیل ہو رہا تھا، میری آواز سن کر انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ ان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ مجھے کہاں پتا تھا کہ یہ آخری ملاقات بھی ہے۔ انہوں نے میری نثری نظم کے مجموعے پر

بہت محبت اور صداقت سے اپنی رائے دی تھی (جو شاملِ کتاب ہوگی)۔ حالانکہ اس وقت وہ مجھے اور میں ان کے بارے میں (سوائے شاعری) کے کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں نے انہیں پھول پیش کئے، وہ مسکرائیں' میرے سر پر دست شفقت پھیرا اور ان کی آنکھوں میں ستارے جھلملانے لگے۔ ان کے چہرے پر ساری شفقت سمٹ آئی۔ میں نے ان کے پاؤں چھوئے، نرم و نازک پاؤں جن میں گوشت ندارد' صرف ہڈیاں تھیں جن پر انہوں نے کڑی زندگی کا سفر طے کیا تھا......اب تھکن سے نڈھال تھے......سفر نے ان کے پاؤں کھا لئے تھے۔ میرے دل میں وسوسے، واہمے امڈے چلے آ رہے تھے۔ میں اپنے والد کو اس حال میں دیکھ چکا تھا، اپنے پیاروں کو لمحہ لمحہ اذیت و کرب کے ساتھ موت کے منہ میں جاتے دیکھنا بہت اذیت ناک ہوتا ہے، کلیجہ کٹتا ہے، ان لمحوں کے احساسات کو مشاہدے سے نہیں صرف تجربے ہی سے محسوس کیا جا سکتا ہے، بیان نہیں کیا جا سکتا۔ تمام تر ترقی تمام تر کاوشوں کے باوجود...... بے بس، بے کس اور مجبور انسان جو نہ خود کو بچا سکے نہ اپنے پیاروں کو۔ اپنی تمام تر سائنسی و آسائشی قوت و جبروت سے مسلح انسان کی شکست کا اعلامیہ ہے موت...... جو ہر پل ہر طرف سے انسانوں پر جھپٹ رہی ہے۔ شاید اس روز میں زندگی سے اپنی آخری امید آخری جنگ ہار گیا۔ میرے والد مزدور آدمی تھے ان کی مدد تو شاید کوئی نہیں کرتا، مگر نسرین تو پرائیڈ آف پرفارمنس رکھتی تھیں۔ ریڈیو پاکستان لاہور کی ڈپٹی کنٹرولر بھی تھیں، مگر حکومت پنجاب کے خادم اعلیٰ اور وفاق کے ناظم اعلیٰ کیلئے بھی یہ خبر سندھ کی سائیں سرکار کی طرح تھی جنہیں اپنے باس کی خوشنودی اللہ کی رضا سے زیادہ مطلوب ہے۔ جن کی نظریں تھر کے مرتے ہوئے بچوں پر بھی نہیں پڑتیں، وہ نسرین انجم بھٹی ایک شاعرہ یا اپنے ایک حقیر ملازم کی کیا خبر لیتے۔ جن کی مدد کی اپیلیں ان بڑی میزوں تک پتا نہیں پہنچیں بھی یا نہیں' کسی نے ان کی فیملی کی اپیل پر کوئی توجہ نہیں دی اور وہ چلی گئی......اس کا چلے جانا ہی بہتر تھا!

اور جب وہ چلی / لوگ بولے / کہ جھلی، پاگل، مینٹل ہے اور اس نے سنا / تو ہنسی
انگلیوں سے وہ دیوار پر دو لکیریں بناتی چلی گئی
لکیریں جو دیوار پر / چند نقطوں کے موہوم فاصلوں سے
اکھٹی چلی جا رہی تھیں / دمادم رواں / بے رکے
آگے......آگے ہی آگے
نہ ملنے کی خاطر / ملنا ہی تو حرف آخر نہیں......(بالآخر)

نسرین انجم اور امرتا پریتم دونوں نے اپنی شرائط پر زندگی گزاری۔ برصغیر سے ایسی کوئی اور مثال نہیں جن کو زندگی کا کوئی بھی مشکل پل اپنی راہ سے ہٹا سکا ہے۔ زبیر رانا ان کی زندگی کے ساتھی تھے اور بائیں بازو کے مزدور رہنما۔ وہ اپنی زندگی میں مگن اور یہ اپنی زندگی میں مگر نسرین نے ہر لمحہ آخری سانس تک ان کا خیال رکھا اور ان کی زندگی کی تکلیفوں، دشواریوں کو اپنا لیا۔ وہ جیل بھی گئیں مگر ثابت قدم رہیں۔ وہ مزدوروں کی ہم نوا تھیں اور بھٹو کی شہادت پر انہوں نے مرزا صاحباں کی رومانوی داستان کو' وار'

بنا دیا۔ یہ بھٹو کی پھانسی کے خلاف پہلی طاقتور آواز تھی جو سارے پاکستان میں گونج گئی۔ وہ کہتی تھیں:
’’اردو شاعری کا سچ ہی اس کی خوبصورتی ہے۔ جذبے اور احساس کی نرمی اور نزاکت بڑی سے بڑی تلخ حقیقت کو خوبصورت بنا دیتی ہے۔‘‘

سچائی کی ترجمان، بنجر سماعتوں کے شہر میں اذان کی طرح بلند ہونے والی یہ شاعرہ نسرین انجم بھٹی 1943 میں کوئٹہ میں پیدا ہوئیں۔ جیکب آباد، سندھ میں انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ لاہور میں انہوں نے ایم اے پنجابی ادب میں کیا اور 1971 میں پاکستان براڈ کاسٹنگ لاہور سے وابستہ ہوئیں اور 2014 میں وہاں سے بطور ڈپٹی کنٹرولر ریٹائرڈ ہوئیں۔ سرکاری ملازمت کے دوران آپ کی باغیانہ شاعرانہ للکار مدہم نہیں ہوئی جس کی پاداش میں ضیا سامراج نے آپ کو بھٹو کا نوحہ لکھنے کے جرم میں قید و بند کی صعوبتیں دیں۔ جیل سے باہر آتے ہی آپ نے 1979 میں پہلا مجموعہ نیل کرائیاں، نیلکاں شائع کرایا۔ پھر اٹھے پہر تراہ اور بن باس 2009ء میں شائع ہوئے۔

نیل کرائیاں، نیلکاں میں چی گویرا، لیلیٰ خالد اور بھٹو پر لکھی آپ کی شاہکار نظمیں شامل تھیں۔ نسرین انجم بھٹی نے بابا بلھے شاہ، شاہ حسین، شاہ لطیف بھٹائی سے بھرپور استفادہ کیا اور ان کی علامتوں اور استعاروں کو نئی معنویت عطا کی اور ماضی کو انہوں نے عصری صورتحال سے جوڑ دیا۔ بن باس ہو یا ان کے پنجابی مجموعے ان کا مجموعی تاثر جذبہ، سوچ اور احساس کی وحدت ہے جس بنا پر بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے الفاظ محدب عدسے میں تبدیل ہو گئے ہوں، ان کی تمازت اور شدت میں آگ بھر گئی ہو۔

انہوں نے اظہار کیلئے غزل کی بجائے نظم اور نثری نظم کو اپنایا۔ ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا مگر انہوں نے مغربی علامتوں کی بجائے پاکستان کے تین صوبوں بلوچستان، سندھ اور پنجاب کی ثقافتوں اور لوک شاعری سے اپنی شاعرانہ کائنات تخلیق کی اور رمز و ایما کے کنائے سے شعوری اور لاشعوری طور پر ان کی تزئین کی۔ ان کا طرز زندگی بھی سادہ تھا اور شاعرانہ اسکول بھی کیوں کہ وہ اپنے لوگوں میں اپنی دھرتی سے جڑ کر زندگی گزارنا چاہتی تھیں اور انہوں نے ایسا ہی کیا انہوں نے نسائی جذبوں کی ترجمانی کی اور خوب کہا:

’دعائیں‘ گونگی بیٹیاں ہوتی ہیں جن کی زبان صرف مائیں سمجھتی ہیں
میری کوکھ میں ’نہیں‘ کا پہلا لفظ گرا اور دوپہر تک سفید ہوتی چلی گئی
میری ماں مجھے چونٹیوں سے بچانے دوڑی
چونٹیوں کے ساتھ میں بھی ان کے پاؤں تلے آ گئی
وہ کہتی تھیں کہ
’’بابا میں ڈر لگدا اے / میرے اندروں کڈھ لے مینوں
آسوں پاسوں وڈھ دے مینوں / میں بالی نہ مردانی
میں چیلی نہ گرودانی / میں آن ڈھولن دی دل جانی
بابا مینوں نکی کر لے / نکی کر تلی تے دھر لے / آپے آپ ای جر لے

یہ ہماری جی دار بہادر شاعرہ 26 جنوری 2016 کو کراچی کے PNS میں راہیٔ ملک عدم ہوئی۔ سینٹ چرچ محمود آباد کراچی میں تین بجے سہ پہر ان کی نمازِ آخر ہوئی جس میں فیملی کے علاوہ صرف پانچ لوگ شامل تھے، اسے زندگی اور موت کا بھرپور احساس تھا سو وہ اپنے کرب کی سولی چپ چاپ مگر بہادری سے چڑھ گئی کہ
’’ہمارے زندہ رہنے کیلئے محبت کا اظہار اور ان کے زندہ رہنے کیلئے نفرت کا اخراج ضروری ہے۔ ہم کھجور کے درخت اپنی پھانسیوں اور سدابہار کے درخت اپنی سولیوں کے لئے کاشت کرتے ہیں اور وہ ہر زندہ اور حساس ضمیر سے کہتی ہیں کہ ’’مجھے آنسوؤں کے ڈھیر سے اٹھا لو، میں صرف ایک بوند ہوں‘‘۔

❁❁❁

....

اُڑتی ہے مری خاک مری جستجو کے ساتھ
مجھ کو نہ میری جان سر شام دیکھنا
(منجمد پیاس۔ احسن سلیم)

بمل رائے: ہدایت کار یا جادوگر؟

ماہ طلعت زاہدی

یہ جو معاشرے میں رفتہ رفتہ بہتری پیدا ہو رہی ہوتی ہے' ہم اپنی زندگیوں میں انقلاب آفریں فیصلے کر رہے ہوتے ہیں کہ سماج فرسودگی کو اُتار رہا ہوتا ہے۔
یہ جو ہم تازہ ہوا میں سانس لیتے ہیں' آکسیجن کو محسوس کرتے ہیں کُچھ کر گزرنے کا ولولہ اپنے اندر پاتے ہیں' اس سب کے پیچھے بہت سے بڑے بڑے اوتاروں کا ہاتھ ہوتا ہے' شاعر' مصور' گلوکار یا ہدایت کار' اُنہیں کوئی بھی نام دے لیں جن میں سے ایک ہندوستانی فلمی صنعت کا وہ آدرش ہے کہ آج تک کوئی اُس کی خاکِ پا کو چھو نہیں سکا۔
بمل رائے نے چھپن سال کی عمر پائی اور 1966ء میں آنجہانی ہوئے مگر اُنہوں نے اپنے پیچھے فلم انڈسٹری کیلئے اتنا بڑا خزانہ چھوڑا کہ صرف اُنہی کی فلمیں ''فلم انسٹیٹیوٹ'' میں اداکاری' فوٹوگرافی' شاعری موسیقی' مناظر کے انتخاب' کہانیوں کا چناؤ' اداکاروں کی محنت' لگن' مکالمہ نویسوں کی جانفشانی' ایڈیٹنگ کی ضرورت کا مقصد اور ذریعہ تربیت بن سکتی ہیں۔ بمل رائے نے بہترین آرٹ فلمیں بیسویں صدی کے آغاز میں ہمیں دیں' جب ابھی آرٹ مووی کا تصور بھی ذہن میں نہیں تھا۔
بمل رائے نام ہے ذوق کی لطافت' احساس کی نفاست' شوق کی انتہا' سماج کو بدلنے کی دُھن' بدی کی قوت سے بھڑ جانے کی طاقت کا۔ بمل رائے کا کام ہے عورت اور مرد کو ایک جان بنا کر دو قالب میں رکھنا' گھر اور سماج میں ہم آہنگی' توازن اور تناسب پیدا کرنا' بڑوں اور چھوٹوں' امیر غریب' اونچی اور نیچی ذات کا فرق مٹانا' طبقاتی تقسیم کو ختم کرنا' زندگی میں حسن دیکھنا اور دِکھانا' جذبے کی شدت کے ذریعے اچھی اقدار کو جنم دینا' بُری اقدار کو ملیا میٹ کرنا اتنا سب کُچھ کرنا اور بے حد خاموشی سے' یہ تو کسی مہاتما کا چمتکار ہی ہوسکتا ہے اور اسی لئے بمل رائے پر لکھنا میرے لئے از حد مشکل کام ہے۔ کیونکہ وہ قلمکار نہیں' جس کیلئے میں اُس کی تحریر سے مثالیں لاسکوں۔ اگر میں بھی کوئی ہدایت کار ہوتی تو بمل

رائے پر ایک ڈاکومنٹری فلم بناتی' جہاں اس کے وہ مناظر دکھاتی' جو ایک حساس ذہن کو دیوانہ بنا دیتے ہیں اور ایک خلاق ذہن کو تحریک دیتے ہیں' میں قلم کے ذریعے آنکھ میں کُھب جانیوالے مناظر کو کیسے زندہ کروں؟ یہی میرے لئے وہ سنگ سخت ہے جہاں فرہاد تیشہ رکھ کر ہاتھ جوڑ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ''یا اُستاد''! بمل رائے کی بہت سی فلمیں ہیں جس میں بلراج ساہنی کی 'دو بیگھ زمین' بھی ہے مگر میں نے اس تحریر میں صرف پانچ فلموں کو موضوع بنایا ہے' تمام فلموں پر لکھنے کیلئے ایک کتاب بھی شاید کم پڑ جائے۔ بہر حال' میں کوشش کروں گی کہ بتا سکوں' بمل رائے میری تمام زندگی اور احساسات پر کیوں کر چھا گیا ہے اور کیسے......؟
وہ بہت بڑا بت شکن ہے......اُس نے ہندو سماج میں رہتے ہوئے' اچھوت کا مسئلہ اپنی فلم 'سُجاتا' میں اٹھایا جس میں ایک بچی جو لاوارث ہے کس طرح ایک برہمن کے گھر پہنچ جاتی ہے اور اُسی گھر کی دوسری بچی کے ساتھ پلتی بڑھتی ہے۔ جوان ہو کر ایک برہمن ہیرو کی نظر میں سما جاتی ہے جس کیلئے ہیرو سنیل دت مشہور گیت گاتا ہے (جلتے ہیں جس کیلئے تیری آنکھوں کے دیئے' طلعت محمود) اچھوت لڑکی نوتن ہے اور اچھے ماحول میں تربیت پا کر کمیونسٹ فلسفے پر پورا اُترتی ہے' کہ ماحول اصل چیز ہے' بچہ جس ماحول میں پلے گا بڑھے گا ویسا ہی بنے گا۔ پھر ہدایت کار بمل رائے کہانی کو محبت کی قوت سے ایسا گھماتا ہے کہ سماج گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لکھنے میں یہ ایک پیرایہ اور چند لفظوں کا ڈھیر ہے مگر ذرا سوچ کر دیکھئے کہ بمل رائے نے ایک اچھوت لڑکی کو ایسا باعزت مقام دیا کہ برہمن لڑکے سے شادی کروا دی گویا بمل رائے نے سماج کے دھارے کو یکسر موڑ دیا!
بمل رائے کی 'بُت شکن' میں چھوٹی ذات کا برہمن اور بڑی ذات کا برہمن بھی موضوع بنتے ہیں۔
دلیپ کمار اور سُچترا سین بچپن کے ساتھی اور پڑوسی ہیں مگر جب بیاہ کا مسئلہ اُٹھتا ہے تو دیوداس (دلیپ کمار) کا باپ یہ کہہ کر صاف انکار کر دیتا ہے کہ ''ہم اونچی ذات کے برہمن وہ نیچی ذات کے برہمن' یہ رشتہ کیسے ہوسکتا ہے؟''
یہ شادی نہیں ہو پاتی۔ نتیجتاً دیوداس شراب میں ڈوب جاتا ہے اور موت کو اپنا لیتا ہے۔ یہ ایک ضمنی مسئلہ بھی ساتھ ساتھ اُٹھتا ہے کہ کیسی کیسی جوانیاں اُس دور میں بے بسی اور بے کسی کے ہاتھوں شراب کے ذریعے موت کے سپرد ہو گئیں۔
''پرینیتا'' (شادی شدہ عورت) میں بھی بمل رائے ذات پات اور امیر غریب پڑوسیوں کے مسئلے کو موضوع بناتا ہے لیکن ہاں بالآخر جیت محبت' معصومیت کی ہوتی ہے اور ہیرو (اشوک کمار) کا باپ جو ایک بدمعاش مہاجن ہے اور ہیروئن کے چاچا کو جو پڑوسی بھی ہے لُوٹ لُوٹ کر' اُس کی جائیداد کوٹھکانے لگا رہا ہے۔ یہ مہاجن اپنے ہی غصّے کی لپیٹ میں آ کر دل کے دورے کا شکار ہوتا ہے اور معصوم پڑوسن (مینا کماری) جس کے گلے میں کبھی ہنسی ہنسی میں ہیرو نے پھولوں کی مالا ڈال دی تھی اور یوں وہ خود کو شادی شدہ سمجھ کر کہیں شادی نہیں کرتی۔ ہیرو کی ماں شائستہ اور شریف ہے۔ وہ 'ورمالا' کی

اس ریت کو اٹوٹ بندھن میں باندھ دیتی ہے۔ اس فلم میں بمل رائے نے ایک تیر سے دو شکار کئے ہیں ایک معصوم لڑکی کے ذریعے 'ورمالا' کا تقدس بحال کیا اور یوں غربت اور امارت کی دیوار گرائی۔ مقروض اور مہاجن کا فرق مٹایا۔ یہ بھی سمجھایا کہ کچھ ہنسی مذاق' بعض معصوم زندگیاں تباہ بھی کر سکتے ہیں!! بمل رائے اس جہاں سے سرسری گزر ہی نہیں سکتے تھے!!

'بندنی' میں اشوک کمار ایک سیاسی قیدی ہے جو ایک دیہات میں نظر بند کیا گیا ہے۔ مگر اس عزت کے ساتھ کہ وہ دن کے وقت لوگوں سے میل جول رکھ سکتا ہے۔ پوسٹ ماسٹر کی بیٹی نوتن کے ساتھ اُس کا میل جول ہوتا ہے۔ بلکہ پوسٹ ماسٹر جو ایک پڑھا لکھا' روشن خیال باپ ہے خود شام اور رادھا کی کویتائیں دونوں کو پڑھ پڑھ کر سناتا ہے۔ ایک رات موسلا دھار بارش میں جب سیاسی قیدی اپنی بیرک میں واپس نہیں پہنچتا تو انگریز سرکار کے سپاہی اُسے لینے آتے ہیں۔ قیدی پلنگ پر بخار میں لیٹا ہے اور ہیروئن پلنگ کی پٹی سے جڑی بیٹھی ہے۔ دونوں نیند میں ہیں، یہ وہ وقت ہے جب ہیروئن پر تہمت لگتی ہے اور اشوک فوراً کہہ اُٹھتا ہے، "یہ میری پتنی ہے" اب گاؤں میں سوالوں کا طوفان کھڑا ہے کہ شادی کب ہوئی؟ لوگ باپ بیٹی کا حقہ پانی بند کر دیتے ہیں۔

ہیروئن گاؤں چھوڑ کر شہر اپنی سہیلی کے گھر اور پھر وہاں سے ایک اسپتال میں بطور ملازمہ کام کرنے آ جاتی ہے۔ وہاں اُسے باپ کے مرنے کی اطلاع ملتی ہے اور اُسی عالم میں وہ اشوک کو اپنی نیم پاگل جنونی پتنی کے ساتھ دیکھتی ہے جس کی خدمت کے نتیجے میں وہ پاگل عورت کی گالیاں سہتی تھی اور تھپڑ کھاتی تھی اور مار پیٹ کرنے والی ظالم ذہنی مریضہ کی چائے میں زہر ملا دیتی ہے۔ پولیس کے آنے پر نوتن اقرارِ جرم کر رہی ہے اور اشوک اُس پاک صاف' پڑھی لکھی لڑکی کو ایک خادمہ کے روپ میں دیکھ کر دنگ ہے اور کہتا ہے "یہ قتل اس نے نہیں کیا' میری پتنی نے آتما ہتیا کی ہے۔"

ہیروئن جیل میں آٹھ سال شرافت' دیانت' خدمت کے ساتھ گزار کر جب ایک ڈاکٹر کی بیوی بننے جاری ہے تو اُسے اشوک نظر آتا ہے جو اب ٹی بی کا مریض ہے اور اُسکی کہانی یہ ہے کہ اس کی شادی ایک سیاسی شادی تھی دُشمن سرکار کے راز حاصل کرنے کے لئے۔ ہیروئن کے لئے ایک بڑا اچھا موقع ہے کہ اُس ڈاکٹر کو اپنا لے جس نے خود اس کیلئے جیلر کو رشتہ بھیجا ہے۔ مگر یہاں ایک جملے کی حُرمت رکھنا بھی ہیروئن کا فرض ہے۔ جب ہیرو نے ایک بڑی بدنامی سے بچانے کیلئے اُسے اپنی پتنی کہا تھا اور اس کی لاج رکھ لی تھی۔ اس موقع پر ایس ڈی برمن کا یادگار شاہکار گیت ہے:

"او رے مانجھ میرے ساجن میں اس پار" ہیروئن نوتن دوڑا ہے کو پھلانگ کر جوان اور صحت مند ڈاکٹر کو چھوڑ کر ٹی بی کے مریض اشوک کی طرف دوڑتی ہے۔ یہ پاس وفا اور قول کی پاس داری اور لحاظ ہے جو کردار سازی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس جگہ ایک طرف ریل کی سیٹی بج رہی ہے جو نوتن کو واپس بلا رہی ہے تو دوسری طرف اسٹیمر کا بھونپو بج رہا ہے' جہاں بیمار اشوک ہے اور بیچ میں ایس ڈی برمن گا رہے ہیں "مرا کھینچتی ہے آنچل' من بیت تیری ہر پکار' مرے ساجن ہیں اُس پار"

مدھومتی کا قصہ جنموں کی کہانی ہے...... مگر اصل موضوع شہری مرد دلیپ کمار' دیہاتی لڑکی وجنتی مالا

کی محبت ہے۔ ایک طوفانی رات جب دلیپ' وجنتی سے ملنے پہاڑ سے اُتر کر اس کی کٹیا میں جاتا ہے تو ہیروئن کا غیّور طاقت ور باپ کندھے پر من دو من کا گدھا رکھے نمودار ہوتا ہے۔ طاقت کے اس مظہر کے سامنے شہری بابو کی کیا حیثیت؟ چنانچہ وہ واپس لوٹتے ہوئے اس شہری کی طرف اپنا خنجر پھینکتا ہے جو درخت کے تنے میں گڑ جاتا ہے اور دلیپ خود وہ خنجر نکال کر لڑکی کے باپ کو دیتا ہے جس نے کہا کہ "نیچ مری عزت سے کھیل کر کہاں جا رہا ہے" خنجر دیتے ہوئے ہیرو کہتا ہے "میری گردن کاٹ دیجئے مگر مجھ پر جھوٹا الزام مت لگائیے" اب روتی ہوئی وجنتی بیچ میں آ جاتی ہے تو باپ بیٹی سے کہتا ہے 'پوچھ کے دیکھ یہ تجھ سے بیاہ کرے گا' پوچھ کے دیکھ......؟ اور ہیرو بیاہ کا اقرار کرتا ہے۔

یہاں بیاہ کی قدر ایک دائمی قدر کے طور پر اُجاگر ہوتی ہے جو شہری اور دیہاتن کا فرق مٹا دیتی ہے اور یہ قدر محبت سے ایک قدم آگے بڑھ جاتی ہے۔

ان فلموں کی کہانیاں بمل رائے نے نہیں لکھیں' لیکن ان کہانیوں کا انتخاب انہوں نے ہی کیا۔ پھر جب ہدایتکار بمل رائے ہو تو کہانی کا موضوع' مکالمہ اداکاروں کا انتخاب' موسیقار' گلوکار' کیمرہ آرٹسٹ' سبھی کو بمل رائے کی آنکھ سے دیکھنا' قلم سے لکھنا اور اداکاری کرنا پڑتی ہے۔ ورنہ کیوں ہر کہانی کے منظر ذہن میں یوں محفوظ ہو جائیں کہ مٹائیں نہ مٹیں۔ کیوں مکالمے ہی نہیں اُن کو ادا کرنے والا فنکار بھی' چاہے وہ ایک دو ہی مناظر میں اپنا تعارف کرا سکا ہو' کبھی بھلایا نہ جا سکے۔ کیوں وہ گیت' وہ موسیقی تمام جزئیات سمیت یادداشت کا حصہ بن جائے؟

بمل رائے کا ایک اور بڑا کارنامہ عورت کے اندر جرأت اور ہمت کو جگہ دینا ہے۔ مجھے کسی بڑے فلسفی کا ایک قول یاد آ رہا ہے "جہاں عشق ہو' وہاں اندھیرا نہیں ڈراتا۔"

جب دیوداس کی ہیروئن پارو نصف شب کے عمل میں اپنے گھر سے نکل کر دیوداس کی عظیم الشان حویلی میں داخل ہوتی ہے تو وہاں برآمدے میں نوکر چاکر سو رہے ہیں۔ کوئی پوچھتا ہے' کون؟ پارو' آنچل سے منہ ڈھکے ہوئے کہتی ہے "میں" اندر آ کر وہ دلیپ کمار کے کمرے کو بند کر دیتی ہے اور دلیپ کمار جو کوئی کتاب پڑھتے ہوئے صوفے پر ہی سو گیا ہے' سراسیمگی میں دیوار پر گھڑی کی طرف دیکھتا ہے۔ رات کے دو بجے کا عمل ہے وہ پارو سے کہتا ہے کہ "اتنی رات گئے' کیا اکیلی ہی آئی ہو" پارو کہتی ہے "ہاں" ہیرو کہتا ہے "تمہیں ڈر نہیں لگا" پارو کہتی ہے "میں جن بھوت سے نہیں ڈرتی" دیوداس کہتا ہے "مگر باہر سب ملازم لیٹے ہوئے ہیں اگر کسی نے تمہیں دیکھ لیا ہو؟"

پارو کا جواب ہے کہ جب مجھے پتا ہے کہ میری لجا کو تم ڈھک لو گے تو میں کسی سے کیوں ڈروں؟ مجھے اپنے چرنوں میں جگہ دے دو دیوداس۔ اپنا رشتہ پارو خود دیوداس کے پاس لے کر آتی ہے جو 1955ء کے برصغیر میں ایک عورت کی طرف سے سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

بمل رائے کا ایک دوسرا حسن سادگی ہے۔ یہ سادگی صرف لباس میں نہیں' قول وفعل' جذبے' فرض' زندگی کے ہر پہلو میں نظر آتی ہے بلکہ فلم فلم نہیں رہتی خود زندگی بن جاتی ہے' سیدھی اور سچی زندگی!

پھر اسی فلسفی (افلاطون) کا ایک قول یاد کروں گی "علم ان باتوں سے محبت سکھاتا ہے جن سے

محبت ہونی چاہئے یعنی دردمندی‘ سچ‘ محبت‘ انسانیت اور علم کو ان باتوں سے نفرت سکھانی چاہئے جن سے نفرت جائز ہے یعنی جھوٹ‘ کینہ‘ ہوس‘ فریب وغیرہ‘‘۔

بمل رائے کی فلمیں سادگی اور سچ‘ انسان دوستی اور محبت کی انتہا کو پہنچ جاتی ہیں۔ساری فلموں میں ہیروئن دو تین ہی ساڑھیاں بدلتی ہے (علاوہ طوائف کے) بلکہ وہ تو طوائف کو بھی محبت کی مار سے جوگن بنا دیتے ہیں۔ بہادری کے تمام کارنامے عورت کے ذریعے ہوتے ہیں اور ان کارناموں کے پیچھے عشق کا سچ کام کر رہا ہوتا ہے۔’’بندنی‘‘ کی ہیروئن نوتن جسے اشوک نے ایک بڑے الزام سے بچانے کیلئے اپنی پتنی کہہ دیا ہے اور نوتن اور اس کے باپ نے اسے سچ مان لیا ہے‘ مگر اس عرصے میں ہیرو کو انگریز سرکار جیل بھیج دیتی ہے اور اب جب نوتن باپ کا گاؤں چھوڑ کر شہر جا رہی ہے تو یہ ایک بڑا فیصلہ ہے جو باپ کو بدنامی سے بچانے کیلئے کیا گیا ہے پھر جب وہ اشوک کو ایک بیوی کے ساتھ دیکھتی ہے‘ وہ بیوی جو ہسٹیرک جنونی گلیاری ہے اور اپنی خادمہ نوتن کو مارتی ہے تو نوتن کا دماغ کام نہیں کرتا وہ اس کی چائے میں زہر ملا دیتی ہے۔ظاہر ہے یہ جرم ہے جس کی سزا بھی نوتن کو آٹھ سال قید بامشقت کے طور پر بھگتنا پڑتی ہے۔مگر ہدایت کار بمل رائے کا کمال یہ ہے کہ ہم مقتول کے بجائے قاتل سے پیار کر رہے ہوتے ہیں۔ ہم ہی نہیں جیلر‘ قیدی مریضائیں سبھی اور ڈکٹر (دھرمیندر) تو اس کا رشتہ بھی جیلر کے پاس بھیج دیتا ہے۔یعنی ایک بدمزاج‘ گالیاں بکنے والی مارپیٹ کرنے والی مقتولہ کی نسبت‘ ایک پڑھی لکھی‘ پاک طینت‘ خوش تربیت‘ نیک‘ سچ بولنے میں اتنی بے باک ہے کہ اقرارِ قتل تک کر لیتی ہے سبھی اُس عورت کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔

پھر بندنی کی یہی ہیروئن اپنی سزا مکمل کر کے جب ڈاکٹر کی بیوی بننے جا رہی ہے تو سامنے سمندر کے اسٹیمر پر اشوک کو سوار ہونا ہے دوسری طرف ریل تیار ہے دونوں کی ملاقات بیچ کے انتظار گاہ میں ہوتی ہے جہاں اشوک اُس سے اپنے ناکردہ گناہوں کی معافی مانگتا ہے اور وطن کی خاطر‘ سیاسی شادی‘ لمبی جیل پھر ٹی بی کے مرض کا بتاتا ہے۔ وہ ہرگز یہ نہیں کہتا کہ ’’تم میرے ساتھ چلو‘‘ اُس زمانے میں ٹی بی کا مرض ایسا ہی تھا جیسا آج کل ایڈز کا مرض ہے۔ یہ چھوت کا مرض تھا اور مریض ہی نہیں تیماردار کیلئے موت کا پیغام......مگر یہاں بھی بندنی کی ہیروئن (ایک ناتواں مگر مضبوط کردار عورت) ہی فیصلہ کرتی ہے اور تمام پچھلی بدنامیوں‘ اگلے اندیشوں کو بھول کر محبت اور اس ایک لمحے کو گلے لگا لیتی ہے‘ جب ہیرو نے اس کی عزت بچانے کیلئے اسے اپنی بیوی کہہ دیا تھا۔

بمل رائے ایک انتہائی شائستہ سماج سدھار کارکن تھے۔ وہ ایک ایسے باغی بھی تھے جنہوں نے فلم کے ذریعے زمانے کو بڑی خاموشی کے ساتھ کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔

اس کے باوجود بمل رائے نے کچھ پرانی رسموں کو بچایا بھی ہے۔مثلاً مجھے یاد ہے‘ میرے بچپن تک‘ بچیاں گڑیاں گڈے کی شادی کیا کرتی تھیں اور باقاعدہ شادی کی رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ گھر کے بڑے بھی ان شادیوں میں ہنسی خوشی شریک ہوا کرتے تھے۔ یوں ایک طرح سے بچیوں کو آئندہ زندگی کی تربیت دی جاتی تھی۔

’’پرینیتا‘‘ میں ایک مشہور گیت آشا نے گایا جو اشکوک کمار کی غریب پڑوسن مینا کماری کی چچازاد بہنوں نے گڑیا کی شادی میں دہرایا ہے۔اس فلمی منظر میں کلکتے کا انتہائی سادہ اور غربت کا مارا گھرانا ہے چھوٹی چھوٹی دس بارہ بچیاں جن کی عمریں دس سال سے بھی کم ہیں اور دو جوان لڑکیاں مینا کماری اور اُس کی بہن (جو گا رہی ہے) یہ گیت سنئے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے بمل رائے نے شاعر کا ہاتھ پکڑ کر لکھوایا ہے۔ اگر آج کے زمانے کا کوئی ناپختہ ہدایت کار ہوتا تو چکا چوند اور دھما چوکڑی سے اس گیت کا سبق ہی محو کرا دیتا جو ایک گڑیا کو ہاتھ میں لے کر دیا جا رہا ہے یہ گانا بھارت دیو اس نے تحریر کیا تھا۔

پیا کے سنگ کسھی میٹھی میٹھی بولنا‘ ان کے نینن میں سکھی دھیرے دھیرے ڈولنا غصہ کریں وہ زبان نہیں کھولنا

ساجن کو من کے مندر میں رکھنا
نینوں کا دیپک اُجال کے چلو
دلہنیا پیا سے ملنے‘ چھوٹا سا گھونگٹ نکال کے

بمل رائے اپنی اس فلم میں 1950ء میں جس سماج کو دکھا رہے ہیں وہ عورت اور مرد کیلئے مساوی نہیں تھا۔ دونوں فریقوں میں بعدالقطبین پایا جاتا تھا۔عورت کیلئے تعلیم کا نہ ہونا ذہنی بلوغت کی پسماندگی اور عورت کا خود کفیل نہ ہونا‘ اس حساب سے یہ گیت گو آج کے سماج کے مطابق نہیں لگتا مگر اس وقت گھر کی زندگی کو پُرامن رکھنے کا یہی ایک نسخہ تھا‘ سوچا جائے تو ’’پیا‘‘ کیلئے بھی ایک اشارہ ہے کہ ’انہیں‘‘ من مندر کے سنگھاسن پر براجنے کے لائق ہونا چاہئے! ویسے یہ نسخہ ہر عہد میں کارگر رہے گا یا ہو سکتا ہے بمل رائے شاید ایسا ہی دیکھتے ہیں۔

وہ اپنی ہر فلم میں بڑوں کے ساتھ چھوٹوں کو ضرور رکھتے ہیں‘ یہ بھی ان کا ایک نسخہ خاص ہے‘ مثلاً ’’مدھومتی‘‘ میں گاؤں کی لڑکیاں میلے میں وجنتی مالا کے ساتھ رقص میں ہیں‘ لتا کے بول ہیں:

جلمی سنگ آنکھ لڑی اے‘ جانے کیسی یہ گانٹھ پڑی

یہ رقص فلمی رقص نہیں لگتا‘ کیونکہ رقص کے دائرے میں اچانک کہیں سے آ کر چھوٹی چھوٹی دو تین بچیاں بھی شامل رقص ہو جاتی ہیں۔ یہ بمل رائے کی ایک خاص بصیرت ہے جو فلم کو زندگی سے قریب کر دیتی ہے اور وہ اصلاح جو مغرب سے ہمارے ہاں در آئی Generation Gap اس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

دیوداس میں بھی‘ جب دیوداس اور اس کی بچپن کی ساتھی جدا ہوتے ہیں تو وہ بچی جو بڑی ہو کر سچترا سین کے روپ میں پارو بنے گی‘ جنگل میں بیٹھی رو رہی ہے۔ایک بھکشو جوڑا اپتی پتنی ہاتھ میں اک تارہ لئے کہیں سے آتے ہیں اور بچی کو بہلانے کیلئے ساحر لدھیانوی کا لکھا یہ بھجن گاتے ہیں۔

آن ملو آن ملو‘ شام سانورے
برج میں اکیلی رادھے کھوئی پھرے

اساطیر‘ دیومالا‘ شعر اور فنون لطیفہ کو اگلی نسلوں تک پہچانا‘ بمل رائے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہیں یہ

بڑوں کے ذریعے چھوٹوں سے کلام کرنا' بمل رائے کی وہ ذہنی تربیت ہے' جو آج معاشرے میں ہم گنوا بیٹھے۔

بمل رائے ایک سماج سدھارک ہی نہیں' جادوگر بھی ہیں۔ وہ اپنا جادو کیمرے کے ذریعے عجیب وغریب طریقوں سے منواتے ہیں مثلاً مدھومتی کے میلے میں دلیپ کمار دور سے وجنتی مالا کو دیکھ رہا ہے سامنے سے بیل گاڑی گزرتی ہے جس پر چٹائیاں گولائی میں لپٹی رکھی ہیں' بیل گاڑی کے گزرتے ہی ہیرو کو وہاں ہیروئن نظر نہیں آتی۔ وہ گاڑی کے پیچھے چھپ کر نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے' مدھومتی میں جگہ جگہ یہی کام بادلوں کے چھاجانے سے لیا گیا ہے' آبشار اور جھرنوں کے زور میں جب مکیش کا گیت دلیپ گارہا ہے

سہانا سفر ہے اور یہ موسم حسین' ہمیں ڈر ہے ہم کھو نہ جائیں کہیں

تو پہاڑوں سے آواز کی بازگشت ہوتی ہے' جس پر ہیرو کے ساتھ ہم بھی سہانے سفر میں کھوجاتے ہیں' سلیل چوہدری اس سفر کو حسین دُھن دیتے ہیں۔

بمل کمار رائے کا جادو بعض اوقات احساس تک کو چھولیتا ہے' یہ ایک کرشمہ ہی کہا جاسکتا ہے' بچپن کی جدائی کے بعد جب دیوداس جوان ہوکر کلکتے سے لوٹتا ہے تو شیام سو رہی ہے تو پارو اپنے کمرے میں اپنی شرم چھپانے کیلئے بظاہر بھگوان کی مورتی کے آگے دیا جلانے میں مصروف ہوجاتی ہے......دونوں کی آنکھیں چار ہوتی ہیں' جلتی ہوئی دیا سلائی پارو کی انگلی کی پور تک پہنچ چکی ہے اور پھر وہ جلن سے ہلکا سا سانس لیتی ہے......لگتا ہے کہ ہماری ہی انگلی جل گئی۔

دیوداس' جسے میں بمل رائے کا شاہکار مانتی ہوں' وہاں ایسے لاتعداد مناظر' جو روح میں اُتر جاتے ہیں' چندرمکھی (وجنتی مالا) ایک طوائف جو دیوداس کی نگاہ پڑتے ہی' جوگن بن جاتی ہے' دیوداس کی کھوج میں اسی گاؤں کی طرف پیدل آرہی ہے۔ کچی پگڈنڈی پر دوسری طرف چار کہار پارو کی پالکی لئے چلے آرہے ہیں۔ کہاروں کے بدن پر صرف تہمد ہے پسینہ بہہ رہا ہے۔ چندرمکھی پیدل دھوپ میں پسینہ پونچھتی جارہی ہے۔ کہار ایک گیت گارہے ہیں۔ عجب گیت اور ایس ڈی برمن کی عجب سحر انگیز موسیقی ہے......ایسا لگتا ہے کہ کھیتوں سے اٹھتے ہوئے حبس نے ہمیں گھیر لیا ہے' دم گھٹنے لگتا ہے کیونکہ اب دیوداس سے ان دونوں' محبت کی ماری' عورتوں کی کبھی ملاقات نہیں ہوگی' ساحر کا گیت جو کہار گارہے ہیں' کچھ یوں ہے۔

جیون کی چاہ میں ...... راہی کے واسطے
سکھ کے بھی راستے...... دکھ کے بھی راستے
کہیں گھنی چھاؤں ہے...... کہیں کڑی دھوپ ہے
وہ بھی ایک روپ ہے...... یہ بھی ایک روپ ہے
کئی یہاں کھوئیں گے......کئی یہاں پائیں گے
کئی ابھی آئیں گے...... کئی ابھی جائیں گے

گیت کی بحر چھوٹی' بول سادہ ہیں جو کہار ہی گاسکتے ہیں' مگر دھن ایسی دکھ بھری ہے جیسے کوئی گلا گھونٹ رہا ہے۔

بمل رائے کی جادوگری میں صوتیات بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ رات کے 2 بجے جب' پارو دیوداس کی حویلی کی طرف چلتی ہے تو کتے بھونک بھونک کر اندھیرے اور پارو کے اکیلے پن کو ہولناک بناتے ہیں۔ مدھومتی جب مرچکی ہے اور دیوانگی میں دلیپ پاگلوں کی طرح اسے جنگلوں' پہاڑوں میں کھوج رہا ہے تو مسلسل فاختہ کی آواز سنائی دیتی ہے۔ میرے لئے فاختہ آج جہاں کہیں بھی بولتی ہے فقط ایک ہی نام لیتی ہے......بمل رائے......بمل رائے۔

'بندنی' میں جب نوتن' اسٹیمر اور ریل کے امتحان کے بیچ انتخاب کے دوراہے پر تذبذب میں ہے تو ریل کی سیٹی اور اسٹیمر کا بھونپو ایک خاص کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ ایک ہیجانی کیفیت جو تناؤ میں لے آتی ہے' جیسے فیصلے کی گھڑی آن پہنچی ہو! دیوداس جب پارو کے گھر کے باہر پیپل کے پیڑ کے نیچے آخری سانس لے رہا ہے تو پارو کے دل کی دھڑکن کو اتنا بڑھا دیا جاتا ہے کہ سننے والے کی اپنی دھڑکن بڑھ جاتی ہے بلکہ دل اچھل کر حلق میں آجاتا ہے۔

دیوداس جب کلکتے سے پارو کو خط لکھتا ہے کہ ''میرے ماتا پتا اس رشتے کو قبول نہیں کرینگے'' اور یہ بھی کہ ''میں نے تمہیں کبھی من سے نہیں چاہا'' عین اُسی پل میز پر رکھی گھڑی کا الارم زور سے بجنے لگتا ہے۔

خط ملازم کو دیتے ہی دیوداس کو پارو کا جملہ یاد آتا ہے:

کیا ندی میں اتنا بھی جل نہیں جو میرا کلن ڈھانپ لے' تو دیوداس اڑی رنگت کے ساتھ جس طرح بے تابانہ ملازم کو پکارتا ہے' اس پکار میں درد بھرا ایسا پچھتاوا ہوتا ہے کہ جی چاہتا ہے کہ کاش ملازم نے ابھی خط سپرد ڈاک نہ کیا ہو' جسے بدمعاش زمیندار نے اغوا کر کے بے حرمت کرنا چاہا اور اس نے محل کی دیوار سے کود کر جان دے دی۔ مدھومتی میں مدھو اس کی روح حویلی میں' پہاڑوں اور جنگلوں میں سامنے آکر چھپ کر ایک سرگوشی میں ہیرو کو پکارتی ہے ''بابو جی'' یہ سرگوشی مرنے والی کی آہ ہوتی ہے جو کانوں سے جگر کے پار اتر جاتی ہے اور کلیجہ چیر کر رکھ دیتی ہے۔

دیوداس جب شراب میں بے حال ہوکر ایک لاحاصل سفر پر نکلتا ہے تو ریل کے پہیوں کی آواز کھٹا کھٹ' ٹھکا ٹھک ٹھکا ٹھک' ہمارے اپنے سانسوں میں گھل مل جاتی ہے' بلکہ سانس اکھڑنے لگتا ہے!!

دیوداس اپنے بچپن میں پارو کی کھڑکی کے ٹین کے چھجے پر' سامنے کے درخت سے آم توڑ کر پھینکا کرتا تھا' یہی عمل وہ اپنی جوانی میں بھی دہراتا ہے۔ آم کا ٹین کے چھجے پر گرنا ٹنٹناٹن کی آواز کے ساتھ ہی پس منظر میں ستار کی دھن پر پارو کا دوڑتے ہوئے آنا کوئی بھول نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ دیوداس میں ریل کے سفر کے خاتمے پر ایک قلی لالٹین ہاتھ میں لئے آواز لگارہا ہے کہ پانڈوا اسٹیشن مانک پور (پارو کی سسرال) کی سواریاں اتر جائیں۔ یہ آواز بھی رہ رہ کر کانوں میں گونجا ہی کرتی ہے۔ پھر جب دیو داس چندرمکھی سے جدا ہورہا ہے تو پس منظر میں ایک روتی ہوئی آواز گونجتی ہے۔ مبارک بیگم کی اس درد

بھری، الوداعی پکار اور بے بس صدا کو کون سا دل ہوگا جو سہ سکے؟

وہ نہ آئیں گے پلٹ کر انہیں لاکھ ہم بلائیں

میں بِمل رائے کا حق ادا نہیں کر سکتی، اس تحریر کے ذریعے میں نے محض ایک قرض چکانے کی کوشش کی ہے جو میرے قلم کی تخلیقی زندگی پر واجب تھا۔ بِمل رائے کو میں دکھا ہی نہیں سکتی کیونکہ میں ہدایت کار نہیں مگر جیسے فراق نے میر کیلئے کہا تھا "میر نہیں ہماری تہذیب بول رہی ہے" کچھ ایسا ہی بِمل رائے کے لیے کہنا چاہوں گی۔

❁ ❁ ❁

آج پاکستان سمیت دنیا بھر میں دہشت گردی کی لامتناہی لہر غیر محفوظ دنوں کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس لہر کو ختم کرنے کے لیے حکومتوں کے اقدامات سے زیادہ ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں کی ضرورت ہے۔ دنیا کے اُن تمام ملکوں میں جہاں دہشت گردی کا کانٹوں بھرا ببول اپنی جڑیں گہری کر کے ایک مہیب درخت بن گیا ہے، اسے محض کاٹنے سے دہشت گردی ختم نہیں ہوگی، بلکہ اس کی جڑوں کو جلانے کے لیے محبت، امن، دوستی، بھائی چارہ، تعاون اور یگانگت کے موضوعات سے لبریز تحریروں کو جراثیم کش دوا کے طور پر جڑوں میں ڈالنا ہوگا، تاکہ حکومتوں کے سطحی اقدامات کے ساتھ ساتھ اہلِ قلم، تخلیق کاروں، فن کاروں اور صحافت سے جڑے دانش وروں کی پائیدار کوششیں بار آور ہوں۔ اس کے لیے ہمیں اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنا ہوگا۔

(احسن سلیم)

محمد کاظم، علم کی بات، کل کی بات ہوئی

محمود الحسن

میں نے کاظم صاحب جیسے عالم آدمی سے تعلق کو ہمیشہ اپنی کسی نیکی کا انعام جانا۔ میرا ان سے ملنا اس زمانے میں رہا جب ان کی زندگی کا سورج اتار کی جانب گامزن تھا۔ ساڑھے چار برس میں ان سے ملاقات زیادہ تر ان کے گھر میں رہی لیکن کبھی کبھار وہ لاہور میں کتابوں کی مشہور دکان "ریڈنگز" پر آتے تو بھی ان سے ملنا ہو جاتا۔ ان سے تعارف اس انٹرویو کے ذریعے سے ہوا جو میں نے ایکسپریس سنڈے میگزین کے لیے کیا۔ اس دور کے ہمارے میگزین انچارج عامر ہاشم خاکوانی اور میرا، دونوں ہی کا خیال تھا کہ ایک تو صاحبان علم کو انٹرویو کیا جائے اور ان میں سے بھی ترجیحاً وہ حضرات ہمارا ہدف ہونا چاہییں جو گوشہ نشین ہیں۔ ایک بار ایسے افراد کی فہرست بنائی تو اس میں کاظم صاحب کا نام سرفہرست رہا، جن کے بارے میں سنا تھا کہ کم آمیز ہیں، اور انٹرویو نہیں دیتے۔ خیر! جی کڑا کر کے ایک دن کاظم صاحب کو فون ملایا اور مدعا بیان کیا۔ ایسا کورا جواب دیا کہ دوبارہ انٹرویو کی بات کرنے کی کوئی جرات نہ کرے۔ تھوڑے دن بعد ہم نے مسعود اشعر صاحب کا انٹرویو کیا جو انھیں اتفاق سے پسند آ گیا۔ ہم نے ان کے خود پر قائم اعتماد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، عرض کی کہ کاظم صاحب کا انٹرویو کرنے کی بڑی خواہش ہے، پر وہ مانتے نہیں۔ مسعود اشعر صاحب نے بڑے یقین سے کہا کہ بھئی! وہ مانتے کیوں نہیں، ہم ان سے بات کریں گے، ضرور دیں گے وہ انٹرویو۔ اس وقت تو ہم نے سمجھا کہ شاید مسعود اشعر صاحب اپنی دوستی پر کچھ زیادہ ہی بھروسہ کر کے یہ بات کر رہے ہیں مگر انھوں نے کاظم صاحب سے بات کی اور نہ جانے ان سے کیا کہا کہ وہ انٹرویو پر آمادہ ہو گئے۔ انٹرویو شائع ہوا تو کاظم صاحب کے خیالات لوگوں کو بہت پسند آئے، اور سچی بات ہے مجھے پھر کبھی کاظم صاحب کے انٹرویو جتنا فیڈ بیک نہ ملا۔ کاظم صاحب بھی اس کاوش سے خوش ہوئے۔ ایک دن از راہ تفنن کہنے لگے کہ آپ نے مجھے مشہور کر دیا اور میری سوسائٹی کے لوگوں کو اب معلوم ہوا ہے کہ میں کوئی پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ چوکھٹوں

کی صورت میں اپنے خیالات کی پیشکش انھیں بے حد پسند آئی۔

میرے ساتھ بات چیت میں کاظم صاحب نے جماعت اسلامی چھوڑنے کی وجوہات پر جس دن روشنی ڈالی، اس سے اگلے روز فون پر مجھ سے کہنے لگے کہ جماعت سے متعلق ان کی باتیں شائع نہ کی جائیں تو بہتر ہے، کہیں جماعت والے برا نہ مان جائیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے مسئلہ پیدا ہو اور اب تو جماعت اسلامی کے کردار پر اس سے کہیں زیادہ تند لہجے میں لکھا اور بولا جاتا ہے اور یوں بھی آپ نے ذاتی حوالے سے بات کی ہے۔ انھوں نے میری بات مان لی۔ کاظم صاحب نے ایک بار بتایا کہ ابوالخیر مودودی کے بارے میں ان کی یادداشتوں کو ممتاز ادیب شمس الرحمٰن فاروقی نے جماعت اسلامی (انڈیا) کی ناراضی کے ڈر سے اپنے رسالے ''شب خون'' میں چھاپنے سے معذرت کر لی تھی۔ یہ تحریر بعد میں ''سمبل'' میں علی محمد فرشی نے جوں کی توں چھاپ دی۔

(اس بارے میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا موقف ہے ''صرف جماعت اسلامی نہیں، مولانا مودودی مرحوم کے مداح اور بھی بہت سے اس ملک میں ہیں۔ لیکن میرا اصول رہا ہے کہ ''شب خون'' میں کوئی ایسی بات نہ چھپے جس پر ذاتیات کا شبہ ہو۔ کاظم صاحب مرحوم کی سب باتیں ان کی اپنی معلومات اور تجربے پر مبنی تھیں، ان میں جھوٹ کا شائبہ مجھے کہیں نہ ملا تھا۔ لیکن آبگینوں کو ٹھیس نہ لگے اور خاطر احباب کا خیال رہے، یہ ہمیشہ میرا دستور رہا)

کاظم صاحب کے فکری سفر کا آغاز مولانا مودودی کی تعلیمات کے زیر اثر ہوا۔ ''پردہ'' سمیت مولانا مودودی کی چھ کتابوں کو انھوں نے اردو سے عربی میں ترجمہ کیا۔ بعد ازاں جماعت اسلامی اور اس کے بانی سے جن دو وجوہات کی بنیاد پر وہ دور ہو گئے، ان کے بارے میں انھوں نے انٹرویو میں بتایا تھا:

''مولانا امین احسن اصلاحی کے جماعت سے الگ ہونے پر جماعت کی علمی فضا متاثر ہوئی۔ جماعت میں وہ لوگ زیادہ نمایاں ہو گئے جن کا ذہن علمی سرگرمیوں کے بجائے سیاست میں زیادہ چلتا تھا جس سے جماعت کا مزاج اسلامی اور اصلاحی کی بجائے سیاسی ہوتا گیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ 1964 میں میرے آٹھ سالہ بیٹے کا انتقال ہوا جس کی موت نے مجھے توڑ کر رکھ دیا۔ اس صدمے پر ان لوگوں نے میری دلجوئی کی جن سے نظریاتی اعتبار سے میرا اختلاف تھا لیکن اگر کسی نے میرے ساتھ تعزیت نہ کی اور مشکل کی اس گھڑی میں میری خبر نہ لی تو وہ جماعت اسلامی تھی۔ مولانا مودودی نے اظہار افسوس کے لیے نہ مجھے خط لکھا نہ ہی کسی ذریعے سے پیغام دیا، اور نہ مجھ سے مل کر افسوس کیا حالانکہ میں مولانا مودودی کی بیشتر تحریروں کا اردو سے عربی زبان میں ترجمہ کر چکا تھا اور ان سے خاصے عرصہ سے میرا تعلق تھا۔ اس زمانے میں مغربی فلسفہ کا بھی خوب مطالعہ کیا تو کچھ اس کا بھی اثر تھا کہ میں جماعت اسلامی کے اثر سے نکل گیا۔

مولانا مودودی کو جب میری ناراضی کی اطلاع ملی تو انھوں نے مجھے کھانے پر بلایا اور کہا کہ 'میں اس لیے آپ سے تعزیت کے لیے نہ آسکا کہ آپ سرکاری ملازم ہیں، میرے ملنے سے کہیں آپ حکومت کی

لسٹ میں نہ آجائیں، کراچی میں میرا برادر نسبتی بھی سرکاری ملازم ہے، میں اس سے ملنے سے بھی مجتنب رہتا ہوں۔' اس بات نے مجھے مطمئن نہ کیا اور مجھے یہ عذر لنگ ہی لگا۔ اس کے بعد وہ آمدم برسر مطلب پر آگئے اور کہا کہ میری خواہش ہے کہ آپ تفہیم القران کا عربی میں ترجمہ کریں۔ وہ مجھ سے ترجمہ اس لیے کروانا چاہتے تھے کہ عربوں نے ترجمے کے لیے میرا نام تجویز کیا لیکن اب میں یہ کام کرنا نہ چاہتا تھا۔ مولانا مودودی مصر رہے اور میں ٹالتا رہا۔ میں نے ان کو بتایا کہ جدید عربی ادب پڑھنے سے میرا اسلوب اب پہلے والا نہیں رہا۔ اس پر مولانا مودودی کہنے لگے، آپ یہ بات مجھ سے نہ کہیں، میں جانتا ہوں آپ کسی بھی زمانے کی عربی لکھ سکتے ہیں۔ میں نے سرکاری مصروفیات کا بھی عذر کیا لیکن وہ مانے نہیں، اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ قاہرہ سے کاظم کو اہم تفاسیر منگوا کر دیں لیکن وہ تفاسیر مجھ تک نہ پہنچیں اور نہ ہی اس کے بعد انھوں نے مجھ سے ترجمے کے بارے میں کہا۔ وہ بڑے ذہین آدمی تھے، انھوں نے اندازہ کر لیا تھا کہ میں اب یہ کام نہیں کروں گا کیونکہ جب پہلے مجھے مودودی صاحب کے کام کا ترجمہ کرنے کو کہا جاتا تو میرے چہرے پر چمک آجاتی۔ اب وہ کہہ رہے تھے تو میں انکار کر رہا تھا۔''

عجب بات ہے، کاظم صاحب اگر فکری سفر کے ابتدائی زمانے میں مولانا مودودی کی کتابوں کا ترجمہ کرتے رہے تو زندگی کے آخری برسوں میں ان کے فکری مخالف ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی تین کتابوں کو مسعود اشعر صاحب کی تحریک پر انھوں نے انگریزی سے اردو میں منتقل کیا۔ یہ کتابیں ''مشعل'' نے ''اسلام اور جدیدیت''، ''قران کے بنیادی موضوعات'' اور ''اسلام'' کے نام سے شائع کیں۔ کاظم صاحب کا عربی زبان سے ناتا دو اتفاقات کا مرہون منت رہا۔ ان میں سے ایک انھیں وقتی طور پر عربی سے دور لے گیا تو دوسرے اتفاق نے اس زبان سے اٹوٹ تعلق کی بنیاد رکھ دی۔ ان دو واقعات کے بارے میں انٹرویو میں تو مختصراً بتایا لیکن ''ایکسپریس'' نے جب معروف شخصیات کی زندگی کے دو تین یادگار واقعات پر مشتمل سلسلہ ''بھلا نہ سکے'' شروع کیا تو اس کے لیے میں نے کاظم صاحب کو زحمت دی تو انھوں نے عربی سے اپنے شغف کی بنیاد سے متعلق دو واقعات کو قدرے تفصیل سے بیان کیا۔

محمد کاظم کے بقول: ''انسان کی زندگی میں کوئی ایک ایسا واقعہ پیش آتا ہے جو اس کی زندگی کا دھارا ہی بدل کے رکھ دیتا ہے۔ ایسا واقعہ مجھے اس وقت پیش آیا جب میں آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کر کے نویں جماعت میں داخل ہوا۔ ہمارا اسکول واقع احمد پور شرقیہ میں آٹھویں جماعت کا امتحان ریاست بہاولپور کا ایک بورڈ لیتا تھا۔ میں اس امتحان میں اونچے نمبر لے کر کامیاب ہوا تھا اور اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن حاصل کی تھی۔ نویں جماعت میں اختیاری مضمون کے طور پر میں نے عربی کا انتخاب کیا۔ انھی دنوں میرے گھر والوں کو کسی وجہ سے بہاولپور جانا پڑا۔ آٹھویں جماعت میں میری اعلیٰ کارکردگی کی اطلاع وہاں میرے بزرگوں کو پہلے ہی مل چکی تھی۔ میرے اہل خانہ مجھے ایک ماموں سے ملانے کے لیے لے گئے جو بہاولپور کی عدالت میں جج کے عہدے پر فائز تھے۔ ماموں نے میری پیٹھ تھپکی اور مجھے شاباش دی۔ ساتھ ہی انھوں نے مجھ سے پوچھا، اچھا تو اب نویں جماعت میں کون سا مضمون لینے کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا عربی کا مضمون میں نے لے بھی لیا ہے۔ اس پر وہ جلال میں آ

گئے اور سرائیکی میں اپنی گونج دار آواز میں پکارے،'' کیناں کیناں (بالکل نہیں، بالکل نہیں) تمھیں سائنس کا مضمون لینا ہوگا۔ اب براہ مہربانی واپس جا کر عربی کے بجائے سائنس کا مضمون لو۔ تمھیں آگے بھی سائنس ہی پڑھنی ہے۔'' میرے یہ ماموں بڑے دبدبے والے تھے۔ انھوں نے جس طرح مجھے عربی کا مضمون لینے سے روکا مجھے یوں لگا جیسے میرے متعلق یہ حکم ان کی عدالت سے صادر ہوا ہے، جس سے سرتابی کا سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ میں نے احمد پور شرقیہ واپس آ کر میٹرک میں سائنس کا مضمون لے لیا۔ میٹرک کرنے کے بعد ایف ایس سی کے امتحان میں میری فرسٹ ڈویژن نہ آسکی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انجینئرنگ میں داخلے کے لیے بہاولپور میں جو مقابلہ ہوا میں اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ میرے بزرگ مجھے انجینئرنگ میں بھیجنے پر بضد تھے۔ انھوں نے مجھے علی گڑھ یونیورسٹی بھیج دیا تا کہ وہاں انجینئرنگ میں داخلے کے لیے امتحان میں شامل ہو کر قسمت آزمائی کروں۔ اس امتحان میں خوش قسمتی سے میری کارکردگی اچھی رہی اور اس پر میں انجینئرنگ کی کلاس میں داخلہ لینے میں کامیاب ہوگیا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ اگر ہم لوگ ان دنوں ماموں سے ملنے نہ جاتے اور میٹرک میں اختیاری مضمون کے بارے میں ان کا حکم نہ سنتے تو یہی ہونا تھا کہ میں میٹرک اور ایف اے اور اس کے بعد بی اے میں عربی پڑھتا چلا جاتا اور شاید بی اے یا ایم اے کے بعد کسی سکول کا ہیڈ ماسٹر یا کسی کالج میں لیکچرار کے عہدے پر تعینات ہو جاتا۔ اس ایک واقعہ نے میری زندگی کا دھارا ہی بدل دیا اور مجھے ایک ٹیچر کی بجائے انجینئر بنا دیا۔

ایک عجیب اتفاق ہے اور اتفاق سب عجیب ہی ہوتے ہیں۔ میرے عربی زبان سیکھنے کی ابتدا علی گڑھ سے ہوئی۔ یہ اتفاق یوں ہوا کہ ہمارے انجینئرنگ کورس کے دوسرے سیشن میں ہمیں موسم گرما کی صرف دس چھٹیاں دی گئیں۔ میں نے سوچا کہ اتنی محدود تعطیلات میں دور دراز کا سفر کر کے بہاولپور جانا اور واپس آنا، اس میں زحمت زیادہ ہوگی اور گھر والوں کے ساتھ چند ہی روز گزارنے میں کوئی زیادہ طمانیت حاصل نہیں ہوگی۔ چناں چہ میں نے ان چھٹیوں میں ہوسٹل ہی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ انھی دنوں میں نے کسی اخبار میں ندوۃ العلما لکھنو کے کسی ادارے کی طرف سے عربی سکھانے کے لیے ایک کتابچے کا اشتہار دیکھا۔ کتابچے کا نام تھا'' عربی زبان کے دس سبق'' میں فارغ تو تھا ہی، سوچا کہ لاؤ ان دنوں میں عربی کے یہ دس سبق ہی پڑھ لیتے ہیں۔ کتابچہ میں نے منگوا لیا، اور اس کے ہاتھ میں آتے ہی اسے تن دہی سے پڑھنا شروع کر دیا۔ میں نے دو دو سبق روزانہ پڑھ کے اور ان کی مشقیں حل کر کے اسے پانچ ہی روز میں ختم کر دیا۔ یہ رسالہ ختم کر کے میں نے اپنے اندر ایک عجیب چیز محسوس کی۔ میں نے محسوس کیا کہ عربی زبان میرے لیے کسی طرح بھی اجنبی نہیں ہے۔ اس کے جراثیم میرے اندر کہیں موجود ہیں۔ چناں چہ اسے پڑھتے ہوئے مجھے لگتا ہے جیسے میں اپنی مقامی زبان میں سے کوئی زبان پڑھ رہا ہوں۔ اس رسالہ کی پشت پر چند دوسری کتابوں کا اشتہار تھا۔ قرآن مجید کی پہلی کتاب، قرآن مجید کی دوسری کتاب اور تسہیل العربیہ وغیرہ۔ میں نے یہ کتابیں بھی منگوا لیں اور انہیں پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ تین چار کتابیں پڑھنے کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں میرے اندر اتنی استعداد پیدا ہو

گئی کہ میں یونیورسٹی لائبریری میں جا کر خلیجی ریاستوں کا ایک رسالہ'' العرب'' پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں اسے پوری طرح سمجھ تو نہیں پاتا تھا، لیکن اس میں سے بعض خبریں اور فیچر میں عربی اردو لغت کی مدد سے پڑھ کر سمجھ لیتا تھا، اور خوش ہوتا تھا کہ میں ایک عربی رسالہ پڑھنے کے قابل ہو گیا ہوں۔ انھی دنوں مولانا ابوالحسن علی ندوی کا ایک سلسلہ کتب'' قصص النبین الاطفال'' (بچوں کے لیے انبیاء کے قصے) بہت ہی آسان زبان میں لکھا ہوا میرے ہاتھ لگا۔ میں نے یہ سلسلہ بھی بڑے شوق اور انہماک سے پڑھ ڈالا۔ اب عربی زبان میرے دل میں گھر کر گئی تھی اور میں اسے کسی حال میں نہ چھوڑ سکا۔ انجینئرنگ کے آخری امتحان کے دنوں میں بھی میرا دستور العمل یہ رہا کہ جب میں ایک پرچہ دے کر ہوسٹل آتا، تو سب سے پہلے ایک دو گھنٹے عربی پڑھتا اور اس کے بعد اگلے دن کے پرچے کی تیاری شروع کرتا۔ ایک دن میرے روم میٹ نے حیران ہو کر پوچھا کہ اس امتحان میں کامیاب ہونے کے بارے میں آپ کا کیا ارادہ ہے؟ میں نے کہا جب تک واپس آ کر میں کچھ دیر کے لیے عربی نہ پڑھوں اگلے مطالعے کے لیے میرا ذہن ہی نہیں کھلتا۔ وہ میری عجیب سی منطق سن کر حیران ہوا اور خاموش ہو گیا۔ میں اگر چھٹیوں میں علی گڑھ یونیورسٹی سے گھر چلا جاتا تو نہ تو عربی سیکھنے سے متعلق اشتہار میری نظر سے گزرتا اور نہ ہی شاید عربی زبان میں میری دلچسپی قائم ہوتی۔''

کاظم صاحب کے تبصروں پر مشتمل کتاب'' کل کی بات'' کی اشاعت میں میرا بھی کردار رہا۔ ان سے ایک دن پوچھا:'' آپ کو فنون میں چھپے تبصروں کو کتابی صورت میں چھپوانے کا خیال نہیں آیا؟'' کہنے لگے'' پبلشر سے ایک بار کہا تو اس نے جواب دیا، کاظم صاحب! تبصرے کون پڑھتا ہے۔'' تقاضے پر اپنے تبصرے پڑھنے کے واسطے دیے جو میری وساطت سے محمد سلیم الرحمٰن صاحب کی نظر سے گزرے تو انھیں پسند آئے اور انھوں نے القا پبلیکیشنز سے انھیں کتابی صورت میں شائع کرنے کی سفارش کر دی اور'' کل کی بات'' سامنے آ گئی۔ احمد ندیم قاسمی سے ان کو گہرا تعلق خاطر تھا۔ وہ اگر اردو کے صاحب طرز ادیب بنے تو اس میں احمد ندیم قاسمی اور'' فنون'' کا بنیادی کردار تھا۔ اردو میں ان کا جو کام کتابی صورت میں سامنے آیا ہے، اس میں سے بیش تر'' فنون'' میں چھپا۔ احمد ندیم قاسمی کے بارے میں وہ خاصے حساس تھے، فتح محمد ملک نے جب ان کے، اپنے نام وہ خطوط شائع کر دیے جن میں نجی معاملات کا ذکر تھا اور کچھ ناگفتنی باتیں بھی تو کاظم صاحب بڑے مضطرب اور خفا نظر آئے۔

محمد خالد اختر کے ساتھ ان کا گہرا یارانہ رہا، انھیں کے زیر اثر انگریزی ادب کی طرف راغب ہوئے۔ محمد خالد اختر میرے بھی پسندیدہ ادیب ہیں، اس لیے اکثر گفتگو میں ان کا ذکر آتا۔ کاظم صاحب کی لاہور میں کار چوری ہوئی اور اس کی تلاش کے لیے پشاور کے کئی چکر انھوں نے لگائے جو بے سود رہے۔ اس کار میں محمد خالد اختر کی ایک کتاب کا مسودہ بھی تھا جس کی نقل بھی نہیں تھی۔ کاظم صاحب بتایا کرتے کہ آفرین ہے ان کے دوست پر جس نے کبھی اشارتاً بھی مسودے کی گمشدگی پر تاسف ظاہر نہیں کیا اور ہمیشہ گاڑی کے بارے میں پوچھا۔ ایک بار بتایا کہ خالد اختر نے یادداشتیں لکھنا شروع کیں اور ابھی اپنے والد صاحب کے بارے میں ہی اپنے خاص اسلوب میں لکھا تھا کہ وہ تحریر

ان کی بہنوں کے ہاتھ لگ گئی تو انھوں نے خفا ہو کر ان سے کہا کہ تم کو پڑھا لکھا کر اس دن کے لیے بڑا کیا تھا کہ باپ کی بے عزتی کرتے پھرو؟ یہ بات بتاتے ہوئے کاظم صاحب نے تبصرہ کیا کہ ہمارے ہاں سچی آپ بیتی لکھنے کے ضمن میں معاشرتی دباؤ لکھنے والے پر اس طریقے سے بھی رہتا ہے۔ایک بار بڑے مزے سے سنایا کہ ایک بار محمد خالد اختر نے جب انھیں بتایا کہ وہ نماز پڑھ کر آ رہے ہیں تو کاظم صاحب نے ہنستے ہوئے ان سے کہا کہ تم کو آج نماز کا خیال کیسے آ گیا،تو معلوم ہوا بیمار بیٹے کی صحت یابی کی دعا کے لیے نماز پڑھی ہے۔محمد خالد اختر کے نماز پڑھنے نے جس طرح کاظم صاحب کو حیران کیا، اس طرح ’اجمل کمال، مولانا روم کے مزار پر ان کو روتا دیکھ کر حیران ہوئے اور پوچھا کہ یہ ایک دم سے آپ کو کیا ہو گیا؟ تو اس کا جواب جن کو ایک دم سے کچھ ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ ان کے پاس نہیں ہوتا اور جن کو زندگی بھر ایک دم کچھ نہیں ہوتا، ان کے لیے اس کیفیت کو سمجھنا ممکن نہیں ہوتا۔ایک بار محمد خالد اختر کا بیٹا گاڑی کے ٹائی راڈ کھل جانے کے باعث حادثے سے بال بال بچا تو اس واقعہ کے بارے میں کاظم صاحب کو بتاتے ہوئے، انھوں نے لکھا ’’منصور اب میرے کہنے پر شکرانے کے نفل پڑھ رہا ہے (اور اپنے Paganism کے باوجود میں بھی پڑھوں گا) زندگی جس پر ہم اتنا بھرم رکھتے ہیں، بالکل غیر یقینی (Uncertain) ہے۔‘‘

2011ء میں میرا ارادہ بنا کہ اردو میں تبصروں پر مشتمل رسالہ جاری کیا جائے۔اس ضمن میں جن احباب سے تبصرے کے لیے درخواست کی ان میں سے اکثر نے لیت ولعل سے کام لیا۔صرف چند ایک ہی ایسے نکلے جنھوں نے تبصرے کی ہامی بھری اور پھر وعدہ نبھایا بھی۔ کاظم صاحب اس معاملے میں سب سے کھرے ثابت ہوئے۔ انھوں نے میری تجویز کردہ کتاب پر بہت جلد تبصرہ کر کے میرے حوالے کر دیا۔کمپوزنگ کے بعد پروف بھی خود دیکھے۔ رسالہ بوجوہ نکل نہیں سکا، اس لیے ان کا نیر مسعود کے مضامین پر تبصرہ ایک امانت کی صورت میرے پاس محفوظ ہے۔ نیر مسعود نے کتاب میں شامل ایک مضمون میں اپنے عزیز دوست اور ممتاز محقق رشید حسن خان کی تدوین کردہ مثنویات شوق پر ’خواہش زدہ تحقیق‘ کے عنوان سے مضمون میں کڑی تنقید کی ہے۔ نیر مسعود نے رشید حسن خان کی تحقیق میں جن کمزوریوں کی طرف توجہ دلائی ان کی کاظم صاحب کو، ان جیسے پائے کے محقق سے توقع نہیں تھی، اس لیے وہ انھیں شک کا فائدہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔’’جہاں تک میں نے اس معاملے پر غور کیا ہے مجھے لگتا ہے کہ یہ مضمون رشید حسن خان نے اپنی بڑھتی ہوئی عمر کے اس زمانے میں لکھا ہے جب ان میں زیادہ تحقیق وتدقیق کی مشقت جھیلنے کی طاقت نہیں رہی ہوگی۔ بڑھاپے کی کمزوری کیا ہوتی ہے، یہ کوئی مجھ سے پوچھے کہ آج کل میں خود اس منزل سے گزر رہا ہوں، اور حالت یہ ہے کہ ایک دن جو پڑھتا ہوں دوسرے دن وہ لوح ذہن سے مٹ جاتا ہے اور لوگوں اور کتابوں کے نام تک یاد نہیں رہتے۔‘‘ بڑھتی عمر، بیماری اور قریبی دوستوں کے رفتہ رفتہ گزر جانے سے کاظم صاحب کبھی کبھی کچھ ایسی باتیں بھی کرتے، جن سے مایوسی جھلکتی اور لگتا کہ ان کے اندر یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ اب ان کی عمر کا سفینہ کنارے پر آ لگا ہے۔ زندگی کے آخری برسوں میں قرآن مجید کے ترجمے میں منہمک رہے، جس کی

اشاعت میں تاخیر نے انھیں خاصا بے چین کئے رکھا۔صد شکر کہ قرآن پاک کا ان کے قلم سے ہونے والا سلیس اور رواں ترجمہ ان کی زندگی میں ہی چھپ کر سامنے آ گیا۔

ایک بار ان کے ہاں جانا ہوا تو بتایا کہ کچھ ہی دیر قبل وہ کسی طالب علم کے، جو ان پر مقالہ لکھ رہا ہے، بیس سوالوں کا جواب لکھ کر فارغ ہوئے ہیں۔ یہ جوابات دکھائے اور ان کی نقل مجھے بھی دی۔ان میں سے دو جوابات کے ذریعے سے ان کا ادبی نقطہ نظر واضح ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں:’’میں کسی خاص نظریاتی تحریک سے متفق اور متاثر نہیں ہوں۔ ہر نظریاتی تحریک میں مجھے جو باتیں اچھی لگتی ہیں انھیں قبول کر لیتا ہوں اور ان کے مطابق اپنے آپ کو ڈھال لیتا ہوں ☆ میرا نظریہ فن کچھ نہیں ہے، فن تو فن ہوتا ہے جس کی بنیاد ذوق جمال (senseaesthetic) ہے۔ وہ کسی نظریے کے تحت تخلیق نہیں کیا جاتا۔فن کا مقصد پڑھنے والوں کو مسرت پہنچانا ہوتا ہے۔‘‘

ہمارے ہاں کے کئی صاحبان علم کے صاحب تصنیف ہونے میں ان کی تکمیلیت پسندی حائل رہی ہے۔ بہت سوں نے اگر رسالوں میں کچھ چھپوا لیا تو کتابی صورت میں لانے سے پہلے ان میں اضافے ہی کرتے چلے گئے اور تسلی پھر بھی نہ ہوئی۔اس قبیل کے لوگوں میں ہری پور ہزارہ میں مقیم محمد ارشاد بھی شامل ہیں، جن کی علمیت کا اندازہ ’’فنون‘‘ میں ان کے مضامین سے اہل علم کو بخوبی ہو گیا تھا۔وہ اگر کتاب کے مصنف بنے ہیں تو اس کا سارے کا سارا کریڈٹ محمد کاظم کے سر ہے، جنھوں نے محمد ارشاد کو رباعی سے متعلق کتاب چھپوانے کی تحریک دی، مسودہ پڑھا، اسے پسند کیا، اور پھر چھاپنے کے لیے پبلشر پر زور دیا۔محمد ارشاد نے پیش لفظ کے آخری پیراگراف میں اپنی کتاب کی اشاعت میں کاظم صاحب کے کردار کا فراخدلانہ اعتراف کیا ہے۔

کاظم صاحب نے زندگی بھر جو بھی کام کیا وہ قدر اول کے زمرے میں آتا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی چھ کتابوں کو انھوں نے اردو سے عربی میں ترجمہ کیا، جن کو عرب دنیا میں بھی پذیرائی ملی۔سید سلیمان ندوی، مسعود عالم ندوی، مولانا مودودی، ابوالخیر مودودی اور خورشید رضوی جیسے عالموں نے عربی میں ان کی دستگاہ کو مانا۔ان کے اردو مضامین کی داد اس زبان کے جید ادیبوں نے دی۔’’مغربی جرمنی میں ایک برس‘‘ کو اردو کے بہترین سفرناموں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔تبصرے لکھے تو انگریزی کے دو ممتاز تبصرہ نگاروں محمد سلیم الرحمٰن اور خالد احمد نے تحسین کی۔ ترجمے کا کام انھوں نے تین زبانوں میں انجام دیا۔عربی سے اردو، اردو سے عربی اور انگریزی سے اردو، ان تینوں طرح کے ترجموں میں اس فن کے ماہرین سے داد وصول کی۔ اردو مضامین کا باقاعدہ آغاز ’’فنون‘‘ میں الف لیلہ پر مضمون سے کیا۔ ابوالخیر مودودی نے اس مضمون کو پڑھ کر کاظم صاحب سے کہا:’’آپ نے یہ مضمون بڑی محنت سے لکھا ہے۔‘‘ کاظم صاحب کے بقول ’’بعد میں ہم نے جانا کہ ان کا اتنا کہہ دینا ہی ان کی بھرپور تحسین کا انداز تھا۔‘‘ اس مضمون کی اشاعت سے قبل قاسمی صاحب سے پوچھا کہ کیا یہ ’’فنون‘‘ کے معیار پر پورا اترتا ہے تو جواب ملا کہ یہ ’’فنون‘‘ کے معیار سے کچھ اونچا ہی ہے۔عربی کے عالم خورشید رضوی کے لیے یہ طے کرنا مشکل ہو گیا کہ مضمون میں ادیب محقق پر غالب ہے یا محقق ادیب پر۔’’مضامین۔عربی ادب میں

مطالعے'' کا انتساب ابوالخیر مودودی کے نام ہے۔ کاظم صاحب کتاب پیش کرنے گئے تو وہ صاحب فراش تھے۔ پہلے صفحے پر اپنا نام دیکھ کر کاظم صاحب سے کہنے لگے'' آپ نے مجھے بھی مولانا بنا دیا۔ اس پر کاظم صاحب نے جواب دیا: ''میں نے کئی بار سوچا کہ آپ کے نام کے ساتھ مولانا لکھوں یا نہ لکھوں پھر مجھے خیال آیا کہ یہ لقب کہیں تو صحیح استعمال ہونا چاہیے۔'' کاظم صاحب کی مولانا مودودی سے قربت رہی لیکن بعد میں دوری ہوگئی مگر ان کے بڑے بھائی ابوالخیر مودودی سے ان کی وفات تک مراسم رہے۔ کاظم صاحب کو اپنی کتابوں میں ''عربی ادب میں مطالعے'' سب سے بڑھ کر پسند تھی۔ کچھ باتیں اب اس کتاب کے بارے میں بحوالہ ڈاکٹر خورشید رضوی، جنھوں نے ''فنون'' میں اس کتاب پر نہایت عمدہ مضمون لکھا تھا جس سے ایک اقتباس نقل کرتا ہوں تاکہ کتاب کی اہمیت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو سکے۔

''عربی ادب کے منتشر موضوعات پر اس نوعیت کی کتاب اردو تو خیر عربی میں بھی کم کم ملے گی۔ ایسا آدمی ان کے ہاں بھی عام نہیں جو امراؤالقیس اور محمود درویش دونوں پر یکساں اعتماد، سہولت اور بصیرت کے ساتھ لکھے۔ جدید سے رغبت رکھنے والوں کو عموماً قدیم سے کچھ سروکار نہیں اور قدیم کے چاہنے والے جدید کو مہمل جانتے ہیں۔ ہاں طہ حسین کی بعض کتابوں خصوصاً فصول فی الادب والنقد اور حدیث الاربعا سے مجھے اس کتاب کی گہری مماثلت کا احساس ہوا۔ کیونکہ یہاں بھی نقطہ نظر کا وہی اچھوتا پن، اسلوب کی وہی سلاست، استدلال کی وہی براقی و دل نشینی، نظر کی وہی وسعت اور موضوعات کا وہی تنوع دکھائی دیا جو طہ حسین کا خاصہ ہے۔''

اس تبصرے سے کاظم صاحب بہت خوش ہوئے، جس کا اندازہ ان کے اس خط سے ہوتا ہے، جو تبصرے کی اشاعت کے بعد خورشید رضوی کو انھوں نے لکھا'' فنون کے تازہ شمارے میں اپنی کتاب ''مضامین'' پر آپ کا مقالہ پڑھا اور بے حد شرمندہ اور embarrassed ہوا۔ آپ نے اس کتاب کے مندرجات کو جس توجہ اور عنایت سے پڑھا ہے، اور پھر ان میں سے جو لطیف اور باریک نکتے برآمد کیے ہیں، وہ دلیل ہے، اس محبت کی جو آپ کو نہ صرف عربی زبان و ادب سے ہے، بلکہ اس ناچیز سے بھی ہے۔ آپ کا یہ مضمون پڑھ کر مجھے یوں لگا جیسے مجھے اس سے زیادہ داد ملی ہے جس کا میں مستحق تھا۔'' دلچسپ بات یہ ہے کہ خلیل جبران کو بطور ادیب خورشید رضوی زیادہ گردانتے ہیں اور نہ ہی کاظم صاحب ان کو اہمیت دیتے۔ خورشید رضوی کا کہنا ہے کہ خلیل جبران کوشش کے باوجود ان سے تو پڑھا نہیں گیا۔ جبران کے تخلیق کردہ ادب کے بارے میں اس کے ایک دوست نے ایک بار رائے دی تھی کہ اس میں ایک بدمزہ اور رقت آمیز جذباتیت کے اور کچھ نہیں۔ یہ حوالہ کاظم صاحب نے اپنے مضمون میں نقل کیا اور اس کے بعد ان الفاظ پر صاد کر کے بات ختم کر دی۔

کاظم صاحب کو مطالعے اور پھر اس میں اوروں کو شریک کرنے کا بہت خیال رہتا جس کی ایک صورت تبصرے بھی ہیں مگر وہ ذاتی طور پر بھی دوست احباب کو اپنی پسند کی تخلیقات کے بارے میں بتاتے اور ان سے کسی کتاب کی تعریف سن کر اسے پڑھنے کا اشتیاق ان کے ہاں پیدا ہو جاتا۔ معروف افسانہ نگار ہاجرہ مسرور کے ایک خط سے پتا چلتا ہے کہ کاظم صاحب ہی نے سولزے نتسن کی کتاب

''کینسر وارڈ'' پڑھنے کے لیے انھیں تجویز کی تھی۔ ایک بار مجھے بتایا کہ وہ اپنے ایک دیرینہ دوست سے جب بھی ملنے جائیں، ان کے لیے کتاب لے کر جاتے ہیں۔ کسی اخبار رسالے یا دوست کے ذریعے نئی کتاب کا پتا چلتا تو مجھے اسے لانے کے لیے کہہ دیتے اور میں انھیں مطلوبہ کتاب فراہم کر دیا کرتا۔ وفات سے چند دن قبل بھی ان کا فون آیا اور مجھ سے خوشونت سنگھ کے ناول ''ٹرین ٹو پاکستان'' اور محمود ہاشمی کا سفرنامہ ''کشمیر اداس ہے'' کی فرمائش کی، کتابوں کو ان تک پہنچانے کی سوچ میں تھا کہ اطلاع ملی کہ وہ بیمار ہو کر ہسپتال پہنچ گئے ہیں۔ مسعود اشعر صاحب نے کاظم صاحب تک باریابی کو ممکن بنایا اور پھر ان سے آخری ملاقات ڈاکٹرز ہسپتال میں ان ہی کے ہم راہ ہوئی، جس کے چند روز بعد وہ انتقال کر گئے۔ ہسپتال داخل ہونے سے قبل ان سے آخری ملاقات ریڈنگز پر ہوئی۔ ریڈنگز پر ایک دن کسی صاحب کو کاظم صاحب کی علمی کام کی بے حد تعریف اور یہ کہتے سنا کہ کاش! کاظم صاحب سے ملاقات ہو جائے۔ اس روز جب کاظم صاحب گھر کے لیے رخصت ہو رہے تھے، وہ صاحب اتفاق سے ادھر موجود تھے، میں نے سوچا کہ چلو موصوف ان سے مل لیں، تھوڑی دیر میں احساس ہوا کہ ہماری نیکی بیچارے کاظم صاحب کے گلے پڑ گئی ہے۔ ان صاحب کو بولنے کا ہیضہ تھا، بس بولتے چلے گئے، کاظم صاحب بیزاری ظاہر کر رہے ہیں، اور وہ چپ ہونے میں نہیں آ رہے، میں الگ شرمندہ، ایسے میں مجھے ایک ترکیب سوجھی، میں چپکے سے کاظم صاحب کے عزیز ہارون کے پاس گیا، جو ان کی گاڑی ڈرائیو کر کے لائے تھے، ان کو صورتحال سے آگاہ کیا، اور کہا کہ وہ جا کر کاظم صاحب سے کہیں کہ دیر ہو رہی ہے اب چلیں۔ یہ تدبیر کارگر رہی، اور مذکورہ باتونی سے ان کی جان چھوٹی۔ یہ تو ایک صاحب سے کاظم صاحب کو ملوانے کے تلخ تجربے سے متعلق ایک بات ہے لیکن اب خوش گوار یاد کا بھی ذکر کر دوں۔ کراچی سے معروف شاعر اور مترجم سید کاشف رضا آئے تو کاظم صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، میں انھیں موٹر سائیکل پر ان کے ہاں ملوانے لے گیا تو وہ ان سے مل کر بے حد خوش ہوئے اور مہمان کو اپنی دستخط شدہ تازہ کتاب ''یادیں اور باتیں'' بڑی محبت سے پیش کی۔

8 اپریل 2014ء کو کاظم صاحب کے دنیا سے گزر جانے کے بعد امجد اسلام امجد نے اپنے کالم میں لکھا کہ 'کتنی بدنصیبی کی بات ہے کہ پڑھے لکھے لوگوں میں سے بھی دس میں سے نو کو یہ بتانا پڑتا ہے کہ سید محمد کاظم کون تھے اور ان کا کام اور علمی درجہ کیا ہے؟' محمد کاظم کو علی عباس جلال پوری کی وفات کا تین ہفتے بعد پتا چلا تو انھوں نے دکھ سے لکھا: ''سنا ہے کسی اردو اخبار میں ان کے انتقال کی مختصر سی خبر چھپی تھی لیکن جو انگریزی اخبار میرے ہاں آتا ہے، اس کے لائق مدیروں کے نزدیک یہ کوئی قابل ذکر خبر نہیں تھی کہ فلسفہ و فکر کے اتنے بڑے استاد اور مصنف اس جہان سے گزر گئے۔'' افسوس کی بات یہ ہے کہ کاظم صاحب کے ساتھ بھی ہمارے اخبارات نے علی عباس جلالپوری جیسا سلوک روا رکھا۔

۞۞۞

کائنات کے آخری پانچ سیکنڈ کا قضیہ

سید کاشف رضا

سائنس دانوں کا اندازہ ہے کہ یہ کائنات تیرہ ارب اسی کروڑ سال پہلے ایک بگ بینگ یا بڑے دھماکے کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ تیرہ ارب اسی کروڑ سال۔ کہنا آسان ہے، مگر اس پورے عرصے کو اپنے ذہن میں لانا مشکل۔ اس کا حل مشہور امریکی مفکر کارل سیگن نے یہ نکالا کہ ایک کائناتی کیلنڈر ترتیب دیا اور بگ بینگ سے اپنے زمانے تک کے واقعات کو ایک سال کے کیلنڈر کے اندر بیان کر دیا۔ اس کیلنڈر کا ایک سیکنڈ اس زمین پر گزرے ہوئے چار سو سینتیس برسوں کا احاطہ کرتا ہے۔ اندازہ ہے کہ اس کائنات میں پانچ سو کہکشائیں ہیں۔ ان میں سے ہمارا نظام شمسی جس کہکشاں میں واقع ہے اسے 'ملکی وے' کہا جاتا ہے۔ بگ بینگ ایک سالہ کائناتی کیلنڈر کی پہلی تاریخ یعنی یکم جنوری کو رات بارہ بجے ہوا۔ ہماری کہکشاں سولہ مارچ کو بنی اور پھر ہمارا نظامِ شمسی دو ستمبر کو وجود میں آیا جس کا ایک سیارہ ہماری زمین بھی ہے۔

زمین پر حیات کو وجود میں آنے میں مزید کروڑوں سال لگ گئے۔ حیات سے پہلے ایسے عوامل پیدا ہوئے جنھیں آگے چل کر حیات کی تشکیل میں معاون ثابت ہونا تھا۔ ایسا پہلا عامل جو اب تک دریافت ہوا ہے وہ گریفائٹ ہے جس کے ساڑھے تین ارب سال پرانے نشانات گرین لینڈ سے ملے ہیں۔ کائناتی کیلنڈر میں گریفائٹ کی تشکیل کی تاریخ چودہ ستمبر درج ہے۔ اکیس ستمبر کو پہلا خلیہ تیار ہوسکا جو ایک زندہ نامیہ تھا۔ لیکن کئی خلیوں پر مشتمل حیات کی ابتدا کائناتی کیلنڈر کے آخری مہینے دسمبر میں ہی کہیں جا کر ہوسکی۔ سات دسمبر کو سادہ جانور، چودہ دسمبر کو حشرات، سترہ دسمبر کو مچھلیاں اور بیس دسمبر کو ارضیاتی پودے پیدا ہوئے۔ وہ ڈائنوسار جن کے بارے میں فلمیں اپنے بچوں کو دکھا کر ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے انھیں کسی بہت قدیم راز سے آگاہ کر دیا، وہ پچیس دسمبر کو پیدا ہوئے اور اسی روز نابود ہو گئے۔ بچوں کو دودھ پلانے والے جانور، یعنی ممالیا، چھبیس دسمبر کو پیدا ہوئے۔ کائناتی کیلنڈر کے مطابق

بوزنوں کا دور اکتیس دسمبر کو صبح چھ بج کر پانچ منٹ پر شروع ہوتا ہے۔ ہماری باقی تاریخ اگلے اٹھارہ گھنٹوں کی تاریخ ہے۔

سائنس کے مطابق ان اٹھارہ گھنٹوں میں ہم نے بوزنوں سے جدید انسان تک کا سفر کیا ہے۔ مجید امجد جب ایک 'بس اسٹینڈ پر' کھڑے انسانوں کے بارے میں یہ کہہ رہے تھے کہ:

ابھی کل تک جب اس کے ابروؤں تک موئے پیچاں تھے
ابھی کل تک جب اس کے ہونٹ محرومِ زنخ داں تھے

تو وہ کوئی بہت پرانے زمانے کی بات نہیں کر رہے تھے۔ آگ کی دریافت کے بعد انسانوں نے اس کے ارد گرد رات کو بیٹھ کر ایک دوسرے کو کہانیاں سنانا شروع کیں، یہ دریافت صرف سولہ منٹ پہلے کی بات ہے۔ انسان نے تخلیقی اظہار کے لیے سب سے پہلے مصوری کو منتخب کیا۔ مصوری اور مجسمہ سازی دو منٹ پہلے کا قصہ ہے اور انسان کی ابتدائی قسم کی تحریریں صرف تیرہ سیکنڈ پہلے کا۔ افضال احمد سید کی مشہور نظم 'شاعری میں نے ایجاد کی' اس کے بعد کا قصہ سناتی ہے۔ یہ وہ دور تھا جس کا تذکرہ سر جیمز فریزر نے اپنی مشہور کتاب 'شاخِ زرّیں' میں کیا ہے اور جس سے ٹی ایس ایلیٹ نے اپنی مشہور نظم 'دی ویسٹ لینڈ' میں استفادہ کیا۔ انسان ٹوٹم اور ٹیبو، جادو اور توہمات سے گزرتا ہوا آج سے پانچ چھ سیکنڈ پہلے باقاعدہ مذاہب تک پہنچا۔ میلادِ مسیح کا زمانہ سیگن کے کائناتی کیلنڈر پر پانچ سیکنڈ پہلے گزرا ہے اور اسلام کی ترویج کا زمانہ صرف چار سیکنڈ پہلے۔ مغرب کی نشاۃ الثانیہ اور سائنس کا عروج کائناتی تاریخ کے آخری ایک سیکنڈ کی داستان ہے۔

مذاہب کے بعد ان کی معتدل اور متشدد ہر طرح کی صورتیں سامنے آئیں اور پھر ایک ایک مذہب کئی کئی فرقوں میں منقسم ہو گیا۔ مسلمان آبادی کی اکثریت والے ملکوں کی فکری تاریخ کا غالب ترین حصہ ان مذاہب اور فرقوں کی تشریح، تعبیر اور تفسیر میں صرف ہو گیا جن کی عمر کائناتی کیلنڈر میں صرف چار یا پانچ سیکنڈ کی ہے۔ ہمارا سارا علم صرف پچھلے پانچ سیکنڈوں کا احاطہ کرتا ہے جب کہ امریکا اور یورپ میں کارل سیگن جیسے درجنوں مصنفین کی کتابیں لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوتی ہیں۔ ہمارے بچے مذہبی اور فرقہ وارانہ بحث مباحثے کی فضا میں پروان چڑھتے ہیں اور مغرب کے بچے زمین سے کائنات تک کے رازوں کی کہانیاں پڑھتے جوان ہوتے ہیں۔ اپنے اپنے ذہنی تناظر کے ساتھ دونوں جب عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں تو ان کی اپروچ میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ ہم سائنس، سائنسی اندازِ فکر اور اس اندازِ فکر سے وابستہ ترقی کو اس طرح کھلے بازوؤں کے ساتھ خوش آمدید نہیں کہہ سکے جیسے مثلاً جاپان اور بعض دیگر غیر یورپی اقوام نے کیا، جن کے لیے یہ سائنس اس سے کم غیر تھی جتنی ہمارے لیے، کیونکہ ہم نے تو یہ دعویٰ کر رکھا ہے کہ یورپی اقوام نے سائنس کی مشعل مسلمانوں کی مشعلِ علم سے ہی جلائی ہے۔

تعداد کے لحاظ سے انسانوں کا سب سے زیادہ قتل مذہب کے نام پر ہوا۔ یہ قتال اس تیقن کا لازمی نتیجہ تھا کہ صرف ہمارا مذہب، صرف ہمارا فرقہ اور صرف ہماری تشریح و تعبیر درست ہے۔ ذرا سوچیے

کہ یہ کائنات ابھی پانچ سیکنڈ پہلے جن مذاہب کے بغیر گزارا کررہی تھی، ان کے بارے میں یہ قاتل انسان کس قدر سنجیدہ تھے۔ مذہبی جنگیں یورپ نے بھی لڑیں، اس کے بعد قوم پرستی کے بخار میں یورپ بھی مبتلا ہوا۔لیکن تجربے نے اسے سکھایا کہ سچائی پر کسی ایک مذہب کے ماننے والوں کا اجارہ نہیں اور کوئی ایک قوم آسمانوں کی منتخب اور پسندیدہ نہیں۔انھوں نے جانا کہ اب تک کی معلوم پانچ سو ارب کہکشاؤں میں حیات صرف اسی چھوٹے سے سیارے پر موجود ہے جسے زمین کہتے ہیں۔اس حیات کی قدر کی جائے جو ہم میں سے ہر ایک کو ملی ہے اور جو دوسروں کے لیے بھی اتنی ہی قابلِ قدر ہے جتنی خود ہمارے لیے۔

آج یورپی اقوام ایسے تعصّبات سے جان چھڑا کر اپنے عوام کو زندگی کی بہترین سہولتیں دے رہی ہیں اور وہاں کے عوام تاریخِ انسانی کی شان دار ترین زندگیاں بسر کررہے ہیں۔ یورپ کو یہ سبق سیکھنے کے لیے خود آگ اور خون کی ندیوں سے گزرنا پڑا۔ہم ایشیائی ایسے تجربے سے گزرے بغیر انھی نتائج پر پہنچ سکتے تھے جن پر یورپی اقوام پہنچیں۔لیکن ہم کائناتی کیلنڈر کی پچھلے ایک سیکنڈ کی تاریخ بھی جاننے اور اس سے سبق حاصل کرنے کو تیار نہیں۔ پورے کائناتی کیلنڈر پر غور و خوض تو بہت دور کی بات ہے۔

☆☆☆

کائنات کا اگلا سیکنڈ اور ہم

ملکوں، مذاہب اور تہذیبوں کے عروج و زوال کی بات کرتے ہوئے ہم نہ زیادہ دور تک ماضی میں جاتے ہیں نہ زیادہ دور تک مستقبل میں۔ ہم میں سے زیادہ تر کا تناظر ہمارے مذہبی تصورات سے وابستہ ٹائم لائن تک محدود ہے۔ہم یہ جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کوئی دو ہزار سال پہلے آئے تھے اور اس کے بعد یہودیت، مسیحیت اور اسلام کا فراہم کردہ تناظر ہمیں جلد ہی کسی قیامت کے دن سے ہم کنار کر دیتا ہے۔قربِ قیامت کی نشانیاں جو ہماری مذہبی روایات میں بیان کی گئیں ان میں سے بیش تر نشانیاں ہمارے لوگ پیغمبرِ اسلام کی وفات کے کچھ ہی برسوں بعد دیکھنا شروع ہو گئے تھے۔سن ایک ہزار عیسوی اور پھر سن دو ہزار عیسوی میں بھی قیامت کا انتظار کیا گیا کیونکہ انسان کے بنائے ہوئے کیلنڈر میں ایک اہم ترین سال آچکا تھا اور قیامت کے لیے یہ مناسب موقع تھا کہ وہ آجاتی۔مگر وہ نہ آئی۔ دنیا میں یوم قیامت کے بارے میں تازہ ترین توقع سال اکیس دسمبر دو ہزار بارہ کے دن سے ظاہر کی گئی مگر یہ دن اس توقع پر پورا نہ اترا۔کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور۔سامی مذاہب میں سے کچھ میں کائنات کے خاتمے کی تاریخ کافی دور بھی ہے۔ ہندو ضمیات میں کائنات کی عمر تین سو پندرہ کھرب سال بتائی گئی ہے۔ ہماری پچھلی نسلیں زمین یا کائنات کے اختتام کے لیے اتنا طویل انتظار کرنے کی عادی تو نہیں رہیں، پھر بھی ہمارے لیے یہ مناسب ہے کہ ہم یہ بھی جان لیں کہ سائنس دان ہمارے مستقبل اور مستقبل بعید کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

مستقبل کے لیے سائنس دانوں کے پاس جاتے ہی جو پہلی چیز معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے ہمیں کائنات کی عمر تیرہ ارب اسی کروڑ سال بتائی تھی تو ہمیں وہ بہت زیادہ لگی تھی، مگر وہ ہماری کائنات کے مستقبل کی عمر اس سے بھی زیادہ بتاتے ہیں۔اس عمر کی گنتی میں اتنے زیادہ صفر لگتے ہیں کہ یہ گنتی ہزاروں کھرب سال سے آگے نکل جاتی ہے۔

لیکن ہمیں زیادہ دلچسپی صرف انسان سے ہے، اس لیے آئیے کھربوں سال بعد کے مستقبل کی بات کرنے کے بجائے سو ڈیڑھ سو سال کے اندر واقع مستقبل کی بات کرتے ہیں۔ امریکی مفکر کارل سیگن نے جس کائناتی کیلنڈر کا ذکر کیا تھا، اس کا ایک سال ہمارے چار سو سینتیس برسوں کے برابر ہے۔ ہم کائنات کے اگلے چار پانچ سیکنڈوں کے بجائے بس اگلے ایک سیکنڈ کی بات کر لیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ سائنس دان اور مستقبلیات کے ماہرین اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔

موجودہ صدی اپنے ساتھ انفارمیشن ٹیکنالوجی کا سیلاب لائی ہے۔کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ جنیٹکس، نینو ٹیکنالوجی اور روبوٹکس کے شعبے ایسے ہیں، جو مستقبل کی انسانی تاریخ میں اہم ترین عوامل ہوں گے۔ابھی سے گلوبل گاؤں کہلانے والی دنیا میں یہ عوامل ایک ایسا انسانی معاشرہ تشکیل دیں گے جسے ٹرانس ہیومنزم کا نام دیا گیا ہے۔اس کی شکل ہم ابھی سے فیس بک، ٹوئٹر اور یوٹیوب کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔طب کے شعبے میں بھی حیرت انگیز پیش رفت ہو رہی ہے۔جلد ایسے چھوٹے مگر پیچیدہ آلات بنا لیے جائیں گے جنھیں انسانی جسم میں لگایا جاسکے گا اور جن کی مدد سے نہ صرف بیماریوں کی روک تھام کر کے انسانی عمر میں اضافہ کیا جاسکے گا بلکہ انسان کی پانچوں حسیات کی صلاحیت میں بھی اضافہ کیا جاسکے گا۔ذرا سوچیے کہ جب ہماری سماعت، بصارت، شامہ، لامسہ اور ذائقہ جیسی حسیات تیز تر ہو جائیں گی تو ہم فطرت اور اس کے حسی لذائذ سے اور زیادہ حظ اٹھا سکیں گے۔ یہ حسیاتی جنت ہمیں کوئی مذہب نہیں بلکہ سائنس فراہم کرے گی۔

جس زمین پر ہم رہ رہے ہیں اس کی زندگی محدود ہے۔اگر ہم نے خود اس زمین کو تباہ نہ کر لیا تب بھی یہ زمین بس چند کروڑ سال ہی زندہ رہ سکے گی۔اس کا ایک حل یہ ہے کہ زمین کے علاوہ دوسرے سیاروں پر انسانی آبادکاری کے امکانات کا جائزہ لیا جائے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ سن دو ہزار پچاس تک مریخ پر انسانی آبادکاری ممکنات میں داخل ہو جائے گی۔بائیسویں صدی میں چھوٹے سیاروں، سیارچوں اور نظامِ شمسی میں آوارہ بھٹکتے اجسام میں کان کنی شروع ہو جائے گی اور وہاں سے لوہا، کوبالٹ، مینگنیز، نکل، ایلومینئم جیسی دھاتیں نکالی جاسکیں گی جو ان اجسام یا پھر زمین پر بڑی بڑی تعمیرات کے کام آئیں گی۔ان اجسام سے سونا اور چاندی بھی نکلنے کا امکان ہے، جو زمین پر لائی گئی تو ایسا کرنے والے ملک کی دولت میں بے پناہ اضافہ ہو جائے گا۔بے تیغ لڑنے والے سپاہیوں کو ڈرون سے نشانہ بنانے والی اقوام تب ہم سے کتنی آگے نکل چکی ہوں گی، یہ صرف سوچا ہی جاسکتا ہے۔

انسان زراعت کے دور میں داخل ہوا تو اس نے ایسے اوزار بنائے جو زمین پر فصلیں کاشت کرنے میں اس کی مدد کرنے لگے۔ بڑھتی ہوئی انسانی آبادی کے لیے خوراک کی بڑھتی ہوئی ضرورت

پوری کرنے میں ان اوزار نے مدد دی۔ صنعتی دور آیا تو یہی کام مشینوں نے کیا۔ آیندہ دور میں یہ کام مصنوعی ذہانت کی حامل مشینیں یا روبوٹ کریں گے۔ نوکری کا کلچر بھی تبدیل ہوجائے گا اور بہت سے ملازمین گھر بیٹھے دفتر کا کام کرسکیں گے۔ یوں انسان کو اضافی فراغت میسر آئے گی جسے وہ زندگی سے زیادہ سے زیادہ لطف کشید کرنے میں استعمال کر سکے گا۔ مگر یہ فراغت اور یہ آسائش انھی قوموں کو حاصل ہوگی جو جدید ترین علوم کے حصول سے شغف دکھائیں گے۔

یہ سب تو وہ ہے جو اس زمین پر اگلے ڈیڑھ سو برسوں میں ہونے جا رہا ہے۔ اگر ہم نے سائنسی اندازِ فکر نہ اپنایا اور ایک مخصوص تناظر میں ہی زندگی بسر کرنے پر اصرار کرتے رہے تو ہم اپنی جگہ سے بہ مشکل اتنے آگے بڑھ پائیں گے کہ چین کی طرح مغربی ٹیکنالوجی کو کاپی پیسٹ کرلیں۔ انسان کی قیادت کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔ انسان کے لیے ہر روز کوئی نیا راستہ، کوئی نئی آسائش تلاش کی جا رہی ہے۔ تلاش کے اس سفر کے قافلہ سالاروں میں پاکستان یا مسلم دنیا کے بہت کم لوگ شامل ہیں۔ ہم اپنے* گوڈو کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ ہمارا ماضی دو ہزار سال پہلے شروع ہوتا ہے تو ہمارا مستقبل تو اتنا دور بھی نظر نہیں آتا۔ کیا ہمیں ہمیشہ دوسروں کے دست نگر ہی رہیں گے۔ ہم مغربی سائنس و ٹیکنالوجی کو بس کاپی پیسٹ کرنے کو اپنے علم کی معراج سمجھتے رہیں گے۔ اگر ہم ایسا نہیں کرنا چاہتے تو اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ ہم کائنات اور زمین کے ماضی اور مستقبل کے بارے میں اپنا تناظر تبدیل اور وسیع کریں۔

۞۞۞

☆ گوڈو: Samuel Beckett کے ہلے Waiting for Godot کی سمت اشارہ ہے۔

غزل

رُوحی کُنجاہی

یہ زمین باقی ہے، آسمان باقی ہے
ہم نہیں تو کیا رُوحی ہر نشان باقی ہے
کامیابی کیسی اور کیسی ہے یہ ناکامی
آپ کا نتیجہ بھی امتحان باقی ہے
واقعہ کچھ ایسا ہے، سانحہ کچھ ایسا ہے
داستاں سنا کر بھی داستان باقی ہے
اِس طرف تباہی ہے، اُس طرف تباہی ہے
ہر طرح ابھی قائم درمیان باقی ہے
ہوچکا ہے بے معنی، ہوچکا ہے لایعنی
راز فاش کرکے بھی رازدان باقی ہے
آنا جانا رہتا ہے دُکھ مکان سہتا ہے
چار دن مکینوں کے، پھر مکان باقی ہے
کوئی آئے یا جائے فرق کچھ نہیں پڑتا
کارواں چلا جائے، کاروان باقی ہے
اُس جہاں میں جو پہنچا، جیتے جی نہیں پہنچا
یہ جہان زندہ ہے ،یہ جہان باقی ہے

☆☆☆

غزل

صابر ظفر

گریز کر کے مسافر کوئی گزر بھی گیا
نجانے کیسے مری روح میں اُتر بھی گیا

میں رنگ بھرتا تھا سو سو طرح محبت میں
شباب ختم ہوا اور یہ ہنر بھی گیا

کہاں گئے وہ مسافر نواز بہتیرے
سفر نہ ختم ہوا اور کوئی بکھر بھی گیا

خود اتنی کھوکھلی کر دی ہیں تم نے اس کی جڑیں
ہوا چلی تو سمجھنا کہ یہ شجر بھی گیا

کہا تھا اس نے کہ مسکاؤ اور مرجاؤ
سو میں اسی گھڑی مسکایا اور مر بھی گیا

بس ایک یاد کی وحشت گئی نہ دل سے ظفر
جدھر جدھر بھی میں ٹھہرا جدھر جدھر بھی گیا

☆☆☆

غزل

صابر ظفر

اجل ہے راہ کا پتھر، اِسے ہٹا کے چلو
دلوں کو رکنے نہ دو، ہم سفر بنا کے چلو

سفر بھی سہل ہو اور ہو قریب تر منزل
ملال عہدِ گذشتہ اگر بھُلا کے چلو

وہ لوگ ساتھ جو چلتے نہیں، چلیں گے ضرور
کہ سو رہے ہیں ازل سے اُنہیں جگا کے چلو

تمہیں تکیں گے نہیں، جب تلک ہیں نامحرم
سفر میں دھند بہت ہے نقاب اُٹھا کے چلو

ظفر جو شخص ہے روح و بدن کا ہمراہی
اُسی کے واسطے یہ زندگی بچا کے چلو

☆☆☆

غزل

عباس رضوی

سورج لمحے بھر میں خاک نہیں ہوسکتا
قصہ اتنی جلدی پاک نہیں ہو سکتا

مرنے والے جان گئے ہیں کیا کیا کچھ
جینے والوں کو ادراک نہیں ہو سکتا

خاک بہ سر ہیں اور ایسے مسرور ہیں جیسے
ہم سا کوئی خوش پوشاک نہیں ہوسکتا

خوابوں کی تعبیر بتانا کیا مشکل ہے
عش مگر اتنا بے باک نہیں ہو سکتا

موج میں آ کر دکھتی رگ پر انگلی رکھ دے
موسم اتنا بھی سفاک نہیں ہو سکتا

عشق کا موسم بیت گیا سو بیت گیا
اب یہ گریباں پھر سے چاک نہیں ہوسکتا

☆☆☆

غزل

عباس رضوی

دلوں میں خواہشِ دستار ہی نہیں رکھتے
سروں سے ہم تو سروکار ہی نہیں رکھتے

بہت عزیز ہے دولت سکونِ دل کی ہمیں
سو ہم ضمیر سا آزار ہی نہیں رکھتے

وہ حبس ہے کہ شجر دم بہ خود کھڑے ہی تمام
کہ جیسے طاقتِ گفتار ہی نہیں رکھتے

دل و دماغ تو رکھتے ہیں شہریار سبھی
بس ایک دیدۂ بیدار ہی نہیں رکھتے

کبھی کبھی یہی ساحر جِلا بھی دیتے ہیں
یہ دل زدوں کو فقط مار ہی نہیں رکھتے

مریضِ عشق کا رکھتے ہیں چارہ ساز خیال
شِفا بھی دیتے ہیں بیمار ہی نہیں رکھتے

☆☆☆

غزل

غلام حسین ساجد

درد جب جب قدم بڑھائے گا
کوئی بے طرح یاد آئے گا
رونق افروز ہوچکے ہو تم
کوئی اب شمع کیوں جلائے گا
عکس میں جان پڑنے والی ہے
آج آئینہ ٹوٹ جائے گا
دیکھنا یہ ہے اس خرابے میں
کون کب کس کو چھوڑ جائے گا
خاک اڑتی رہے گی آنکھوں میں
کوئی آیا ہے اور نہ آئے گا
جب سناؤں گا داستاں اپنی
تو بھی میرے ہنسی اڑائے گا
میری مٹی کو گوندھنے والا
کب نیا آسمان بنائے گا
کس کی خاطر سنور رہی ہے صبح
بام پر کون جگمگائے گا
میں اسے یاد کر رہا ہوں گا
وہ مجھے یاد آ نہ پائے گا
ہوچکا ریزہ ریزہ میرا وجود
اب مجھے کس قدر ستائے گا
اے نگاہوں کو ہانکنے والے
کب وہ صورت مجھے دکھائے گا
جس کو آزاد کرچکا ہوں میں
اب وہ مجھ میں کہاں سمائے گا
جس کی خاطر بھٹک رہا ہوں میں
خود مجھے راستہ دکھائے گا
جس کو تخریب سے علاقہ ہے
کیا کسی کا وہ گھر بسائے گا
میری تائید کو بھی وہ ساجد
میرے دشمن کے ساتھ آئے گا

☆☆☆

غزل

جلیل عالی

سب ہمدرد چراغ بجھائے کس کی انا نے
ہجر اندھیرے اور بڑھائے کس کی انا نے
کس نے گریز کے سائے سارے میں پھیلائے
رنگ رفاقت کے زردائے کس کی انا نے
اک خود سر لمحے نے ذرا سی آگ لگائی
شعلے برسوں تک بھڑکائے کس کی انا نے
وہ جو شوق جزیروں پر تعمیر کیے تھے
وہ سب خواب گھروندے ڈھائے کس کی انا نے
باغ تعلق پھولوں پھول ہوا کرتا تھا
تھوہر اور ببول اگائے کس کی انا نے
کس نے برگ سخن سے چُپ دیوار گرائی
شکووں کے انبار لگائے کس کی انا نے
کس نے پاسِ وفا میں ضد زنجیریں توڑیں
اونچے اور حصار اٹھائے کس کی انا نے
کون لیے گل دستے دروازے پر پہنچا
کیسے جذبے خاک ملائے کس کی انا نے
غیر بھی بانٹ لیا کرتے تھے درد ہمارے
اپنے بھی کردیئے پرائے کس کی انا نے

☆☆☆

غزل

صبا اکرام

نہ تارے اور نہ حسیں چندرما نکلتا ہے
لئے وہ دامن دل میں دیا نکلتا ہے
سمے نے بیچ میں دیوار جو اٹھائی ہے
اُسی سے شام ڈھلے راستہ نکلتا ہے
جو ڈھونڈو عشق کے آثار گزری صدیوں میں
کہیں دیا کہیں کچا گھڑا نکلتا ہے
گھروں کے بٹنے سے طے مسئلے نہیں ہوتے
کہ جھگڑا بعد میں دیوار کا نکلتا ہے
تمام عمر کٹی پتھروں کے چننے میں
کہ سنگ سے بھی سنا تھا، خدا نکلتا ہے
کہو تو جان دوں، نذرانہ میں صبا اکرام
جو اس میں پہلو کوئی خیر کا نکلتا ہے

☆☆☆

غزل

قاضی حبیب الرحمٰن

دشت ہوائے شام میں رقص غزال دیکھنا
بسکہ رواں ہے چارسو موج خیال دیکھنا
مٹ گئے سارے ذائقے، عہد غم ونشاط کے
یعنی اسیر حال کو پھر نہ بحال دیکھنا
جز خط وخال وچشم ولب، جز تب وتاب روز وشب
کس کو نصیب ہے یہاں اس کا جمال دیکھنا
حکم جناب جو بھی ہو یعنی جواب جو بھی ہو
اس سے تو کچھ غرض نہیں، طرز سوال دیکھنا
شوق طلب میں دربدر، اپنی طرف بھی اک نظر
وہ جو نہیں تو کیا ہوا اس کی مثال دیکھنا
ظلمت ونور ہر طرف، شانہ بہ شانہ صف بہ صف
صبح نشاط سوچنا، شام ملال دیکھنا
ہائے یہ فکر بیش و کم، آہ یہ قہر دم بہ دم
آئینۂ عروج میں عکس زوال دیکھنا
اہل فراق نے دیا جیسے کہ دل کو حوصلہ
جاں سے مگر گزر گئے اہل وصال دیکھنا
ذوق نظر کی بات ہے شوق کی واردات ہے
ایک ہی شخص کے حبیب، جملہ کمال دیکھنا

☆☆☆

غزل

قاضی حبیب الرحمٰن

آسماں رکھ پاؤں کے نیچے، زمیں سر پر اٹھا
آج اس نازو ادا سے جھوم کر ساغر اٹھا
تو کسی کے دل کے ویرانے کو نفرت سے نہ دیکھ
جنگلوں سے ہر نئی تہذیب کا پیکر اٹھا
دوسروں پر اس طرح نشتر زنی سے فائدہ
تجھ میں ہمت ہے تو اپنے آپ پر خنجر اٹھا
مٹ گئے جو نقش ان کی یاد میں پاگل نہ ہو
آ غبار چشم حسرت سے نئے منظر اٹھا
دشت غم میں جستجو کر آپ اپنا راستہ
خاکِ رہ بن جا، نہ بار منت رہبر اٹھا
پڑھ کسی سے جا کے پھر درس حیات آموز عشق
قریۂ دل سے تمیز اسود و احمر اٹھا
ڈھونڈتا پھرتا ہوں دشتِ مرگ میں روح دوام
پردۂ ہستی اٹھا یا فتنۂ محشر اٹھا
کب تلک اڑتی رہے گی خاک وحشت شہر میں
اپنے دیوانے کے سر پر آخری پتھر اٹھا
لمحہ لمحہ بڑھ رہا ہے سیل خاموشی، حبیب
قطرہ قطرہ ایک طوفاں روح کے اندر اٹھا

☆☆☆

غزل

نصرت صدیقی

کوئی ملے اسے پہلے سلام کرتے ہیں
ہم اس طرح بھی محبت کو عام کرتے ہیں
بنا رہے ہیں عبث کھیل کود کے میداں
ہمارے شہر کے بچے تو کام کرتے رہے ہیں
تمہیں خیال بھی جن کا کبھی نہیں آیا
تمہارا ذکر وہی صبح و شام کرتے ہیں
غم حیات، غم عاشقی، غم انسان
ہم ایک شعر میں سو التزام کرتے ہیں
یہی بہت ہے کہ اس دور کم نگاہی میں
ہم ایک دوسرے کا احترام کرتے ہیں
ہم ایسے اہل جنوں کے لیے یہ سنگ بدست
کبھی کبھی تو بڑا اہتمام کرتے ہیں
بڑھا نہ دیں کہیں منزل کے فاصلے نصرت
مسافرت میں جو غافل قیام کرتے ہیں

☆☆☆

غزل

نصرت صدیقی

مہرباں جب سے تری خوئے ستم رانی ہے
شعر کہنے میں مجھے اور بھی آسانی ہے
جب تلک تم نہ ملے تھے میں پریشاں تھا بہت
مل گئے ہو تو اب اک اور پریشانی ہے
تیری خوش قامتی ہے میری غزل کی پہچان
تو کہیں مصرع اولیٰ ہے کہیں ثانی ہے
غم کا دریا نہ بہالوں کبھی دشتِ جاں میں
یہ علاقہ تو بہت دیر سے بارانی ہے
تشنہ لب جا بھی چکے تشنگی ہی ساتھ لئے
اب یہ کس کام کا جو تین طرف پانی ہے

☆☆☆

غزل

صفدر صدیق رضی

کیا ہے نیا دنیا میں دنیا پہلے سے ہے
چہرہ پہلے سے ہے دھوکا پہلے سے ہے

اس افراتفری کا ذمہ دار نہیں ہوں
میں اب آیا ہوں ہنگامہ پہلے سے ہے

تیرے قریب آتے ہی دُور نکل آیا ہوں
ویسے مرے سر میں یہ سودا پہلے سے ہے

کچھ تو میں نے تیری محبت میں سیکھا ہے
اور مجھے کچھ اس کا سلیقہ پہلے سے ہے

آتے نہیں اک ساتھ محبت کے رستے میں
صحرا اب آیا ہے دریا پہلے سے ہے

جس میں چراغ نہیں جلتا وہ ایک ہی گھر ہے
ایک ہی گھر ہے، جس میں اُجالا پہلے سے ہے

☆☆☆

غزل

(دانیال طریر کے لیے)

سید ایاز محمود

گماں ادراک سے پہلے نہیں تھا
یہ کوزہ چاک سے پہلے نہیں تھا

نئے موسم کی جولانی کا منظر
ہماری خاک سے پہلے نہیں تھا

قیامت خیزیوں کا زرد حاصل
رہِ پیچاک سے پہلے نہیں تھا

ارادے اوڑھ کر ظاہر ہوا ہوں
سو میں پوشاک سے پہلے نہیں تھا

بکھرتی بے کرانی کا حوالہ
دل صد چاک سے پہلے نہیں تھا

☆☆☆

غزل

عارف شفیق

مختلف ہے ہر قصہ اس جہانِ فانی کا
انت ایک جیسا ہے پھر بھی ہر کہانی کا

تخت و تاج کو ہم نے ٹھوکروں میں رکھا ہے
خواب دیکھتا ہے تُو ہم پہ حکمرانی کا

گونجتی ہے گلیوں میں چاپ بھاری بوٹوں کی
آ گیا لہو موسم پھر سے بے زبانی کا

آج بھی ہر اک گھر میں تذکرہ ہے صبح و شام
میرے ٹوٹے رشتوں کا میری بے مکانی کا

اب تو اس بڑھاپے میں یاد کچھ نہیں رہتا
بھولتا نہیں لیکن قصہ اک جوانی کا

لفظ تیرے جھوٹے ہیں لہجے میں بناوٹ ہے
دل پہ ہو اثر کیسے تیری خوش بیانی کا

صبح و شام ہونٹوں پر اُس کا ذکر رہتا ہے
خوف دل میں کیسے ہو مرگِ ناگہانی کا

میرے خواجہ کی چوکھٹ اور ہوگئی آباد
مٹ گیا نشاں آخر تیری راجدھانی کا

یہ بھی میرے مرشد کی عارف اک کرامت ہے
ساحلِ سمندر پہ چشمہ میٹھے پانی کا

☆☆☆

غزل

عارف شفیق

لالوکھیت کی گلیوں میں ہی سچ پہ چلنا سیکھا تھا
بچپن ہی میں ہر ظالم سے میں نے لڑنا سیکھا تھا

اب بھی ان کے نام کے اکثر دیپ جلایا کرتا ہوں
جن لوگوں سے تھوڑا بہت بھی لکھنا پڑھنا سیکھا تھا

سوچ کے کتنا ہنستا ہوں کہ وہ بھی نہیں پہچان سکے
جن چہروں کو دیکھ کے میں نے چہرہ بدلنا سیکھا تھا

میں نے پرندوں سے سیکھا تھا شام کو واپس گھر آنا
سورج سے تو صبح سویرے گھر سے نکلنا سیکھا تھا

آج نہیں تو دیکھنا یہ کل سوچیں گے اس شہر کے لوگ
پھول سے بچے نے کیوں آخر زہر اُگلنا سیکھا تھا

ہم ہیں خالد ہم ہیں قاسم ہم ہی ہیں ٹیپو سلطان
اپنی دھرتی کی حرمت پر ہم نے مرنا سیکھا تھا

آگ اور خون کا دریا بھی کب روک سکا رستہ اپنا
آندھی اور طوفانوں میں بھی ہم نے چلنا سیکھا تھا

یہ تاریخ گواہی دے گی اپنے وطن کے خاکے میں
وقت پڑا تو اپنے لہو کا رنگ بھی بھرنا سیکھا تھا

میں آوارہ اک لڑکا تھا وقت مرا استاد بنا
ٹھوکر کھا کر عارف میں نے خود ہی سنبھلنا سیکھا تھا

☆☆☆

غزل

ریحانہ روحی

پازیب، چوڑی، کاجل اور گجرا تمام شد
لگتا ہے جیسے ہجر میں دنیا تمام شد

چہرے کا سارا حسن ہی حسنِ نظر میں ہے
حسنِ نظر نہیں ہے تو چہرہ تمام شد

بے تابئ وجود کو کرنا نہیں مثال
گر پیاس بجھ گئی تو یہ دریا تمام شد

سہمی ہوئی ہوں فکر تماشا کے خوف سے
کیسے کہوں کے سارا تماشا تمام شد

سب جل کے راکھ ہوگیا نفرت کی آگ میں
کس کس کو کیابتاؤں کہ کیا کیا تمام شد

مرضی سے عمر جینے کی مہلت نہ جب ملی
اندر کی کشمکش میں تمنا تمام شد

روحی جب اس نے ترک تعلق کیا تو پھر
گڈے کی داستان سے گڑیا تمام شد

☆☆☆

غزل

ریحانہ روحی

جو آگ دل میں لگائی بجھائی بھی اس نے
اسی نے عشق کیا بے وفائی بھی اس نے

جسے تھا ترکِ تعلق سے اختلاف بہت
سزائے ترک تعلق سنائی بھی اس نے

جو بات عمر بھر اس کو چھپائے رکھنی تھی
وہ بات جانے مجھے کیوں بتائی بھی اس نے

اسی نے فرض کیا سب سے قیمتی خود کو
پھر اپنے آپ کی قیمت گھٹائی بھی اس نے

غزل کا جو بھی مخالف ہوا ہے آخرِ کار
غزل بھی اس نے لکھی ہے رباعی بھی اس نے

جب اس نے توڑ دیا وعدۂ وفا روحی
تو پھر یہ وعدہ خلاف نبھائی بھی اس نے

☆☆☆

غزل

خالد معین

سنا ہے آئینہ بردار ہونے والا ہے
یہ شہر نیند سے بیدار ہونے والا ہے
بچھڑنے والے بچھڑ جا مگر یہ دھیان رہے
یہیں سے راستہ ہموار ہونے والا ہے
زہے نصیب مرے دل تجھے مبارک ہو
کہ تُو بھی صاحبِ انکار ہونے والا ہے
میں چاہتا ہوں کہ شمشیر بے نیام نہ ہو
مگر یہ فیصلہ نا چار ہونے والا ہے
یہ میرا شہر، مرے لوگ بے خبر تو نہیں
یہیں کہیں سے کوئی وار ہونے والا ہے
کسی کے طرزِ تغافل کا کیا گلہ صاحب
مگر وہ خواب جو مسمار ہونے والا ہے
تمام شہر کی آنکھیں اُسی پہ ہیں مرکوز
جو واقعہ پسِ دیوار ہونے والا ہے
بلا کے رَت جگے طاری، کمال کی وحشت
یہ مجھ کو کون سا آزار ہونے والا ہے
نئے عذابوں، ثوابوں کے درمیاں ہے خبر
کچھ اور بھی مرے سرکار ہونے والا ہے

☆☆☆

غزل

خالد معین

خوش بُو کا ہم رکاب ہوا ہے کوئی کوئی
اور کھل کے یوں گلاب ہوا ہے کوئی کوئی

یہ دل کسی کسی پہ ہی دھڑکا ہے ناگہاں
نظروں کا انتخاب ہوا ہے کوئی کوئی

ویسے تو حسن آپ بھی رکھتا ہے اک چمک
پر عکسِ ماہ تاب ہوا ہے کوئی کوئی

ایسا کہیں کہیں کوئی دِکھتا ہے معجزہ
خود اپنا ہی جواب ہوا ہے کوئی کوئی

ویسے کتابِ دل تو محبت کے نام ہے
ہاں رنجشوں کا باب ہوا ہے کوئی کوئی

سود و زیاں کے باب سے ہٹ کے کبھی کبھی
یوں درپئے حساب ہوا ہے کوئی کوئی

اُس شخص کا جمال سمیٹے جو ہو بہ ہو
شعر ایسا انتساب ہوا ہے کوئی کوئی

☆☆☆

غزل

لیاقت علی عاصم

چاندی سا بدن لے کے کہاں چاند چلا ہے
اے دل وہیں چلتے ہیں جہاں چاند چلا ہے
دھمال میں ہے بحر تو وحشت میں بیاباں
کیا رات ہے کیا رقص کناں چاند چلا ہے
مدھم ہوئی جاتی ہیں ستاروں کی جبینیں
کچھ ایسا حسیں ایسا جواں چاند چلا ہے
یہ روشنیٔ ذات بھی کیا ظلم ہے دیکھو
اپنی ہی نگاہوں سے نہاں چاند چلا ہے
اے اشک در انداز مجھے دیکھنے تو دے
آنکھوں میں مری آ کے کہاں چاند چلا ہے
میں نے اسے دیکھا تھا کہ پوچھا تھا کسی سے
ہر سمت یہی شور تھا، ہاں چاند چلا ہے
میں عمر گزیدہ ہوں خبر ہے مجھے عاصم
کس آگ میں ہونے کو دھواں، چاند چلا ہے

☆☆☆

غزل

لیاقت علی عاصم

درد دل کے سوا کوئی نہیں ہے
اس سے اب رابطہ کوئی نہیں ہے
جو خبر اس کی خیریت کی دے
تجھ سوا اے خدا کوئی نہیں ہے
مری مٹی کا دم نہ گھٹ جائے
آگ پانی ہوا کوئی نہیں ہے
لا ذرا اس کی بوے رنگ فشاں
باغ میں اے صبا کوئی نہیں ہے
میں یہ سمجھا تھا درمیاں میں ہیں لوگ
وہ گیا تو کھلا، کوئی نہیں ہے
کاش دریا کو بھی خبر ہو جائے
ناو میں ناخدا کوئی نہیں ہے
میں ہوں اور میں ہوں اور میں ہوں بس
دوسرا تیسرا کوئی نہیں ہے

☆☆☆

غزل

غالب عرفان

وہ جہاں بھی تھا وہیں محصور تھا
میں بھی اپنے آپ سے کچھ دور تھا

کھینچ لایا تھا جو ساحل سے مجھے
وہ سمندر بھی تھکن سے چُور تھا

وہ ہیولہ تھا نہ پرچھائیں مگر
عکس آئینے میں تو بھرپور تھا

راس آئی اُس کو جب آوارگی
میں حدودِ وقت میں محصور تھا

اک تسلسل روز وشب کا تھا تو کیا
زندگی کا سلسلہ بے نور تھا

راہِ عرفاں کا مسافر بھی کبھی
شرحِ حرف وصوت پر مامور تھا

☆☆☆

غزل

غالب عرفان

فطرت کے رنگ وروپ کا جب خون ہوگیا
جو بھی زباں سے نکلا وہ قانون ہوگیا

کتنے مشاہدات کو نسلوں میں چھوڑ کر
انسان تجربات میں مدفون ہوگیا

راس آ سکی نہ کوئی بھی خود داریوں کی راہ
جذبہ معاشیات کا مرہون ہوگیا

صدیوں کا اکتساب جو حاصل ہے ایک پَل
جس نے برت لیا وہی ہارون ہوگیا

ڈھانپا تھا تیرگی نے ہر اک چہرۂ گناہ
جب روشنی کے شہر میں شب خون ہوگیا

لکھنے کو تھا فسانۂ عرفان رنگ و بُو
تحریر حسن و عشق کا مضمون ہوگیا

☆☆☆

غزل

مبین مرزا

کبھی خدا کبھی خود سے سوال کرتے ہوئے
میں جی رہا ہوں مسلسل ملال کرتے ہوئے

مگن تھا کارِ محبت میں اِس طرح کہ مجھے
خبر نہ ہوسکی اپنا یہ حال کرتے ہوئے

کسے بتاؤں گزارا ہے میں نے بھی اک دور
مثال ہوتے ہوئے اور مثال کرتے ہوئے

وہ جذب وشوق ہی آخر عذابِ جاں ٹھہرا
حرام ہوگیا ، جینا حلال کرتے ہوئے

نہ کوئی رنج اُن آنکھوں میں تھا دمِ رخصت
نہ تھی زبان میں لکنت سوال کرتے ہوئے

یہ کام اُس کے لیے جیسے مسئلہ ہی نہ تھا
وہ پُرسکون تھا کارِ محال کرتے ہوئے

تمام عمر جو لَو دیں ، مجھے رکھیں آباد
گیا وہ ایسے غموں سے نہال کرتے ہوئے

☆☆☆

غزل

مبین مرزا

لپٹی رہے گی اس طرح قدموں سے دنیا کب تلک
برپا رہے گا خاکِ جاں تیرا تماشا کب تلک

وہ تازہ دم تھا منزلیں آگے بلاتی تھیں اُسے
رکھتا بھی ساتھ اُس کے ہمیں آخر کو رستہ کب تلک

آشفتگی میری ہی کیا اُس کی بھی آنکھیں بول اٹھیں
ہوتا نہ دنیا پر بھلا یہ راز افشا کب تلک

اس کا خیال اپنی جگہ میرا ملال اپنی جگہ
اب دیکھنا ہے اس طرح چلتا ہے قصہ کب تلک

شورِ تلاطم کہہ اٹھا اب روکنا ممکن نہیں
تھامے رہوں دل میں یونہی آخر یہ دریا کب تلک

مدت ہوئی ڈھوتے ہوئے اس جسم وجاں کے ڈھیر کو
اے زندگی پھرتا رہوں لے کر یہ ملبہ کب تلک

☆☆☆

غزل

عطاءالرحمٰن قاضی

اندر سے شب و روز وہ باہر کا الجھنا
اچھا نہیں لگتا مے و ساغر کا الجھنا

ہر شام مناظر کا بکھرنا وہ بہر سُو
ہر گام مسافر سے کسی ڈر کا الجھنا

کُچھ وسعتِ امکاں تو نہیں وسعتِ صحرا
دیوار کی ہے قید نہ وہ در کا الجھنا

ہر روز وہی کشمکش شام و سحر ہے
ہرروز مکینوں سے وہی گھر کا الجھنا

دکھلائے گا کیا رنگ عطا دیکھئے دل سے
اک لمحۂ موجود و میسر کا الجھنا

☆☆☆

غزل

عطاءالرحمٰن قاضی

یہ ہم جو درد کو خوشبو میں ڈھالتے ہیں میاں
رُتوں کا عطرؔ لہو سے نکالتے ہیں میاں

اٹھا رہے ہیں قسم حرمتِ قلم کی جو لوگ
ازار بند، قلم سے ہی ڈالتے ہیں میاں

کسی کسی پہ ٹھہرتی ہے جا کے دل کی نظر
ہر ایک زخم کہاں ہم اجالتے ہیں میاں

وہ تاج وتخت تمہارا، تمہیں مبارک ہو
ہم اپنی مملکتِ دل سنبھالتے ہیں میاں

عطا خبر تو ملے تیرگی کہاں تک ہے!
کوئی چراغ ہوا میں اچھالتے ہیں میاں

☆☆☆

غزل

انور جاوید ہاشمی

دکھلا رہے ہیں لوگ سبھی آئینہ مجھے
لے جائے دیکھیے یہ کہاں سلسلہ مجھے

کیا صبر، جستجو نہ جہاں کارگر رہے
ملتا نہیں ہے عرض و گزارش بِنا مجھے

رسم و رواج اپنی جگہ خوب ہی سہی
پھر دیکھنا پڑے گا نیا راستہ مجھے

پہلے بھی بھوک، پیاس یہاں مسئلہ رہی
یہ اور بات لگتا نہ تھا مسئلہ مجھے

یوں تو لغت میں لفظ و معانی نہیں ہیں کم
اک لفظ 'عشق' چن لیا، اچھا لگا مجھے

تم بھی سنو کہ عصر کی دہلیز سے کوئی
مُڑ مُڑ کے دے رہا ہے ابھی تک صدا مجھے

☆☆☆

غزل

نرجس افروز

اپنے دل سے گزر رہی ہوں میں
پھر تجھے یاد کر رہی ہوں میں

تم نہ چونکو! تمھیں تمھاری قسم
بات دنیا کی کر رہی ہوں میں

کتنا بے اعتبار ہے ترا ساتھ
اب محبت سے ڈر رہی ہوں میں

رہ گزارو! تمھی گواہی دو
اپنی خود ہمسفر رہی ہوں میں

کام آیا نہیں سنگھار مرے
آئینے میں بکھر رہی ہوں میں

☆☆☆

غزل

کاشف حسین غائر

لذّتِ آوارگی جاتی رہی
جانے والی چیز تھی، جاتی رہی

پہلے مجھ کو بھیڑ میں گم کر دیا
پھر مجھے آواز دی جاتی رہی

ایک گھر تعمیر مجھ میں ہو گیا
اور میری بے گھری جاتی رہی

جس طرف کوئی نہ تھا، کچھ بھی نہ تھا
اُس طرف بھی روشنی جاتی رہی

لمحہ لمحہ دل اُدھر کھنچتا گیا
رفتہ رفتہ بے دلی جاتی رہی

وہ خوشی، کہتے ہیں جس کو زندگی
زندگی بھر فرض کی جاتی رہی

سننے والا کون تھا، کوئی نہیں
بات تو پھر بھی کہی جاتی رہی

جاتے جاتے رُک گیا کوئی، مگر
اُس مکاں تک وہ گلی جاتی رہی

☆☆☆

غزل

کاشف حسین غائر

کچھ دنوں ہی بے دلی دیوار تھی
پھر وہی دل تھا، وہی دیوار تھی

میں کہ اپنے آپ سے ٹکرا گیا
ویسے تو اک اَور بھی دیوار تھی

لوگ اُس کے سائے میں بیٹھے تھے، اور
زندگی گرتی ہوئی دیوار تھی

اوج پر تھی خواہشِ ترکِ سفر
پر، کسی کی ہمرہی دیوار تھی

گھر میں دونوں رات بھر لڑتے رہے
تھا پرانا در، نئی دیوار تھی

اس جگہ سے کیوں پلٹ جاتی ہے موج
اِس جگہ پر کیا کوئی دیوار تھی؟

ہاں مری پہلی محبت کی گواہ
اُس گلی کی آخری دیوار تھی

☆☆☆

غزل

شبیر نازش

گر نہیں وصف تو پھر عیب اُچھالے میرے
عشق میں کچھ تو رہیں زندہ حوالے میرے
خوش نہیں آیا مجھے اُس کا مزاجِ تشکیک
خوش نہیں آئے اُسے ڈھنگ نرالے میرے
وہ عجب ساعتِ خوش رنگ میں بچھڑا مجھ سے
رنج و غم بھی نہ کیے اُس نے حوالے میرے
جو بہت دُور ہے کیا اُس سے توقع رکھوں
جو مرے پاس ہے سنتا نہیں نالے میرے
ایک مُدّت سے کوئی طعنہ و دُشنام نہیں
کیا مجھے بھول گئے چاہنے والے میرے
مَیں بھی ہیرو تھا، مرے گرد بھی رہتا تھا ہجوم
رنگ تھا کھِلتا ہُوا ، بال تھے کالے میرے
اب وہ آنکھیں ہیں نہ آنکھوں میں چمک ہے نازشؔ
لے گیا ساتھ ہی اِک شخص اُجالے میرے

☆☆☆

غزل

شبیر نازش

رُکی ہوئی ہیں گردشیں ، نظام چل نہیں رہا
گیا وہ جب سے چھوڑ کے ، سمے بدل نہیں رہا
ہر ایک شے ہے آس پاس جوں کی توں رواں دواں
مگر مری گرفت میں وہ ایک پل نہیں رہا
میانِ وصل یک نفس وہ یوں کھُلا کہ اُس گھڑی
ابد ابد نہیں رہا ، ازل ازل نہیں رہا
نفس نفس حکایتیں ، زباں زباں روایتیں
سِوا ہے علم ہر کہیں مگر عمل نہیں رہا
خدا کرے کہ وہم ہو ، خدا کرے کہ خیر ہو
بہت دنوں سے اُس طرف چراغ جل نہیں رہا
ترے سِوا بھی صورتیں ، بسیں ہماری آنکھ میں
مگر کسی کا تذکرہ غزل غزل نہیں رہا
ہُوا تھا جو بھی بھول جا ، جو ہو سکے تو لوٹ آ
ترے بغیر جانیا! یہ دل بہل نہیں رہا

☆☆☆

غزل

سید نواب حیدر نقوی

اے سر زمین درد کوئی چارہ گر تو ہو
گر یہ نہیں تو ساتھ کوئی نوحہ گر تو ہو
کب تک درازئ شبِ ہجراں کو روئیں ہم
ہیں گوش بر آواز، صدائے سحر تو ہو
کس کس کو ہم فسانۂ غمگیں سنائیں گے
یارب! کسی کے پاس دل غم اثر تو ہو
کُنجِ قفس میں لو تو رہائی کی کچھ رہے
اے پاسبان! تذکرۂ بال و پر تو ہو
کس طرح ہم تلاش حریمِ وفا کریں
اور کچھ نہیں تو روشنئ بام و در تو ہو
کِھل جائیں گے گلاب تمنّا بھی، جانِ جاں!
گلشن میں خوش خرام نسیم سحر تو ہو
کر لیں گے ہفت خوان محبت بھی سر کبھی
راہیؔ مثال خضر کوئی ہم سفر تو ہو

☆☆☆

غزل

سید نواب حیدر نقوی

لگ گئی آگ آشیانے کو
نہ رہی شاخ بھی ٹھکانے کو
مضطرب دل نہ ہو اندھیروں سے
شمعِ جاں ہے ابھی جلانے کو
کاٹیے کیسے شامِ تنہائی
یاد آئے وہ بھول جانے کو
ہر زمانے کو نسلِ انساں کے
کتنے الزام ہیں اُٹھانے کو
سرِ مژگاں ہیں آنسوؤں کے چراغ
رکھ دیے کس نے ٹمٹمانے کو
عشرتِ جاوداں کے دھوکے میں
گھر بنایا تھا قیدخانے کو
دلِ محزوں نے رد کیا راہیؔ
راحتِ جاں کے ہر فسانے کو

☆☆☆

غزل

محمد آصف مرزا

حلقۂ مشکل وآساں سے نکل آیا ہوں
صحنِ دنیا! ترے زنداں سے نکل آیا ہوں

کچھ ہراساں نہیں اندیشۂ نایافت سے اب
کلفتِ تنگیٔ ساماں سے نکل آیا ہوں

اب ہے درپیش مجھے اپنے ہی اندر کا سکوت
اپنے اطراف کے طوفان سے نکل آیا ہوں

اپنے زخموں کے جلو میں ہوں بڑی راحت سے
تیری پرسش کے نمکداں سے نکل آیا ہوں

سب سے نظروں کو چراتا ہوں کچھ ایسے جیسے
کسی چوری شدہ ساماں سے نکل آیا ہوں

جتنا بے مایہ ہوا اور گھٹی فکر زیاں
بیش وکم ہونے کے امکاں سے نکل آیا ہوں

اب مقابل ہے فقط، ریگ رواں اور صحرا
دورِ آوازۂ طفلاں سے نکل آیا ہوں

مجھ کو کچھ یوں بھی خوش آیا ہے غزل کا پیکر
کسی پابندیٔ عنواں سے نکل آیا ہوں

☆☆☆

غزل

محمد آصف مرزا

یہی دل میں سمائی ہے دِوانہ وار می رقصم
دکھائی دے رہا ہے مجھ کو میرا یار می رقصم

بکھرتا جارہا ہے جسم کا طومار می رقصم
اترتا جارہا ہے روح کا زنگار می قصم

نہ جانے کب سے مصروفِ تماشا ہوں نہیں معلوم
کہیں دیکھا ہے کیا مجھ سا کوئی جاندار می رقصم

کبھی جنگل میں بھی ناچا کیا تھا صورتِ طاؤس
ذرا دیکھا! تماشائی ہے اب سنسار می رقصم

قسم ہے کرمک شب تاب کی رہتا ہوں میں اکثر
اندھیروں کی نگر میں مثل آتش بار می رقصم

اسی امید پر طوف حرم کی یاد میں گم ہوں
کبھی تو ہوگا حاصل مجھ کو استمرار می رقصم

☆☆☆

غزل

ریاض ندیم نیازی

دے کے الفت کا یہ آزار، مرے یار
کر ڈالا مری زیست کو دُشوار، مرے یار

یہ وادیٔ پرخار ہے، ہر گام سنبھل کر
گر جائے نہ سر سے ترے دستار، میرے یار

دے گا مِرا ماضی مری عظمت کی گواہی
ہوتا تھا مرا شعر ہی شہکار مرے یار

کیا چیز پس پردۂ احوال جنوں ہے
کھل جائیں گے اک روز یہ اسرار مرے یار

ہوجانے کو ہے ختم یہ ہستی کی مسافت
ہر شخص ہی چلنے کو ہے تیار مرے یار

ہرسوچ یہاں زر کی پرستش میں مگن ہے
کوئی نہیں یوسف کا خریدار، مرے یار

میں ہی تھا ندیم رہِ ہستی، سو مجھے بھی
کرڈالا ترے عشق نے بے کار، مرے یار

☆☆☆

غزل

سیّدہ عطیہ

جب روشنی پہ کچھ بھی اجارہ نہیں رہا
پھر آئینے میں عکس ہمارا نہیں رہا

دل کی ہے اور بات تیقّن پسند تھا
آنکھوں کو انتظار تمھارا نہیں رہا

یہ بھی ہوا کا تنگیٔ دامانِ ظرف ہے
ریگِ رواں پہ نقش دوبارہ نہیں رہا

جو ہم نشینِ ماہِ منور تھا مدتوں
ٹوٹا تو آسمان کا تارا نہیں رہا

موجوں کو ساحلوں کی رفاقت نہیں ملی
آبِ رواں کا کوئی کنارہ نہیں رہا

جب تک تھا اذن سب سے جدا دیکھتے اُسے
اب اُس کی سمت دل کا اشارہ نہیں رہا

☆☆☆

غزل

شیر جان برمانی

قدم نہیں ہے جو محو خرام کس کا ہے
دیار دربدراں میں قیام کس کا ہے
سفر تھمے جو کبھی مڑ کے دیکھ لینا تم
مسافتوں سے اٹا یہ سلام کس کا ہے
کہیں اسی کا نہ ہو جس کے غم میں بیٹھے ہیں
خبر کرو شب ہجراں یہ نام کس کا ہے
یہ فیصلہ کسی تاریخ داں پہ چھوڑتے ہیں
کہ میرا قتل ہے جو انتقام کس کا ہے
بدن تو کیا، اتر آیا ہے روح میں بھی لہو
میرے وجود میں یہ قتل عام کس کا ہے
ہمارا زہر تھا چپکے سے پی لیا ہم نے
جو گر گیا دم حیرت وہ جام کس کا ہے
یہ کون شیر جاں سورج کی موت میں ہے مگن
سوادِ درد میں بھی رقص شام کس کا ہے

☆☆☆

غزل

میثم علی آغا

ظہور فکر میں تاروں نے جب کلام کیا
ہوا نے جھک کے چراغوں کو کیوں سلام کیا
نشانِ ماتم ہجراں پہ کھل اٹھی وحشت
ترے فقیر کا صحرا نے احترام کیا
چراغ بجھنے پہ آیا تو میری آنکھوں نے
بڑے خلوص سے گریے کا اہتمام کیا
خزاں رسیدہ شجر بھی دعائیں دینے لگے
حریم عشق میں وحشت نے جب قیام کیا
ضعیف حجر محبت کے منکروں میں ہو
تُو مقتدی بھی نہیں تھا تجھے امام کیا

☆☆☆

غزل

سیمان نوید

جن مکانوں میں مکیں ہوتے ہیں
ان میں آسیب نہیں ہوتے ہیں
اب ملاقات کہاں ہوتی ہے
ہم کہیں، آپ کہیں ہوتے ہیں
کہیں جاتے نہیں خود سے باہر
ہم جہاں بھی ہوں، وہیں ہوتے ہیں
یار ایسا تو نہیں ہوتا ہے
یار ایسے تو نہیں ہوتے ہیں
جہاں جاتے ہیں ہمارے ہمراہ
آسماں اور زمیں ہوتے ہیں

☆☆☆

(افسانے)

نہ پری رہی نہ جنوں رہا

رشید امجد

شروع شروع میں شک تھا، لیکن اب یہ یقین ہو چلا تھا کہ اس گھر میں ان کے علاوہ کوئی اور بھی رہتا ہے۔ گھر میں اس وقت چار لوگ تھے، دونوں میاں بیوی، ڈرائیور اور ایک ملازم جو کچن اور گھر کے کام کرتا تھا۔ دونوں میاں بیوی عمر کی آخری سیڑھیوں پر تھے، میاں کو ریٹائر ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ ایک زمانے میں وہ بہت خواب دیکھتا تھا، بے شمار بے تعبیر خواب، اب اس نے خواب دیکھنا تقریباً چھوڑ دیا تھا، خواب اب اپنی مرضی سے تو دیکھے نہیں جا سکتے، جی تو چاہتا تھا کہ اب بھی خواب دیکھے، بھلے سے بے تعبیر ہی ہوں لیکن اب تو نیند کی گولی کھا کر بھی نیند نہیں آتی تھی، رات کو واش روم جانے کیلئے اٹھتا تو پھر نیند ہی نہیں آتی، ایک دو بار ٹی وی لگایا تو بیوی اٹھ گئی، سو اب اس نے ایک نیا طریقہ نکالا، ٹی وی آن کر کے آواز بند کر دیتا۔ عجیب سا لگتا۔

میں شاید بغیر آواز والی تصویروں کے دور میں پہنچ گیا ہوں۔

پھر اس میں بھی ایک مزہ آنے لگا، آواز کے بغیر حرکات............ وہ ہلتے ہونٹوں کو اپنے معنی پہنا دیتا۔ بیوی بھی ڈسٹرب نہ ہوتی، وہ بھی اپنی عمر کی آخری سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ ہر وقت اداس رہتی، بیٹے بیویوں کو لے کر باہر چلے جاتے، بیٹیاں اپنے اپنے گھر، اس گھر میں بچوں کی قلقاریاں بستی تھیں، سجے سجائے، بھرے پرے گھر میں اک اداسی اور تنہائی چوکڑی مار کر بیٹھی ہوئی تھی اور جاتے نہ جاتی تھی، دونوں ملازم سرونٹ کوارٹر میں رہتے تھے۔ رات کو نو دس بجے وہ اپنے کمرے میں چلے جاتے اور صبح ان کے دروازہ کھولنے پر اندر آتے۔ میاں ان کے جانے کے بعد ایک ایک دروازہ چیک کرتا اور پھر دیر تک ٹی وی دیکھتا رہتا۔ بیوی سو جاتی۔ اس اداس گھر میں وہ دونوں اکثر خاموش رہتے، کبھی کبھار کوئی بات ہو جاتی بس ایک دوسرے کے پاس ہونے کا احساس تھا۔

اس گھر کے اندر وہ دو تھے، رات کے وقت، دن کو چار ہو جاتے۔

اندر کون تھا؟ بس ایک دن احساس ہوا کہ کوئی اور بھی ہے، جو ہے تو سہی مگر دکھائی نہیں دیتا۔
یہ خوف کی بات تھی لیکن خوف محسوس نہیں ہوا' اس تیسرے کا احساس تو دن کو بھی ہوتا تھا لیکن رات کو تو یہ احساس بڑھ جاتا لگتا کوئی کبھی لاؤنج، کبھی اوپر والے حصے میں، کبھی سیڑھیوں میں موجود ہے ،کئی بار جی چاہا کہ اپنے کمرے سے نکل کر دیکھے لیکن ہمت نہ ہوتی۔ بیوی سے بات کرتے ڈرتا تھا کہ خوف زدہ ہوجائے گی وہ پہلے ہی ایک ڈری ہوئی سہمی ہوئی دکھی عورت تھی۔

شروع شروع میں اس تیسرے کا احساس رات کو باہر کے کمرے میں ہوتا تھا لیکن اب لگتا کہ وہ ان کے بیڈ روم میں بھی موجود ہے۔

بس ایک احساس ہی تھا، ورنہ دکھائی تو کچھ نہ دیتا، پھر لگا کوئی ان کے درمیان میں ہے، اپنی اپنی دیواروں کی طرف منہ کئے دونوں میاں بیوی عمر کی ڈھلوان پر تیزی سے پھسلتے ہوئے انتظار کررہے تھے، لیکن اب شاید انتظار بھی نہیں تھا۔ درمیان میں لیٹا ہوا کوئی خود کو محسوس کرا رہا تھا، کئی بار غیر ارادی طور پر میاں بغیر مڑے ہاتھ سے کچھ ٹٹولنے کی کوشش کرتا، درمیانی خالی جگہ پر ہاتھ ادھر ادھر ہوتا تو اطمینان سا آجاتا، لیکن دوسرے ہی لمحے اطمینان کی چڑیا پھر سے اڑ جاتی۔

''کوئی تو ہے'' وہ سوچتا، پر دکھائی کیوں نہیں دیتا،

دکھائی تو وہ نہیں دیا بس اپنے ہونے کا احساس ہی کراتا رہا۔

اب وہ اپنے وجود پر بھی اس کی دستک محسوس کرسکتا تھا، شاید دستکیں دیکر وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ اپنے وجود میں موجود بھی ہے یا نہیں-

یہ تو میری کیفیت ہے میاں سوچتا، میری بیوی کو تو کوئی احساس ہی نہیں۔

وہ یہ ذکر کر کے اسے خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا، وہ تو پہلے ہی ڈری ہوئی سہمی ہوئی عورت تھی۔

تنہائی بھی اپنا وجود رکھتی ہے، اسے ایک دن اچانک خیال آیا پرندے ہجرت کرجائیں تو باغ اجڑ جاتا ہے گھر میں بچوں کی قلقاریاں نہ ہوں تو گھر کتنا ہی سجا سجایا ہوا اداس ہوتا ہے، اور یہ اداسی بھی تو اپنا وجود رکھتی ہے۔

تو یہ تنہائی تھی یا اداسی جو اس گھر میں دبے پاؤں چلتی تھی اور اپنے ہونے کا غیر محسوس احساس کراتی تھی۔

ہم دونوں میں سے جو پہلے چلا جائے گا وہ شاید خوش قسمت ہوگا، اس نے سوچا جو رہ گیا یہ جو کوئی نظر نہیں آتا بھوکے کتے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے گا۔

تصور میں اپنے وجود کو ادھیڑتا ہوا دیکھتا، محسوس کرتا۔

''اذیت نہ ختم ہونے والی اذیت۔''

''ہم دونوں میں سے ایک کو تو اس سے گزرنا ہے۔''

ہمدردی سے اپنی دیوار کی طرف منہ کئے ڈری سہمی عورت کو دیکھتا۔

''یہ تو پہلے ہی بڑی دکھی ہے اور اذیت برداشت نہیں کرسکے گی۔''

کچھ نہ سوجھتا، موجود تو کوئی ہے بے شک دکھائی نہ دے اور اس نے ان میں سے کسی ایک کو تو ادھیڑنا تھا۔

درد کی ٹیسیں سارے وجود میں دوڑ جاتیں۔

''ہم میں سے ایک کو...''

تفتیشی افسر نے اپنی رپورٹ میں لکھا:''وجہ معلوم نہیں ہوسکی، تمام تر کوشش کے باوجود وہ کچھ بتاتا ہی نہیں۔''

نیم تاریک کوٹھری کے کھردرے فرش پر لیٹے لیٹے سوچتا ہے.......... بتائے بھی کیا، بتانے کو کچھ ہے ہی نہیں، شاید یہ تیسرا جو ہے تو سہی..... پر دکھائی نہیں دیتا۔

۞۞۞

اک نان بہت ہے مری تسکین کو لیکن
کب مال ضرورت کسی حق دار کو پہنچا
(منجمد پیاس۔ احسن سلیم)

کلیئرنس سیل

ڈاکٹر سلیم اختر

پیغام ملا: ''میاں صاحب بلا رہے ہیں۔''

میاں صاحب ''وہ'' والے میاں نہیں بلکہ ہمارے اپنے میاں یعنی مدیر اعلیٰ۔ میاں صاحب صحیح معنوں میں پروفیشنل صحافی ہیں۔ اخبار کی بہتری اور مقبولیت کے لئے ہمیشہ سرگرم۔ انہوں نے کبھی بھی حکمرانوں کی خوشامد کر کے کچھ نہ حاصل کیا۔ نہ اپنے لئے نہ اپنی اولاد کیلئے۔ اسی لئے میں ان کا بہت مداح ہوں۔ ہمارا اخبار ملک میں سب سے زیادہ چھپتا تھا لیکن باشعور اور ذہین قارئین میں خاصا مقبول تھا، ہمارے اخبار کی قوت سرکاری اشتہارات نہیں بلکہ ہماری لائف لائن وہ قارئین تھے جو خرید کر اخبار پڑھتے تھے۔

کہنے لگے: ''آج کا اخبار دیکھا؟''

''جی دیکھا ہے۔''

''تمہارے خیال میں اس میں سب سے اہم بلکہ اہم ترین کون سی خبر ہے؟''

''وہ جو صفحہ سات پر چھٹے کالم کے اختتام کے قریب چند سطروں میں چھپی ہوئی ہے۔''

''اتنی غیر اہم جگہ چھپی؟ اور کون سی خبر ہے؟''

''وہ خبر جس میں ماں باپ نے تین بچے نیلام کرنے کا اعلان کیا ہے۔''

یہ سن کر میاں صاحب بہت خوش ہوئے۔ ''صحیح، میں نے بھی یہ خبر دیکھی۔ یہ کم از کم دو کالم کی خبر تھی۔ اسے پوری طرح فلیش کیا جانا چاہئے تھا لیکن نہ جانے کیوں اسے Kill کر دیا گیا۔''

پھر مجھ سے پوچھا: ''جمیل صاحب سے پوچھا؟''

''پوچھا تھا وہ کہنے لگے، وزیر اعلیٰ نے اورنج ٹرین کے بارے میں جو خاص اعلان کیا تھا اسے چار کالم کی رنگین سرخی میں چھپنا تھا اس لئے...........''

میں نے بات ختم کی: ''چلیں چھوڑیں۔''

''نہیں! یہ خبر چھوڑی نہیں جا سکتی۔''

''آپ کے ذہن میں کوئی خاص آئیڈیا ہے؟''

''کیا؟''

''ہم سنڈے ایڈیشن کے لئے اسے باتصویر فیچر بنائیں گے۔''

''گڈ آئیڈیا!''

''اسی لئے تمہیں بلایا ہے، فوٹو گرافر کو ساتھ لے جاؤ۔ اچھی طرح سے چھان بین کر کے اس جذباتی واقعے کو غیر جذباتی اسلوب میں تحریر کرنا۔ سمجھے؟''

''جی ہاں!''

''دراصل لکھتے وقت تم بہت ایموشنل ہو جاتے ہو۔''

''ہاں یہ تو ہے۔''

وہ پُرخیال انداز میں بولے: ''میرے خیال میں یہ اسٹوری ہٹ ہوگی، باقی اخباروں نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ سب نے اسی طرح غیر اہم طریقے پر چھاپی۔''

''جی ہاں! دراصل سب نے شراب پی کر فٹ پاتھ پر سوئے ہوئے دو افراد کے قتل کے مقدمے سے سلمان خان کے باعزت بری ہونے کی خبر کو فلیش کیا ہے تصویروں کے ساتھ۔''

وہ بولے: ''ہاں بھئی اپنے اپنے ریفرنسز ہیں۔''

''درست۔'' میں نے پوچھا اس ضمن میں اس علاقے کے رکن اسمبلی یا کسی وزیر کا بیان لے لوں تو کیسا رہے گا؟

بے زاری سے بولے: ''دفعہ کرو انہیں۔ وہ روٹین کا بیان دے دیں گے، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ دیں گے کہ اس ضمن میں اعلیٰ اختیارات کا اعلیٰ سطح کا ایک کمیشن تشکیل دے کر واقعے کی انکوائری کرا دیں گے۔''

''جب کہ یہ واقعہ نہیں، بلکہ سانحہ ہے۔''

''سانحہ نہیں بلکہ حادثہ کہو حادثہ۔ بلکہ ایک بہت بڑا تماچا۔''

''کس کے گال پر؟''

میں اور فوٹو گرافر تلاش کرتے کرتے جس بے نام کچی آبادی میں پہنچے، وہاں جگہ جگہ غلاظت کے ڈھیر لگے تھے، گلی کے نام پر جو پگڈنڈی نما جگہ تھی، اس کے درمیان میں سے گند سے اٹی نالی جس میں طرح طرح کی غلاظت اٹکی تھی، آگے نگاہ کی تو ایک نیم برہنہ بچہ فراغت پا رہا تھا۔ فوٹو گرافر نے کیمرے کا رخ اس کی طرف کیا تو وہ اسی عالم میں بھاگ گیا۔ ایک دو دروازوں کے سامنے عورتیں گندے کپڑوں میں ہمیں ہی گھور رہی تھیں، گھر کا پتا پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ گھر کے سامنے مجمع سج رہا تھا۔ ایک چار پائی پر دس بارہ برس کی لڑکی واجبی سی صورت، ساتھ دو بچے سات اور پانچ برس کے، میلے کپڑوں میں کالے بدنما، مرکز نگاہ بننے کی بنا پر پریشان، گھبرائے

سے، کسی سے آنکھ نہ ملا رہے تھے۔ لڑکی بھی گھبرائی، لوگوں کی چہ مگوئیاں باتیں، تبصرے۔

دوسری طرف نگاہ گئی تو ایک عورت ٹوٹے کواڑ والے دروازے میں ریں ریں کرتا بچہ گود میں لئے بیٹھی تھی۔ اس نے گندا کرتہ اٹھایا اور بچے کے منہ میں جلا ہوا بینگن دے دیا۔ آثار قدیمہ کی چیز۔ بابا لاٹھی ٹیکتا ہوا آ رہا تھا۔

میں پیشہ ور صحافی ہوں اس لئے کسی طرح کے واقعات بھی مجھ پر اثر انداز نہیں ہوتے لیکن یہ سب دیکھ کر مجھے متلی کا سا احساس ہو رہا تھا۔

میں نے اسے بتایا: ''میں یہ واقعہ کور کرنے آیا ہوں۔''

وہ بولا: ''کیا زمانہ آ گیا ہے۔''

دوسرا بولا: ''خدا کسی پر ایسا وقت نہ لائے۔''

''یہ سب ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔'' ایک ریش دراز بولا۔

میں نے اسے جواب دیا: ''کریں اسلام آباد والے اور بھریں کچی آبادی کے غریب لوگ۔''

کسی نے پوچھا: ''اس علاقے کا ایم پی اے نہیں آیا؟''

''وہ کیوں آتا؟''

''اس علاقے کا ایم پی اے ہے اس کا یہ فرض بنتا ہے۔''

''فرض۔ وہ کیا ہوتا ہے؟''

فوٹوگرافر نے اپنا کام شروع کر دیا۔ بچوں کے کلوز اپ، مختلف زاویوں سے ماں کی تصویر یں اور پھر چاروں کی تصویریں۔

میں ماں کے پاس گیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے پوچھا۔

''بی بی آپ یہ کیا کر رہی ہیں؟''

''کیا کر رہی ہوں؟''

''یہی بچوں کی نیلامی۔''

''اور کیا کروں؟ گھر میں دو دن کا فاقہ ہے۔''

''ان کا باپ کہاں ہے؟''

اس نے دوسری جانب چارپائی پر لیٹے شخص کی طرف اشارہ کیا جو گویا پیش منظر سے لاتعلق خلا میں گھور رہا تھا۔ کئی دن کی بڑھی داڑھی میں سفید اور سیاہ بال ایک طرف کو مڑی ناک، سیاہ ہونٹ، عجب سا مثلث نما چہرہ۔

''اسلام علیکم!''

اس نے میری طرف یوں دیکھا گویا مجھے نہ دیکھ رہا ہو۔

اس کی بیوی بولی: ''اس سے کیا پوچھتے ہیں؟ یہ اب بات کرنے کے قابل نہیں رہا۔''

''کیوں کیا ہوا ہے اسے؟''

''ہونا کیا ہے۔ کیا بتاؤں۔'' اور اس نے رونا شروع کر دیا تو فوٹوگرافر نے آنسو بہاتے چہرے کا کلوز اپ بنانا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد خود ہی خاموش ہو کر بولی: ''رونے کا کیا فائدہ؟ کہاں تک روؤں۔''

''کیوں کیا ہوا؟''

''سنئے! یہ رکشہ چلاتا تھا۔ رکشہ اپنا نہ تھا، کرائے پر تھا لیکن گزارا ہو جاتا تھا کسی بڑے آدمی کے ہاں چوری ہو گئی۔ دراصل چوری اس کے ڈرائیور نے کی تھی۔ اس کی بھی اس کے ساتھ دوستی تھی چنانچہ یہ بھی دھر لیا گیا۔ وہ مارا، وہ مارا کہ ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی اس کا چوری سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ اللہ رسول اور قرآن پاک کی قسمیں کھاتا رہا، لیکن انہوں نے مارنا بند نہ کیا۔ میں محلے کے دو تین شریف لوگوں کو لے کر تھانے گئی۔ اب تک تھانیدار کو بھی یقین ہو چکا تھا کہ یہ بے گناہ ہے اس لئے اس نے پچاس ہزار روپے مانگے۔ میں کہاں سے اتنی بڑی رقم لاؤں چنانچہ انہوں نے غصے میں اس کی پٹائی کا سلسلہ جاری رکھا اور پھر تنگ آ کر ایک دن اس کی ٹانگوں پر رولر پھیر دیا۔ یوں اس کی ٹانگیں ٹوٹ گئیں، اس کے بعد اس بے ہوش کو گھر پھینک کر چلے گئے۔''

وہ پھر رونے لگی۔ ''محلّہ کے کچھ نیک لوگوں نے چندہ کر کے اس کا علاج کرا دیا۔ اب یہ رکشہ چلانے کے قابل نہیں رہا۔ رکشہ کیا چلائے گا یہ تو خود بھی چلنے کے قابل نہیں رہا۔ اس کے تلوؤں پر بھی انہوں نے لوہے کی سلاخیں ماری تھیں۔ یہ دیکھیں۔''

اس نے مرد کی ٹانگوں پر سے بڑا گندا کھیس اتارا۔ فوٹوگرافر کو یہ تصویر بنانے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ جس طرح سر جھکائے بیٹھا تھا، اسی طرح بیٹھا رہا۔

میں نے اسے بتایا: ''میں اخبار کا رپورٹر ہوں آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں میں چھاپ دوں گا۔''

''آپ چھاپ دیں گے میں جو کچھ کہوں گا؟''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔''

''تو لکھئے! میں دنیا بھر کو گالیاں دیتا ہوں، ہر روز جو بد دعائیں دیتا ہوں کیا آپ انہیں چھاپ دیں گے۔''

اب تک گلی لوگوں سے بھر چکی تھی۔ بچوں کی ماں ہاتھ جوڑ کر بولی: ''بھائیو! میں مصیبت کی ماری ان بچوں کو بیچنا چاہتی ہوں۔ آپ مدد کریں کہ خاوند کا علاج کرا سکوں۔ اتنی التجا ہے کہ جب آپ انہیں خریدیں تو ان سے بچوں والا سلوک کریں، بھیڑ بکری والا نہیں۔''

ایک پہلوان نما شخص بے صبری سے بولا: ''بی بی قیمت بولو۔''

''جی میں کیا بولوں، میں نے کبھی بچے بیچے ہیں جو مجھے ان کی قیمت لگانے کا کچھ پتا ہو۔''

پہلوان بولا: ''اچھا تو ٹھیک میں ہی بولتا ہوں۔ اس لڑکی کے ہزار دے سکتا ہوں۔''

''نہیں جی۔''

''چلو ہزار کا اور اضافہ کر دو۔''

نیلامی شروع ہو چکی تھی۔

”ساڑھے تین ہزار۔“

”چار ہزار۔“

”چار ہزار پانچ سوٗ“۔

”چھ ہزار۔ یہ آخری بات ہے۔“

میرے ساتھ ریش دراز جو خاموش کھڑا تھا بولا: ”دس ہزار۔“

سب نے اسے چونک کر دیکھا، بلکہ زیادہ غور سے دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا: ہاں ہاں... یہ کہہ کر اس نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکالی اور پانچ پانچ ہزار کے دو نوٹ ماں کے ہاتھ پر رکھ کر لڑکی کا بازو پکڑ لیا۔

”اور یہ دو لڑکے؟“

”انہیں کوئی اور لے لے گا۔“

”میں ان کا اچار ڈالوں گی۔“ پھر مجمعے کی طرف دیکھ کر بولی: ”کوئی تو کچھ بولو۔“

”سب چپ۔“

ریش دراز نے لڑکی کا بازو تھام لیا: ”چلو!“

لڑکی بے چارگی سے ماں کو دیکھ رہی تھی، اس کا محدود ذہن صورتحال کا ادراک نہ کر پایا تھا۔

”نہیں نہیں وہ رو رہی تھی۔“

ریش دراز نے بازو پکڑ کر سختی سے کھینچا۔ ”چلو اٹھو!“

”نہیں نہیں۔“ وہ چیخ کر بازو چھڑا رہی تھی۔ ”ماں ....اماں ۔ماں، دیکھ یہ کیا کر رہا ہے۔ ابا..........دیکھو..........ابا؟“

ریش دراز ماں سے مخاطب ہوا: ”سمجھاؤ اِسے یہ کیا تماشا ہو رہا ۔“ پھر درشتی سے بولا: ”اٹھو!“

اچانک بالکل فلمی انداز میں کوئی چیخا: ”پولیس، پولیس۔“

سب گھبرا کر اٹھ بھاگے۔

ریش دراز نے لڑکی کو کھینچا، اسے جوتی بھی نہ پہننے دی اور ننگے پاؤں گھسیٹتی کو لے بھاگا۔

چند منٹ میں میدان صاف۔

حیرت زدہ عورت بھاگتے لوگوں اور ہمیں دیکھ رہی تھی پھر وہ ایک دم چیخی: ”بچے.......... میرے بچے کہاں گئے؟ میرے بیٹے کہاں گئے؟ کون لے گیا انہیں؟ فوٹو گرافر نے بھاگتی عورت کی تصویر بنانے کیلئے کیمرہ اٹھایا، فوکس کیا اور پھر یوں ہاتھ نیچے کر لیا غالباً یہ سوچ کر کہ کیا فائدہ۔

ایس ایچ او اور سپاہی آئے تو میدان صاف، صرف بچوں کا اپاہج باپ چار پائی پر۔

ایس ایچ او اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایک سپاہی بولا سر جی یہ وہی ہے ۔ ہاں میں بھی یہی دیکھ رہا ہوں۔

”اوئے، چوری کے بعد بچے چُرا کر بیچنے شروع کر دیئے اس نے۔“

اس نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ آنکھوں میں آنسو، ہاتھوں میں رعشہ۔

”بچے کہاں گئے؟“

وہ ہاتھ جوڑے انکار میں سر ہلا رہا تھا۔

سپاہی نے بھی مستعدی دکھانے کو گرج کر پوچھا: ”بچے کہاں سے چرائے؟“

”بول اوئے ماں دیا کھسماں!“

وہ سر ہلائے جا رہا تھا

”جوتے مارو حرامی کو۔“

”پچھلی مار بھول گیا۔“

مرد صرف سر ہلاتے جا رہا تھا۔

سپاہیوں نے جواب طلب نظروں سے اپنے سر جی کی طرف دیکھا۔

پھر ایک بولا: ”یہ ماننے والوں میں سے نہیں، اسے تھانے لے چلو اور چھتر کولا سے اس کی تواضع کرو تو خود ہی بک دے گا۔“

وہ تو خود سے اٹھ نہ سکتا تھا انہوں نے ہی اسے کھینچ کر گھسیٹا تو وہ چار پائی سے نیچے گر گیا، وہ کراہ رہا تھا۔

سپاہیوں نے اسے ٹھڈے مارنے شروع کر دیئے۔

سپاہیوں نے اسے گردن سے پکڑ کر کھڑا کیا تو وہ قدموں پر کھڑا نہ ہو سکتا تھا۔ جسم ڈول رہا تھا۔ ابھی گرا کہ ابھی گرا۔

”چل اوئے حرامیا۔ مارو اسے۔“

ایک سپاہی نے گردن سے دبوچ کر اسے گھسیٹا۔

وہ چلایا۔

مگر دوسرے نے اس کی بغل پر ہاتھ ڈال کر اسے اٹھا لیا۔

”چل اوئے ماں دے یارا۔“

یہ تو میں نے گالی کا سلیس ترجمہ کیا ہے ۔ ورنہ وہ گالی لکھی نہ جا سکتی تھی ۔

”خانہ خراب! چوری سے دل نہ بھرا تو بچوں کی کلیئرنس سیل بھی لگا دی۔“

”اوئے تیری!“ وہ اسے گھسیٹ کر لے جا رہے تھے کچی مٹی پر اس کے گھسٹتے پاؤں جو لکیریں بنا رہے تھے وہ متوازی نہ تھیں۔

❁❁❁

اجنبی

جیتندر بلّو

رچمنڈ کے دریائے تھیمز کے کِنارے ''وائٹ ہاؤس'' نام کا جو پب واقع ہے، وہ مجھے اس قدر عزیز ہے کہ اگر میں اک روز وہاں قدم نہ رکھوں تو پب کا مالک، جس کے نام تک سے میں واقف نہیں ہوں، وہ قدرے مایوس، قدرے ناراض ہوجاتا ہے۔

میں ایک ڈھلتی دوپہر میں اپنے وقت کے مطابق پب میں داخل ہوا۔ کاؤنٹر سے بیئر کا مگ تھام کر اپنے مخصوص کونے کی طرف بڑھا، تو میز پر صبح اور دوپہر کے اخبارات پھیلے ہوئے گلے مل رہے تھے۔ مجھے ذرا بھی خوشی نہ ہوئی۔ اس لئے کہ کچھ مدت پہلے میں نے اخبارات اس غرض سے پڑھنا بند کردیئے تھے کہ موجودہ حکومت کی زبان بولا کرتے ہیں۔ یہی حال کم وبیش ٹیلی ویژن اور سوشل میڈیا کا بھی تھا۔ ان تمام کا رویہ یکسر سیدھا سادا تھا، موجودہ حکومت پہلے آتی ہے، عوام بعد میں۔ پب میں چند روزانہ کے آنے والے گاہک بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم نے مسکراتے چہروں سے ایک دوسرے کا خیر مقدم کیا۔ میرے دائیں ہاتھ پر چند گز کے فاصلے پر تنہا بیٹھی ہوئی لڑکی کسی کتاب کے مطالعے میں غرق تھی۔ کھلے ہوئے بھورے بال، کمر اور گردن کے درمیان لٹک رہے تھے۔ پیشانی پر اس نے لال رنگ کی پٹی کس کر باندھ رکھی تھی۔ وضع قطع کے اعتبار سے وہ ریڈ انڈین لگ رہی تھی ۔ میں نے ویٹر کو بلایا۔ وہ اسکاٹ لینڈ کی رہنے والی تھی، اس کا کام میزیں صاف کرنا اور وہاں سے گلاس وغیرہ اٹھانا تھا۔ ہم ایک دوسرے کے پس منظر سے واقف تھے۔

''یہ ردّی نہیں ہے سر.......... آج کے اخبار ہیں۔''

''جانتا ہوں۔ پر میری نظر میں تمام اخبار ردّی کے برابر ہیں۔'' میرے لہجے میں اتنی تیزی تھی کہ قریب بیٹھی ہوئی لڑکی نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔ لیکن ہماری نظریں ملتے ہی اس نے نظریں یوں چرالیں، گویا نظریں ٹکراتے ہی کوئی خطرناک بات ہوجائے گی۔ مسکراتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ خطرناک بات کا اندیشہ تو اکثر مباشرت کے بعد ہی پیدا ہوا کرتا ہے۔

ویٹر نے لڑکی کی میز سے چائے کا خالی پیالہ اٹھایا اور کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی۔ لڑکی کتاب پڑھنے میں مگن رہی۔ مگر اس کا دایاں ہاتھ سگریٹ کی ڈبیا سے متواتر کھیلتا رہا۔ اسے پڑھتا ہوا دیکھ کر گمان گزرتا تھا کہ وہ پڑھ نہیں رہی، بلکہ ایک ایک لفظ کو خردبینی نگاہ سے دیکھ کر اسے اپنے اندر دل میں اتار رہی ہے۔ وہ بیئر کا مگ اٹھا کر گھونٹ بھرلیا کرتی ۔ اسے جب سگریٹ پینے کی طلب ہوتی تو وہ اپنا سامان وہیں چھوڑ کر پب سے باہر چلی جاتی۔ سگریٹ سلگا کر لمبے لمبے کش لیتی۔

(دراصل ٹوری حکومت نے عوام کے پرزور دباؤ میں آ کر پب میں تمبا کونوشی پر پابندی عائد کررکھی تھی۔ سگریٹ نوش سخت ناراض تھے اور اس ریزرویشن کے سخت خلاف تھے)

وہ لڑکی پب سے اپنا سامان اٹھا کر کب چلی گئی، مجھے احساس تک نہ ہوا کہ میں بھی کافکا کے ناول ''ٹرائل'' میں ڈوبا ہوا تھا۔

خدائی چھٹی کا دن تھا۔ میں بازو پھیلائے ریلنگ کے سہارے رچمنڈ کے مین جنکشن پر کھڑا، سڑکوں پر رواں دواں ٹریفک کو دیکھ رہا تھا۔ پانچ کشادہ سڑکیں، مختلف سمتوں سے ہوتی ہوئی ایک مرکز پر اکھٹی ہورہی تھیں ۔ مجھے خیال آیا کہ یہ زندگی کی مختلف راہیں ہیں۔ جو الگ الگ پہلوؤں سے ہوتی ہوئیں ایک مرکز پر اکھٹی ہوتی ہیں اور وہ مرکز ہے موت، جس سے بچنا ناممکن ہے۔ لیکن جلد ہی مجھے اپنا خیال اس وجہ سے مہمل لگا کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یہ سڑکیں محض سڑکیں ہیں۔ چھ روز تک لاکھوں آدمیوں کا بوجھ سہتے سہتے تھک جاتی ہیں اور لوگ سڑکوں کو ایک مکمل دن آرام کی خاطر بخش دیتے ہیں کہ وہ تازہ دم ہوکر پھر سے بوجھ اٹھانے کے قابل ہوجائیں ....

دور نیلگوں آکاش تلے مجھے ایک پرندہ دکھائی دیا، جو ہر پابندی سے آزاد بے فکری سے اڑا جارہا تھا۔ وہ پرندہ یقیناً ابابیل تھی۔ مجھے خود پر حیرت بھی ہوئی کہ میں آج تک کسی پرندے کا نام بھول نہیں پایا تھا۔ جبکہ میں اپنا نام بدحواسی کے عالم میں بھول گیا تھا۔ اگلے پل یہ خیال میرے ذہن سے گزرا کہ اگر اس پرندے کا کوئی نام نہ بھی ہوتا تو کیا دنیا میں زلزلہ آجاتا؟ دھرتی کا کلیجہ پھٹ جاتا؟ کیا یہ لازمی ہے کہ ہر جاندار شے کا کوئی نام ہو؟ تاکہ اسے اس کے جاری کردہ نام سے پہچانا جائے، پکارا جائے۔ محبت کی جائے، نفرت کی جائے۔ دیکھا جائے تو پرندہ پرندہ ہوتا ہے، جانور جانور اور آدمی آدمی۔ میں دیر تک وہیں بے حس وحرکت کھڑا سوچتا رہا کہ اس کرہ ارض پر وہ کون سی پہلی شے تھی، جسے آدمی نے اپنی سمجھ کے مطابق نام عطا کیا تھا؟ مگر کیوں کیا تھا؟ اور اس کی وجہ تسمیہ کیا تھی؟ کوئی منطق تو ضرور رہی ہوگی؟

سامنے سے وہی لڑکی چلی آرہی تھی۔ اس کے کندھے پر وہی جھولا تھا۔ مگر پیشانی پر سرخ رنگ کی پٹی کے بجائے سبز رنگ کی پٹی بندھی ہوئی تھی ۔ وہ نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھتی ہوئی میرے قریب آن کھڑی ہوئی۔

''ان راہوں میں سے کون سی راہ چنی ہے تم نے؟''

''ان راہوں سے میرا کوئی سمبندھ نہیں.......... میری راہ تو بالکل الگ ہے۔''

’’میں جانتی تھی۔تمہارا یہی جواب ہوگا۔‘‘

’’تمہاری نظر کافی تیز جان پڑتی ہے؟‘‘

’’جب کسی کی نظر میں اپنی نظر دکھنے لگے،تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔‘‘

’’میں سمجھا نہیں؟‘‘

’’کیا تمہیں میری صورت میں اپنا عکس دکھائی نہیں دیتا؟‘‘

ذہن پر زور ڈال کر میں نے کہا:’’ کچھ کچھ۔‘‘

اس کا سنجیدہ چہرہ پل بھر میں بدل کر احساس دلانے گا کہ اسے مدت سے میرا انتظار تھا۔

ہم دونوں گرجا گھر کے آگے سے گزر رہے تھے۔ گرجا گھر معصوم بھیڑوں سے بھرا ہوا تھا۔ باہر بھی سکون کی متلاشی دوزانوں جھکی ہوئی تھیں۔

سفید ریش پادری انجیل مقدس کی کوئی آیت پڑھ کر معصوم بھیڑوں کو صحیح راستے پر چلنے کی تلقین کرر ہا تھا۔ وہ چلتے چلتے اچانک رک گئی اور ماحول پر اچٹتی سی نگاہ ڈال کر پوچھ بیٹھی۔

’’کیا خدا اس مکان کے اندر رہتا ہے؟‘‘

’’کہہ نہیں سکتا۔ میں نے تو اس کے بارے میں سوچنا بند کر دیا ہے۔‘‘

’’کیوں؟ کوئی خاص وجہ ہے؟‘‘

’’ہاں ...تم کہہ سکتی ہو کہ ہاں۔‘‘

’’کیا وجہ بیان کر سکتے ہو؟‘‘

دیکھو نا .... فلسطین میں کئی دہائیوں سے کیا ہورہا ہے؟ پھر افغانستان کو کیوں بھولتے ہو؟............شام اور لیبیا بھی اسی تباہی سے دو چار ہیں ...... لاکھوں بندے بے وجہ موت کی نذر ہو چکے ہیں ، ہزاروں لاکھوں گھروں سے بے گھر ہوکر یورپ میں پناہ ڈھونڈ رہے ہیں .... عظیم طاقتیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی خاطر بہت کچھ کیا کرتی ہیں۔‘‘

وہ چلتے چلتے اچانک رک گئی۔ اس نے بیگ میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر مجھے سگریٹ پیش کی۔ مگر میں نے’’ ناں‘‘ میں گردن ہلادی ۔ وہ سگریٹ سلگا کر مجھے گہری نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر گویا ہوئی۔

’’کہیں ایسا تو نہیں کہ خدا کے معاملے میں تم بھی تشکیک کی سطح پر زندہ ہو۔‘‘

’’تم کہہ سکتی ہو کہ ہاں۔‘‘

’’تم نے ٹھیک کہا............اگر خدا ہوتا تو وہ خود ہی جواب دیتا کہ اس کا خالق کون سا ہے۔‘‘

اندر سے پادری کی آواز آرہی تھی۔

’’یسوع نے پکار کر کہا جو مجھ پر ایمان لاتا ہے، وہ مجھ پر نہیں بلکہ میرے بھیجنے والے پر ایمان لاتا ہے............ میں نور ہو کر اس دنیا میں آیا تا کہ جو مجھ پر ایمان لائے ، اندھیرے میں نہ رہے، بدن کا چراغ آنکھ ہے، بس اگر تیری آنکھ درست ہے تو تیرا سارا بدن روشن ہوگا اور اگر تیری آنکھ

خراب ہے تو تیرا سارا بدن تاریک ہوگا۔‘‘

وہ دیوانہ وار ہنسنے لگی تھی ۔احاطے میں کھڑی بھیڑیں اسے خوں خوار نظروں سے دیکھنے لگیں۔ لیکن وہ بدستور ہنسے جا رہی تھی ۔ہنسی کا ایک طوفان تھا جو تھمنے میں ہی نہ آرہا تھا۔ بھیڑوں نے ایک دوسرے کی آنکھ میں جھانک کر فیصلہ کیا کہ اس کی بوٹی بوٹی کر دی جائے۔ اس پر میں بھی ہنسنے لگا تھا۔ ہم دونوں قہقہوں میں شریک رفتہ رفتہ آگے بڑھنے لگے۔

کمرے کا تالا کھول کر وہ پل بھر کو رک گئی ۔ نیم وا آنکھوں سے مجھے دیکھا ،مسکرائی اور بولی

’’آؤ اندر آؤ۔‘‘

چھوٹا سا کمرہ تھا۔ دیوار پر چند تصاویر الٹی آویزاں تھیں ۔قریب ہی بستر فرش پر بچھا ہوا تھا۔ کھڑکی سے لگی کھانے کی میز دھری تھی۔ جس پر کرسیاں اوندھی رکھی تھیں۔ کھڑکی سے دریا دکھائی دے رہا تھا۔ آبی پرندوں کی ڈار وہاں سے گزر رہی تھی۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے ہوا میں بازو ہلا کر اڑنے کی کوشش کی ۔ وہ مسکرا اٹھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر فرش پر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور ٹِک ٹِکی باندھے کھانے کی میز اور کرسیوں کو دیکھتا رہا۔ وہ سگریٹ سلگا کر بولی’’ آدمی فرش پر بیٹھ کر بھی کھانا کھا سکتا ہے۔‘‘

تم ٹھیک کہتی ہو۔ یہ سب دل بہلاوے کا سامان ہے۔‘‘

’’لیکن دل ان چیزوں سے کہاں بہلتا ہے ۔ وہ کم بخت تو ہر حد کو پھلانگنا چاہتا ہے؟‘‘

’’اور پھلانگ کر کتنی شانتی ملتی ہے اسے۔‘‘

اس نے مسکرا کر اثبات میں گردن ہلادی۔ میں بھی مسکرا کر اٹھا ، پھر کچھ سوچ کر گویا ہوا:’’ تم نے یہ تصویریں اُلٹی کیوں لٹکا رکھی ہیں؟‘‘

اس کے چہرے پر کئی سوالات ابھر آئے تھے۔ نیم وا آنکھیں سوچ میں ڈوب گئی تھیں۔ ایک طویل کش کھینچ کر وہ بولی۔

’’ماضی ہمارے پیچھے ہے اور مستقبل آگے۔ ماضی میں جھانکنے کیلئے ہمیں پیچھے کی طرف دیکھنا پڑتا ہے ۔ جب کہ ہماری آنکھیں آگے ہیں، پیچھے نہیں۔‘‘

میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اپنے ماضی کی تمام کشتیاں جلا چکی ہے۔ لیکن صنف نازک تو ہمیشہ ماضی میں رہا کرتی ہے۔ خواہ اس کا ماضی کتنا بھی خراب کیوں نہ گزرا ہو، مگر وہ اسے جان کی حد تک عزیز رہتا ہے۔

جبکہ مرد تو حال میں رہ کر بھی مستقبل پر آنکھ رکھتا ہے اور دن رات سنہرے مستقبل کے خواب دیکھا کرتا ہے۔

’’اب مجھے تمہاری صورت میں اپنا عکس کافی حد تک نظر آنے لگا ہے۔‘‘

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی ۔ بدن کا خون اس کے چہرے پر جمع ہونے لگا تھا۔ ہنسی کے ساتھ ساتھ چہرے کا سرخ پن بھی بڑھنے لگا تھا اور وہ فضا میں قہقہے بکھیرتی ادھر ادھر ٹہلنے لگی، انجام کار ہنسی

سے لوٹ پوٹ ہوکر بستر پر دراز ہوگئی۔ میں محسوس کررہا تھا کہ وہ اس جوگن کی طرح ہے، جسے تلاش بسیار کے بعد اچانک زندگی کا سراغ مل گیا ہواور وہ اپنی کامیابی پر مارے خوشی کے پاگل ہوئی جارہی ہو۔ یکبارگی اس نے ہنسی پر قابو پاکر مجھے جس انداز سے دیکھا، اس میں تڑپ کے ساتھ چاہت بھی شامل تھی۔ میں لپک کراس کے قریب پہنچا۔ ہمارے درمیان حیا کا مہین سا پردہ حائل تھا۔ جسے میں نے ایک ہی جھٹکے سے الگ کردیا اور اس کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں میں مقید کرکے اسے بستر سے اٹھالیا۔لیکن نیم وادروازہ دیکھ کر میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی میں دروازہ بند کرنا چاہتا تھا کہ اس نے میری کلائی مضبوطی سے پکڑ لی اور مجھے اپنی طرف کھینچ کر بولی:'' ضروری نہیں کہ دروازہ بند کیا جائے۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ اپنی خودساختہ تخلیق کردہ قدروں کے سہارے زندہ رہنا چاہتی ہے۔

اس کے گہرے گندمی مائل بدن سے مہک پھوٹ رہی تھی اور میں اس سے سرشار ہوکر تراشے ہوئے بدن کو دیکھ رہا تھا۔ پہلو میں لیٹی ہوئی طلائی مورتی کی خواہش تھی کہ میں فی الفور اپنے ہاتھوں، ہونٹوں اور مردانگی سے اس میں روح پھونک دوں،اس کا بدن اس قدر ملائم تھا کہ جہاں کہیں بھی میرا ہاتھ پڑ جاتا، انگلیاں پھسل جایا کرتیں مگر وہی انگلیاں جب کہیں کھپ جاتیں وہ حصہ مجھے ربڑ ہونے کا احساس دلایا کرتا۔ جی چاہ رہا تھا کہ میں ربڑ کو پھاڑ ڈالوں اور اپنے وجود کو اس میں سموکر موت پر فتح پالوں۔ ہم پوری قوت سے ایک دوسرے میں مدغم ہونے میں کوشاں تھے۔ لگا کہ ہم ایک دوسرے میں تحلیل ہوگئے ہیں مگر جلد ہی جدا ہونے کی گھڑی آ گئی۔ پر وہ مجھ کو خود سے جدا کرنے کو تیار نہ تھی۔ رہی سہی قوت کو یکجا کرکے اس نے مجھے اپنی بانہوں میں جکڑے رکھا اور زبان سے کان کی لوئیں چاٹ کر نمک کی لذت حاصل کرتی رہی۔ انجام کار گویا ہوئی۔

''کتنا اچھا لگ رہا ہے۔ ہم ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں، پھر بھی بے حد خوش ہیں۔''

''اس خوشی کے واسطے تو میں مارا مارا پھرا ہوں۔''

وہ گیلی انگلیاں میرے بالوں میں پھیر کر مجھ میں اترنے لگی جبکہ اس کی اپنی آنکھیں کہہ رہی تھیں،'' کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اسی طرح ملتے رہیں اور وقت ایک دوسرے کے سہارے گزار دیں؟''

میں نے اپنے فیصلے کا جواب ایک طویل بوسے سے دیا۔

ایک روز علی الصبح وہ کھڑکی سے دریا کی وسعت کا جائزہ لے رہی تھی۔ تین چار بادبانی کشتیاں جانے کس منزل کی طرف رواں دواں تھیں۔ ساحل کے قریب ایک عمارت کے احاطے میں رنگ برنگے پھول رکھے تھے، جو اپنی شگفتگی، تازگی اور مہک بکھیر رہے تھے۔ وہ سوچنے لگی کاش یہ پھول اس کے اندر جھانک کر دیکھ سکتے کہ اس کے اندرون میں ان سے زیادہ شگفتگی، تازگی اور مہک پھیلی ہوئی ہے، جس سے اس کا رواں رواں پھولا نہیں سمارہا۔ سڑک پر ننھے منّے فرشتے صاف شفاف لباس پہنے اسکول جارہے تھے۔ ہر کسی کے چہرے پر معصومیت تھی، پاکیزگی تھی، وہ انہیں دیکھ کر

از حد خوش ہوئی۔ لیکن یہ سوچ کر جلد اداس ہوگئی کہ یہی فرشتے جب سمجھ بوجھ کی حدود میں داخل ہوں گے تو ان کی پاکیزگی، معصومیت اور اچھائیاں ہمیشہ کیلئے دم توڑ دیں گی۔ یہ نت نئے چہرے بدل کر جھوٹ بولیں گے، خود کو دھوکہ دیں گے اور دوسروں کو ڈس کر انہیں اذیت پہنچائیں گے۔ ان تمام باتوں کا ذکر جب اس نے مجھ سے کیا تو میں نے لب سڑک اسے بازؤں میں اٹھالیا اور ہوا میں گھما کر کہا۔

'' مجھے خوشی ہے کہ تم نے آج تک فرشتے کو مرنے نہیں دیا۔ ورنہ لوگ باگ ہوش سنبھالتے ہی اسے بے دردی سے قتل کر ڈالتے ہیں۔''

'' جب کہ اس کا کوئی دوش نہیں ہوتا؟''

'' ہاں.......... یقین جانو تم سے مل کر کتنی خوشی ہوتی ہے۔ پتہ ہی نہیں چلتا، وقت کب کٹ جاتا ہے.......... جی چاہتا ہے کہ ساری عمر ہم اکھٹے گزار دیں اور ہمیں کبھی موت نہ آئے۔''

'' یہ کیسے ہوسکتا ہے.......... آج تک موت پر کسی نے فتح پائی ہے؟.......... پھر جانے کب تمہارا دل مجھ سے بھر جائے یا میرا تم سے اور ہم اپنی اپنی راہ اختیار کرلیں؟''

'' تم بہت ہی ذہین ہو اور بہت ہی PRACTICAL۔''

اس نے میرے جوتوں پر اپنے جوتے رکھ کر اپنا قد بڑھایا اور مجھے لب سڑک چوم کر کہا:

'' جب زندگی کی معنویت اور انسانی فطرت سمجھ میں آجائے تو اسی طرح محسوس ہوتا ہے۔''

'' میں تم پر فخر کرتا ہوں۔ تم نے آج تک یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ میں کون ہوں؟ کیا ہوں اور خود کو زندہ رکھنے کی خاطر کیا کرتا ہوں؟''

'' یہ سب فضول کی باتیں ہیں.......... میرا سمبندھ تم سے ہے۔ تمہارے وجود سے ہے۔ تمہارے ماضی، حال اور مستقبل سے نہیں۔''

'' تم ٹھیک کہتی ہو.......... یوں بھی انسان کا ماضی کتنا گھناؤنا کیوں نہ گزرا ہو، وہ اسے عالی شان ہی بتاتا ہے۔ حال کتنا ہی خستہ کیوں نہ گزرا ہو، وہ اپنی عزت کی خاطر اسے خوبصورت ہی پیش کرتا ہے اور مستقبل؟'' یہ کہہ کہ میں زور سے ہنس دیا۔ گویا مستقبل کا دوسرا نام مذاق ٹھہرا ہے۔

ساحل پر ہم چہل قدمی کررہے تھے۔ قدم سے قدم ملا کر گیلی ریت پر اپنے پیروں کے نشان دیکھ کر مسرت پا رہے تھے۔ بار بار ہماری نگاہیں پیچھے چھوڑے ہوئے نشانات کا نظارہ کررہی تھیں، مگر جلد ہی شور مچاتی ہوئی ایک لہر اٹھی اور اس کے سفید جھاگ نشانات کو مٹا کر دور تک پھیل گئی۔ ہم اداس نظروں سے سفید جھاگ کو دیکھنے لگے، جو پلٹ کر پانی سے ملنا چاہ رہی تھی۔ لیکن وہ دھیرے دھیرے ریت میں جذب ہوکر رہ گئی۔ اس نے اپنا ہونٹ دانتوں سے کاٹ لیا۔ پھر کچھ سوچ کر سنجیدگی سے گوش گزار ہوئی:'' سب مٹ جاتا ہے، کچھ باقی نہیں رہتا۔''

'' صرف مرنے کے بعد انسان کا نام رہ جاتا ہے۔''

'' وہ بھی ہمیں تب یاد آتا ہے جب اس کا ذکر ہوتا ہے۔ ورنہ اس کا خیال آئے کئی سال بیت

جاتے ہیں۔''

''کیا کیا جائے۔ یہ انسان کی مجبوری ہے۔''

''کتنا اچھا ہوتا اگر انسان کا نام ہی نہ ہوتا۔ اس کے مرتے ہی اس کی ہر شے خود بخود ختم ہوجاتی۔'' میں چلتے چلتے یک لخت رک گیا اسے نہایت گہری نظروں سے دیکھا پھر اپنے من کا اظہار کیا۔

''کبھی میں بھی تمہاری طرح سوچا کرتا تھا، لیکن اب محسوس کرتا ہوں کہ میں غلطی پر تھا............اگر جان دار شے کا کوئی نام ہی نہ ہوتا تو اس کی شناخت کیسے ہوتی؟ ہر شے کا کوئی نہ کوئی نام تو ہونا ہی چاہئے۔ ورنہ ہم اسے پہچانیں گے کیسے؟''

وہ دور سمندر کے اس پار دیکھنے لگی۔ ڈوبتا سورج دنیا پر الوداعی نظر ڈال رہا تھا۔ لہروں کا شور بڑھ رہا تھا اور سفید جھاگ اس کی پنڈلیوں کو چھو رہا تھا۔ مگر وہ ہر شے سے بے نیاز دور خلاؤں میں نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھی ۔ میں نے بڑھ کر اس کے شانے کو چھوا لیکن اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر قدرے سہم سا گیا۔ چہرے کی ویرانی اپنی زبان خود ہی بول رہی تھی کہ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے زندگی کی بازی ہار دی ہے اور اب وہ بے یارومددگار ہاری ہوئی بازی کو جیتنے کیلئے کون سا داؤ آزمائے ۔ میں نے اسے بازوؤں میں لینا چاہا۔ مگر وہ مچھلی کی طرح تڑپ کر میرے بازوؤں سے آزاد ہوگئی، دیر تک وہ گہری سوچ میں ڈوبی ساحل پر تنہا چکر کاٹتی رہی۔ حتیٰ کہ اندھیرا ہوگیا مگر وہ ایک اجنبی کی طرح ادھر ادھر بھٹکتی رہی۔

وہ ریستوران کے ایک گوشے میں اکیلی بیٹھی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی ۔ لیکن میرے وارد ہونے پر کتاب بند کرکے مسکرا اٹھی اور مسکراہٹ ہی سے میرا خیر مقدم کیا۔ لیکن جلد ہی مسکراہٹ دم توڑتے ، اس کا چہرہ بجھ کر رہ گیا۔ میں اس تبدیلی کو نظر انداز کئے کرسی پر بیٹھ گیا اور مجلد کتاب کو اٹھا کر مصنف کا نام اور کتاب کا عنوان جاننا چاہا۔ مگر شروع کے دو تین صفحے غائب تھے۔ میری سمجھ میں یکسر نہیں آرہا تھا کہ وہ آخر ایسا کیوں کررہی ہے۔ پچھلے چند دنوں سے اس کے ہاں کئی تبدیلیاں پیدا ہوئی تھیں ۔ وہ کم وبیش ہر موقع پر کسی بھی شے کو خاطر میں لانے کو تیار نہ تھی۔ حتیٰ کے بہت سے لوگوں کے وجود کو بھی قبول کرنے سے انکار کیا کرتی۔

''تم زندگی سے مایوس کیوں ہوتی جارہی ہو؟''

''تم غلط سوچ رہے ہو............ میں تو زندگی سے بہت خوش ہوں۔ جس قسم کی زندگی گزارنا چاہتی ہوں، گزار رہی ہوں۔''

خاموش رہ کر میں نے اس کی آنکھوں کے آر پار دیکھا، مگر اس کی آنکھوں میں سچائی تھی اس کا اندھا وشواس تھا کہ چہرہ جھوٹ بول سکتا ہے ، زبان جھوٹ بول سکتی ہے مگر آنکھیں کوشش کے باوجود جھوٹ نہیں بول سکتیں اس لئے کہ آنکھوں کا آتما کے ساتھ براہ راست سمبندھ ہوتا ہے، میں

کھڑکی سے سمندر کو دور تک دیکھنے لگا۔ باغی لہریں دیوار سے ٹکرا رہی تھیں اور جھاگ اڑ رہا تھا، میں نے کچھ کہنا چاہا، مگر ہونٹ کپکپا کر رہ گئے ، لگا کہ میرے حلق میں کانٹا پھنس کر رہ گیا ہے، جس کا کرب مجھ سے برداشت نہیں ہو پا رہا ہے۔ کافی پس وپیش کے بعد میں گویا ہوا۔ ''ہم مکمل طور پر ایک دوسرے کو جان چکے ہیں، ہمارے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہیں رہا، مگر پھر بھی کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کیلئے اجنبی ہیں؟''

''جب ہم پوری طرح سے ایک دوسرے کو جان چکے ہیں تو پھر تمہیں اجنبیت کا احساس کیوں ہوتا ہے؟''

''اس لئے کہ تمہارے بارے میں سوچتے ہوئے ایک ہی خیال مجھے بار بار آتا ہے کہ میں کس کے بارے میں سوچ رہا ہوں میں ......میں تمہارے نام سے واقف نہیں ہوں؟''

اس نے لاتعلقی سے مجھ کو دیکھا مگر جلد ہی اس کے چہرے پر کئی معنی ابھر آئے تھے اور لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ جو برملا میرا مذاق اڑا رہی تھی ۔ اس نے اٹھ کر اپنی اشیا کو سنبھالا ، میز پر چند سکے پھینکے اور بولی۔

''مجھے پورا یقین ہے، ہماری ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔''

یہ کہہ کر وہ تیزی سے اٹھی اور اسی رفتار سے ریستوران سے نکل کر بھیڑ کا حصہ بن گئی۔ میں وہیں بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔ میری سمجھ میں ذرا بھی نہ آیا کہ یکبارگی میری زندگی میں اتنا بڑا انقلاب کیونکر رونما ہوا ہے، لگا کہ وقت کے ساتھ زمین کی گردش بھی رک گئی ہے۔ آسمان نے بھی اپنا رنگ بدل لیا ہے اور میں لڑکی کے عجیب رویے اور اس کے چلے جانے سے پھر سے اجنبی بن گیا ہوں۔ میں ریستوران سے نکلا تو اپنے ساتھ نہ تھا۔

❁ ❁ ❁

کِکّر تے انگور چڑھایا

محمود احمد قاضی

ہم لوگ اس چھوٹے سے شہر میں کرائے کے ایک گھر میں رہتے تھے، جس کے پچھواڑے میں ایک فٹ بال گراؤنڈ تھا۔ پچھلی کھڑکی جب کھولی جاتی تھی تو کھلاڑیوں کا شور ہمارے گھر میں کودتا ہوا آجاتا تھا۔ میری ماں میری اس کھڑکی کھولنے کی عادت کو پسند نہیں کرتی تھی۔ لیکن مجھے شور پسند تھا اور جوش بھی، جس کے بل بوتے پر کھلاڑی مخالف گول پوسٹ پر یلغار کرتے تھے۔ میں یہ جان گیا تھا کہ کھلاڑیوں میں سے ایک جو رائٹ آؤٹ تھا، کھیلتے ہوئے جب ہماری کھڑکی کے قریب سے گزرتا تھا تو اس کی نگاہیں صحن میں کام کرتی میری ماں کی طرف بھی اٹھ جاتی تھیں۔ ماں کبھی ادھر دیکھتی اور کبھی نہیں دیکھتی تھی۔ وہ جب ادھر دیکھتی تھی تب بھی وہ الجھی ہوئی لگتی تھی۔ اس کا ذہن صاف نہیں لگتا تھا بلکہ کہیں اور بھٹکا ہوا لگتا تھا، خدا نے جب میری ماں کو غربت دی تو ساتھ ہی اسے خوبصورتی بھی دے دی اور یہی اس کے ساتھ اچھا نہیں ہوا تھا، میری ماں نے اپنی غربت کے ساتھ اس خوبصورتی کو بھی بھگتا تھا، میں حالانکہ اس وقت صرف سات سال کا تھا لیکن میں یہ بات بخوبی جان چکا تھا کہ وہ فٹبالر میری ماں کی طرف مائل ہو چکا تھا، ماں بے خبر تھی یا اس صورتحال سے جان بوجھ کر بے خبر رہنا چاہتی تھی مجھے اس بات کا بہر حال پوری طرح سے اندازہ نہیں تھا لیکن ایک شب کو جب میرا والد ایک کمپنی کی پراڈکٹ بیچ کر چند دنوں کے بعد دوسرے شہر سے گھر آیا تو میں نے سنا، ماں آہستگی سے والد سے کہہ رہی تھی کہ اسے اس مکان سے وحشت ہونے لگی ہے اس لئے اگر اس کی اجازت ہو تو وہ کہیں اور شفٹ ہو جائیں۔ میرا والد کچھ دیر تک سگریٹ کو ہونٹوں میں دبائے اسے آہستگی سے دانتوں تلے کچلنے کا انداز اپنائے رہا پھر بولا، ہوں تو ایسا ہے تم اکیلی یہ کام کیسے کرو گی۔ انتظار کرو میں ایک آدھ روز کی چھٹی کروں گا، تو تمہارے لئے نئے گھر کا بندوبست کر دوں گا، ماں کا اصرار بڑھا تو وہ مان گیا۔ لیکن میں دیکھ رہا تھا وہ اپنی گھنی مونچھوں کے پیچھے جو کہ سگریٹ پینے کی وجہ سے پیلی ہو رہی تھیں اپنی کسی سوچ کی پیلاہٹ میں گم تھا ہم ایک اور جگہ اٹھ

آئے۔ یہ ایک تنگ جگہ تھی نیچے ایک فیملی رہائش پذیر تھی۔ یہ دو میاں بیوی تھے جو اپنے بچوں کی شادیاں کر کے اب بے فکری کی زندگی گزار رہے تھے۔ گھر میں یہ شخص ہر وقت دھوتی بنیان پہنے رہتا تھا، وہ پاؤں سے بھی ننگا ہی رہتا تھا، وہ ایک نیم گنجا شخص تھا، اور اس کی آنکھیں ہر وقت گندی رہتی تھیں۔ بیوی اس کی البتہ بہت تیز طرار قسم کی لیکن صاف ستھری رہنے والی عورت تھی۔ ہم دونوں ماں بیٹا وہاں رہنے لگے ماں چونکہ ایک اسکول میں آیا کے طور پر کام کرتی تھی اس لئے مجھے بھی اسی اسکول میں داخل کروا دیا گیا تھا مجھے یہ اسکول پسند نہیں تھا لیکن ماں کی اور میری مشترکہ مجبوری تھی کہ ہم ساتھ رہیں، وہ مجھے اپنی نگاہوں سے دور نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ایک ڈری ہوئی سہمی ہوئی عورت تھی۔ اس مکان میں ہماری رہائش کو ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ وہ گندا واقعہ پیش آ گیا، اس شخص نے میری ماں کو سیڑھیوں میں پکڑ لیا تھا اور زبردستی اس کا بوسہ لینے کی کوشش کی تھی۔ ماں نے اسے دھکا دے کر نیچے گرایا تو وہ چوٹ لگنے کی وجہ سے ڈکرایا۔ اتنے میں اس کی بیوی ادھر آ گئی اس بندے نے اپنی جان چھڑانے کیلئے جھوٹ بول دیا، سارا الزام میری ماں پر آ گیا، وہ عورت سیخ پا ہو گئی اس نے فوری فیصلہ کر کے ہمیں یہ جگہ چھوڑنے کو کہا۔ یہ رات تھی اور خاصی سرد تھی ہم نے اپنا سامان ادھر ہی بند کیا اور کہا کہ سامان ہم صبح آ کر لے جائیں گے۔ ہم ماں بیٹا چل پڑے۔ اب ایک اور مصیبت آ گئی کہ بوندا باندی بھی ہونے لگی ہم دونوں چند دکانوں کے آگے بنے برآمدے میں آ کر رک گئے۔ بجلی بار بار کوندرہی تھی اور رات کے اندھیرے کا سینہ اپنی روشنی کے خنجر سے چاک کئے جا رہی تھی۔ میرے قدموں کے قریب وہاں پہلے سے لیٹے ہوئے کتے نے اپنی آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا اس کے انداز میں اکتاہٹ اور بیگانگی تھی۔ اتنے میں وہاں دو کتے اور آ گئے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ کتے جیسے ہی تھے بلکہ شاید وہ سویا ہوا کتا ان سے بہتر تھا ان میں سے ایک نے میری ماں کے گرد چکر لگایا۔ دوسرے نے میری ماں کے گال پر چٹکی لی، وہ گرجی
''حرام تخم!''

وہ دونوں حرامی ہنسی ہنسے۔ ماں نے میرے بازو کو جکڑا اور ایک طرف چل پڑی............ وہ دونوں ساتھ ہی چلے۔ اتنے میں وہ سویا ہوا کتا ان پر آ گرا، وہ اس اچانک حملے کو سہہ نہ سکے اور بھاگ نکلے۔ یہ رات ہم نے ایک ٹھنڈے ہوتے تندور پر بیٹھ کر گزاری دوسرے دن کے معاملات خاصے گمبھیر تھے۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح سے ماں نے بندوبست کر ہی لیا۔ ہمیں ایک اور مکان مل گیا اگلی رات کو میرا والد اس مکان میں آیا تھا۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا، ماں نے اسے ساری روداد سنا دی تھی۔ وہ سن کر روہانسا ہو رہا تھا۔ ماں کو تسلی دے رہا تھا مجھے اپنے ساتھ لپٹا کر تقریباً رو ہی دینے والا تھا، پر جب ماں رو پڑی تو ہم تینوں ایک ساتھ رونے لگے، لیکن اگلی صبح کو رونے کے لئے ہم ماں بیٹا ہی رہ گئے تھے کہ والد تو اٹھا ہی نہیں۔ وہ سوتے ہوئے ہی چل بسا تھا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر ایک طرح کا سکون تھا، شاید وہ اپنے حصے کی سزا کاٹ لینے پر مطمئن تھا۔ اب ہمیں صرف ہماری غربت کا سہارا تھا۔ میری ماں پہلے تو صرف غریب تھی

خوبصورت تھی مگر اب اکیلی بھی رہ گئی تھی۔ اب ہم لاوارث تھے اور لاوارثوں کے مقدر میں جو ٹھوکریں ہوتی ہیں، وہ ہمارے حصے میں بھی آئیں۔

ایک بار ہم بری طرح پھنس گئے۔ غلطی میری تھی میں ماں سے شہر سے باہر لگی سرکس دیکھنے کی ضد کر بیٹھا تھا، واپسی پر خاصی رات ہوگئی۔ جب ہم ایک نیم اندھیری مگر ویران جگہ سے گزرے تو تین مشٹنڈے پتا نہیں کہاں سے آ کر ہمارے راستے میں حائل ہوگئے۔ ماں گھبرا گئی میں بھی پریشان تھا، ہم نے کوشش کی، لیکن ہم نے جب جب کوشش کی ہم توں توں ان کے چنگل میں پھنستے گئے۔ ماں چلائی، روئی، گڑگڑائی، کوئی مدد کو نہ آیا، ماں سہم گئی، تھک گئی۔ میں ایک ستون کی آڑ سے دیکھتا رہا۔ میرے ہاتھ میں ان کو مارنے کیلئے پکڑا ہوا پتھر پسیجتا رہا اور پھر میرے ہاتھ سے گر گیا۔

ماں نے اگلے دن سے آیا کی نوکری چھوڑ دی، مجھے بھی اسکول سے اٹھالیا، وہ ایک نئی جگہ پر اٹھ آئی وہاں وہ مجھے ایک پڑوسن بڑھیا کے سپرد کرتی اور باہر نکل جاتی۔ میری ماں جو پہلے ہی خوبصورت تھی وقت کے ساتھ ساتھ اس کی خوبصورتی بڑھتی رہی اور خود میں بھی بڑا ہوتا گیا۔ میں نے ایک دن ماں کا پیچھا کیا وہ ایک مکان کے اندر چلی گئی میں بھی دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہوگیا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر شخص موجود تھا اس نے اپنا ہاتھ میری ماں کی طرف بڑھایا، میرا چاقو والا ہاتھ بھی آگے بڑھ گیا۔

مجھے یاد ہے میں نے ماں پر ایک ہی وار کیا تھا۔

❁ ❁ ❁

آنکھوں میں اگر خواب نہ ہوتے
دنیا میں کہیں رات نہ ہوتی
(منجمد پیاس۔ احسن سلیم)

دیمک

محمد سعید شیخ

بیماری اس کے جسم پر نہیں، اس کے اندر اس کی رُوح میں تھی جو اس کی قوتوں کو دیمک کی طرح چاٹ رہی تھی۔ وہ گھلتی جارہی تھی، اس کی بھوک مرچکی تھی، رنگ پھیکا پڑ چکا تھا، نیلی آنکھیں پیلی پڑ گئی تھیں، گال پچک گئے تھے، ناک کی نوک ڈھیلی پڑ گئی تھی وہ تیزی سے لڑھک رہی تھی۔

اس کی بیٹی گھر آ گئی اور اسے اسپتال لے آئی تا کہ اس کا مناسب علاج ہو سکے۔ اُسے اپنی ماں کی بہت فکر تھی۔ باپ کے بعد وہ اپنی ماں کی شفقت سے کسی طرح بھی محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کے خون، پیشاب، تھوک، پاخانے کے ٹیسٹ کرائے مگر کوئی تشخیص نہ کرسکے۔ مختلف ادویات استعمال کرائی گئیں کوئی فرق نہ پڑا۔ ایک نامعلوم سی ناتوانی اس کے اعصاب پر پھیلتی جارہی تھی

''ہم ابھی تک کسی بیماری کا سراغ نہیں لگا سکے ہیں، جو آپ کی والدہ کو لاحق ہے' ڈاکٹر ہمایوں نے مریضہ کی بیٹی کو بتایا اب ڈاکٹر اس کا کیا علاج کرتے کہ وہ ہر وقت کسی اندرونی آگ میں سُلگتی رہتی تھی۔ راتوں کو جب اس کا سارا وجود دھڑا دھڑ کھلنے لگتا تو اس کی چیخیں نکل جاتیں۔ ہسپتال کے اس وارڈ کی اس کمرے کی ساری نرسیں بھاگ اٹھتیں۔ اس کا بلڈ پریشر چیک کرتیں اور پھر ڈاکٹر کی ہدایت پر اسے دوائی، انجکشن کے ذریعے غنودگی میں دھکیل دیتیں۔ پھر بھی ڈاکٹر علاج کرتے رہے، دوائیاں بدل بدل کر مریضہ کی بیٹی ماں کی پٹی سے لگی رہی۔

''ماں۔ کیا تمہیں میرے باپ کا دُکھ ہے؟''

ماں نے غنودگی کی حالت میں بیٹی سے سوال سُنا۔ دماغ نے سوچنے کی کوشش کی، دھند نے اسے راستہ دینے سے انکار کردیا وہ بول نہ سکی۔ پھر کوئی اس کے کمرے میں آیا۔ پھول اس کے سرہانے رکھے۔ اس نے اس کی موجودگی سے طاقت پا کر خوابیدگی سے رہائی پانے کی کوشش کرتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور بڑی نحیف آواز میں پُوچھا: ''کون آیا ہے؟''

اس وقت اس کمرے میں مریضہ کی بیٹی کے سوا اور کوئی نہ تھا جو اُسے جانتا۔ اُسے ہی ذرا جھکنا پڑا۔ ''میں ہوں...... اجمال...... ''اجمال!''

مریضہ نے اپنی یادداشت پر زور ڈالتے ہوئے کہا: ''ہاں...... عظمیٰ...... میں اجمال ہوں، میں امریکہ سے آیا ہوں تمہیں دیکھنے۔'' مریضہ کو چُپ لگ گئی جیسے وہ کچھ یاد نہ کر پا رہی ہو۔

پھر ان دونوں کی نگاہیں ملیں' پہچان کا ایک جھماکا سا ہوا۔ مریضہ کے ہونٹ کپکپائے: ''اوہ...... اجمال...... مائی اولڈ فرینڈ!'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا کمزور ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ بہت شکریہ تم اتنی دور سے مجھے دیکھنے آئے ہو پھر اس نے مسکراتے ہوئے اپنی بات بڑھائی ''تم اتنی دور کیوں چلے گئے تھے؟''

''بس عظمیٰ...... میں اپنا کیریئر بنانا چاہتا تھا۔ اس لڑکی کے پاس گرین کارڈ تھا مگر جس کی آنکھیں سبز پانیوں جیسی نہیں تھیں۔'' عظمیٰ نے کہا، و: ''مگر اب میری آنکھوں کے پانی خشک ہوگئے ہیں۔ ان میں اب موت کا خوف ہے۔''

''ماما............ زیادہ باتیں کرنے سے آپ کو ڈاکٹر نے منع کیا ہے، تھک جائیں گی۔''

''یہ میری بیٹی ہے اسماء۔'' اس نے اپنی بیٹی کو اجمال سے متعارف کرایا۔ ''تمہارے بتائے بغیر ہی یہ پہنچانی جاسکتی ہے۔''

اور عظمیٰ یہ کہتے کہتے رک گئی: ''اور اسماء...... یہ اجمال ہے تمہارا باپ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔''

یہ شاید درست ہوتا۔ عظمیٰ اجمال سے دیر تک منسوب رہ چکی تھی' اگر وہ گرین کارڈ والی لڑکی ان کے درمیان نہ آ گئی ہوتی لیکن اسماء کو اس بات کی خبر نہ تھی۔ یہ اس کے لئے اچھا ہی ہوتا اس طرح وہ اپنے باپ کو ایک طرح کی یکسوئی سے یاد کرسکتی تھی۔ اس کا باپ اس کی زندگی میں صرف ایک مرتبہ گھر آیا تھا بہت دھندلی سے کوئی یاد بہت کوشش سے اس کے ذہن کے اُفق پر نمودار ہوتی پھر محو ہوجاتی۔ اس کی ماں کی یادوں پر دھول بیٹھ چکی تھی۔ اس کا دل گواہی دیتا تھا کہ یٰسین اب اس دنیا میں نہیں' وہ اسے کہہ گیا تھا کہ میری موت کا غم نہ کرنا میں شاید دوسری دنیا میں جنت میں تجھے ملوں گا۔ میں شہادت کا راستہ منتخب کرچکا ہوں میں طالبان میں شامل ہوچکا ہوں۔ آج نہیں تو کل شہادت کا مرتبہ پاجاؤں گا۔

میری بیٹی کو نیک عورت بنانا' اسے اپنے ساتھ رکھنا' وہ اب اس کے ساتھ ہی تھی لیکن وہ ڈرتی تھی کہ وہ اگر مرگئی تو اس کی بیٹی اکیلی رہ جائے گی اور یہی خوف اسے موت سے مزاحمت کرنے پر آمادہ کرتا تھا ورنہ اس کے پاس زندہ رہنے کا کوئی جواز نہیں رہ گیا تھا۔

اور اب ایک مدت بعد اچانک اجمال اس کی زندگی میں آیا تھا جس سے باتیں کرتے اس کا جی نہیں بھرتا تھا۔ ایک وقت ان پر وہ بھی گزرا تھا جب وہ ایک دوسرے کیلئے جیتے تھے اور آج پھر وہ جیسے اس کے دم سے جی اٹھی تھی۔ تم تو اپنا مستقبل سنوارنے کیلئے امریکا چلے گئے' مجھ سے پیٹھ موڑ کر

بغیر یہ سوچے سمجھے کہ تمہارے بغیر میں مرجاؤں گی۔ عظمیٰ نے اپنی آنکھوں میں آنسو بھر کے کہا۔

''ہاں...... لیکن وہ مستقبل میرا نہیں تھا اور نہ ہی میں اسے سنوار سکتا۔ تمہاری بدعاؤں نے مجھے کہیں کا نہ رہنے دیا۔ نہ امریکی بن سکا نہ ہی پاکستانی رہا۔''

''نہیں...... میں نے تمہارے لئے کبھی بدعا نہیں کی۔ ہمیشہ تمہاری خیر کی ہی خواہشمند رہی۔'' میں تو جیسا ہوں، یہ تمہارا کیا حال ہوگیا؟''

''میرا مالی مجھے چھوڑ گیا۔ اب تو مجھے اس کی شکل بھی بھولتی جارہی ہے۔ وہ اپنی جنت کی تلاش میں چلا گیا اور مجھے اس جہنم میں جھونک گیا۔''

''ہم اپنا اپنا راستہ خود منتخب کرتے ہیں' اپنی جنت' دوزخ خود بناتے ہیں' ہم اپنے خالق خود ہیں۔ تم چاہو تو اب بھی اپنی زندگی سنبھال سکتی ہو۔ تم اپنی مالک بن سکتی ہو۔ اس بیماری سے نکل سکتی ہو...... اپنے ماضی کو بھول جاؤ۔ حال میں آجاؤ۔ ابھی تمہارے لئے وقت ہے۔''

اجمال کے چلے جانے کے بعد اس کی باتوں پر غور کرتی رہی۔

رات اس نے نیند کی گولی لینے سے بھی انکار کرتے ہوئے سوچا: ''میں اپنی اذیت کو برداشت کرونگی' اسے شکست دوں گی' میں زندہ رہوں گی۔''

اگلے روز وہ اپنے قدموں سے چل کر واش روم گئی اور واپس آ کر بستر پر لیٹنے کی بجائے کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں یہیں بیٹھ کر ناشتہ کروں گی۔''

اس کی بیٹی نے اُسے گنگناتے ہوئے سنا: ''جو گزر گیا وہ گزر گیا۔ وہ مجھے قید نہیں رکھ سکے گا۔'' اپنی ماں کے جینے کے عزم نے بیٹی کو امیدوں سے بھر دیا: ''وہ شخص جو کل آیا تھا میری ماں کو زندہ کر گیا۔''

وہ بہت خوش تھی: ''کمال شخص تھا میری ماں کو زندہ رہنے کی شکتی دے گیا۔'' اس نے حیرت سے سوچا ڈاکٹر اور نرسیں تک حیران تھے کہ اس مریضہ نے کس حیرتناک طور پر اپنے مرض پر قابو پالیا تھا۔ عظمیٰ آج پھر اس مسیحا صفت انسان کے انتظار میں تھی۔

اجمال اس کے دل و ماغ پر اتنا چھا گیا تھا کہ یٰسین کا چہرہ بہت دھندلا گیا تھا۔

جینے کیلئے مجھے ایک زندہ انسان کا ساتھ چاہئے۔

یہ سوچتے ہوئے اسے یاد آ گیا کہ یٰسین جب آخری مرتبہ اسے چھوڑ کر گیا تھا تو وہ کہہ گیا تھا۔ ''یاد رکھنا عظمیٰ میں شہید ہوگیا تو پھر بھی زندہ رہوں گا۔ شہید کبھی نہیں مرتے۔'' اب اجمال اس کی زندگی میں واپس آ گیا تھا۔ اس میں زندگی کی ایک امنگ پیدا ہوگئی تھی' روزانہ اس کی خبر گیری کیلئے اسپتال آتا ہے' گھنٹوں اس سے باتیں کرتا تھا۔

اس وقت کی باتیں جب ان کے درمیان کوئی نہیں تھا۔

جب اس کی آنکھیں خوش خیال مستقبل سے چمکتی تھیں' جب اس کے ہونٹ مسکراہٹوں سے چھلکتے رہتے تھے اور گالوں میں گلاب کے رنگ بہتے رہتے تھے اور وہ خوبصورت اور خوش نما نظر آتی

تھی اجمال اس کا دوست تھا' ایسا دوست جس کے جیسا اور کوئی نہیں تھا۔

وہ خود' ایک مسحور رکن زندگی گزار رہی تھی' ایک خواب تھا جس کی تعبیر ان دونوں کے اختیار میں تھی آنے والے کل کے متعلق انہیں کوئی پریشانی نہیں تھی' لیکن جو کہتے ہیں کل کس نے دیکھا ہے تو انہوں نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کل میں نیلم چھپی تھی' جسے پاکستان سے کسی ایسے لڑکے کی تلاش تھی جو امریکا میں اس کے ساتھ وفاداری نبھا سکے' امریکی لڑکوں پر اُسے اعتبار نہیں تھا۔ امریکا اس کے کیلئے خوابوں کی دنیا تھی' ممکنات اور مواقع سے بھری اس دنیا کے متعلق اس نے بہت کچھ پڑھ رکھا تھا مگر اس دنیا کو دیکھنا اس کی زندگی کا تجربہ کرنا دوسری بات تھی اس وقت ہر پُر اُمید لڑکے کے دل میں امریکا سمایا ہوا تھا۔

اگر یہ لڑکی نیلم میرے لئے امریکا جانے کا سہارا بن رہی ہے تو یہ میرا کرنا نہیں میری تقدیر کا کمال ہے ۔اس خیال نے اسے عظمیٰ کی محبت کو پس پشت ڈالنے پر مائل کرلیا۔

چپکے سے اس نے نیلم سے شادی کے کاغذات بنوائے' ویزا حاصل کیا' سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ اسے خود یہ سمجھ نہ آئی کہ اس کی قسمت کا یہی منشا ہے وہ بغیر عظمیٰ کو بتائے امریکا فلائی کر گیا۔ اس نے کیا سوچ رکھا تھا' کیا ہوگیا۔ زندگی ایسے ہی غیر متوقع واقعات سے بھری پڑی ہے ۔

اس نے یوں سوچا تھا جیسے یہی اس کی زندگی کی صحیح سمت ہے اور اسی طرح وہ خاص آدمی بن سکتا ہے جو اپنی تمام قابلیتوں کو بروئے کار لا سکے۔ اُسے اپنی صلاحیتوں پر بھروسے نے محبت جیسے آفاقی تجربے سے بھی بے نیاز کردیا تھا۔ امریکا میں اسے اپنی آئی ٹی کی ڈگری کو بہتر بنانے کی فوری ضرورت پیش آئی' دنیا بھر سے آئی ٹی کے ماہر قابل لوگ وہاں موجود تھے' خاص طور پر ہندوستانی ماہروں سے امریکا بھرا ہوا تھا۔ دو سال لگ گئے اسے امریکی اسٹینڈرڈ تک پہنچنے کیلئے تب جا کر اسے کام کی جاب ملی اور اسے نیلم کی طرف متوجہ ہونے کا موقع ملا' اس دوران اسے یونیورسٹی میں پارٹ ٹائم جاب کرنا پڑی اس طرح اس نے خرچہ پورا کرنے کا اہتمام کیا۔ نیلم کے والدین نے اسے امریکا کے سمندر میں اکیلا اپنی دنیا بنانے کیلئے چھوڑ دیا صرف اتنا کیا کہ اسے رہنے کیلئے جگہ مل گئی۔ وہ بھی غنیمت تھی نیلم اپنی کمائی اور ماں باپ کی کمائی سے شادی سے قبل ہی اپنا فلیٹ خرید چکی تھی۔

جب وہ اچھی تنخواہ کمانے لگا تو اسے آنکھیں کھول کر ارد گرد کی دنیا کو دیکھنے کا موقع ملا۔ ہر کوئی کام اور کام پر لگا ہوا تھا۔ اعصاب شکن محنت کے بغیر زندہ رہنے سے اور قابل عزت مقام پر ٹھہرنے کی طاقت سے محروم تھا۔ زندگی ڈالروں میں تلتی تھی۔ وہاں سونا، جاگنا، سوچنا، جینا، مرنا سب ڈالروں کی نسبت سے تھا۔

ہر سال اسے نیلم کو حساب دینا پڑتا تھا کہ وہ کتنے ڈالرز اکھٹے کرچکا ہے اور پھر ڈالروں کے اس حساب کے ساتھ اسے یہ اعتراف کرنا پڑتا تھا کہ یہاں وہ جو کچھ ہے نیلم کے طفیل ہے۔ وہ بھی اس کی وفاداری کی معترف تھی اس نے ابھی تک امریکا میں کوئی گرل فرینڈ نہیں بنائی تھی، حالانکہ کئی

خوبصورت لڑکیاں اس کی طرف ملتفت بھی ہوئی تھیں مگر اسے تو اپنا مستقبل بنانے کی فکر نے ہی گھیر رکھا تھا' پھر نیلم اس کی حرکات پر کڑی نگاہ رکھتی تھی۔ دفتری اوقات اور دفتر سے باہر وہ کہاں جاتا ہے کس سے ملتا ہے وہ یوں خبر رکھتی تھی گو وہ قیدی ہو جس کے بھاگ جانے کا اس کے مالک کو ہر دم خطرہ ہو۔ اس کی اپنی فرینڈز کو بھی اس نے اس بات کی اجازت نہیں دے رکھی تھی کہ کوئی اجمال سے ایک حد سے زیادہ بے تکلف ہو سکے۔ یہ حد بندیاں کبھی کبھی اسے بہت کھلتی تھیں۔

''وہ مجھے اپنا زرخرید غلام ہی سمجھتی ہے۔'' سیکس کے معاملات بھی اس کی مرضی سے طے پاتے تھے، یہ محبت نہیں تھی' وہ سمجھ رہا تھا۔ اس ایک طرح کی سرد مہری کے باوجود وہ اس سے دو بیٹے اور ایک بیٹی حاصل کرچکی تھی، جن کی تربیت کی بھی خود ذمہ دار تھی۔ وہ بچوں کو امریکی رنگ میں رنگنا چاہتی تھی۔ وہ محسوس کرتی تھی اجمال کی مشرقیت امریکی رنگ کو قبول نہیں کرتی تھی۔ امریکی لباس وہ پہنتا ضرور تھا مگر وہ اس پر فٹ نہیں بیٹھتا تھا۔

اجمال نے اپنے دونوں بیٹوں کو اسلامک سینٹر بھجوانے کی تجویز پیش کی تو نیلم نے اس کی اس تجویز کو ماننے سے صاف انکار کردیا۔

''ہم کوئی شے یا کوئی خیالات ان پر ٹھونسنا نہیں چاہتے۔ میں ان کی تعلیم میں مداخلت کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ انہیں خود بڑا ہونے دو' اپنا ذہن استعمال کرنے دو۔''

اجمال کو نیلم کی اس دلیل نے بری طرح ناراض کیا۔

''وہ ایک مسلمان کے بچے ہیں' ہم انہیں اسلامی تعلیمات سے آگاہ کرنے کا سامان نہیں کریں گے تو وہ کبھی اسلام کے متعلق نہیں جان سکیں گے، سمجھنے کی کوشش کرو......نیلم!''

''ابھی ان کے ذہن کچے ہیں اجمال۔ انہیں بڑا ہونے دو پھر دیکھیں گے۔''

وہ اپنی بات پر بضد رہی۔

وہ جمعہ کی نماز پڑھنے کیلئے بچوں کو ساتھ لے کر جانے کی کوشش کرتا، بچے تیار نہیں ہوتے۔ وہ زبردستی کرنے کی کوشش کرتا تو وہ بچوں کی حمایت پر اُتر آتی: ''زبردستی مت کرو اجمال...... یہاں امریکا میں زبردستی کا رواج نہیں''۔

''تو اس کا مطلب ہوا کہ کل تم اسکرٹ پہننا شروع کردو تو میں تمہیں روک نہیں سکوں گا۔''

''نہیں! بالکل نہیں!! یہ آزاد دنیا ہے آزادی ہی یہاں کی سب سے بڑی قدر ہے اور یہ ہر ایک کا فطری حق ہے۔''

پتا نہیں کیا بات تھی، نیلم نے اس دن اجمال کی ہر بات سے انکار کردیا: ''یہ میرا محتاج ہے میں نے اسے بنا دیا ہے۔'' گویا وہ کوئی گگو گھوڑا ہو' بے جان' بے خیال، زیادہ وقت نہیں لگا کہ اس نے محسوس کرلیا اس دنیا میں محبت نام کی کوئی شے نہیں ہے' اگر ہے تو وہ تمہاری کامیابیاں ہیں' تمہاری محنت ہے' تمہاری Grateness ہے' جس کے تم بلا شرکت غیرے مالک بن جاؤ تو دنیا تمہاری صلاحیتوں کا اعتراف کرے گی۔

اللہ کی حکمتیں بھی بڑے پر اسرار طریقے سے کام کرتی ہیں اور جو بظاہر ہی غیر اہم اتفاقات ہوتے ہیں ان کا رخ اس کی ذات کی بہتری کی طرف مڑ جاتا ہے۔ نیلم اور بچوں نے جو بے رخی اسے دی تھی اسے قطرہ قطرہ اکٹھا کر کے اجمال نے اپنے اندر تعمیری قوتوں کا ڈھیر جمع کر لیا۔ اب اس نے جانا امریکا موقع کی امکانات کی دنیا ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ اس نے آئی ٹی کا اپنا پروجیکٹ کھڑا کر لیا بڑے بڑے شراکت دار اور حصہ دار اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔

یہاں دن رات کی رفتار بہت تیز تھی اور اسی تیزی سے اس کا کاروبار پھیلتا گیا اور ساتھ ہی ساتھ نیلم اس سے دور ہوتی گئی۔ نیلم کی جو کچھ خبر بھی اسے ملتی وہ اپنے بچوں سے ملتی، جو ماہانہ خرچہ وصول کرنے اس کے پاس آتے تھے۔ دونوں بچے بڑے ہو کر اسکول کے آخری گریڈ تک پہنچ گئے تھے۔ بیٹی ڈاکٹری کے کورس پڑھ رہی تھی اور بڑی صحت مندی کے ساتھ جوان ہو رہی تھی جسے دیکھ کر اسے خوشی کے بجائے فکر لاحق ہو جاتی تھی۔ بچے اپنے اپنے راستوں میں بھاگ رہے تھے بغیر راستوں کے نشیب و فراز کو دیکھے کامیابی کی دھن ان کے دماغ پر سوار تھی اب جب کہ ان کے باپ نے کامیابیوں کے کئی سنگ میل پیدا کر لئے تھے کبھی کبھی وہ محبت سے اپنے باپ سے چمٹ جاتے۔ آپ کتنے باوقار ہو گئے ہیں ڈیڈ۔

تمہاری ماں کیا کبھی مجھے یاد کرتی ہیں؟ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پوچھے بغیر نہ رہ سکتا۔ راتوں کو اس کے بدن کی یادیں اسے کبھی کبھی بے تحاشا یاد آتی ہیں۔

''انہوں نے بہت دوست بنا لئے ہیں وہ آپ کی کمی دور کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں، آپ کا نام لیں تو ان کی آنکھوں میں آنسو ضرور آ جاتے ہیں ویسے وہ ضدی بہت ہیں۔'' علیحدہ علیحدہ تین چیک کاٹ کر اجمال نے ان کے ہاتھوں میں تھمائے۔'' کاش! ان ڈالروں سے تم وہ خوشیاں خرید سکتے جو عمر بھر تمہارے دل کی خوشی بن جائیں!''

اس کے بچے خوش ضرور ہوئے مگر وہ اپنے باپ کے دل کی تہہ میں نہیں جھانک سکے۔

''میں تو کل اپنے دوستوں کے ساتھ پیرس جا رہی ہوں، خوشیاں منانے''۔

''میں تمہارے لئے دعا ہی کر سکتا ہوں، تم میری اولاد ہو مگر تمہارے مستقبل پر میرا کوئی اختیار نہیں۔ تم کبھی بھی میری آنکھوں سے زندگی کو نہیں دیکھو گے۔''

بچے اس کے شاندار دفتر سے نکلے وہ اپنی واکنگ چیئر کی پشت سے ٹیک لگا کر سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ یہ عادت اس نے نیلم کی یادیں جلانے کیلئے اختیار کر لی تھی۔ دوسری عادت اس کی وہسکی تھی' ایک آدھ دن میں دو ایک پیگ پی کر وہ اپنے شعور کو بے خود کرنا سیکھ چکا تھا' اس کے بغیر اسے نیند نہیں آتی تھی۔ کسی امریکن لڑکی کی محبت اسے ابھی تک راس نہیں آئی تھی۔ اگرچہ اس کی کمپنی میں کئی ایک خوبصورت لڑکیاں کام کرتی تھیں جو دفتری کام کے علاوہ مہمانداری میں مہارت حاصل کر چکی تھیں۔

ان میں سے دو ایک تو اس کی ذات کی محرومیوں تک پہنچ چکی تھیں ایسے متمول اور خوش شکل اور

خوش اطوار شخص ان کے شکار کا پسندیدہ ہدف بن سکتے تھے مگر اجمال کو عورت کے جسم میں اس حد تک دلچسپی نہیں تھی اور نہ ابھی تک کوئی لڑکی یا عورت اس کے اندر ایسی تحریک پیدا کر سکی تھی اور نہ اسے نیلم کے جسم کی نیلاہٹ اور ریشمی نرمی اور زبان ابھی تک یاد تھی مگر اسے اب عورت کے بدن کی وفاداری پر اعتماد نہیں رہا تھا۔

صرف جنیفر اس کے نزدیک ہونے کا دعویٰ کر سکتی تھی، اسے یہ اعزاز حاصل تھا کہ وہ اجمال کیلئے بڑی اچھی کافی بناتی تھی اس کے لباس میں کافی کا ہلکا رنگ جھلکتا تھا وہ جب اس کے قریب آ کر اس کے کان میں بات کرتی تھی جو کسی وجہ سے وہ اونچی آواز میں نہیں کر سکتی تھی تو اجمال کو اس کے منہ سے دودھ پیتے بچے کی کچی کلیوں کی سی خوشبو آتی تھی جسے وہ بعد میں بھی اپنی سماعتِ شامہ کے کناروں پر محسوس کرتا رہتا تھا۔

اس کے دو ایک دوست تو بعض اوقات کافی پینے کے بہانے اس کے پاس آ بیٹھتے تھے۔

''کیا کافی ہے' کیا مٹھاس ہے' کیا خوشبو ہے' اس کا دوست شرجیل کہے بغیر نہیں رہتا تھا۔ وہ اُٹھنے کا نام نہیں لیتا تھا' ساتھ ساتھ وہ جینفر کو دیکھتا رہتا تھا اس کی نظر نہیں بھرتی تھی۔

''اللہ نے انسان کو کن کن نعمتوں سے نواز رکھا ہے کہ ہم چاہیں بھی تو ایک عمر میں اس کا شکریہ نہ ادا کر سکیں۔''

یہ جملے اس نے بڑی محنت سے جوڑے تھے' جو شاید اس موقع کی نسبت سے بہت مناسب تھے۔ جو کم کم ہی کسی کو دکھائی دیتی تھی۔ جینیفر کے ہونٹ ہلکی ہلکی مسکراہٹ میں لرزتے رہتے تھے اور ان سے کافی کی خوشبو اڑتی رہتی تھی۔ اجمال کے اشارے پر جب وہ کمرے سے نکل جاتی تو شرجیل زیادہ دیر نہ بیٹھ سکتا۔'' تم سے ہماری خوشی نہیں دیکھی جاتی۔'' وہ جاتے ہوئے ہنس دیتا' ''میں نے اور کام بھی کرنے ہیں۔'' اجمال کہتا۔

''اس سے بڑا کام اور کونسا ہو سکتا ہے' تم دراصل ڈر جاتے ہو کہ کوئی تم سے تمہاری یہ دولت نہ چھین لے۔''

''نہیں تم غلط سوچتے ہو اس دولت کا کیا اعتبار ہے آج یہاں کل وہاں۔ وقت کسی چیز کو ایک جیسا نہیں رہنے دیتا۔''

''میں حیران ہوتا ہوں اجمال اس سوچ کے مالک ہونے کے باوجود تم نے اتنی دولت کیسے جمع کر لی۔'' شرجیل نے ڈرتے ڈرتے کہہ ہی دیا۔'' اسے بھی بس اتفاق ہی سمجھو' کوئی بھی دوسرا اتفاق تجھے کچھ اور بنا سکتا ہے۔ میں اتنا خوش نصیب بھی نہیں ہوں جتنا تم سمجھتے رہتے ہو۔''

''اور ایک بات میری یاد رکھنا میں اپنی ساری دولت کے باوجود امریکی زندگی کی مصنوعی لہروں کے ساتھ نہیں بہہ سکوں گا۔''

پوری بات سنے بغیر شرجیل اس کے دفتر سے نکل گیا تھا مگر اجمال کے آخری الفاظ ٹوٹے پھوٹے اُڑتے اس کے پیچھے اُڑ رہے تھے شرجیل اس کا بہت قریبی دوست تھا' اسے پتا تھا اس کی زندگی میں کیا کمی ہے۔

اجمال نے اسے کبھی نہیں بتایا تھا کہ توہین اور بے قدری کے جلتے ہوئے حالات نے اسے کیسے بے وقار کردیا تھا' جو نیلم کے ہاتھوں اسے ملا تھا۔ اس کے چہرے پر اپنے لئے اسے یہ عبارت پڑھنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی تھی۔ ''تم یہاں امریکا میں جو زندگی بھی حاصل کروگے وہ میری طفیل ہوگی' میری دین' مجھے تمہاری کتنی بھی ضرورت ہو' میں کبھی بھی دل سے تمہیں محبت نہیں کرسکوں گی۔ اس کے باوجود یا شاید اس لئے اس نے اجمال کے خون سے تین بچے حاصل کرلئے تھے۔ بچے اس کی کمزوری تھی اجمال نے اگر اس کی یہ ضرورت اتنی جلدی پوری نہ کی ہوتی تو شاید اس میں ابھی اتنی سردمہری نہ آپاتی۔ اجمال کو اس نے اپنے بدن پر پورا اختیار تو دیا تھا مگر وہ اپنے دل کو اس کے حوالے کرنے کیلئے کبھی بھی تیار نہ کرسکی۔ جو پاکستانی اپنا ملک چھوڑ کر پیسہ کمانے کے لئے امریکہ آبستے ہیں۔ ان کی اس کی نگاہ میں کوئی عزت نہیں تھی۔ اس کے والدین بھی روزی کمانے کی خاطر امریکہ آکر سیٹل ہوئے تھے مگر وہ خود تو امریکہ میں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی تھی۔ اسے بجا طور پر امریکی ہونے پر فخر تھا' اور وہ اس فخر کو کسی بھی جذبے کے قدموں میں ڈالنے کو تیار نہیں تھی بھلے ہی وہ محبت کا جذبہ ہی کیوں نہ ہو۔

یہ اب آکے ہوا تھا کہ اسے اجمال کے خیال سے دور رہنے کیلئے بڑی جدوجہد کرنا پڑ رہی تھی۔ اس کا خیال کبھی کبھی خوشبو کی طرح اڑتا ہوا آتا تھا اور اس کے حواس پر سوار ہوجاتا تھا یہ خوشبو اسے مسحور کردیتی تھی۔

اس پر ایسے لمحے ضرور گزرتے تھے جب اس کے دل میں بے شمار خواہشیں جگادیتے تھے وہ خواہشیں دیر تک اس کے وجود کے اندھیروں میں لو دیتی رہتی تھیں پھر وہ اپنے وجود کو جھٹکتی تھی تاکہ اس کے اندر اجمال کی آرزو نہ جاگ اٹھے۔

وہ اپنی کمزوری کے آگے سر جھکانے پر خود کو تیار نہیں کرپاتی تھی وہ ٹوٹنے کو تیار تھی مگر اپنی ضد چھوڑنے پر رضامند نہیں ہوپاتی تھی۔ اس میں شاید اس کا بھی کوئی قصور نہیں تھا' وہ بنی ہی ایسی تھی اس کے جسم میں تو لچک تھی مگر دماغ عقل میں نہیں تھی۔

وہ ابھی تک یہ طے نہیں کرپائی تھی کہ اس نے اہمیت سے لحاظ سے کس شے کو کس مقام پر رکھنا ہے۔ اس نے بہت سے دوست بنالئے تھے جو اس کی مسرت کے سامان ڈھونڈتے رہتے تھے' کچھ ایسے بھی تھے جو اس کے بدن کی مٹھاس پر بھنبھناتے رہتے تھے کہ اس نے اپنے بدن کا سنہرا پن مدھم نہیں پڑنے دیا تھا خاص طور پر ڈیوڈ اس کی ذات کا گرویدہ ہوتا جارہا تھا وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے دل میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے وہ اسے بھرنے کی کوشش کرسکتا ہے۔نیلم نے اپنی دوستی کیلئے اونچی اونچی دیواریں اٹھا رکھی تھیں وہ کسی کو بھی ان دیواروں سے اونچا اٹھ کر اس کے اندر جھانکنے کی اجازت دینے کیلئے خود کو تیار نہیں کرسکتی تھی۔ اسے اپنی انا ہر حالت میں کسی بھی دوسری بات سے عزیز تر تھی۔

یہی انا ہی تو اس کے آڑے آرہی تھی کہ اجمال کے پاس جاکر محبت کی بھیک مانگنے کو تیار نہیں تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اس نے اتنے وقت کی دوری کے بعد اسے بھلا دیا ہے اس کا جسم اب بھی کبھی

کبھی اس کے لمس کیلئے ہمکتا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔

لیکن کبھی کبھی یہ خیال اسے ہولا دیتا تھا کہ اس طرح تو میں بوڑھی ہوجاؤں گی کسی نے اس کے کان میں سرگوشی کی محبت کے بغیر تم راکھ ہوجاؤ گی جسے وقت کی ہوائیں اُڑا لے جائیں گی۔

اس روز رات کے کھانے پر تینوں بچے اور ان کی ماما اکھٹے آگئے۔ آج بھی عافیہ کو ہی بات کرنا پڑی' اس کے بھائی ماں سے اس موضوع پر بات کرنے سے گھبراتے تھے۔

''ماما۔ آپ ڈیڈی سے اپنا جھگڑا کیوں ختم نہیں کرتیں؟''

میرا تو ان سے کوئی جھگڑا نہیں' عافیہ تم ان کو منا کر لے آؤ۔ میں کوئی اعتراض نہیں کروں گی' میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔

''یہ کیا بات ہوئی ماما۔ وہ آپ کے شوہر ہیں اور وہ آپ سے ناراض ہیں تو ان کو منانا آپ کا کام ہے۔''

''اپنی حد میں رہا کرو عافیہ۔ میں کوئی روایتی بیوی نہیں ہوں کہ ان کو مناتی پھروں۔ جی چاہتا ہے تو آئیں، نہیں جی چاہتا تو نہ آئیں' مجھ سے ان کے نخرے برداشت نہیں ہوتے یہاں میاں کو بیوی پر کوئی فوقیت نہیں ہے۔ یہ امریکا ہے پاکستان نہیں۔''

عافیہ نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور غصے میں اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

''آپ کو ڈیڈی کا کوئی بدل نہیں ملے گا' شیشے کے سامنے کھڑا ہوکر دیکھیں............؟ اب آپ جوان نہیں رہیں' تین جوان بچوں کی ماں ہیں جن میں سے دو یہ بیٹے ہیں جنہیں شاید باپ کے سر پر نہ ہونے کا بھی کوئی افسوس نہیں۔ ان کی گرل فرینڈز بھی انہیں چھوڑ جائیں گی ایک دن۔''

''کیا بکواس کررہی ہو؟'' بڑا بھائی حسن بول پڑا۔

''میں بکواس نہیں کررہی، مام کو سمجھا رہی ہوں جنہیں نہ جانے کس بات کا غرور ہے کہ انہیں اپنے شوہر کے سامنے جھکنے نہیں دیتا حالانکہ ان سے یہ تین بچے حاصل کرچکی ہیں۔ جن کے ساتھ کتنے ہی سال یہ اپنا بستر شیئر کرتی رہی ہیں۔ یاد رکھنا ماما!! آپ کو ڈیڈی سے اچھا کوئی یار نہیں ملے گا۔ یہ انکل ڈیوڈ تو اُن کے پاؤں کی خاک بھی نہیں جنہیں آپ ساتھ ساتھ لئے پھرتی ہیں۔''

اس کی ماں غصے سے لال پیلی ہوکر اپنی نشست سے اُٹھی اور عافیہ کے منہ پر تھپڑ مارا عافیہ روتی ہوئی چلی گئی اور اس کے پیچھے اس کے بھائی بھی۔''

چند دنوں بعد بھائی' بہن پھر اکھٹے ہوئے تو اُنہوں نے اپنی ماں کے مشورے کے بغیر فیصلہ کیا۔ ''اب ہم اپنے ڈیڈی کے پاس جائیں گے اور ان سے معافی چاہتے ہوئے انہیں واپس گھر لانے کی درخواست کریں گے تاکہ ہم ایک مکمل خوشحال فیملی کی صورت میں زندگی گزار سکیں۔''

مگر عجب اتفاق ہوا کہ جب وہ اپنے ڈیڈی کے دفتر پہنچے تو پتہ چلا کہ وہ گزشتہ روز ہی پاکستان چلے گئے تھے۔

پاکستانی زمین پر قدم رکھتے ہی اس کی خفیہ یادیں جاگ پڑی تھیں ان میں عظمیٰ کی یاد کی لو

سب سے اونچی تھی، جو اس وقت اسپتال میں پڑی راکھ بنتی جا رہی تھی۔
کسی طرح اجمال اس تک پہنچ ہی گیا۔
وہ روزانہ پھول لے کر اسپتال جاتا تھا ان پھولوں سے جو اپنائیت اور خلوص کی خوشبو آتی تھی عظمیٰ اس میں نہال رہتی تھی گنتی کے دنوں میں وہ صحت یاب ہوگئی اور ڈاکٹروں نے اسے گھر جانے کی اجازت دے دی۔
عظمیٰ کی بیٹی اب پریشان ہوگئی۔ یہ سوچ کر یہ شخص جس نے اس کی ماں کی زندگی بحال کی تھی اس سے اس کی ماں کی محبت نہ چھن جائے۔
''اجمال دو ایک مرتبہ ان کے گھر بھی آیا۔ عظمیٰ اپنی بیٹی کے جذبات سمجھ رہی تھی۔ اس شخص کا اس کی ماں کے اتنے قریب ہونا اب اسے بے کل کر دیتا تھا۔
اور پھر ایک روز اس نے ماں سے بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا: ''امی کہیں آپ انکل اجمال سے دوسری شادی کرنے کا ارادہ تو نہیں کر رہی ہیں؟''
''اتنا بڑا فیصلہ بیٹا میں تمہارے مشورے کے بغیر کیسے کر سکتی ہوں؟'' اس نے اپنی بیٹی سے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا۔
''تو میرا مشورہ یہ ہے کہ امی کہ ابو کا انتظار کریں، ہوسکتا ہے وہ زندہ ہوں دشمنوں کی قید میں ہوں اور ایک روز اچانک ہمارے پاس واپس آ جائیں۔''
وہ چند لمحے جیسے سانس لینے کو رُکی اور پھر بولی: ''فرض کیجئے کہ وہ شہید بھی ہو گئے ہوں تو اللہ کا فرمان ہے کہ شہید کبھی نہیں مرتے وہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں آپ ابو کو مردہ نہ سمجھیں۔'' عظمیٰ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے بیٹی کی محبت اسے بہت عزیز تھی، اس نے اپنے اندر جیسے کسی چیز کے ٹوٹنے کی آواز سنی۔
اور شام کو وہ اجمال کے سامنے بیٹھی تو اس کے چہرے پر دن کے وقت بہائے گئے آنسوؤں کے نشان باقی تھے پیشتر اس کے اجمال اپنی کوئی تجویز اس کے سامنے رکھتا وہ بول پڑی۔ ''یہ ٹھیک ہے اجمال کہ تم نے میری مرتی ہوئی روح کو زندہ کیا، میں تمہاری احسان مند ہوں مگر میں تم سے دوسری شادی نہیں کر سکتی۔ بہتر ہے تم اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ، وہیں جہاں تمہاری بیوی ہے، تمہارے بچے ہیں تمہارا بزنس ہے۔'' اجمال جو کچھ کہنا چاہتا تھا وہ اب کیسے کہتا وہ اٹھا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔
اجمال کے جانے کے بعد اس کے گھر کا ڈرائنگ روم خالی ہو گیا اور اس کے ساتھ ساتھ وہ بھی تنہا ہوئی تو بلک بلک کر رونے سے اسے کوئی روکنے، دلاسہ دینے والا نزدیک نہیں تھا۔

❁❁❁

علم اور عقیدے میں گھری کہانی

عابد میر

بالآخر کہانی نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا۔
ایک عرصے سے وہ اس کشمکش میں مبتلا تھی اور اسے کہنے اور لکھنے والا اس سے کہیں زیادہ دہرے عذاب کا شکار۔ لکھنے والے کو کہنے کی آزادی درکار تھی اور سماج کی اکثریت کا خیال تھا کہ اس کا اظہار دوسروں کی آزادی میں مخل ہوتا ہے اور اگر اُس نے اِس اظہار پر قابو نہ پایا تو اُسے سرِ عام سنگسار کر دیا جائے گا۔ کہانی اور کہانی کار کا سماج کئی انتہاؤں میں بٹ چکا تھا۔ ہر انتہا اپنے بَر حق ہونے پر مصر تھی۔ امن کی حمایت کرو تو جنگی قوتیں خون آلود نظروں سے گھورتی ہیں، جنگ کی حمایت میں بولو تو فریقِ مخالف پر گراں گزرتا ہے۔ کوئی غدار قرار دیتا ہے، کوئی لاپتا کر دیتا ہے، کوئی جہل اور جذباتیت کے فتوے صادر کرتا ہے تو کوئی کہانی کی لاش کو مسخ کر کے کہیں کسی ویرانے میں پھینک دیتا ہے۔
____ لیکن اب تو حد ہی ہوگئی......انتہا پسند سماج کا ہر فرد اَز خود قانون بننے لگا۔ خود ہی فردِ جرم عائد کرتا ہے، خود ہی مجرم قرار دیتا ہے اور خود ہی لمحے بھر میں وہیں سزا کا اعلان کر دیتا ہے۔ اور سزا، سزائے موت سے کسی طرح کم نہیں۔
ایسے میں کہانی کار کا دم گھٹنے لگا۔ اظہار کی آزادی چھن جائے اور اندر کی لگن سے لکھنے کی بجائے لکھنا صرف وقت گزاری بن جائے، کسی خاص طبقے کی خوشنودی کے لئے لکھا جائے، یا محض پیشے کے طور پر لکھا جائے...... ایسا لکھنے کی دنیا میں کہیں اور تو شاید ممکن ہو لیکن ہمیشہ سے سچ کی شیدائی اور عوام سے جُڑی کہانی کے لئے کہاں ممکن! کہانی میں احتجاج تو ہوسکتا ہے، کہانی قصیدہ نہیں بن سکتی۔ کہانی کار نظریاتی کارکن تو ہوسکتا ہے، تنخواہ دار اور قصیدہ گو نہیں۔ سو، کہانی کار کا ہوش وحواس میں رہنا ممکن نہ تھا اور کہانی اُسے مزید اس کیفیت میں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ تو بالآخر اُس نے

خودکشی کا فیصلہ کرلیا۔
خودکشی کے لئے سمندر کا انتخاب بھی اُس نے خود ہی کیا۔سمندر اُس کے تخلیق کار کے لئے ہمیشہ حُسن اور دانش کا استعارہ رہا تھا۔کئی بار وہ دونوں (کہانی اور کہانی کار) ساحلِ سمندر پر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے خاموشی کی زُباں میں محوِ گفتگو رہے تھے۔ دونوں مل کر گھنٹوں سمندر کے شور تلے چُھپی خاموشی کو سُنتے رہتے ۔کچھ نہ بولتے......کچھ نہ کہتے......بس رات دیر گئے جب واپس لوٹتے تو کہانی کار کاغذ قلم اٹھاتا اور اُسے اظہار کا روپ دینے لگتا۔کسی نئی صورت میں،کسی نئے عنوان کے ساتھ !......گویا لہروں کے شور تلے راج کرتی خاموشی کہانیوں کی زنبیل تھی جس سے ہمکلام ہوکر ہر بار اُس کا ساتھی کوئی نئی کہانی ساتھ لے آتا۔
یہی سوچ کر کہانی نے خودکشی کے لئے سمندر کا انتخاب کیا کہ انتہا پسند سماج کے ہاتھوں،اس کے کہانی کار کے سِسک سِسک کر مرنے سے بہتر ہے کہ وہ خود کو ان لہروں کے حوالے کر دے اور اِن کی تہہ میں چُھپی کہانیوں سے جا ملے۔کیا پتہ کسی روز انہی لہروں کی خاموشی سے ہمکلام ہوتے ہوئے اس کا ساجھی تخلیق کار اُسے اِس زنبیل کے کسی کونے سے ڈھونڈ کر نیا جیون دے دے۔ پر کیا پتا تب تک اُس کی سانسیں باقی رہیں بھی کہ نہیں؟!
اِن وسوسوں نے اُس کے قدم لڑکھڑا دیے۔ اندیشے اُسے ساحل کے قریب جانے سے روکنے لگے ۔لیکن پھر جیسے ہی اُس کی نظروں کے سامنے انتہا پسندوں کے ہاتھوں رُسوا ہوتے ،تلملاتے اور شدید ذہنی کرب میں مُبتلا اپنے تخلیق کار کا چہرہ آیا......اور ساتھ ہی یہ خیال کہ اگر وہ اس کے ساتھ رہی اور اُس نے اپنے مزاج سے مجبور ہور کر اُسے سماج کی اکثریت کی پسند کے بَرخلاف کسی اظہار سے عنوان دے دیا تو اَز خود قانون بنی ہوئی سماج کی انتہا پسند اکثریت اُسے کیسے سنگسار کر ڈالے گی۔ اسی خیال نے اُسے آگے بڑھتے رہنے پر مجبور کیا۔اُس نے محسوس کیا کہ اگر اُس نے مزید سوچ و بچار سے کام لیا تو شاید وہ اپنے ارادے پر عمل درآمد نہ کر سکے۔ اس لئے اُس نے ایک دم ذہن کو ماؤف کر ڈالا۔اور پھر سمندر کی بپھرتی لہروں کی جانب بڑھنے لگی ۔آگے بڑھتے ہوئے اُس نے اپنے تئیں آسمان پر نظر ڈالی ۔آسمان صاف تھا......خالی تھا......!
ایسے میں چمکتے سُورج نے اُس کی آنکھوں کو چندھیا ڈالا۔اُس کے لڑکھڑاتے قدموں کی توانائی جواب دے گئی ۔سر چکرانے لگا۔سمندر کی اُچھلتی لہروں کے بیچ گھری کہانی ڈگمگانے لگی ۔اور اگلے لمحے اُسے لگا کہ وہ خود کو اِن لہروں کے حوالے کر چکی ہے......

☆☆☆

فضا میں ہر سُو مدھرتا کا احساس تھا۔نرم و لطیف احساس......بظاہر جنت کا کوئی گوشہ معلوم ہوتا تھا۔ جہاں تین بزرگ سر جوڑے محو گفتگو تھے۔ یہیں کہیں کونے میں موجود کہانی ،تینوں حضرات کو بغور تک رہی تھی۔ بڑی گھنی (مگر سلجھی ہوئی) داڑھیوں والے، پُر نور پیشانی والے، یہ لوگ جانے کیوں اُسے جانے پہچانے سے لگے ۔اُن کے چہروں پہ نظر پڑتے ہی عجب سا ایک احساس

اُس کے بدن میں سرائیت کر گیا؛ جیسے کسی ہمدرد، کسی بہت ہی اپنے ،بہت ہی پیارے عزیز سے ملنے کا احساس ۔ جیسے دنیا کے ستائے ہوئے معصوم بچے کے لیے ممتا کا احساس۔اس لئے نہ جانے کیوں خود بخود اس کی آنکھیں نم ہو گئیں اور اُس نے چاہا کہ وہ چِلاّ کر،رو رو کر اِن بزرگوں کو اپنی آپ بیتی سُنائے...........لیکن اس کی آواز حلق میں ہی گُھٹ کر رہ گئی ۔ اگلے ہی لمحے اس پر یہ منکشف ہو کہ وہ کچھ بھی بولنے سے محروم تھی۔ ایک دم اُسے احساس ہو کہ شاید وہ مر چکی ہے۔ یہ شاید اُس کی رُوح ہے، اور شاید اس لئے تینوں بزرگ اُس کی موجودگی کو محسوس نہیں کر رہے تھے۔ لیکن اُس نے محسوس کیا کہ وہ اُن کی آواز کو سُن سکتی ہے۔ یہ احساس ہوتے ہی اچانک باقی سب کچھ بھول کر اُس نے اپنی تمام تر توجہ اُن بزرگوں کی سر گوشیوں پر لگا دی۔ جیسے جیسے وہ اُن کے قریب ہوتی گئی،سر گوشیاں واضح ہوتی گئیں۔
''سُنا ہے کہانی نے خودکشی کا ارادہ کرلیا ہے۔''
''جی ہاں...... بتایا گیا ہے کہ انتہا پسند سماج کے ہاتھوں مجبور ہوکر اُس نے ایسا فیصلہ کیا ہے۔''
''اِسی لئے ہمیں یہاں غور وفکر کے لئے بُلایا گیا ہے کہ ہم اِس بابت اپنی رائے کا اظہار کریں، کہ شاید ہماری کوئی دلیل اُسے اس ارادے سے باز رکھ سکے۔''
''لیکن اِس کے لئے ہمارا ہی انتخاب کیوں کیا گیا؟''
''بتایا گیا ہے کہ ہم نے چونکہ اپنے اپنے عہد میں اپنے علم و عمل سے اپنے عہد کی کہانی کو بچایا ہے، اس لیے ہمیں اس موضوع پر اظہارِ خیال کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔''
''تو آپ اِس بابت کیا کہیں گے جنابِ سقراط!''
اور یوں کہانی پر اِس پہلے بزرگ کے نام کا انکشاف ہوا۔
سقراط...... وہ پہلا آدمی جس نے زہر کا پیالا پی کر کہانی کی جان بچائی۔گویا باقی کے دونوں حضرات بھی ان ہی کے پائے کے کہانی کے کوئی ہمدرد ہوں گے......!ساتھ ہی اس پر یہ بھی انکشاف ہو کہ وہ اب تک زندہ ہے، جو یہ لوگ اس کے خودکشی کے ارادے پر گفتگو کر رہے ہیں۔ لیکن کیا پتا اُن تک یہ خبر ہی دیر سے پہنچی ہو۔ اور انہیں پتہ ہی نہ ہو کہ کہانی تو کب کا خود کو سمندر کی لہروں کے حوالے کر چُکی ہے......!!
لیکن اُس نے تمام تر خیالات کو جھٹک کر،اپنی تمام تر توجہ اُس بزرگ کی طرف کر لی، جسے سُقراط کہہ کر مخاطب کیا گیا تھا۔
سُقراط نے گلا کھنکار کر گفتگو کا آغاز کیا؛
''جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے، میں ظاہر ہے کہ اُسے اپنے تجربے کی رُو سے دیکھتا ہوں ۔ میں نے جب سوال کی صُورت میں کہانی کا نیا چہرہ اپنے سماج میں پیش کیا تو مجھ سے کہا گیا کہ یا تو میں اس کہانی سے دستبردار ہو جاؤں یا اپنی زندگی سے......میں نے اپنی زندگی سے دستبرداری قبول کر لی، اس لئے کہ کہانی کی زندگی زیادہ اہم تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس فیصلے کے نتیجے میں، میں

دوبارہ زندہ ہوکر سماج کو کوئی نئی کہانی نہ دے سکوں گا لیکن مجھے اتنا یقین ضرور تھا کہ کہانی زندہ رہے گی تو کوئی نہ کوئی تخلیق کار اُس کے بطن سے ایک نئی کہانی کو جنم دے ہی دے گا۔اس لئے کہانی کی زندگی زیادہ اہم ہے۔سماج کو نئی کہانی کی ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ اس لیے تمام تر پابندیوں، حتیٰ کہ کہانی کار کو زہر کا پیالہ پینے کے باوجود کہانی کو زندہ رہنا چاہیے ۔ میرا خیال ہے کہ کہانی زندہ رہے گی تو سماج زندہ رہے گا۔''

یہ کہہ کر اُنہوں نے اپنی گفتگو ختم کی اور اپنے سامنے بیٹھے بزرگ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا؛

''آپ کیا کہیں گے جنابِ گلیلو!''

یہ نام سُنتے ہی کہانی ایک بار پھر ٹھٹکی ......گلیلو! کہانی کو نیا چہرہ دینے والا ایک اور تخلیق کار...... فرطِ جذبات سے ایک بار پھر اُس کی آنکھیں بھر آئیں ۔وہ ہمہ تن گوش ہوکر اُنہیں سُننے لگی۔

گلیلو چند ثانیے خاموش رہے اور پھر گویا ہوئے؛

''جناب! میرے تجربے کی رُو سے میں آپ سے مختلف رائے رکھتا ہوں۔خیر اس کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ میں کہانی کے خاتمے کے حق میں ہوں۔لیکن میں ساتھ ہی کہانی کار کے خاتمے کے بھی حق میں نہیں؛ جیسا کہ میں نے خُود کیا۔ مجھ سے بھی تو یہی کہا گیا تھا کہ کہانی کا نیا چہرہ دریافت کرنے کی پاداش میں یا تو زندگی سے دستبردار ہو جاؤں یا کہانی کے نئے چہرے کی دریافت اور اُس کے اظہار سے توبہ تائب ہو جاؤں جو اکثریت کے عقیدے کو زَک پہنچاتا ہے۔ میں نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا۔محض اس لئے نہیں کہ مجھے تادیر سانسیں لیتے رہنے کا شوق تھا بلکہ اس لئے کہ میں یہ جانتا تھا کہ میرے اظہار پر قدغن سے کہانی کا یہ نیا چہرہ نہ تو چُھپایا جا سکے گا، نہ بدلا جا سکے گا۔لیکن اگر میں اس طرح کچھ دیر اور جی لیا تو شاید اس کے چہرے کے نقوش کو کچھ مزید نکھار سکوں اور آنے والوں کو کہانی کے اس نئے چہرے کی شناخت میں سہولت ہو۔اور میرا خیال ہے کہ میں کسی حد تک اس مقصد میں کامیاب بھی رہا۔ اس لئے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ کہانی کے نئے چہروں کی دریافت کا سفر جاری رہنا چاہئے لیکن ساتھ ہی اس کے تخلیق کار کو بھی، جب تک کہ وہ کہانی کا ساتھ دے سکتا ہے،بقائے ہوش وحواس قائم رہنا چاہیے ۔ اِن دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے ۔ ایک کہانی کار کے قتل سے شاید کہانی کے سفر پر کوئی اثر نہ پڑتا ہو لیکن کہانی کی موت، کہانی کار کو بھی مار ڈالے گی ۔گویا یہ بیک وقت دو قتل ہوں گے ۔ اس لیے سماج کی بہتری بھی اسی میں ہے کہ بیک وقت دونوں کو بچایا جائے۔''

کہانی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔اُس کا جی چاہا کہ وہ اپنے ان بزرگ تخلیق کاروں سے گلے مل کر رو دے۔لیکن افسوس کہ اُس لمحے وہ ایسا کرنے پر قادر نہ تھی۔ یہ سوچ سوچ کر اس کا جی بھر آتا رہا کہ ایک طرف انتہاؤں کا شکار سماج جو اُس کے اور اس کے تخلیق کار کی جان کے دَر پے آزار تھا اور ایک طرف سماجی سائنس کی کہانی کے تخلیق کار یہ بزرگ جو اُس کی جان وحیات سے متعلق کس قدر فکر میں غلطاں تھے۔

''آپ کیا فرمائیں گے جنابِ مارکس!''

اُسی بزرگ کے اِس جملے نے کہانی کے خیالات کا تسلسل توڑ دیا۔ وہ حیرت و استعجاب کے ساتھ اُس تیسرے بزرگ کی طرف دیکھنے لگی جسے مارکس کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔سماجی سائنس کی تاریخ کی کہانی کی سب سے اعلیٰ اور افضل صورت دریافت کرنے والا اُس کا تخلیق کار......کارل مارکس!

کیا کیا نہ مصیبتیں دیکھیں اِس آدمی نے، کیا کیا عذاب نہ جھیلے اپنی دریافت کردہ کہانی کے لئے۔ اپنے جگر گوشے تک قربان کر ڈالے اس کے لئے ۔ یہ خیال آتے ہی کہانی کی نم آلود پلکیں اس شخص کی عقیدت میں جُھک گئیں۔

مارکس نے اپنی چمکتی آنکھوں سے دونوں احباب کی اَور دیکھا اور لبوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ سجائے ہوئے، نہایت متانت سے گفتگو کا آغاز کیا؛

''دوستو! میرا خیال ہے کہ کہانی کی خودکشی اور کہانی کار کا سماج سے مایوسی کا معاملہ اس قدر معمولی نہیں کہ ہم اِسے محض اپنے نجی تجربات کے آئینے میں دیکھتے ہوئے اظہارِ خیال کریں......''

اُس کے اس پہلے جملے کے مکمل ہوتے ہی دونوں احباب کی پیشانی پر کچھ شکنیں نمودار ہوئیں لیکن دونوں نہایت توجہ اور سنجیدگی سے اُسے سُنتے رہے ۔ مارکس نے احباب کی جبینوں پر شکنیں واضح طور پر محسوس کیں ۔ایک لمحے کو توقف کیا اور پھر گویا ہوا؛

''کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس نازک معاملے پر محض ہم تین لوگوں کا انتخاب ہی اس کی حساسیت اور ہماری رائے کی افادیت کو واضح کرتا ہے۔اس لئے میرا خیال ہے کہ پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہم کس عہد اور کس سماج کی کہانی کے مسئلے پر گفتگو کر رہے ہیں ۔ہمارے عہد، ہمارے سماج اور ہماری کہانی کے مسائل مختلف تھے۔اس لئے لازماً زیرِ بحث کہانی، اس کے عہد اور سماج کے مسائل بھی مختلف ہوں گے ۔ہمیں جو صورتِ حال بتائی گئی ہے، اس کے مطابق مذکورہ کہانی کا بنیادی مسئلہ علم اور عقیدہ کے مابین الجھاؤ کا ہے۔ کہانی اور اس کے کہانی کار کا سماج ہر دو معاملات میں انتہاؤں پر چلا گیا ہے اور ہمارے محبّی اینگلز نے کہا تھا کہ ہمیشہ دو انتہائیں آپس میں ٹکراتی ہیں۔ یہ بھی مذکورہ سماج کی ہر دو انتہاؤں کا ٹکراؤ ہے۔سوال یہ ہے کہ ایسے میں کہانی کار، کہانی کے نئے چہرے اور نئے عنوانات کی دریافت کو کیوں کر جاری رکھ سکتا ہے......''

یہاں ایک لمحے کو اس نے توقف کیا۔ ہر دو احباب کی جبینوں کی شکنیں غائب ہو چکی تھیں لیکن سنجیدگی اسی طرح برقرار تھی۔خود کہانی کی دلچسپی اور توجہ بڑھ چکی تھی۔

ماحول کا سرسری جائزہ لے کر مارکس نے وہیں سے اپنی بات شروع کی؛

''ہماری دریافت کردہ کہانی ، میرا مطلب ہے کہ جدلیات کا اصول یہ ہے کہ کہانی کو اپنے معروضی حالات کے مطابق ارتقا کرنے دیا جائے۔ اگرچہ اکثر، کہانی کار معروضی حالات سے فکری طور پر آگے نکل جاتا ہے اور اسی باعث اس کی دریافت کردہ کہانی اس کے سماج کے لئے اجنبی ہو

جاتی ہے جس کی سزا اُسے اپنی جان گنوا کے بھی ادا کرنا پڑتی ہے...... جیسا کہ جنابِ سقراط کے ساتھ ہُوا۔لیکن معروضی حالات کا تقاضا یہ ہے کہ کہانی کو کچھوے کی رفتار سے ارتقا کرنے دیا جائے ۔خرگوش کی چھلانگیں کہانی اور کہانی کار دونوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوں گی ۔

جہاں تک عقیدے کا معاملہ ہے، ہم نے اسی لئے اسے نشے سے تشبیہہ دی تھی کہ عقیدے میں مبتلا آدمی اپنے عقائد سے متعلق ہوش وحواس سے کام نہیں لیتا لیکن یہی معاملہ اگر علم کے ساتھ بھی ہوجائے تو ظاہر ہے کہ دونوں میں کوئی تفاوت ہی نہ رہے گی۔ بلکہ اُلٹا علم کی یہ ذمّے داری بنتی ہے کہ وہ عقائد پہ براہِ راست حملہ کیے بِنا،عوام الناس کوکہانی کے ایسے باشعور روپ سے آشنا کروائے جوانہیں جوش کی بجائے ہوش سے کام لینے کے قابل بنائے۔دیکھئے،عقائد سماج کو جامد کرتے ہیں، لیکن اگرعلم عقیدے کا روپ دھار لےتو سماج ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔''

مارکس سانس لینے کورُکا تو ماحول کی سانس بھی تھمی ہوئی تھی۔احباب کی نظریں اسی پر مرکوز تھیں ۔س لئے وہ فوراً آگے بڑھا؛

''جب انتہاؤں میں ٹکراؤ کی صورتحال ہوتو کہانی کوکسی ایک انتہا کی حمایت یا مخالفت کی بجائے وہ ماحول تیار کرنا چاہیے جوان انتہاؤں کے ٹکراؤ کے بعد جنم لے گا،اور جو......سماج کوتبدیلی کی طرف لے جائے گا۔''

یہ کہہ کراُس نے جونہی بات ختم کی ۔ ہر دو احباب نے بیک وقت ایک سوال داغ دیا؛''تو آپ کے خیال میں انتہاؤں میں گھری،خودکشی پرآمادہ اس کہانی کو کیا کرنا ہوگا؟''

''یہ کہانی اوراس کے سماج کےمعروضی حالات خود طے کریں گے۔''

مارکس نے مُسکرا کر جواب دیا۔

☆☆☆

سُورج کی تیز شعاؤں نے کہانی کے چہرے پر پڑتے ہی اُسے بیدار کر دیا۔ وہ ہڑ بڑا کر یوں اُٹھی گویا اچانک کسی خواب سے بیدار ہوئی ہو۔ ہرطرف لہروں کا شور......سمندر، ماں کی بانہوں کی طرح اُسے اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھا۔اُس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہ کب سے یہاں پڑی تھی...... اُسے محسوس ہُوا کہ کئی لمحے، کئی پل، کئی برس ، شاید کئی صدیاں گزر گئیں ،اُسے ان لہروں کے بیچ پڑے ۔ اور پھراس کے ذہن میں روشنی کے کئی جھماکے ہوئے ۔اُسے گزری ہوئی محفل یاد آئی......اپنے ہم درد بزرگ یاد آئے......اُن کی گفتگو یاد آئی ...... اُس نے حیرت سے اپنے آپ کو دیکھا اورسوچا؛

'کیا میں مرچکی ہوں؟...... یا مرکر نیا وجود پا چکی ہوں؟......میرا نیا چہرہ کیا ہے......؟!'

یہ خیال آتے ہی اُس نے اپنے بدن میں ایک تیز رَوتبدیلی محسوس کی...... لمحے بھر میں کہانی ایک رنگ برنگی تتلی بن چکی تھی......اُس نے ساحل سے اُڑان بھری۔ دیر تک سمندر کی لہروں کے شور تلے راج کرتی خاموشی کوسُنتی رہی ۔آج اُسے یہ خاموشی نئے مفہوم دیتی نظر آئی...... ہرجلوہ نیا

رنگ لیے تھا۔ وہ یونہی منڈلاتی ہوئی باغ میں آنکلی ۔کئی رنگ برنگے حسیں پھولوں کا رس اُس نے لیا اوروہیں باغ کے ایک کونے میں، اپنے محبوب کی مُنتظر ایک نازنین کے لبوں میں سما گئی ۔

نازنین کے لبوں میں سماتے ہی اُس پر ایک اور راز منکشف ہوا۔ یہ خوبصورت نازنین اُس کے تخلیق کار، سانجھی ، ساتھی کہانی کارہی کے انتظار میں گنگنا رہی تھی ۔کہانی نے چمن کے حسین تر پھولوں کا سارا رس اس نازنین کے لبوں میں انڈیل دیا اور انتظار کرنے لگی اُس پل کا ، جب یہ ہونٹ اپنے منتظر محبوب کہانی کار کے خشک ہونٹوں سے جاملیں گے۔

۞۞۞

ادب خلا میں پیدانہیں ہوتا اور نہ ہی ہوا میں معلق رہتا ہے۔افسانہ، کہانی، ناول، نظم، غزل یا ادب کی کوئی بھی صنف محض ہوائی قلعے تعمیر کرنے کا نام نہیں۔ بلکہ ادب بالواسطہ یا بلا واسطہ معاشرے اورسماج سے متعلق رہتا ہے۔ادب صرف فرد کی کتھارسس نہیں، بلکہ سوسائٹی کے اجتماعی وجود کی کتھارسس کا وسیلہ بھی بنتا ہے۔کیوں کہ ادب معاشرے میں بالا دستوں کے ظلم اور جبر کے خلاف ردعمل ضرور ظاہر کرتا ہے۔ادبی بیانیوں اوران کے متون میں جہاں حسن وصداقت کا بیان ہوتا ہے، وہیں کبھی بین السطور اور کبھی علی الاعلان احتجاج کی لہریں کروٹ لیتی رہتی ہیں۔دیکھنے والی آنکھ اورمحسوس کرنے والا دل ہونا چاہیے۔

(احسن سلیم)

خسارہ

سیمیں کرن

سلمان داؤدی جب بمبئی سے کراچی کے ائیرپورٹ پر اترا تو دل عجب متضاد سے رنگوں میں بھیگا ہوا تھا۔ یہاں اس کے دنیا میں موجود سب سے قریبی خونی رشتے موجود تھے۔ یہاں اس کے ماں باپ کی ہڈیاں بھی دفن تھیں، جن کو خاک ہوئے اک مدت بیت گئی ۔ یہاں اس کا قیمتی بچپن بھی بیتا تھا۔ اس شہر کی فضاؤں میں اس کیلئے ایک مانوسیت اور وارفتگی کی بے ساختگی اور والہانہ پن تھا۔ اس نے اک گہرا سانس بھرا۔ بمبئی گئے کتنے زمانے بیت گئے مگر کراچی جو کشش رکھتا تھا وہ بمبئی میں نہ لگی۔ حالانکہ رشتے ناتے اور دوست احباب بھی تھے اور سائرہ اسحاق وہیں ملی اسے ۔ اس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں' سیاہ بالوں والی سفید چاندی جیسے چہرے والی سائرہ اسحاق اس کی شریک حیات اور جیسے ملی اسی طرح کچھ سال اس کے ساتھ گزار کر تھوڑی سی علالت کے بعد اچانک چل بسی۔ وہ حیران ششدر کھڑا تھا کہ کیا ہوا سائرہ اسحاق اسے چھوڑ کر چلی گئی یہ چند خواب جیسے برس جن رفاقتوں کا کوئی ثمر بھی اس کے آنگن میں نہ کھلا تھا اور زندگی ایک تندور جیسے بیابان کی طرح اس پر تپتی ہوئی تھی۔

عورت پھر اس کی زندگی میں بیوی کی شکل میں تو نہ آئی، ہاں بستر میں ضرور ضروتاً داخل ہوئیں۔ اپنے تئیں سائرہ اسحاق سے وفاداری کے اس مظاہرے پر وہ خوش اور مطمئن تھا پر اس کے مزاج وعادات یا رویے کی بے ڈھی تھی یا پھر حالات کے دھارے نے اس کی ساخت ایسی کردی تھی کہ نہ تو وہ اپنے دائرے میں بہت جلد کسی کو داخل کر پاتا تھا نہ ہوسکتا تھا۔ احساس کمتری تھی شاید جو برتری میں ڈھل گئی تھی یا پھر عدم تحفظ کا احساس ہجرتوں اور دربدری کے دکھ، جن کے پیچھے آج کی نہیں صدیوں کی خونچکاں حکایتیں چھپی تھیں۔

وہ ہر سال بمبئی سے جو دکھنے میں کراچی جیسا ہی تھا مگر یہ کراچی کی کشش تھی یا یہاں پر بسے اپنے عزیز رشتہ داروں کی مگر ہر سال یوم کپور منانے وہ آتا تھا۔ وہ یوم کپور سے اک ہفتہ پہلے جمعہ

کو پہنچتا تھا جب سیات استوار شروع ہوجاتا ۔سیات استوار یوم سبت جمعہ کی رات شام ڈھلنے سے شروع ہوتا اور ہفتہ کو اگلی رات جب آسمان پہ تین ستارے نظر آنے لگتے' اختتام پذیر ہوجاتا ۔ سلمان داؤدی کے ماموں اور خالہ کے گھرانے کچھ قدامت پرست وقدامت پسند لوگ تھے اور ان مذہبی روایات کا عقیدت سے اہتمام کرتے یوم سبت جس پر کام کاج سے گریز کیا جاتا اور Malacha کا پورا اہتمام ہوتا اور یوم کپور سے پہلے جو یوم سبت ہوتا اس کی خاص طور پر تیاری کی جاتی۔ داؤدی خاندان میں آگے پیچھے تو سبت والوں کی طرح بہت سی راہیں نکال ہی لی جاتی تھیں !

سلمان داؤدی جب ائیرپورٹ سے اُترا تو ٹیکسی کا رخ اس نے میوہ شاہ میں موجود یہودی قبرستان کی طرف مڑوادیا۔ وہ قبرستان جہاں کراچی میں شاید پہلا اور آخری شیلوم سینگاگ یہود کی عبادت گاہ ان کے سجدوں ، نمازوں اور تالمود کی تلاوت کی گواہ عمارت ہوا کرتی تھی۔ جہاں اس کا اہتمام اس سینگاک کو بنوانے والا سولومن ڈیوڈ اپنی شریک حیات کے ہمراہ ابدی نیند سوتا تھا اور جہاں سلمان داؤدی کے ماں باپ کی ہڈیاں بھی دفن تھیں۔ یہ سینگاگ کراچی کے ''مسلمان'' ہوتے ہی (خاص طور پر ضیائی مارشل لا کی ظلمت کے بعد) ایسا ''مسلم'' ہوا کہ غیر مسلموں کی قبریں بھی تنگ پڑنے لگیں۔ سلمان داؤدی اور اس کے رشتے دار خوف کی حالت میں جیتے اور مرتے تھے اور اپنی قبروں کو بے نام ونشان چھوڑ دیتے تھے، شناخت کے خوف سے!

اور جب کسی فرد، قوم، طبقہ سے اس کی شناخت چھن رہی ہو تو وہ لاشعوری بقا کے جذبے سے اپنی چھوٹی سے چھوٹی روایت کو سینے سے لگالیتا ہے۔ یہی سلمان داؤدی کے خاندان کے ساتھ ہوا تھا جو لوگ یہاں پاکستان میں رہ گئے تھے، وہ اپنی رسوم وروایات سے سختی سے چمٹے ہوئے تھے اور آدھا خاندان مارشل لا کے دور میں یہاں سے ہجرت کر کے بمبئی جا بسا تھا۔ کچھ لوگوں نے بظاہر پارسی مذہب میں پناہ لے لی تھی! سلمان داؤی اک مخلوط نسل، مخلوط خون جس کی ماں یہودی تھی اور جس کا باپ صرف اس لئے مسلمان تھا کہ وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا تھا وہ اسکی ایرانی النسل ماں فرح داؤدی کا ایسا اسیر ہوا کہ پھر سب کچھ بھول گیا۔ اس کی محبتوں کے درمیان کبھی مذہب حائل نہ ہوا تھا۔ اس کی ماں بے شک بہت مذہبی عورت تھی اور باپ بس عید کی نماز تک مسلمان تھا۔ اسی لئے ان کے گھر میں محبت کے مذہب کی پیروی کی جاتی تھی۔ اس کی ماں جو شے پکاتی جس کے حلال ہونے پر اس کے باپ کو کوئی شک نہیں تھا۔ وہ تینوں وقت نماز یا سروس کا اہتمام کرتی خاص طور پر صبح کے شاخاریت پہ تلمود کی تلاوت اور طویل عبادت جس میں توریت اور زبور کی تلاوت بھی شامل ہوتی تو اس کا باپ ہنستا اور کہتا: '' فرح تم ماں کی یاد دلاتی ہو وہ بھی فجر کے وقت یہی کچھ کرتی تھی!''

اور اس کی حسین ماں اپنی چھوٹی سی ناک سکیڑ کر کہتی: '' شاخاریت ہماری فجر ہی تو ہے!''
اور کبھی وہ غرور سے محبت بھرے ناز سے کہتی
'' تم لوگوں کی فجر ہماری شاخاریت ہے۔'' تو اس کا باپ محمد اسماعیل اس کے ذومعنی بیان پر

ہنسے چلا جاتا اور کہتا:

''مجھے بخشو بھئی، میں تو گناہ گار لادین آدمی ہوں، میں تو سب کو ہی سچا مانتا ہوں اور شاید کسی کو ہی پورا سچ نہیں سمجھتا۔''

محمد اسماعیل اور فرح داؤدی کا بیٹا سلمان داؤدی جس کا نام فرح نے بڑی آس اور امید سے اپنے باپ کے نام پر رکھا تھا اور اسماعیل کو کہا تھا:

''اسماعیل تم جب اسے اسکول داخل کروانا تو اس کے نام کے ساتھ سلمان داؤدی بن اسماعیل لگا دینا مگر مجھے اس کا نام اپنے مرحوم باپ کے نام پر رکھنے دو۔''

اور محبت کے پیامبر اسماعیل نے اعلیٰ ظرفی سے اس کو اجازت دے دی تھی یہ کہہ کر کہ فرح ہماری شاخ پر کھلا یہ پھول ہم دونوں کا ہی ہے' تم جو جی چاہے اسے کہہ کر پکارو۔

اور پھر جب فرح داؤدی مارشل لا کی بربریت کا شکار ہوئی، اسے بھرے بازار میں کوئی ان دیکھی گولی چاٹ گئی تھی، تو محمد اسماعیل اسی دن اصل میں تو مر گیا تھا لیکن دو سال...بمشکل دو سال وہ اپنی زندہ لاش کو گھسیٹتا پھرا اور اپنی زندگی میں ہی وہ برملا کہتا تھا: ''مجھے میری فرح کے پہلو میں دفنانا، ہماری دیوار ساجھی ہو، ارے کیا قبریں بھی مسلمان، یہودی' عیسائی ہوتی ہیں، تیرے نام پر یہ کیا دھندے کھلے ہیں مولا؟''

تو دس بارہ سالہ سلمان داؤدی حیرت سے دیکھتا اور سوچتا تھا کہ اس کے باپ کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ بظاہر جوان دکھنے والا مرد کیوں اتنی خوفناک باتیں کرتا ہے، مگر وہ اس وقت یہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا باپ جینے کی امید کھو چکا ہے اور امید کے بغیر دو سال بھی جی لینا بہت جی داری تھی اور اک دن چپکے سے وہ آنکھیں موند گیا۔ اس کے باپ کی تدفین یہودی رسم رواج کے مطابق یہودی قبرستان اپنی بیوی فرح کے پہلو میں ہوئی۔ ہاں سلمان داؤدی نے اک پھولوں بھری مالا جب باپ کے کفن پر ڈالی تو اعتراض کسی نے بھی نہ کیا کیونکہ وہ تو محمد اسماعیل تھا اور برصغیر کے بسنے والے یہودی بھی اب اپنے مُردوں کے پاس دوسروں کی دیکھا دیکھی پھول رکھنے لگے تھے۔ تو سلمان داؤدی کی محبتوں اور اشکوں کی حیرت سے بھیگی پھولوں کی مالا پہنے محمد اسماعیل فرح داؤدی کے پہلو میں جا سویا۔

خونی اور ننھیالی رشتوں کے باوجود سلمان داؤدی کے لئے جیسے جینے کا جواز ختم ہو گیا تھا۔ وہ جیسے اک اندھی کھائی میں جا گرا تھا۔ بس یونہی چپ چاپ بے سمت جئے جا رہا تھا۔ اس کی آنکھ اندر کی آنکھ اس دن کھلی جب ایک دن ماموں اور خالہ بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے کہ سلمان داؤدی سولہ برس کا ہونے کو ہے، اب دو سال بعد اس کا شناختی کارڈ بنے گا، یہ وقت ہے کہ اب سلمان کو اعتماد میں لیا جائے اور اس کے مذہب کا فیصلہ ہونا چاہئے، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے ننھیالی خاندان نے اس کے والدین کی شادی کو کس مشکل سے ہضم کیا تھا۔

مسلمانوں سے اک تعصب ونفرت صدیوں سے منتقل ہوتے خون میں اس کے ساتھ گردش

کرتا تھا اور یہ تو محمد اسماعیل خود تھا۔ اک بہت نرم طبع اور حلیم روح، وہ مذہب بےزار شخص تھا انتہائی بے ضرر اور فرح داؤدی کے اس کے ساتھ بے تحاشا خوش رہنے کے باعث اور پھر انہی کے خاندان میں رچ بس جانے کی وجہ سے وہ اس کو گوارا کرنے لگے تھے۔ لیکن اب جبکہ وہ نہیں تھا، تو وہ دل ہی دل میں سوچتے تھے کہ اک یہودی ماں اور مسلمان باپ کا بیٹا خود کو کیا کہلانا پسند کرے گا۔ شناختی کارڈ کے خانے میں اپنی کیا شناخت ظاہر کرے گا۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ وہ یہودی کہلایا جائے وہ ان کا خون تھا مگر وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اک مسلم ملک میں اک پرتشدد مسلم ملک میں یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنے اس حق کو استعمال کر سکے۔

اس دن پہلی بار سلمان داؤدی نے خود کو کھوجا، وہ اک نام کی حد تک مسلمان باپ کا بیٹا جس کا ددھیال کے نام پر دور پار کے چند رشتہ دار تھے جو لندن بستے تھے اور اس کے باپ کو کبھی کبھار ملنے آتے تھے تو یہی شکوہ کرتے تھے کہ وہ یہودیوں میں کیوں بس گیا، اسے اک یہودن کو مسلمان کرنا چاہئے تھا اور وہ ہنس کر ٹال دیتا۔ اسے مسلمان باپ کی مذہب سے وابستگی صرف عید کی نماز کے علاوہ کبھی کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ اس نے لاشعوری طور پر خود کو یہودی ہی سمجھا تھا۔ یوں بھی وہ ماں کے قریب تھا کیونکہ اس کا باپ بھی ہر وقت ماں کے عشق میں کھویا رہتا' اس کی ماں کی عبادات یوم سبت' اہتمام' یوم کپور' سالانہ روزہ' اور خصوصی افطار' اس تہوار کا خصوصی اہتمام' اس کو اپنی جڑیں یہیں ملتی تھیں۔

اس کی ماں اک سچی دیندار عورت تھی اور اس کے باپ کی محبت نے اس میں بہت سے تعصّبات ختم کر دیئے تھے وہ اسے پیار سے بٹھا کر کہتی سلو یہ مسلمان بھی اچھے لوگ ہیں ساتوں قوانین نوح کو مانتے ہیں یہ ہدایت یافتہ ہیں اللہ کے نزدیک۔

مگر سلمان داؤدی نے ماں کی موت کے بعد اور پہلے بھی ننھیال کے ساتھ زیادہ وقت بتایا تھا اور پھر ماں کی پراسرار موت اس کے تعصب ونفرت کو ضرب ہی دیتی رہی۔

وہ مسلمانوں کو گمراہ' اجڈ اور دہشت گرد سمجھتا تھا جو اس کو اور اس کی ماں کو اتنی اجازت بھی نہ دیتے تھے کہ وہ اپنا شیلوم تعمیر کر سکیں اور ان کا اپنا سینگاگ! اس کی ماں یہ خواب اپنے ساتھ لے کر مر گئی تھی اور اب یہ خواب اس کی آنکھوں میں جاگتا تھا۔

اور اسی سلمان داؤدی کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ وہ مسلمان کہلائے گا یا یہودی' وہ اپنے اس حق کیلئے لڑنا چاہتا تھا اس کی ماں اس کا باپ اک خالہ' دو ماموں اور بہت سے دوسرے عزیز اگر یہودی قبرستان میں خاک ہوئے تھے تو وہ کیوں خود کو یہودی نہیں کہہ سکتا۔

مگر اس کی نانی اور اکلوتی خالہ کو اس کی جان بہت عزیز تھی اسے خاندان کے کچھ رشتہ داروں کے ساتھ بمبئی بھیج دیا گیا۔ اس وقت وہ سترہ برس کا تھا اور ان چالیس پینتالیس برسوں میں جب وہ تقریباً ساٹھ برس کا ہونے کو آیا تھا بوڑھا ہو گیا تھا لیکن اپنے تشنہ خواب کے ساتھ جیتے اسے لگتا کہ اس کی نفرت بالکل جوان اور توانا ہے۔

وہ ہر سال یہودی مہینے تشری کے دسویں دن منعقد ہونے والے یوم کپور کو منانے ستمبر اکتوبر میں پاکستان کراچی اپنے ننھیال آتا تھا اور اس عہد کو دہراتا تھا کہ وہ یہاں اک سینگاگ تعمیر کر کے اپنی ماں کیلئے جنت میں اک گھر تعمیر کرے گا۔

وہ اپنی ماں کی طرح اک مذہبی آدمی تھا یا شاید مسلمانوں سے نفرت نے اسے شدید مذہبی بنا دیا تھا۔ وہ اس کا تجزیہ نہیں کر پاتا تھا پاکستان کے بعد انڈیا میں بمبئ جیسے بڑے اور مختلف مذاہب اور تہذیبوں کو رچتے بستے دیکھ کر مساوات کی اساس کے پیچھے سیاست کو جانچا اب بزنس کے سلسلے میں لندن پیرس جانے کا اتفاق ہوا، مشاہدہ ونظر وسیع ہوا تو کبھی کبھی اک موازنہ اور تعلق سا اپنے اندر ہی کھل جاتا وہ سوچنے لگتا۔

''ہم یہودی مسلمان مردوں کی طرح تھوڑے کٹے ہوئے یوم سبت منانے والے' دن کی تین' شاخاریت' شاع اور امیدہ کی نمازیں ادا کرنے والے جن کو اگر دس افراد کی جماعت میں پڑھیں تو زیادہ افضل حلال گوشت کھانے والے اور سور کو حرام جاننے والے یوم کپور وکفارے اور مفاہمتی کا دن' توبہ کا دن' با جماعت خدا سے معافی مانگنے کا دن کا روزہ رکھنے والے ہم یہودی ان مسلمانوں سے جو جمعہ کی نماز اور جمعہ کے روز ملکاہ کرتے ہیں پانچ نمازیں پڑھتے ہیں ذبیحہ کھاتے ہیں' روزے رکھتے ہیں اور اپنی عید پر اللہ کو راضی کرنے کو قربانی کرتے ہیں... ہم ایک دوسرے سے کتنے قریب اور ملتے جلتے ہیں پھر ایک دوسرے سے کیوں اتنی نفرت کرتے ہیں مگر یہ سوچ کچھ پل کی لمحاتی ہوتی پھر اس پر نفرت وکدرت پوری شدت سے حاوی ہو جاتی ہے!''

وہ اس نفرت کے سفر کا تو شاید کبھی کبھار تجزیہ کرنے بیٹھ جاتا تھا مگر وہ ان اشتراکات پر کبھی غور نہیں کرتا تھا کہ جب وہ یوم کپور کا روزہ افطار کرنے اپنے اہل وعیال کے ساتھ بیٹھتا تو میز پر سموسہ' کچوری نہ مسلمان تھی اور نہ یہودی' دلہن کا لال جوڑا بھی بے مذہب تھا اور سفید کفن بھی۔

اس کو پاکستان آئے' پانچ چھ روز ہو چکے تھے جب جاوید مسیح نے ہچکچاتے ہوئے اسے روکا' ان کے گھر کے تمام ملازمین عیسائی تھے۔ جاوید مسیح گھر کے تمام امور کا انچارج ہی تھا اور ڈرائیور بھی!

سلمان نے اس سے پوچھا اور ہمت بندھاتے بولا: ''بولو جاوید کیا کہنا ہے؟''

وہ کچھ تذبذب میں بولا

''صاحب کچھ رقم ایڈوانس میں چاہئے آپ بیگم صاحبہ سے سفارش کر دیں یا پھر آپ گاڈ کے نام پر دے دو صاحب!''

سلمان کے استفسار پر اس نے بتایا کہ دس ہزار چاہئیں وہ حیرت سے بولا: ''جاوید خیریت! اتنی رقم کی اچانک کیوں ضرورت پڑ گئی جبکہ کچھ روز ہی قبل تم نے تنخواہ بھی لی ہے اور گھر میں ہی تم بتا رہے تھے سب خیریت ہے۔''

جاوید پھر کچھ اٹکا پھر بولا: ''جی جی صاحب سب خیریت ہے مگر پچھلے سال بڑی بیٹی کی شادی

کی تھی خیر سے بہت اچھے گھر گئی ہے دبئ میں ہوتی ہے اس دفعہ کرسمس پر اس کی پہلی عیدی جائے گی۔ میری بیوی چاہتی ہے کہ اس کے ایک دو اچھے سوٹ آرڈر پر دے دے پہننے کو۔ صاحب غریب آدمی تو دو تین مہینے پہلے ہی سوچے گا ناں خرچے کے بارے میں' کچھ اس مہینے کر لیں گے' کچھ اگلے مہینے' پھر خیر سے اس کے ہاں' خوش خبری بھی ہے تو کچھ بچے کو بھی دینا دلانا صاحب تو خرچہ بہت ہے۔''

سلمان نے خاموشی سے اس کی بات سنی اور جواب دیا: ''اچھا کرتے ہیں کچھ، جاؤ میرے لئے ایک ڈرنک بنا کر لاؤ۔'' جب وہ کمرے سے باہر نکلا تو سلمان داؤدی نے نفرت اور بے زاری سے اک ہنکارا بھرا اور بڑبڑایا ''ہونہہ...... بنی اسرائیل کی گمراہ بھیڑیں۔''

جاوید مسیح نے جاتے جاتے یہ بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔ اس بڑبڑاہٹ میں جو نفرت اور حقارت تھی وہ اس کے ہر احساس کو چھیلتی تھی، وہ اپنی ڈیوٹی جو کہ آج مصروفیت کے باعث رات کی بھی تھی۔ اتوار کی صبح گھر پہنچا تو تھکن اور بے زاری سے اس کا برا حال تھا اس کی بیوی شبیہہ مسیح کے سامنے کارنس پر کینڈل جلائے دعا پڑھ رہی تھی۔

''اے مقدس باپ ہمارے' تیرا نام پاک ہے' تو بادشاہ ہے' ہمیں آج کی روٹی دے دے' زمین آسمان پہ تیری مرضی ہے۔ ہمیں برائی سے بچا' تو جلال والا بادشاہ ہے۔''

بیوی کی دعا نے اس آگ کو اک دم تازہ کر دیا وہ بھی برابر کھڑا ہو کر لاشعوری طور پر دعا دہرانے لگا ورنہ مذہب اس کے لئے کرسمس اور کبھی کبھار چرچ میں عشائیہ ربانی کی دعا تک مختص تھا۔

وہ بیٹھا اسی کھولن میں تھا: ''یہ سلمان داؤدی یہ سالا..............'' اس نے موٹی سی گالی بکی۔

''یہ ہمیں بنی اسرائیل کی گمراہ بھیڑیں کہتا ہے ہم مسیح کے ماننے والے۔ وہ خداوند جو سولی پر چڑھ کر ہمارا کفارہ دے گیا اور یہ مسیح کے قاتل یہ سب کبھی نہیں بخشے جائیں گے یہ سب جہنمی ہیں۔''

اور دور بیٹھی اس کی بیوی سوچتی تھی کہ جاوید جانے کیوں پریشان ہے شاید پیسے نہیں ملے آج چرچ سے سسٹرز اور پادری کو بلایا ہے کچھ پڑوس کی عورتیں ہی آ جائیں گی کھیر پکا کر اجتماعی دعا کروا دیں گی اور وہ مقدس باپ ہم غریبوں کی سنے گا۔

جاوید کچھ دیر کو لیٹ گیا مگر جانے کیوں آج چین نہیں مل رہا تھا وہ شراب کی بوتل کھول کر بیٹھ گیا دو تین پیگ پی لینے کے بعد وہ سرور میں آ گیا۔ اس ملک میں یہ اقلیت سماجی طور پر تو معدوم ومدغم ہو رہی تھی مگر یہاں غریب جاوید کو بھی پرمٹ کی نعمت کی بدولت عمدہ شراب نصیب ہو جاتی تھی۔ آج بھی میوہ منڈی کا سیٹھ محمد خالد آنے والا تھا جو اس سے منہ مانگی قیمت پر بڑھیا شراب خرید لیتا تھا بلکہ کسی وقت ترنگ میں اور خوش ہو کر اس کو اتنے پیسے دے دیتا تھا کہ وہ اپنے لئے بھی اچھی بوتل کھولنے کی عیاشی کر لیتا تھا ورنہ رقم کمانے کا یہ بھی ایک معقول ذریعہ تھا وہ اپنے لئے کوئی گھٹیا قسم یا سستی بیئر سے ہی گزارا کر لیتا۔ غیر قانونی دیسی شراب بھی مل جاتی مگر بڑھیا اور عمدہ کے خریدار اس کو مالا مال کر دیتے۔

سیٹھ خالد کی گاڑی جب اس کے دروازے پر رکی تو چرچ سے آئے لوگ اور پڑوس کی کالی اور گہرے سانولے رنگ کی عورتیں سروں پر شوخ رنگوں کے دوپٹے اوڑھے باہر نکل رہی تھیں۔

وہ خالد سیٹھ کو دیکھ کر حیران ہوا کیونکہ وہ خود بہت کم آتا تھا عموماً اس کا ڈرائیور آکر پیک کیا بیگ لے جاتا تھا۔

وہ آگے بڑھ کر سیٹھ کو سلام کرتے ہوئے بولا: ''سیٹھ آج خود؟ بیگ تیار ہے۔''

سیٹھ محمد خالد بولا: ''خیر تو ہے جاوید یہ گھر میں رش کیسا ہے'' جاوید کچھ عاجزی سے بولا۔

کچھ نہیں سیٹھ' میری بیوی نے گھر میں دعا کروائی ہے کھیر پکا کر' سیٹھ حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھتا رہا پھر اپنے تھل تھل کرتے بے ہنگم وجود سے پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا اس ہنسی میں طنز' تمسخر اور حقارت تھی' ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور پھر اسی طرح ہنسنے لگا۔

''اوتم............تم لوگ............دعا......اچھا...................شاوا بھئی شاوا''

جاوید کو یہ ہنسی اسی بڑبڑاہٹ کی طرح اک تماچا لگی جو سیدھا اس کی روح پر جالگا۔ سیٹھ اپنا سامان لے کر چلا گیا۔

وہ اندر واپس آکر دوبارہ اسی درجہ حرارت میں کھولنے لگا۔

اس نے بے قراری میں ایک پیگ اور تیار کیا۔

''سالا یہ سیٹھ خنزیر کی اولاد............ہمیں جانے کیا سمجھتا ہے؟ یہ مسلم ہمیں چوڑے عیسائی کہہ کر بلانے والے، جو گاڈ معاف کرے مسیح کو اس کا بیٹا نہیں مانتے اور شراب کو حرام سمجھ کر ہی سیٹھ پانی کی جگہ اسے پیتا ہے۔ جہنمی ہیں یہ سارے' سیدھے آگ میں جائیں گے۔''

اور سیٹھ محمد خالد بوتلیں لے کر سیدھا میوہ منڈی میں اپنے گودام اور ملحقہ ریسٹ روم پہنچا' بہت بڑے گودام کے ساتھ پرتعیش ریسٹ روم تھا' اس گودام میں گرتے ریٹوں میں مال ذخیرہ کرلیا جاتا اور تیزی کے دنوں میں نکالا جاتا مصنوعی تیزی پیدا کرنے والے لوگوں میں ایک نام سیٹھ خالد کا بھی تھا۔

سیٹھ خالد ریسٹ روم میں بیٹھا پیگ کی چسکیاں لے رہا تھا، اس کی نگاہوں کے سامنے جاوید مسیح کے گھر کا منظر گھوم گیا پادری کے ہمراہ نن اور محلے کی گہری رنگت پر شوخ چنریوں والی عورتیں' وہ دوبارہ ہنستا چلا گیا، یہ شودروں کی نسل' یہ چوڑے عیسائی' ہماری برابری میں گھر میں دعا کروانے لگے... یہ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہنے والے مشرک' کبھی نہیں بخشے جائیں گے... میں شراب پیتا ہوں' لاکھ گناہگار سہی مگر ہوں تو کلمہ گو............ ہر سال حج کر کے آتا ہوں' اس کا اور میرا کیا مقابلہ......اور ان نفوس کی ان صداؤں سے اوپر زمین آسمان کو گھیرتی پھیلتے سناٹوں میں ایک قدسی آواز کہتی تھی بے شک انسان خسارے میں ہے۔

❁❁❁

برا کہانی کار

سید تحسین گیلانی

یار سچی بات ہے میں اچھا کہانی کار نہیں ہوں۔

ارے آفاق کیسی بات کرتے ہو یار۔

ویسے اچھی گفتگو ہوئی، شیریں کے ادق تنقیدی مضامین پڑے ہی تھے لیکن وہ تو مکالمہ بھی کمال کا کرتی ہے یار۔

ہاں پرکاش، وہ بلاشبہ خاص دماغ ہے۔

تم چائے پیو۔

وہ کہتی ہے تم اچھے کتھا کار نہیں ہو تمہارے پیغام کی ترسیل نہیں ہو پاتی۔

ہاہا...

ہاں یاد آیا، اس دن مباحثے میں بھی تو اس نوجوان فسوں گر نے یہ ہی کہا تھا۔ شاید اس کا اشارہ میری جانب ہی تھا اس نے بھی تو شیریں کی تائید میں ہی کہا تھا کہ:

آپ خود دیکھ لیں عصمت، منٹو، واجدہ تبسم ...ان کی مانگ ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔ وہ اچھی کہانی لکھتے ہیں۔ وہ قاری کے ذہن سے کھیلتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے پردہ در پردہ چھپے ان برہنہ اذہان کی چاہ جنس ہی ہے۔ تو میں نے جواب میں کافکا کے کاسل، ٹرائل، میٹامورفوسس کی مثالیں دیں اور دوران گفتگو کہا تھا گو کہ کافکا استعاراتی و صنعتی زبان کا مخالف تھا، لیکن اس کی کہانیوں کے سب ہی کردار سمبالک ہیں، اس کے ہاں فکشن میں محض Fantasy ہی نہیں Imagination بھی موجود ہوتی ہے۔ سرئیلی ادبا میں امیجز خود کار تحریر ہوتے چلے جاتے ہیں۔

یار آفاق تم گنجلک ہو رہے ہو۔ اس نوجوان کی بات اپنی جگہ اہم ہے کہ قارئین کیا چاہتے ہیں وہ اہم ہے۔

ہاں شاید میں ہی غلط ہوں، لیکن کیا کروں مجبور ہوں مجھے اس آسان رستے پر کانٹے دکھائی دیتے ہیں میں اردی تخلیقی ادب کا قائل نہیں ہوں۔

ہاہاہا ارے بھائی تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ ارادی تخلیق کار ہیں؟

ہاں تو جو ادب، آرٹ کی سطح سے ہٹ کر سطحیت پر اتر آئے اور جنس کا سہارا لے اور قاری کو مدد نظر رکھ کر خلق کیا جائے اسے اور کیا کہوں؟

جو ادب، شاید میں غلط کہہ گیا جو تحریر، بہتر ہے...

دیکھو آفاق تمہاری بات اپنی جگہ اہم ہے، لیکن آج شاید Survival کی جنگ لڑتا ادیب بکنا چاہتا ہے، بالخصوص ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ

ہمارے ادیب کا دماغ ہی اس کا پیٹ ہے۔ وہ اپنے دفاع کی جنگ میں قلم اٹھاتا ہے، اس کے مسائل اور ہیں، اور تم جن کا ذکر کرتے ہو ان کے مسائل اور ہیں یہ تقابل ہی غلط ہے سرے سے۔

دیکھو پرکاش میں خالص تخلیقی عمل کی بات کر رہا ہوں۔ تم سب جانتے ہو مسائل مجھے بھی ہیں۔ بچے، گھر روزگار... واقعی یہ ہمارے ادیب کے اہم مسائل ہیں، جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، یہ مسائل کسی نہ کسی طرح ہر معاشرے کے ادیب کے ساتھ جڑے رہے ہیں۔ یہاں وائف بچوں کے مسائل تو وہاں گرل فرینڈ اور نفسیاتی الجھنیں ......خیر تم موضوع مت بدلو۔

اچھا بابا دھیرج رکھو، میں سن رہا ہوں۔ معلوم ہے بھابھی نہیں ہے تو میرا دماغ چاٹو گے تم؟ یار انھیں لے آؤ چھ مہینے سے زیادہ ہو گئے اب تو اور پچھلے چھ مہینے سے میں روز دیکھتا ہوں یہ بستر یوں ہی پڑا ہے۔ کم از کم صفائی ہی کروا لو کسی کو بلا کر اور خود گیانی صاحب یہاں پڑے رہتے ہیں...

بات تو کرتے ہو ناں...

ارے ہاں ہاں ہوتی رہتی ہے بات۔ سب ٹھیک ہے۔ آ جائے گی، اس کی ماں بیمار ہے تو ویسے بھی گاؤں میں بہن بھائیوں کے ساتھ خوش رہتی ہے۔ مجھے کہتی ہے یہاں سیٹل ہو جائیں ......اسے کیا معلوم کچھ جگہوں سے محبت ہو جاتی ہے شاید اس کی محبت وہ ہے۔

آ جائے گی تب تک ان بستر کی سلوٹوں کو سنبھال کر رکھا ہے۔

ہاں معلوم ہے تم رومان پسند تو ہو۔ لیکن اپنی کہانیوں میں بورنگ ہو صحیح۔ کہتی ہے شیریں اچھے کہانی کار نہیں ہو تم۔

آفاق مجھے یاد ہے، اس نے جدید کہانی کاروں پر لکھے ایک تجزیے میں تمھارے سمبالک اظہار کو بہت رگیدا تھا اور میں متاثر بھی ہوا، اس نے معروف جرمن فلسفی شاپن ہاور کے منطقی استدلال سے تمہارے سمبالک اظہار کو رد کیا تھا۔ یاد ہے آفاق؟

یاد نہیں آ رہا کون سا مضمون؟

ہاں ہاں یاد آیا وہ مضمون ''ترنگ'' میں بھی شائع ہوا تھا۔ اور خاصی لمبی بحث رہی اس پر۔

داستان سرا
اجرا ۔ 24

ہاں وہ ہی اس نے شاپن ہاور کا جو منطقی استدلال کوٹ کیا تھا، اس کی گونج آج تک مجھے سنائی دیتی ہے کہ حقیقی اور اصل معرفت Knowledge کی بنیاد ادراک ہے۔

محض تجریدی تخیل ادراک کا کوئی جوہر نہیں ہوتا، بلکہ وہ ساخت کی ترکیب میں بادل ہوتے ہیں۔ عقل اور عبقریت (Genius) کی بنیاد تجریدی (Abstract) اور استرادی عناصر (Discursive) پر نہیں ہے، بلکہ قوت مشاہدہ پر ہے۔

ارے یار پرکاش، میں جوابی مضمون لکھ چکا ہوں بلکہ اسی جریدے میں میرا خط بھی شائع ہوتا تھا، تو خاموشی ہوئی۔

اس مضمون کا اصل point یہ تھا کہ اور شاپن ہاور کا کہنا بھی اصلا یہ تھا کہ حکمت (Wisdom) ایک بدھی (intuitive) عنصر ہے۔ تو میں اس کے اس کہے کو مانتا ہوں۔ اس نے ہمیں سمبل سے قریب ہونے میں مدد دی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں، لیکن یاد رہے اس نے یہ بات تب کی تھی، جب فلسفے کا منطقی دور تھا اور فلسفہ خالص تجریدی نظریات سے نفسیات کی جانب پیش قدمی کر رہا تھا، لیکن بعد ازاں فرائیڈ اور ژونگ نے اس موضوع کا دائرہ وسیع کیا۔

ہاں مجھے یاد ہے تمھارا خط، لیکن مجھے محسوس ہوا، ناقدین نے شیریں کو زیادہ سراہا۔ تمھارے خط پر سب چپ تو ہو گئے، لیکن مکالمہ رک گیا، جس وجہ سے تمھارے اہم نکات بھی وقت کی دھول میں دب گئے۔

وہ عورت ہے یار اور فطین بھی...

ہاہا... ہاں... لیکن اس کا انداز بھی تو مدلل تھا....

میں کب انکار کرتا ہوں میں۔ خود معترف ہوں اس کی علمی رائے کا۔ لیکن مجھے اختلاف رائے کا پورا حق ہے۔

میں تخلیق کو ایک بدھی وعفوی عمل جانتا ہوں ...ایک داخلی تجربہ۔ اور سطحی ادب کو آرٹ سے الگ کرتا ہوں، جب کہ وہ سطحی اور پاپولر ادب کی پرچارک ہے۔

بس بس بس۔

اب میں چلتا ہوں کل یہیں سے بات شروع کریں گے- آرام کرو تم بھی....

آرام کہاں یار...ابھی کچھ لکھ رہا ہوں مکمل کر لوں پھر سو جاؤں گا۔

کیا لکھ رہے ہو؟

Narcissus نرگس...لڑکا تھا، لیکن اس کے لیے مونث کی جنس کیوں متعین کی گئی؟

☆ پانچ سال بعد

آفاق...سمجھ سے باہر ہے تمہیں مبارک باد دوں یا اس کی جیت پر اسے!

شیریں حسن کو تمہارے افسانے ’’برا کہانی کار‘‘ کے تنقیدی وفکری جائزے پر نیشنل ایوارڈ دیا گیا ہے۔ آخر اس نے تمہیں ایک ’’برا کہانی کار‘‘ ثابت کر ہی دیا۔ پر کاش تم اس کے سمبالک تجزیے کو شاید سمجھ ہی نہیں پائے، ورنہ یہ سوال کبھی نہ کرتے .... مجھے علم ہے میں واقعی ایک برا کہانی کار ہوں۔

بسنے کی تمنا دل ناشاد نہ کرنا
میں خاک سفر ہوں مجھے برباد نہ کرنا
(منجمد پیاس۔احسن سلیم)

شکستِ ذات

زیب لاسی

’’تو تم ہار گئے، ڈاکٹر اظفر نعمانی صاحب!‘‘

اسے جیسے سرگوشی سی سنائی دی، چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا، لیکن کوئی بھی تو نہ تھا۔ ’’بہت ناز تھا ناں تجھے اپنے مقام ومرتبے پر، اپنی کامیابی پر، بڑا زعم تھا تجھے اپنی علمیت کا، سب کچھ تو پل بھر میں ڈھے گیا۔‘‘

پھر کہیں سے آواز اُبھری، گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا، لیکن کسی کو موجود نہ پایا سوائے اپنے آپ کے۔

وہ اسٹڈی روم میں بیٹھا تھا۔ سامنے میز پر گلاس رکھا تھا۔ ہمیشہ اس کا معمول تھا کہ رات کو ایک پیگ حلق میں انڈیلنے کے بعد یک سوئی کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا کام کرتا تھا، لیکن آج گلاس بھرا رکھا تھا اور وہ خالی خولی نظروں سے کھڑکی سے جھانکتے اور زرد چاند کو تک رہا تھا۔ جس کی بیمار روشنی اندھیروں کو بھگانے کے بجائے انھیں اور بھی مہیب بنا رہی تھی، ایک دفعہ تو گلاس کی طرف ہاتھ بڑھایا بھی، لیکن پھر اپنے آپ سے ڈر کے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ آج اس کا اپنا وجود اسے شکست دینے کے درپے تھا۔ نہ سامنا کرنے کا حوصلہ تھا نہ ہی فرار حاصل کرنے کی ہمت۔ بس اس کی بے بسی تھی اور کچوکے مارتی تنہائی میں سوچوں کی یلغار تھی۔

آج تو اسے کامیابی کا بیس سالہ سفر بھی بس رائیگانی کا سفر لگ رہا تھا۔ وہ علم جس کی بدولت اسے شہرت ملی تھی، خود سے فرار حاصل کرنے کی ایک ناکام کوشش لگنے لگی۔ ان بیس برسوں میں ملنے والے ڈھیر سارے اعزازات تو طمانچے محسوس ہو رہے تھے، جو وقت نے اس کے منہ پر مارے تھے اور اس کامیابی کے نتیجے میں ملنے والا اطمینان تو محض ایک دھوکا۔ ’’تو کیا میں اب تک خود کو دھوکا دیتا آیا ہوں۔

اس نے اپنے آپ سوچا:

’’دھوکا...وہ بھی اپنے ساتھ...اور بیس سالوں تک...‘‘

سوچوں کی چبھن نے اسے کرب میں مبتلا کر دیا۔

”ہاں دھوکا ہی تو دیتا آیا ہوں خود کو۔ ورنہ تو میں آج بھی وہیں کھڑا ہوں جہاں بیس سال پہلے تھا۔بس احساس اب ہوا ہے۔“

خود کو دھوکا دینے کا کرب کتنا جان لیوا اور اس کی اذیت کتنی شدید ہوتی ہے۔ یہ احساس اسے پہلی بار ہوا تھا۔

”اے کاش ۔اس وقت میں نے تھوڑے حوصلے سے کام لیا ہوتا!“

پچھتاوے کا زہر اس کے وجود میں سرایت کر گیا۔

”بس چھوڑو۔ حوصلہ نہ اب ہے تیرے پاس اور نہ تب تھا!“

بالآخر آپ اپنی سوچوں سے ہار مان لی۔

ڈاکٹر اظفر نعمانی ادب ،نفسیات اور سماجیات پر اتھارٹی سمجھا جاتا تھا۔ وہ کئی کتابوں کا خالق تھا۔اس کے کریڈٹ پر کتنے ہی کامیاب لیکچرز ، سیمینارز اور درجنوں مقالات تھے، جو ملک کے علمی وادبی جرائد میں چھپتے تھے۔اس کے علاوہ اس نے سیکڑوں لوگوں کو شخصیت کی تعمیر کی، انھیں کامیابی کے راز بتائے تھے۔لیکن آج وہ خود شکست خوردگی کے احساس کا شکار تھا اور بے بسی سے اپنے وجود کو ریزہ ریزہ ہوتے دیکھ رہا تھا۔

شکست ذات کا یہ المیہ کبھی وقوع پذیر نہ ہوتا ،اگر گزشتہ سیمینار میں وہ انہونی نہ ہوئی ہوتی۔ ایک ایسی انہونی جس کا ہونے کا اسے گمان تک نہ تھا۔

سیمینار میں وہ اس بے نیازی کے ساتھ جو اس کی ذات کا حصہ تھی اسٹیج پر بیٹھا تھا اور سامنے میز پر دھری فائل کو بے دھیانی سے دیکھ رہا تھا ،جس میں اس کا مقالہ رکھا تھا، دو اور مقالہ نگار بھی اسٹیج پر موجود تھے اور ان کے علاوہ ہال بھی لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔لیکن وہ ان سب سے لاتعلق سا لگ رہا تھا، کامیابی اور پذیرائی نے اسے مغرور بنا دیا تھا یا علمیت کے زعم نے احساس برتری میں مبتلا کر دیا تھا۔ یا پھر وہ مزاجاً ہی ایسا تھا کہ سب کے ساتھ اور سب سے الگ تھا۔

ایسے میں نظامت کرنے والے نے اعلان کیا:

”آج کے پروگرام کے صدر مجلس ڈاکٹر نینا میرانی بس تشریف لانے ہی والی ہیں ۔ اعلان کو اس نے عدم توجہی سے سنا لیکن نام سن کر چونکا اور یاد کا ایک کوندا سا لپکا۔” ڈاکٹر نینا میرانی؟“

اس نے نام دہرایا۔” کہیں یہ۔ وہ تو نہیں؟“

اس نے سوچا۔لیکن وہ تو” نینا خان“ تھی؟

پر” خان“ کا لاحقہ تو میرا لگایا ہوا تھا۔ممکن ہے پورا نام نینا میرانی ہو۔خود کلامی کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ اس دوران ڈاکٹر نینا میرانی ہال میں داخل ہوئیں۔ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا، تحیر اور بے یقینی کے احساس میں وہ پلکیں جھپکنا بھول گیا۔ ڈاکٹر نینا میرانی تو وہی نینا خان تھی ۔ اس کی یونیورسٹی کی استاد۔ وہ اس طرح عالمانہ وقار کے ساتھ چلتی ہوئی کرسی صدارت پر جلوہ فرما ہوئیں۔

وہ کن اکھیوں سے اسے دیکھتا رہا۔ وہی پرکشش شخصیت وہی ذہانت اور بصیرت سے بھرپور

گہری گہری آنکھیں اور ان میں گُھلی گُھلی اُداسی۔ اگرچہ گردشِ ماہ وسال نے جسم کو قدرے فربا بنا دیا تھا اور آنکھوں میں ہلکی ہلکی سُوجھن رتجگوں کی غمازی کر رہی تھی۔لیکن چہرہ ویسے ہی بیس سال پہلے کی طرح تازہ اور شگفتہ کہ جیسے یہ کلی ابھی پھول نہیں بنی۔

اظفر نعمانی ایم اے نفسیات کے فائنل ائیر میں تھا، جب” میڈم نینا“ نے وزیٹنگ پروفیسر کے طور پر یونیورسٹی جوائن کی تھی ۔ میڈم نینا ستائس سال کی ایک بھرپور، باوقار، سنجیدہ اور سادہ مزاج کی مالک تھیں۔ نہ چہرے پر سرخی پاؤڈر کی تہیں اور نہ ہونٹ لال گلابی اور پہناوا بھی سادہ ۔لیکن ان کی سادگی میں وہ کمال تھا کہ سب طلباء وطالبات ان کے گرویدہ ہو گئے اور اس پر مستزاد ان کے اپنے مضمون میں مہارت کہ گویا پڑھاتی نہیں تھیں ، بلکہ علم گھول کر پلاتی تھیں۔ یہ ان کی دل نواز شخصیت کا اعجاز ہی تھا کہ سب ان سے محبت کرنے لگے ۔اور رہا اظفر نعمانی تو اس کے ساتھ معاملہ ہی کچھ اور ہو گیا۔ پتا نہیں کیسے میڈیم نینا اس کے دل میں اتر گئیں ۔ پہلے تو وہ پریشان ہوا ،۔ الجھ سا گیا۔ اپنے آپ کو ملامت کی ۔شرم دلائی کہ اپنی استاد کے لئے ایسی سوچ رکھتے ہو۔لیکن بات اس کے اختیار کی نہیں تھی ۔سب کچھ آپ ہی آپ ہو گیا تھا۔ اور وہ نفسیات کا طالب علم تھا ، انسان کے جذبات کو خوب سمجھتا تھا ۔ اسے اپنے جذبات میں کوئی کھوٹ یا ملاوٹ نظر نہ آئی ۔البتہ وہ شرمندہ شرمندہ تھا۔ اس لئے وہ میڈم نینا کی کلاس میں ہمیشہ سر جھکائے بیٹھا رہتا۔ اگر اتفاقاً کبھی اس نے سر اٹھایا تو اس دوران کتنی ہی بار اس نے میڈم نینا کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ وہ وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن ان کی آنکھوں میں کچھ تھا ضرور۔ کیا تھا؟ یہ سمجھنا اس کے لئے آسان نہ تھا اگرچہ وہ نفسیات کا طالب علم تھا لیکن سامنے بھی اس کی استاد تھی اور جو شاید جذبات کو چھپانے کا فن جانتی تھی۔

اب اظفر نعمانی کے سامنے مسئلہ اظہار کا تھا۔ جو بھی طریقہ اسے سُوجھتا، وہ خود ہی اسے رد کر دیتا ۔ اگرچہ اس دوران وہ چند ایک بار میڈم کے آفس میں گیا بھی ،لیکن دل کی بات زبان تک نہ پہنچ سکی اور وہ ایسے ہی بن کچھ کہے لوٹتا۔اسے اپنی ناکامی یا رسوائی سے زیادہ میڈم نینا کی عزت کا خیال تھا ۔اس لئے وہ اتنی احتیاط برت رہا تھا۔ یا پھر وہ اپنے آپ سے جھوٹ بول رہا تھا۔ اس کے اندر جرأت کی کمی تھی اور میڈم کی عزت سے زیادہ اپنی رسوائی کا ڈر تھا۔

لیکن بالآخر ایک دن اس نے اپنے اندر حوصلہ پیدا کر لیا۔ یہ اس احتیاط کا تقاضا تھا یا اس کے اندر کوئی بوڑھی روح سمائی ہوئی تھی کہ وہی پرانا طریقہ، یعنی قلم اور کاغذ کے ذریعے اظہار کا سوچا ۔” تو تم اپنی استاد کو محبت نامہ یعنی (Love Leter) لکھو گے؟“

اُس نے اپنے آپ کو ملامت کی۔” لیکن یہ تو صرف اپنی بات ان تک پہنچانے کا ایک محفوظ طریقہ ہے!“

یہ سوچ کر اس نے لکھنا شروع کیا۔

آداب

اسے میرا وجدان کہیے یا ادراک، یا پھر میرے ہمزاد نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے اپنا وہ حق اب تک کسی کو نہیں دیا اور بالفرض محال اگر دے چکی ہیں ،تو خدا آپ کو اس رشتے سے وابستہ تمام مسرتیں تا زیست آپ کو نصیب فرمائے۔ اور بات ہمیشہ ہمیشہ کیلئے یہیں پہ دفن......لیکن اگر نہیں دیا،تو آپ سے آپ کو اپنانے کا حق ، مانگنے کیلئے حاضر ہوا ہوں۔

یہ کسی TEEN AGE کا کوئی جذباتی فیصلہ یا عجلت میں اٹھایا گیا،قدم نہیں بلکہ کسی کی ایک سالہ کشمکش کا حتمی اظہار یہ ہے،جس کی ناگزیریت اس کے اظہار میں پنہاں ہے۔ بات تب شروع ہوئی تھی، جب آپ نے ہماری کلاس لی تھی تب بالکل انجانے میں ایک چنگاری سی بھڑک اٹھی اور سلگتے سلگتے ایک شعلہ جوالہ بنی۔ پھر اسے چھپانے اور سہنے میں مجھے کرب اور اذیت کی کن کیفیتوں سے گزرنا پڑا۔ یہ وہی جانتا ہے، جسے اس آگ کے دریا سے گزرنا پڑا ہو۔

معاملہ کسی اور کے ساتھ ہوتا،تو شاید نہ تو خود پر اتنا ظلم کرتا اور نہ ہی اخفا کی اتنی کوشش ،لیکن جب رشتہ تقدیس کا ہو،ہستی محترم ہو اور احترام کی حد میں حائل ہوں تو اظہار مشکل ہو جاتا ہے اور رابطے کے ذرائع کی تلاش دشوار تر۔ ایسے میں قلم وقرطاس جیسے دیرینہ دوست بھی ساتھ دینے پر آمادہ نہیں ہو پاتے ۔ نہ تو کسی کو ہمراز بنایا جا سکتا ہے اور نہ ہی کسی پر بھروسا کیا جا سکتا ہے ۔گزشتہ ایک سال سے کشمکش کی اس سولی پر لٹکتا رہا ہوں، اس دوران چند ایک بار آپ کے آفس میں آیا بھی نہیں لیکن یہ میری ہمتوں کی پستی تھی یا آپ کی شخصیت کا سحر کہ جو کچھ کہنے کے ارادے سے آتا بن کہے ناکام لوٹ جاتا۔لیکن تابہ کے آخر پگلے دل نے عقل کی پاسبانی سے چھٹکارا پا ہی لیا اور معاملہ آپ کی عدالت میں آ ہی چکا ہے۔

فیصلے کا منتظر

ا۔ن

(التماس ۔شاید اخلاقی حوالے سے میرا طریقہ غلط ہو ۔لیکن جذبات کے اس اظہار یئے کو گستاخی یا کچھ اور مت گردانیے یہ اس دل سے نکلے ہیں جس، میں آپ کے لئے محبت سے زیادہ احترام ہے اور احترام سے زیادہ محبت اور میں جذبات میں کھوٹ کو گناہ عظیم سمجھتا ہوں۔)

لکھ چکنے کے بعد اس نے کاغذ اپنے ایک پسندیدہ مصنف کی کتاب میں رکھا اور اسے تحفے کے طور پر میڈم نینا کو دینے کا سوچا۔

امتحان سے فارغ ہو کر وہ چند دن کے بعد کتاب لے کر یونیورسٹی گیا تو پتا چلا میڈم نینا کا Contract ختم ہو گیا اور وہ چلی گئیں ۔شکست خوردہ سا واپس لوٹنا پڑا تھا۔

سیمینار کے اختتام پر Refreshment کے دوران وہ لرزتے قدموں کے ساتھ ڈاکٹر نینا میرانی کے پاس گیا اور ان کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔سلام دعا کے بعد نینا میرانی نے ایک نظر

اظفر نعمانی پر ڈالی اور پھر خاموشی کا لبادہ اوڑھ لیا۔ گومگو کی کیفیت میں تھا۔اس کے لئے مہ وسال پلٹ گئے تھے ۔اس وقت وہ خود کو ڈاکٹر اظفر نعمانی نہیں، بلکہ یونیورسٹی کا طالب علم اظفر نعمانی محسوس کر رہا تھا۔ وہ کچھ کہنے کیلئے الفاظ تول رہا تھا کہ اس دوران ڈاکٹر نینا نے ایک نظر دوبارہ اسے دیکھا ۔ان کی آنکھوں میں نمی سی تیر رہی تھی۔ وہ یکا یک اٹھ کھڑی ہوئیں ۔بغیر کچھ کہے ریفریشمنٹ ہال سے باہر نکل گئیں۔

اظفر نعمانی کو اپنے اندر کچھ ٹوٹتا سا محسوس ہوا بیس سالوں کا بوجھ اسے اپنے کاندھوں پر محسوس ہونے لگا اور وہ اسی کرسی پر ڈھے گیا۔

ڈاکٹر ’نینا میرانی‘‘ ہال سے باہر نگل گئیں

اس کا دل پکارنے کو چاہا لیکن اسے اپنی آواز اپنے ہی وجود کے صحرا میں کھوتی ہوئی محسوس ہوئی۔

عہد بابر وہمایوں: سیاسی انتشار اور روحانی بگاڑ

ظفر سپل

مغلیہ دور میں داخل ہونے سے ذرا قبل اس تحریک کا ذکر کرنا مناسب ہوگا جو سراسر ہندو مذہبی ثقافتی خمیر سے اٹھی۔ دراصل چشتی اور سہروردی صوفیانہ اپیل نے سارے ہندوستان کے پسے ہوئے ہندو طبقات کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ برہمنی ہندو نظام کے پاس اس طاقتور سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس چیلنج کو بھگتی انسان دوستی نے قبول کرنے کی کوشش کی۔

انسان دوستی کے جھنڈے تلے بھگتی تحریک اپنے ظاہر میں بعض اوقات دونوں مذاہب کی سچائی کو تسلیم کرتے ہوئے اور بعض اوقات دونوں کو رد کرتے ہوئے تیسرے راستے کی تلاش کا عندیہ دیتی رہی مگر ماننا چاہئے کہ سچ کچھ اور تھا اور وہ یہ کہ کسی طرح اسلام کی انقلابی روح سے آکسیجن حاصل کر کے جامد اور ڈھیر ہوتے ہوئے ہندومت کو اسلام ہی کے مدمقابل کھڑا کرنے کا جتن کیا جائے۔

رامانند، جو اس تحریک کا حقیقی سرخیل ہے، نے کہا کہ تمام انسان مساوی ہیں اور خدا تک رسائی صرف محبت کے ذریعے سے ہی ہوسکتی ہے اور اس مسلک کے حصول کیلئے مذہب کی قید کو خارج از بحث کرنا ہوگا۔ اس کے شاگردوں کو دو علیحدہ اسکولوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک اسکول تو کٹر چیلوں پر مشتمل ہے جو ویدوں کی فوقیت سے دستبردار ہونے سے انکاری ہے، اس اسکول کا نمائندہ تلسی داس ہے۔ دوسرے دبستان کا روشن خیال نمائندہ کبیر ہے، جس نے پوری قوت کے ساتھ تحریک کی نمائندگی کی۔

پندرھویں صدی کے ہندوستان کے شاعر کبیر داس (1399-1518) کے بارے میں عمومی خیال یہی ہے کہ وہ ایک برہمن بیوہ کی ناجائز اولاد تھا اور اس کی پرورش ایک مسلمان پارچہ باف کے گھر میں ہوئی۔ اس طرح اس کی شخصیت کی تعمیر میں دونوں مذہبی ثقافتی قوتوں نے برابر حصہ لیا۔ مسلم صوفیانہ روایت اس کو چشتی صوفی شیخ تقی کا مرید گردانتی ہے جبکہ ہندو روایت کے مطابق وہ

اس بزرگ کا مدمقابل اور حریف ہے۔ خیر، اس نے دونوں مذاہب کی مقدس کتابوں پر شک اور رسوم سے انحراف کیا۔ گو وہ خدائے بزرگ و برتر اور رام دونوں سے گہری عقیدت رکھتا ہے لیکن اس کا خیال ہے کہ رام کے نام پر اس کی پوجا بہتر طور پر ہوسکتی ہے۔ یہ لفظ بھگتی تحریک میں ایک خاص اہمیت اختیار کر گیا، اس لئے صوتی مطابقت اور ہم آہنگی میں یہ لفظ رحیم کے قریب تھا۔ مگر یہ بات اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ کبیر داس کی آزادہ روی اور انتخابیت کے باوجود اس تحریک کی جڑیں رام کے مسلک میں مضبوطی سے قائم تھیں۔ کبیر داس نے ہندومت کے ست (Essence) کو انقلابی خدوخال عطا کرنے کی خواہش میں اسلام کے ساتھ ارضی تصفیہ کرنے کی کوشش کی لیکن حقیقتاً اس کا محرک قبولیت اسلام کی طرف رغبت اور کشش کا توڑ کرنا تھا۔ 1495ء میں اسے سکندر لودھی کے دربار میں طلب کر کے بتایا گا کہ اس کے نظریات مسلمہ مذہبی اقدار کے منافی ہیں۔ علما اس کے لئے سزائے موت کے متقاضی تھے مگر سکندر لودھی نے قید و بند کی سزا کو کافی سمجھا۔

بھگتی فکر پنجاب کی زرعی سرزمین میں پہنچ کر ایک زبردست عوامی تحریک میں بدل گئی، جس نے کاشتکار آبادیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ سب گرونانک (1469-1539) کی انتھک مساعی کی بدولت ممکن ہوا۔ بھگت کبیر ہی کی طرح گرونانک نے دونوں مذاہب کی کتابوں کو مسترد کر دیا۔ اگرچہ وہ اسلام کے توحیدی نظام سے متاثر تھا، مگر ظاہر ہے کہ اس کا فکری پس منظر ہندوانہ تھا، سوا س کے سارے حوالے ہندو حوالہ جاتی نظام سے آتے ہیں۔

بھگتی تحریک، جس نے سرزمین ہند میں پوری قوت اور تیزی سے جڑیں پھیلانے والے اسلامی روحانی غلبے کو بے اثر کرنے کی سعی کی تھی، اپنے اندر ہی کے تضادات کا شکار ہوگئی اور بہ یک وقت انکار اور اقرار کے غیر منطقی استدلال نے الٹے پاؤں واپس جانے پر مجبور کر دیا۔

☆☆☆

با ادب، با ملاحظہ، ہوشیار!

اب ہم داخل ہوتے ہیں تختِ ہندوستان کے ایک عظیم عہد میں...... عہدِ مغلیہ!

بابر ابن عمر شیخ مرزا، ابن ابوسعید مرزا، ابن مرزا سلطان محمد، ابن میران شاہ، ابن تیمور اپنی رگوں میں باپ کی طرف سے خونِ تیمور اور ماں قتلغ نگار خانم کی طرف سے خونِ منگول رکھنے والا، شرافت اور شائستگی کا نمونہ ظہیر الدین بابر جب اپنے والد کی وفات کے بعد 1494ء (894ھ) میں وسط ایشیائی ریاست فرغانہ کا وارث بنا تو اس کی عمر صرف بارہ سال تھی اور وہ چہار اطراف سے جان کے دشمن رشتہ داروں اور شیبانی خان جیسے ازبک دشمنوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس نے سب کا جواں مردی سے مقابلہ کیا مگر جب شیبانی خان نے اس کے پاؤں ماوراء النہر میں کہیں نہ ٹکنے دیے تو اس نے ایک اور سمت قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ یہ سمت کابل کا راستہ دکھاتی تھی، سو اس نے اپنے آبائی وطن کو خیر باد کہا اور 1504ء (910ھ) میں کابل پر قبضہ کر لیا۔

تختِ کابل پر بیٹھ کر جواں مرد بابر کی نظریں زیادہ وضاحت کے ساتھ برصغیر پاک و ہند کے افق کو دیکھ سکتی تھیں جو اس کے خیال میں آل تیمور کا کھویا ہوا ورثہ تھا کہ اس کا جد تیمور لنگ اس سرزمین کو اپنے قدموں تلے روند چکا تھا۔سو لودھیوں سے نالاں ہندوستان کے چند امرا کی دعوت پر اس نے ہندوستان کا رخ کیا۔ پانی پت کے میدان میں اس نے بہلول لودھی کے پوتے اور نیک دل مگر غصہ ور سکندر لودھی (دور حکومت 1489 ۔1517ء) کے نالائق بیٹے ابراہیم لودھی (دور حکومت 1517۔1526ء) کو اپریل 1526ء میں شکست دی اور تخت دہلی پر قبضہ کرلیا۔ اس کا بیٹا ہمایوں اس کے ساتھ تھا' جس نے آگے بڑھ کر آگرہ فتح کرلیا۔ دہلی تو فتح ہوگیا مگر یہ مختلف خود مختار امرا اور صوبے داروں کے زیر تسلط منتشر ہوتے ہوئے ہندوستان کی مکمل فتح نہیں تھی۔شمالی ہندوستان پر جری اور نڈر رانا سانگا قابض تھا جو بابر کی فوجی حرکات پر گہری نظر رکھے ہوئے تھا۔ اپنے ایک لاکھ کے ذاتی لشکر اور لودھیوں اور دوسرے راجاؤں کے مزید ایک لاکھ جنگجوؤں کو ملا کر اس نے دو لاکھ فوج اکھٹی کی اور 1527ء میں کنواہہ کے میدان میں بابر سے فیصلہ کن جنگ کے لیے خیمہ زن ہوگیا۔ بابر کے پاس صرف بارہ ہزار کا لشکر تھا۔ یہ کوئی مقابلہ نہیں تھا اور اس سے پہلے کے آگرہ سے بیس میل پرے کنواہہ کے میدانوں میں بابر کو پیس دیا جاتا' وہ خاک پر سجدہ ریز ہوگیا۔ بادہ نوشی اور ریش تراشی سے توبہ کی' پھر سجدے سے سر اٹھایا' اپنے لشکریوں کے سامنے ایک ولولہ انگیز تقریر کی اور میدان جنگ میں ڈٹ گیا۔معرکہ سارا دن جاری رہا جو آخرکار بابر کی فتح پر منتج ہوا۔

26 دسمبر 1530ء کو وفات پانے والے بابر نے کابل پر 26 سال اور ہندوستان پر صرف چار سال حکومت کی ۔

بابر کا علم دوست' نیک نفس اور رحمدل بیٹا ہمایوں اگرچہ باپ کی طرح بہادر تھا مگر جفاکشی میں ویسا ہرگز نہیں تھا۔ آٹھ نو سال آرام سے حکومت کرنے کے بعد اسے بنگال پر قابض جری پٹھان شیر خان سے مقابلہ کرنا پڑا جسے شکست دے کر ایک دفعہ تو اس نے بنگال کو واپس لے لیا مگر اسے علم نہیں تھا کہ ہار نہ ماننے اور جفاکشی کی صفت میں شیر خان دوسرا بابر ہے۔ جب وہ بنگال سے واپس آ رہا تھا تو شیر خان چوسا کے مقام (26 جون 1539ء) پر اس کے آگے بند باندھے کھڑا تھا۔ اس بار قسمت نے ہمایوں سے وفا نہیں کی اور شکست ہوئی۔ ابھی شیر خان (جس نے ایک بار اپنے ساتھیوں سے کہا تھا کہ میں ایک نہ ایک دن مغلوں کو ہندوستان سے نکال کر دم لوں گا) اس کا مقصد پورا نہیں ہوا تھا۔ اس نے 16 مارچ 1540ء کو ایک بار پھر گنگا کے کنارے قنوج کے مقام پر ہمایوں کو گھیر لیا اور لاہور بلکہ سرگودھا تک اس کا تعاقب کرتا چلا گیا۔ ہمایوں کچھ عرصہ سندھ کے مختلف علاقوں میں دربدر رہا اور پھر اس نے کم و بیش دو سال ایران کے شاہ طہماسپ کے ہاں گزارے ۔طہماسپ کے عطا کردہ تیرہ ہزار سواروں کی مدد سے ہی اس نے 1545ء میں قندھار اور کابل اپنے بھائیوں عسکری اور کامران کے قبضے سے چھڑا لئے مگر تخت دہلی واپس حاصل

کرنے کیلئے اسے مزید دس سال تخت سور کے زوال کا انتظار کرنا تھا۔ دور تک دیکھنے والے بابر نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ فرید خان ایک خطرناک آدمی ہے' اس پر نظر رکھو۔ مگر اس وقت اس کی بات پر کسی نے توجہ نہ دی اور پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔ قصہ دراصل یوں ہے کہ بابر ہی کی ایک دعوت میں سہسرام کا جاگیردار فرید خان موجود تھا۔ دستر خوان پر کوئی ایسی ڈش رکھی گئی تھی جسے کھانے کیلئے چھری سے کاٹنا ضروری تھا۔ فرید خان نے ادھر ادھر دیکھا' چھری کہیں نزدیک موجود نہیں تھی۔ اب اس کی آزاد طبیعت نے گوارہ نہیں کیا کہ کسی سے چھری اٹھا کر دینے کیلئے کہے۔ اس نے اپنی کمر سے پیش قبض اتارا اور کھانا کھانے میں مصروف ہوگیا۔ یہ بادشاہ سلامت کے دسترخوان پر ایک دلیری کا اقدام تھا جسے بابر نے فوراً نوٹ کیا اور کہا کہ فرید خان پر نظر رکھی جائے مگر پھر وہی ہوا جو ہونا تھا۔

بابر کے دور حکومت میں فرید خان صوبہ بہار کے ایک علاقے سہسرام کا جاگیردار تھا۔ اس نے جوانی میں ایک شیر کو مار کر صوبے کے حاکم سے شیر خان کا خطاب پایا تھا۔ جن دنوں بابر ہندوستان میں قدم جما رہا تھا' شیر خان جونپور کے مدرسوں میں تعلیم پانے کے بعد اپنی جاگیر کے انتظام میں مصروف تھا مگر وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ میں ایک دن مغلوں کو ہندوستان سے نکال کر دم لوں گا۔ اسے یہ موقع ہمایوں کے دور میں ملا اور اس نے بڑھ کر بنگال پر قبضہ کرلیا۔ قبضہ تو ہمایوں نے چھڑا لیا مگر جیسا کہ پیچھے ذکر کیا گیا' واپسی پر وہ ہمایوں کا راستہ روک کر کھڑا ہوگیا' اسے شکست پر شکست دی اور آخر ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کردیا۔

فرید خان نے شیر خان کے لقب کے ساتھ ہندوستان پر چار پانچ سال حکومت کی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ عدل سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں۔ اس قول کے سائے تلے اس نے وہ کارنامے انجام دیئے جن کی نظیر نہیں ملتی ۔ شیر شاہ کے بعد اس کا لڑکا اسلام شاہ تخت پر بیٹھا اور نو سال (1545 ۔ 1554ء) حکومت کی۔ اس کے بعد آنے والے' اسلام شاہ کے بارہ سالہ بیٹے فیروز شاہ کو اس کے ماموں عادل شاہ نے قتل کرکے حکومت سنبھالی مگر اس کے ساتھ ہی مختلف علاقوں میں بغاوتیں شروع ہوگئیں۔

ہمایوں انہی دنوں کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ کابل سے اٹھا اور نومبر 1554ء میں پشاور اور فروری 1555ء میں لاہور پر قبضہ کرلیا۔ جولائی 1555ء میں اس نے آخری سوری حکمران سکندر شاہ کو شکست دے کر دہلی کا کھویا ہوا تخت واپس حاصل کرلیا۔ ابھی تخت تیمور ہنوز عدم استحکام کی منزلوں میں تھا کہ 24 جنوری 1556ء کو ہمایوں اپنے کتب خانے کی سیڑھیوں سے گر کر راہیٔ ملک عدم ہوا۔

فیروز شاہ سے ہمایوں تک کا سارا زمانہ سیاسی انتشار کا زمانہ ہے۔ مگر مرکزی نظام کی کمزوری اور بکھراؤ محض سیاسی نہیں تھا' روحانی سلطنت میں بھی یہی کچھ ہوا ۔ چشتیہ اور سہروردیہ فکر کی زوال پذیری کے بعد مہدوی' شطاریہ' مداریہ اور روشنیہ تحریکیں اسی مذہبی روحانی انتشار کا پتا دیتی ہیں ۔

نہات نیک نیتی سے اٹھنے والی تجدید دین کی تحریکیں غیر معتدل آزادہ روی اور انتشار کی رو میں بہہ کر اپنی منزلیں کھوٹی کر بیٹھیں۔

مہدوی تحریک کے بانی سید محمد جونپوری 1443ء میں جونپور میں پیدا ہوئے۔ ایام جوانی ہی میں آپ کی علمیت کا شہرہ ہر طرف پھیل گیا اور جونپور کے علما نے آپ کو اسد العلما کا خطاب دے دیا۔ یہ وہ دور ہے جب تخت جونپور پر اس کا آخری بادشاہ سلطان حسین شرقی حکومت کرتا تھا۔ سلطان حسین شرقی 1458 ء میں تخت نشین ہوا اور 1480 ء میں بہلول لودھی کے ہاتھوں تخت وتاج گنوا بیٹھا۔

دوست، دشمن سید محمد جونپوری کے ظاہری اور باطنی علوم اور زہد وتقویٰ کی قسمیں کھاتے تھے۔ اسی احساس وفضیلت کے ساتھ آپ نے 1495ء میں اپنے 360 مریدین کے ساتھ حج بیت اللہ کیا اور طواف کعبہ کے بعد حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا (اس سلسلے میں عام خیال یہی ہے کہ لوگ حجر اسود اور رکن یمانی کے درمیان مہدی کی پیروی اختیار کریں گے) اور کہا کہ میں انہی مادی آنکھوں کے ساتھ اس دنیا میں خدا کا دیدار کراسکتا ہوں۔ مختلف ریاستوں کے حکمرانوں کو تبلیغی خطوط بھی بھیجے گئے۔ سید محمد جونپوری 23 اپریل 1504ء کو خراسان کا سفر کرتے ہوئے فرہ کے مقام پر بہ عارضہ تپ دق انتقال کر گئے۔

مہدویت اپنے وقت کی نہایت قابل ذکر تحریک ہے۔ مہدویوں کا عقیدہ تھا کہ قرآن دو قسم کے فرائض کا ذکر ہوتا ہے۔ ایک تو وہ ہیں جن کا تعلق نبوت سے ہے اور حضرت محمدؐ نے بزبان شریعت ان کی تشریح کر دی مگر کچھ احکام ایسے بھی ہیں جن کا تعلق ولایت سے ہے۔ یہ مقام ولایت سید محمد جونپوری کو عطا کیا گیا ہے اور مقام ولایت میں درج ذیل احکام رکن دین کا درجہ رکھتے ہیں۔

1۔ ترکِ دنیا
2۔ محبتِ صادقین
3۔ عزلت از خلق
4۔ توکل
5۔ طلب دیدارِ خدا
6۔ عشر
7۔ ذکر کثیر
8۔ ہجرت

اس زمانے میں جب سائنسی اشتراکیت کو اپنے سر پیر کی خبر نہیں تھی، مہدویت نے اپنے نظریات کی اشاعت کے لئے مختلف مقامات پر سائنسی طور پر نہایت منظّم ''دائرے'' قائم کئے۔ ان دائروں میں لوگ نہایت اخلاص کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ یہ لوگ

ہر وقت قیامت کا انتظار کرتے۔ ان کے اندر دنیا کی ناپائیداری کا احساس نہایت شدید تھا، سو ان کے پاس جو کچھ ہوتا غربا میں بانٹ کر اور آپس میں تقسیم کر کے نہایت توکل کی زندگی گزارتے۔ شرع پر نہ صرف خود سختی سے پابند رہتے بلکہ جہاں کہیں خلاف شرع عمل دیکھتے، بہ زورِ بازو روکنے کی کوشش کرتے۔ مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں کہ ان لوگوں کے طور طریق عجیب عاشقانہ و والہانہ تھے اور ایسے تھے کہ صحابہ کرام کے خصائل ایمانی کی یاد تازہ کرتے تھے۔

شیر شاہ سوری کے بیٹے اسلام شاہ المعروف سلیم شاہ کے دور میں بنگالہ کے مشہور عالم شیخ علائی کے قبول مہدویت سے اس تحریک کو ایک نیا موڑ ملا۔ اس دور میں مخدوم الملک ملا عبداللہ سلطان پوری کو دربار میں وہی مقام حاصل تھا جو خلافت عثمانیہ میں شیخ الاسلام کا تھا۔ مخدوم الملک جائز طور پر شریعت کا پاسبان تھا، سو شیخ علائی کا سخت مخالف بھی تھا۔ اسی کے کہنے پر اسلام شاہ نے شیخ علائی کو اپنے دربار میں طلب کیا۔ اب شیخ علائی اپنے ہی مزاج کے آدمی تھے، اس لئے اسلام شاہ سے نہایت بے اعتنائی سے پیش آئے اور رسوم دربار کو بھی پاؤں کی نوک پر رکھا۔ اسلام شاہ نے مہدوی عقائد پر شرعی فیصلہ حاصل کرنے کے لیے علما کی کمیٹی بنائی۔ اس کمیٹی میں ابوالفضل اور فیضی کے باپ شیخ مبارک بھی شامل تھے جو شیخ علائی کے واحد طرف دار تھے۔ شیخ کو اپنا عقیدہ ترک کرنے کی شرط پر عہدہ محتسب کا بھی وعدہ کیا گیا مگر پر جوش تجدیدی طریقوں پر یقین رکھنے والے شیخ علائی نے انکار کر دیا۔ مخدوم الملک، جس نے پہلے ہی شیخ کے قتل کا فتویٰ جاری کر رکھا تھا، کیلئے یہ کافی تھا، سو انہوں نے شیخ کو کوڑے مروا کر شہید کروا دیا۔

یہ تو صرف ایک مثال ہے، مہدویوں نے ہمیشہ سیاسی عسکری زندگی کو اپنا طرہ امتیاز بنائے رکھا۔ مہدوی سپاہی اورنگزیب اور ٹیپو سلطان کے لشکر میں بھی شامل تھے۔ یہ لوگ پر خلوص مگر جوشیلے اور سریع الغضب ہوتے تھے اور اپنے نظریات کے لئے جان کی قربانی سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ ماضی قریب میں نواب بہادر یار جنگ مشہور مہدوی گزرے ہیں۔ کراچی میں اب بھی ایک 'ذکری مہدوی انجمن' کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔

اسی عہد میں ایک اور صوفیانہ تحریک ابھر کر سامنے آئی جو ہندوستان میں اپنے موسس اعلیٰ شیخ عبداللہ شطاری کے نام پر شطاریہ سلسلہ کہلاتی ہے۔ اس مکتبہ فکر کو عام طور پر شیخ بایزید بسطامی سے جوڑا جاتا ہے مگر اپنے مرشد کے حکم پر ایران سے ہندوستان آنے والے عبداللہ شطاری پر ایرانی صوفیانہ روایت کی بجائے ہندی وحدت الوجودی فلسفے کے گہرے اثرات تھے۔ انہوں نے قیام کے لئے اس وقت کے اہم سیاسی وثقافتی شہر جونپور کو منتخب کیا مگر سلطان ابراہیم شرقی کے متشرع اراکین دربار سے ان کی نہیں بنی۔ سو انہوں نے جونپور کو چھوڑا اور مالوہ کی راہ لی، جہاں انہوں نے بے مثال شوکتِ ظاہری و باطنی حاصل کر لی۔ ویسے بھی شیخ عبداللہ شطاری اس صوفیانہ فکر کے حامی تھے جس میں سطوتِ ظاہری کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ خود سلطانی لباس پہننے اور اپنے ہمراہیوں کو فوجی وردی پہننے کا حکم دیتے۔ مجلس میں ایک خاص نشان کے ساتھ جلوہ افروز ہوتے اور سفر سے

پہلے نقارہ بجواتے اور علم اٹھواتے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا' شیخ عبداللہ شطاری شدید ہندی سریت کے زیر اثر ویدانتی فلسفہ وحدت الوجود کے حامی تھی اور یہ نقطہ نظر اس قدر شدید تھا کہ وہ تصور فنا کو بھی رد کر دیتے تھے۔ اس لئے کہ فنا کا تصور بھی دو ذوات پر دلالت کرتا ہے' ایک وہ ذات جو فنا ہوتی ہے اور دوسری وہ جس میں پہلی ذات فنا ہوجاتی ہے۔ 1572ء میں وفات پانے والے عبداللہ شطاری کا مزار مالوہ کے سابق دارالحکومت مانڈو میں ہے۔

شیخ عبداللہ شطاری کے جانشینوں میں ایک شیخ محمد غوث گوالیاری ہیں جو شہرت واثر میں اپنے مرشد سے بھی آگے بڑھ گئے۔ شیخ فرید الدین عطار کی نسل سے تعلق رکھنے والے شیخ محمد غوث گوالیاری کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے تیرہ برس جنگل کے اندر رہ کر سخت ریاضتیں کیں اور درختوں کے پتے کھا کر اپنا پیٹ بھرتے رہے۔

شیخ غوث کا مغل دربار سے اس وقت تعلق قائم ہوا جب بابر نے قلعہ گوالیار کا محاصرہ کیا۔ اس وقت شیخ قلعے کے اندر ہی تھے اور ان ہی کی ترکیب سے مغل فوج نے قلعے کے اندر داخل ہو کر اسے فتح کیا۔ بابر کے بعد ہمایوں بھی شیخ کا معتقد رہا مگر جب شیر شاہ سوری کی حکومت آئی تو ظاہر ہے کہ یہ دن شیخ کیلئے مشکل تھے۔ سو انہوں نے اپنے اہل وعیال اور مریدان کے ساتھ گجرات کا رخ کیا۔ ویسے بھی شیخ اپنے باغیانہ مذہبی خیالات کے حوالے سے اپنے مرشد سے دو چار قدم آگے بڑھ گئے تھے' انہوں نے اپنی روحانی معراج کا دعویٰ کر دیا۔ اگر چہ یہ واقعہ وحدت الوجودی فلسفے کی ڈھکی چھپی اصطلاحوں میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی تھی مگر راسخ العقیدہ درباری علما اس صوفیانہ رنگ آمیزی کو محسوس کر سکتے تھے۔ سو ان پر زمین تنگ کر دی گئی اور اس سے قبل کہ کوئی سنجیدہ کارروائی کی جاتی وہ گجرات پہنچ چکے تھے۔ گجرات کے بادشاہ سلطان محمود گجراتی نے ان سے نہایت عمدہ سلوک کیا مگر ہندوستان میں جب ہمایوں کی حکومت دوبارہ قائم ہوگئی تو شیخ نے بھی مغل دربار کا رخ کیا مگر جب وہ واپس پہنچے تو ہمایوں وفات پا چکا تھا اور اس دفعہ مغلیہ دربار میں شیخ کی ویسی قدر دانی نہیں ہوئی جس کی انہیں توقع تھی' سو شیخ مایوس ہو کر گوالیار چلے گئے۔ شیخ نے 1562ء میں 80 سال کی عمر میں وفات پائی اور گوالیار ہی میں دفن ہوئے۔ شیخ کی موسیقی سے عشق کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کا سب سے بڑا گویّا تان سین ان ہی کے روضے کے احاطے میں دفن ہے۔

شدید ہندو سریت کے زیر اثر اسلامی راسخ الاعتقادی سے ٹکر کھانے والی ایک اور تحریک جو انہی دنوں شروع ہوئی' مداریہ تحریک تھی۔ یہ تحریک شام سے آنے والے ایک یہودی نے شروع کی' جس نے اسلامی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اسلام تو قبول کر لیا مگر اس پر پچھلے مذہب کی چھاپ کبھی ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس بزرگ کے طبعی رجحان میں جذب کرنے کی بے پناہ صلاحیت موجود تھی۔ سو ان پر ہندو ازم اور عیسائی مذہب کے بھی اثرات تھے۔

پندرھویں صدی کے ہندوستان میں یہ بزرگ شاہ بدیع الدین مدار تھے' جنہوں نے جونپور کو اپنا مسکن بنایا مگر عبداللہ شطاری کے برعکس سلطان ابراہیم شرقی نے انہیں اپنے دل میں جگہ دی۔

ہندوسریت کے زیر اثر شاہ بدیع الدین نے کلیتاً ہندی صوفیانہ طرز عمل کو اپنا لیا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بارہ سال تک کھانا نہیں کھایا اور جو لباس ایک دفعہ پہن لیا اس کو دھونے کی نوبت نہیں آئی۔ ان کے چیلوں نے بھی یہی طرز عمل اپنایا۔ وہ چار انگشت کی ایسی لنگوٹی پہنے بازاروں میں گھوما کرتے جن سے بمشکل اندام نہانی چھپ سکتا ہے' باقی جسم پر راکھ مل لیتے' سردیوں میں آگ کی گرمی سے ہی لحاف کا کام لیتے اور فولادی زنجیروں سے اپنے جسموں کو اذیت دیتے۔ نشہ آور اشیا کا استعمال بھی ان میں عام تھا۔ مسیحی اثرات کے زیر اثر اس سلسلے نے مسلم تثلیث کا نظریہ پیش کیا اور وہ یوں کہ انہوں نے ذات باری تعالیٰ کو روح' حضرت محمدؐ کو جسم اور شاہ بدیع الدین مدار کو سانس قرار دے دیا۔ ایسے خیالات بھی سامنے آئے' جن کے مطابق شاہ مدار کو ڈھکے چھپے الفاظ میں حضرت محمدؐ سے بلند درجہ عطا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اب ظاہر ہے کہ یہ ایسے خیالات تھے' جن کی کھلی اشاعت ممکن نہیں تھی' سو انہیں خفیہ رکھا جاتا تھا۔

پندرھویں صدی کے سیاسی انتشار میں روحانی بگاڑ پر مبنی ایک اور تحریک روشنیہ سلسلے کے نام سے مشہور ہے' جو ماں باپ کے ازدواجی بگاڑ کے دوران پیدا ہونے اور پرورش پانے والے میاں بایزید انصاری المعروف پیر روشن نے افغان علاقوں میں شروع کی اور جس کا دائرہ کار ہندوستانی علاقوں میں دور دور تک پھیلتا چلا گیا۔ میاں بایزید ایک افغان عالم عبداللہ کے گھر پیدا ہوئے جو کافی گرام میں رہائش پذیر تھے۔ یہ خاندان بنیادی طور پر افغان علاقے میں آباد تھا مگر کافی رشتہ دار ہندوستان میں بھی رہتے تھے۔ عبداللہ کا جالندھر آنا جانا رہتا تھا۔ یہیں پر اس نے ایک شادی کر لی جس کے نتیجے میں 1525ء میں میاں بایزید پیدا ہوئے مگر وہ خود کافی گرام لوٹ آئے اگرچہ نان نفقہ اپنی بیوی کو بھیجتے رہے۔ جب میاں بایزید کی عمر سات سال کی ہوئی تو ان کی ماں نے کافی گرام کا سفر اختیار کیا۔ یہاں پر ان کی افغان سوکن پہلے سے موجود تھی' جن سے ان کا نباہ نہ ہو سکا۔ خاوند کی بے رخی اور سوکن کی بدسلوکی طلاق پر منتج ہوئی اور شفقت مادری سے محروم ہونے والے بایزید کی اپنے باپ سے پھر کبھی نہیں بنی۔

نفسیاتی پس ماندگی کے شکار میاں بایزید انصاری نے کسی سے تعلیم حاصل نہیں کی' انہوں نے اپنا راستہ خود نکالا۔ خوب عبادتیں اور ریاضتیں کیں۔ کلام الٰہی اور احادیث پر غور کیا اور نتیجتاً ایسے خیالات وعقائد پیش کر دیئے جن کے مطابق ظاہری عبادات کی تنظیمی پابندیاں بے کار تھیں۔ حقیقتاً انہوں نے ایک نئی شریعت کا آغاز کیا جس کے مطابق نماز کیلئے قبلہ رو ہونے کی شرط نہیں اور غسل کیلئے پانی ضروری نہیں تھا۔ انتہا پسندی کا نقطہ نظر اپناتے ہوئے انہوں نے کہا کہ وہ آدمی جو ہمارے وحدت الوجودی راستے پر نہ چلے ان کا ذبیح حرام ہے۔ وہ اپنے مخالفین کو قتل کرنا اور ان کا مال لوٹنا جائز سمجھتے تھے اور اس کی وجہ وہ یہ بتاتے تھے کہ جو حقیقت شناس نہیں وہ حیوان ہیں اور

انہیں بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کرنا اور سانپ بچھو سمجھ کر ہلاک کرنا جائز ہے۔

بعض ہندو فرقوں کے تتبع میں پیر روشن نے پہلی دفعہ رقص و سرود کی محفل میں عورتوں اور مردوں کو یکجا بٹھانے کا رواج شروع کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کے عقیدہ تناسخ کو پیر روشن نے اپنی تعلیمات کا حصہ بنالیا تھا۔ اپنے آپ کو ہادی سمجھنے والے اور الہام کا دعویٰ کرنے والے پیر روشن افغان علاقوں سے بڑھ کر خراسان اور ہندوستان کے علاقوں کے روحانی و سیاسی تسخیر کا خواب دیکھتے تھے' اس سلسلے میں ان کی مغلوں سے لڑائیاں بھی ہوئیں۔ ان کے پانچ بیٹے تھے' سب سے بڑے اور ان کے جانشین شیخ عمر کو یوسف زئی قبائل نے قتل کر دیا۔ ایک اور بیٹا بھی اسی لڑائی میں کام آیا' ایک کو گوجروں نے ہلاک کیا' ایک شہنشاہ اکبر کی قید میں فوت ہوا۔ آخری بیٹے میاں جلال الدین جسے مغل' جلالہ' کہتے ہیں' نے مغل دربار سے اچھا تعلق بنانے کی کوشش کی مگر پھر اپنے پرانے راستے پر آ گیا۔

شیخ عمر کا بیٹا احداد خان جہانگیری لشکر کے ہاتھوں مارا گیا۔ آخر کار احداد خان کے بیٹے عبدالقادر کو شاہ جہاں نے اعلیٰ منصب عطا کر کے امرائے شاہی میں داخل کیا اور یوں فرقہ روشنیہ اور مغل دربار میں کش مکش ختم ہوئی۔ راسخ الاعتقادی سے مسلسل تصادم اور علما کے مسلسل تعاقب نے آخر اس تحریک کو زوال پذیر ہونے پر مجبور کر دیا۔

ہندوستانی تصوف پر ابن عربی کے اثرات کو کم و بیش ہر جگہ کھوجا جا سکتا ہے۔ ابن عربی کے ابتدائی متاثرین میں سہروردی سلسلے کے بانی بہاؤالدین زکریا کے فرزند شیخ صدر الدین عارف کا نام لیا جاتا ہے۔ بعض تذکرہ نگار سلطان فیروز شاہ تغلق کے ایک رشتہ دار مسعود بک کا بھی ذکر کرتے ہیں جنہیں وحدت الوجودی ہونے کی بنا پر قتل کر دیا گیا تھا مگر ابن عربی کے ہندوستانی مداحین میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی (پیدائش 1460ء وفات 1538ء) اہم ترین حیثیت کے حامل ہیں۔ فلسفہ وحدت الوجود کا یہ ممتاز ہندوستانی شارح ایک لحاظ سے مختلف بھی ہے اور وہ اس طرح کے فلسفہ وحدت الوجود کو خلافِ شریعت نہ ماننے کے باوجود ان کا خیال ہے کہ اس فلسفے کو قرآن کی کسی نص صریح اور سنت کے عمومی رویے سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ فلسفہ وحدت الوجود کا عوام الناس میں پرچار پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ یہ الوہی راز ہے' جس کا اظہار بھی کفر ہے۔

اسی طرح کی پر شور فضا میں جب چشتیہ اور سہروردیہ سلسلوں کے زوال کے بعد روحانی میدان بنجر ہونے کے قریب تھے' ایک اور طرف سے روشنی کی کرن پھوٹی اور حالات کے سدھار کیلئے اپنی سی کوشش کر گئی۔ یہ پیران پیر غوث اعظم شیخ عبدالقادر جیلانی (وفات 1160ء) سے منسوب سلسلہ قادریہ کی طرف سے ویران دلوں پر دستک دینے کی ایک کوشش تھی۔ اس سلسلے نے پنجاب اور سندھ میں قابل قدر کامیابیاں حاصل کیں۔

اس سلسلے کے پہلے قابل قدر بزرگ مخدوم محمد گیلانی ہیں جو عبدالقادر جیلانی کی اولاد ہی میں

سے ہیں۔ آپ حلب میں پیدا ہوئے اور اپنے والد کی وفات کے بعد ہندوستان تشریف لائے اور اچ شریف میں قیام پذیر ہو گئے۔ سکندر لودھی آپ کے معتقدین میں سے ہیں۔ آپ کی تاریخ پیدائش 1517ء ہے۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے بیٹے مخدوم عبدالقادر ثانی جو مقام روحانیت میں واقعی عبدالقادر ثانی ہیں' نے اس سلسلے کی قبولیت کو بام عروج پر پہنچایا۔ آپ 1533ء میں فوت ہوئے۔ آپ کے بعد آپ کے پڑپوتے شیخ موسیٰ پاک شہید کا نام قابل ذکر ہے جو ملتان میں پاک دروازہ کے اندر دفن ہیں۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اسی بزرگ سے قادریہ سلسلے میں بیعت کی تھی۔

اسی زمانے میں شیخ عبدالقادر ثانی کے پوتے سید حامد کے ایک خلیفہ شیخ داؤد کرمانی ایک بڑے باکمال قادری بزرگ گزرے ہیں۔ شیخ داؤد کرمانی نے بڑی ریاضتیں کیں۔ کہا جاتا ہے کہ آپ برہنہ سر اور برہنہ پا دیپال پور کے صحرا میں پھرا کرتے تھے۔ یہ صحرا نوردی کام آئی اور جلد ہی آپ کی شہرت پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔

اگرچہ آپ خود بڑے پابند شریعت بزرگ تھے مگر یہ سلیم شاہ سوری کا زمانہ تھا اور مخدوم الملک عبداللہ سلطان پوری رد بدعت کا کوڑا اپنے ہاتھ میں لئے پھرتا تھا۔ چنانچہ آپ کو بھی دربار میں طلب کیا گیا مگر مخدوم الملک خود ہی آپ کے زہد و تقویٰ کا قائل ہو گیا۔ کہا جاتا ہے کہ تکلم و تبسم کے وقت آپ کے چہرے پر ایسا نور برستا تھا جو ویران دلوں کو منور کر دیتا۔ آپ کی وفات 1572ء میں ہوئی اور آپ ساہیوال کے ایک قصبہ شیر گڑھ میں آرام فرما ہیں۔

سلسلہ قادریہ کو ایک بہت بڑا افتخار حاصل ہے...... اپنے ایک ارادت مند کی وجہ سے...... اور وہ اس طرح کے شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے شیخ عبدالقادر ثانی کے پڑے پوتے شیخ موسیٰ پاک کے ہاتھ پر اسی سلسلہ قادریہ میں بیعت کی تھی!

(جاری ہے)

❁❁❁

تم کو ارزاں ہے تماشئہ تمدن
ہم سے اپنی ہی کفالت نہیں ہوتی
(منجمد پیاس۔ احسن سلیم)

(تبصرے، مضامین، اظہار خیال)

سرد جنگ/گرم جنگ

محمود شام

میں سب سے پہلے تو جناب سلیم صدیقی کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد دینا چاہوں گا کہ وہ اس دور میں جب لکھنے، پڑھنے کی کوئی عزت رہی ہے نہ ضرورت' انھوں نے زمانے کی اس ناقدری کے باوجود تقریباً 57 عالمی افسانوں کو انتہائی رواں، سلیس اردو میں منتقل کیا اور رنگِ ادب پبلی کیشنز سے اسے شائع کرنے کی ہمت کی۔

میں نے بھی کئی کتابیں تصنیف کی، تالیف کیں، ترجمہ بھی کیا۔ لیکن اب ایک عرصہ سے کتاب مرتب کرنے، چھپوانے کی طرف طبیعت نہیں آ رہی ہے۔ جی نہیں مانتا' لگتا ہے کہ ہم اپنے ہم نفسوں پر بلا وجہ بوجھ لا د رہے ہیں' پڑھنا کون چاہتا ہے کس کو دلچسپی ہے۔

ایک طرف تو یہ کیفیت ہے، دوسری طرف ہم حسن اسکوائر میں لگنے والا کتاب میلہ دیکھتے ہیں، جہاں لاکھوں کراچی والے آتے ہیں، اپنے اہل خانہ کے ہمراہ۔ بچوں کو گود میں اٹھائے یا ٹرامپ میں لئے۔ کروڑوں کی کتابیں بکتی ہیں، پھر خیال آیا کہ شاید ہم وہ کتابیں نہیں لکھ رہے ہیں، جو بکتی ہیں یا ہم وطنوں کو جن کی ضرورت ہے۔

عالمی ادب کے شاہکار افسانے سلیم صدیقی کی قابل قدر کوشش ہے۔ نہ جانے اس کے پس منظر میں کتنے رَت جگے ہوں گے۔ کس کس لائبریری کی خاک چھانی گئی ہوگی' افسانوں کے کتنے مجموعے پڑھے گئے ہوں گے' تب یہ 57 موتی کہانیوں کے اس سمندر سے چنے گئے ہوں گے۔

Transfer Of Technology کی بات ہر روز ہی ہوتی ہے۔ دنیا جیسے ٹیکنالوجی کے تبادلے سے آگے بڑھتی ہے، اسی طرح تہذیب وتمدن علم ودانش کے تبادلے سے نشو ونما پاتے ہیں۔ علم کی منتقلی ترجمے کے ذریعے ہی ہوسکتی ہے۔ عالمی تاریخ پر نظر رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ یورپ میں نشاۃ ثانیہ Renaissance کے ترجمے کے ذریعے ہی ممکن ہوا تھا۔ بارہویں صدی عیسویں ترجمے کی صدی تھی، جب بنیادی طور پر عربی سے ریاضی، طب، فلسفہ انگریزی کے روپ میں ڈھالا

گیا۔ لاطینی اور یونانی سے یہی حکمت انگریزی میں منتقل ہوئی۔ اسے باقاعدہ نام ہی Translation Movement دیا گیا۔ ترجمے کی اس تحریک نے یورپ کو خوشحالی دی، شفادی، تسخیر کیلئے نئے علمی آفاق دیئے۔

پھر کئی صدیوں بعد جب سرد جنگ کا دور آیا، تب مقابلہ زیادہ تر علم کی بنیاد پر ہو رہا تھا۔ امریکہ روس اور دونوں کے اتحادیوں میں کتنی کتابیں مفت تقسیم کی جاتی تھیں۔ سوویت یونین کا اعلیٰ ادب، ناول، افسانے، شاعری، اردو سمیت تمام ملکوں کی مقامی زبانوں میں ترجمہ کر کے کتابی صورت میں مفت یا بہت کم قیمت پر بانٹی جاتی تھیں۔ امریکا کمیونزم کے خلاف ادبیات کو مقامی زبانوں میں ترجمہ کر کے کم قیمت یا مفت تقسیم کرتا تھا۔ دونوں طاقتیں مقامی زبانوں میں بہترین کاغذ پر رسالے شائع کرتی تھیں۔ امریکا کا سیرین روس کا طلوع ہم سب کو یاد ہے، لائبریریاں بھی سفارتخانوں کے ساتھ ہوتی تھیں، یہ لائق تحسین ہے کہ روس کا مرکز ثقافت تو موجود ہے جہاں آج اس تقریب کا اہتمام ہو رہا ہے لیکن رشین لائبریری اب نہیں رہی۔

اردو ادب میں ترجمے کے فن کی بڑی قدیم روایت ہے۔ بڑے بڑے نامور ادیبوں نے ترجمے کئے ہیں۔ بہت سوں نے تو اپنے شوق کے تحت کئے کہ دوسری زبانوں کا اعلیٰ ادب اردو کے قارئین تک پہنچا سکیں، کچھ اپنی معاشی ضرورتوں کے تحت مترجم بنے۔ سفارت خانے اچھے خاصے پیسے دے دیتے تھے۔ ایک دور تھا، جب سارے بڑے اشاعت گھر ناولوں، افسانوں، تنقیدی مقالات کے تراجم باقاعدگی سے شائع کرتے تھے۔

ترجمہ ایک پوری تہذیب، پورے تمدن اور ایک الگ دنیا کو آپ کی زبان میں آپ تک لے کر آتا ہے۔ سلیم صدیقی صاحب کا منتقل کردہ اس گراں قدر خزانے میں سے ابھی پورے اوراق کے مطالعے کا موقع تو نہیں ملا، چند ترجمے پڑھ سکا ہوں، ان میں مفہوم بھرپور انداز میں قاری تک پہنچ رہا ہے۔ اجنبی ماحول ہے، علاقے ہیں، لیکن ان کی زبان اسے ہمارا اپنا بنا رہی ہے۔ مکالموں میں اسی طرح برجستگی باقی ہے۔ بعض تراجم مشکل ہوتے ہیں، لفظ بہ لفظ کر دیئے جاتے ہیں، سلیم صدیقی کے ترجمے سے لاشعوری طور پر مجھ تک تو احساس منتقل ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف مصنف کے اسی افسانے کو نہیں، بلکہ اس مصنف کی شخصیت اور فن کا بھرپور مطالعہ کیا ہے، اس کے عہد کو بھی پڑھا پھر اس افسانے کو اپنے اس مجموعے کے لئے منتخب کیا ہے۔

اردو کے افسانوی ادب میں یقیناً یہ ایک قابل قدر اضافہ ہے، خاص طور پر آج کے اردو کے طالب علموں کی نئی نسل کو اس سے بہت روشنی ملے گی، لکھنے اور پڑھنے کی تحریک ہوگی۔ سلیم صدیقی کی اردو بہت دل نشیں، آسان اور بامحاورہ اور برجستہ ہے۔

اعلیٰ ادب ہی نہیں' ضرورت ہے کہ باہر جو کچھ چھپ رہا ہے، جیسے دنیا آگے بڑھ رہی ہے شہری کامیاب زندگی گزار رہے ہیں، جذباتی اندازِ فکر کی بجائے سائنسی سوچ اختیار کر رہے ہیں، معروضی اسلوب برت رہے ہیں، ان تحریروں کو بھی اردو میں منتقل کیا جائے۔ میں اپنے ماہنامہ 'اطراف' کے

ذریعے کچھ محدود کوشش کر رہا ہوں، اس میں نصف سے زیادہ صفحات دوسری زبانوں میں چھپنے والی کتابوں اور جرائد سے منتخب تحریروں کے ترجموں پر مشتمل ہوتے ہیں۔

پاکستان میں بڑھتی ہوئی انتہاپسندی، جذباتیت اور بےمقصدیت سے آئندہ نسلوں کو بچانے کیلئے ترقی یافتہ قوموں کے ادب، جدید علوم، تہذیبی رجحانات اور محسوسات کو اردو بلکہ علاقائی زبانوں میں بھی ترجمہ کر کے پہنچانا بہت ضروری ہے۔ الغرض آج ہمیں بھی ایک Translation Movement کی ضرورت ہے۔

(یہ مضمون قونصل جنرل روس، کراچی میں پڑھا گیا)

❁❁❁

ہر شام نکلنا کسی انجان کی مانند
کیا خوب سزا ہے مرے دل دار سے کہنا
(منجمد پیاس۔احسن سلیم)

مجید امجد: تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ

محمد حمید شاہد

پچھلے ہفتے مجھے کوئی اٹھانویں سال کی عمر کو پہنچے ہوئے * کشمیری لال ذاکر کی مرتب کردہ کتاب ''فیض کی دنیا'' ملی تھی، مگر میں اُسے کل کھول کر دیکھ پایا، اس انتخاب کے سارے مضامین وہ تھے، جو فیض کی سترویں سالگرہ پر صابر دت نے ''فن اور شخصیت'' کے خاص نمبر میں چھاپے تھے، جنھیں جھاڑ پونچھ کر اس کتاب میں پھر سے چھاپ لیا گیا تھا۔ میں نے اپنے تئیں سوچا، شمس الرحمٰن فاروقی نے یہ انتخاب کیوں بھیجا تھا۔ وجہ، جو مجھے سمجھ میں آئی وہ یہ تھی کہ اس میں ایک عدد مقدمہ فاروقی صاحب کا شامل تھا۔ کتاب میں بس یہی نیا تھا۔

ڈاکٹر نوازش علی کی بہت اہم کتاب ''مجید امجد: تحقیقی وتنقیدی مطالعہ'' پر کچھ عرض کرنے سے پہلے اسی مقدمے سے مقتبس کرنا چاہتا ہوں۔ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

> ''اُردو کے ادبی اور غیر ادبی معاشرے میں ایک فیشن کے طور پر فیض کو ''عظیم ترین شاعر' سمجھنے اور بتانے کا جو سلسلہ جاری رہا ہے، اس کی ہمنوائی میں نے کبھی نہیں کی۔ میں فیض کو میرا جی، ن م راشد، مجید امجد اور اختر الایمان کے ساتھ رکھتا ہوں، ہر چند کہ میری نظر میں ان کا درجہ ان میں چاروں کے بعد ہے۔''

میں نہیں جانتا کہ فاروقی نے آخر فیض کو اتنا معزول کیوں کیا کہ وہ درجے میں اختر الایمان سے بھی مات کھا گئے، تاہم میں اتنا جانتا ہوں کہ مجید امجد کا طرز احساس اتنا منفرد اور تخلیقی تجربہ اتنا مختلف تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے معاصرین میں قامت کو اور بھی نمایاں کرنے لگے تھے۔ جی، میں ان معاصرین کی بات کر رہا ہوں جو اقبال کے بعد کے نمایاں ترین شعراء ہیں اور جنھیں اپنی زندگیوں ہی میں شہرت اور قبولیت کی سند مل چکی تھی۔ ڈاکٹر نوازش علی کی یہ بات پھینک دینے کے لائق نہیں ہے کہ مجید امجد کے معاصرین کے اپنے اپنے شعری آفاق رہے اور یہ بھی تسلیم کہ سب کے اپنے اپنے امتیازات ہیں، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ جب، ہم عصروں کے ساتھ رکھ کر شاعروں کی فکری اور

فنی توفیقات کی طرف دیکھا جاتا ہے، تو قلم خود بہ خود باہمی موازنے کے لیے بنیادیں فراہم کرنے لگتا ہے، بالکل ایسے ہی جیسے ڈاکٹر نوازش علی نے کتاب کے آخری باب میں کیا۔ اس باب میں ہمارے محقق ناقد نے اپنے زمانے میں ''بے نشانی کی نشانی'' ہو جانے والے مجید امجد کو فیض، میرا جی، راشد، ناصر کاظمی، مختار صدیقی، احمد ندیم قاسمی، عزیز حامد مدنی، اختر الایمان، ضیا جالندھری اور منیر نیازی جیسے شاعروں کے ساتھ رکھ کر نہ صرف دیکھا اور آنکا ہے، شہرت کی بنیاد پر قائم تنقیدی بصیرتوں پر چرکے بھی لگائے ہیں۔

معاف کیجئے کہ میں مجید امجد کی زندگی اور فن پر ڈاکٹر نوازش علی کی کتاب کے آخری باب کا ذکر پہلے لے بیٹھا اور اس ترتیب سے گفتگو کو آغاز نہیں دے پایا ہوں، جسے ہمارے محقق ناقد نے ملحوظ خاطر رکھا ہے۔ جس ترتیب میں کتاب کو لکھا گیا ہے، اس میں مجید امجد کی زندگی کے کوائف بہت اہم ہو جاتے ہیں۔ ''سوانح اور شخصیت'' کی ذیل میں مرتب کئے گئے کوائف اس لحاظ سے مصدقہ کہے جا سکتے ہیں کہ اس باب میں پہلے سے موجود مواد کو جوں کا توں نقل نہیں کر دیا گیا، اسے مختلف زاویوں سے جانچا اور پرکھا گیا ہے، دیگر تحریری حوالوں اور واقعاتی شہادتوں سے اسے تصدیق یا تردید کے مرحلوں سے گزارا گیا اور اب تک معرض تحریر میں نہ آنے والے گوشوں کے باب میں ریاضت کو شعار کر کے پورے شخص کو سامنے لانے کے جتن کیے گئے ہیں۔ اپنے ان جتنوں میں وہ بہت حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ تاہم مجھے کہنے دیجئے کہ ساڑھے پانچ سو صفحات کی کتاب میں لگ بھگ تین سو صفحات میں جس مجید امجد کو اجالا گیا ہے، اس سے ہزار درجوں میں بلند قامت اس مجید امجد کی ہے، جو اپنی نظم کے اندر سے قامت نکالتا ہے۔ کتاب کے اس حصے کی تحقیقی افادیت اور اہمیت اپنی جگہ، اور یہ بھی بجا کہ اس باب میں بہت سی الجھنوں کو سلجھایا گیا ہے، مگر کتاب کے باقی ماندہ حصے سے ایسا مجید امجد برآمد ہوتا ہے کہ اس کی مشقت بھری پہاڑ سی زندگی اس کی تخلیقی زندگی کے روشن لباس کے کالر پر ایسے تنکے کی سی ہو جاتی ہے جس کی اتنی بھی اہمیت نہیں رہتی جتنی اہمیت شعر غالب کے مقابلے میں اسے پنشن نہ ملنے والے واقعے اور اس پر کی گئی تحقیق کو رہی ہوگی۔

یوں بھی نہیں ہے کہ میں تحقیق کے اس اہم کام کو بالکل اہمیت نہیں دے رہا، کتاب اپنے نام سے ہی تحقیقی اور تنقیدی مطالعے کا اعلان کر رہی ہے، تو اس کا اہتمام بھی لازم تھا اور ہمارے محقق نے مجید امجد کی اُلجھی ہوئی شخصی زندگی کو جس طرح سنجیدہ مباحث قائم کر کے سلجھایا، اس باب میں پہلے سے موجود کام کو پرکھا، سہل نگار محققین کو آڑے ہاتھوں لے کر انہیں درست راہ دکھائی اور برسوں کی ریاضت سے جس طرح گم شدہ کڑیوں کو ڈھونڈھ کر مجید امجد کی شخصی زندگی مرتب کر دی، یہ کام بہت اہم اور بنیادی حوالہ ہو جانے کی سکت رکھتا ہے۔ کتاب کے اسی افتتاحی حصے میں ہمارے محقق نے مجید امجد کے دودھیالی اور ننھیالی شجرہ جات بھی مرتب کر دیے ہیں۔ یہ کام بھی پہلی بار ہوا ہے اور اس کی داد دی جانی چاہیے۔ میں نے ان شجروں کو بڑی توجہ سے دیکھا اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ شجرہ جات اگرچہ مصدقہ مواد سے مرتب کیے گئے ہیں لیکن دیکھنے والے کو بہت الجھاتے ہیں۔ میں بھی اول اول

الجھا ہوں اور مجھے میں اپنی الجھنوں سے نکلنے کے لیے بعد میں آنے والی تفصیلات کو پڑھنا پڑھا ہے۔ ایسے میں میرے دل میں رہ رہ کر یہ خیال آتا رہا کہ ہمارے محقق نے آخر شجرہ مرتب کرنے والے اُس قرینے کو کیوں نہیں برتا جو ہمارے ہاں لگ بھگ ایک صدی سے مروج چلا آ رہا ہے۔ جی، میں اسی قرینے کی بات کر رہا ہوں جو سر جیمز میک کرون ڈوئی (Sir James McCrone Douie) کی کتاب The Punjab Land Adminstrative Manual میں موجود ہے، یہ کتاب پہلی بار 1915 میں چھپی تھی، اور مسلسل چھپتی رہی ہے۔ شجرہ مرتب کرنے کا یہ طریقہ ہمارے ریونیو ریکارڈ کی اہم کتاب مسلحقیت یا جمع بندی کا لازمی حصہ ہونے کی وجہ سے دیہی معاشرت میں جانا پہچانا ہے۔ اور ہاں اس باب کی ایک اور خواہش، کیا ہی اچھا ہوتا کہ مجید امجد کی زندگی کو مربوط صورت میں ایک کہانی کی طرح لکھا جاتا اور اس باب کے الجھیڑے اور اختلافی مباحث پاورقی حواشی میں ڈال دے جاتے یا اس باب کے آخر میں حوالہ ہو جاتے، تو بہت سے مقامات پر دہرائی جانے والی باتیں از خود منہا ہو جاتیں۔ خیر، یہ میری خواہش ہے۔ میں جو محقق نہیں ہوں۔ اور مجھے تسلیم کرنا چاہیے کہ میں کہانیاں لکھنے والا ہوں اور شاید اسی وجہ سے ایسا سوچنے لگا ہوں، ورنہ یہ کتاب کا سوانحی حصہ نہ تو فکشن ہے نہ محض حیات نامہ، یہ تو اس کا تحقیقی مطالعہ ہے اور اس کے لکھنے کو تحقیق کی دنیا میں اسی طور رواج دیا گیا ہے۔

''مجید امجد کی شاعری: عمل خیر کا تسلسل'' اس کتاب کا ایسا باب ہے جس میں مجید امجد کے تخلیقی شعور کے ایسے روشن ترین علاقوں کو نشان زد کیا گیا ہے، جس نے اپنے ماحول کی دھول میں اٹے ہوئے شخص کو کہیں پیچھے چھوڑ کر اتنا بلند ہو کر دیا ہے کہ ہمیں پہلے سے موجود بلندیاں ہیچ لگنے لگتی ہیں۔ اسی باب میں خود مصنف کا تنقیدی شعور بھی خوب خوب جولانیاں دکھاتا ہے۔ سچ پوچھیں تو کہیں کہیں میں ان کے بیان میں بہتا چلا گیا ہوں۔ صاف ستھری تنقیدی زبان اور شاعر کے بنیادی تخلیقی قضیوں کو اخلاص سے کھوجنے کے اس عمل نے نہ صرف اس کتاب کو اہم بنایا ہے، خود اس ناقد کے تنقیدی فہم کی دھاک بھی میرے دل پر بٹھا دی ہے۔ ڈاکٹر نوازش علی کا یہ کہنا بجا ہے کہ: ''اگرچہ غم و آلام اور مسائل و مصائب سے بھری ہوئی دنیا میں شاعرانہ اور خلاقانہ شعور و ادراک ایک عذاب بے پایاں سے کم نہیں، لیکن مجید امجد نے اس عذاب بیکرانی کو ایک جامع بصیرت سے دیکھا ہے۔''

کتاب کے اس حصے میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح مجید امجد اپنی شاعری کے ابتدائی چند برسوں کے بعد ہی اپنے عہد کی موضوعاتی اور اسلوبیاتی وضعوں سے بتدریج الگ ہوتے چلے گئے اور یہ بھی کہ ان کی توجہ اپنے شعری امکانات کو تلاشنے، تراشنے اور انھیں وسعت دینے کی طرف ہو گئی تھی۔ اور یہ ایسے زمانے میں ہو رہا تھا کہ جب ترقی پسند تحریک کے ذریعے محبوب ہو جانے والا چلن ہی شاعری کا مقبول چلن تھا یا پھر بعد میں نئی شاعری کے نام سے لکھی جانے والی نظم نمایاں ہو رہی تھی۔ اس باب میں مجید امجد کے ان تحریکوں سے فنی، اور موضوعاتی اشتراک یا اختلاف کے علاقے نشان زد کرنے کے بعد مصنف نے اس لطیف فرق کو بھی نشان زد کر دیا گیا ہے، جو مجید امجد کو مقبول رویوں سے الگ کر کے

نمایاں کرتا ہے۔ ڈاکٹر نوازش علی کا یہ تجزیہ بہت توجہ کا طالب ہے کہ مجید امجد کے ہاں کوئی بھی نظریہ نظریہ نہیں رہتا، بلکہ احساسات کی صورت میں تخلیقی تجربہ بن جاتا ہے۔ بجا مگر یہ بات بھی کم اہم نہیں ہے کہ تبدیلی کی خواہش شاعر کے ہاں شدت سے ظاہر ہوتی ہے، جو بہ جائے خود ایک نظریہ ہو جاتی ہے۔ مصنف نے کئی نظموں کے حوالے دے کر مجید امجد کے ہاں تبدیلی کی اس خواہش کو بحث کا حصہ بنایا ہے اور واضح کیا ہے کہ وہ داخلی اور خارجی یا پھر انفرادی اور اجتماعی ہر ہر سطح پر معاشرے کو منقلب دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہیں نوازش علی مصر ہیں کہ یہ خواہش ''ہجوم عاشقاں'' کی ہمرہی میں ''سوئے مقتل'' جانے والی خواہش سے مختلف اور کلیت میں ہمہ جہت ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ کتاب پڑھتے ہوئے کئی مقامات پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعری کو عمل خیر سمجھنے والے مجید امجد کی اس سے بہتر تفہیم یا کچھ اور تفہیم ممکن نہیں تھی۔

مجید امجد کے تصور ہیئت، آزاد نظم اور غزل پر قائم کئے گئے مباحث بھی بیشتر مقامات پر تکنیکی ہونے کے باوجود بہت پر لطف ہیں۔ پڑھتے پڑھتے کئی بار خیال آیا، اپنے ناقد سے ضرور پوچھوں گا، بھئی آپ کو تکنیکی بھید بھنوروں کا اتنا گہرا ادرک ہے تو شاعری کیوں نہ کی؟ خیر، یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں نے آغاز میں فاروقی صاحب کو مقتبس کیا تھا جنھوں نے مجید امجد کو اپنے ہم عصروں میں نمایاں مقام دیا ہے۔ کیا وہ ایسا شروع سے سوچتے تھے؛ شاید نہیں۔ سلیم احمد جیسے شاعروں کے ہاں تو مجید امجد چلا ہی نہیں تھا، مگر واقعہ یہ ہے کہ جب چل نکلا تو وہ بہتوں سے قامت نکالنے لگا۔ میں سمجھتا ہوں، ڈاکٹر نوازش علی کی یہ کتاب ایک اہم ادبی واقعہ ہے، یہ نہ صرف آنے والے وقتوں میں بطور حوالہ استعمال کی جائے گی، اس میں قائم تنقیدی مباحث سے مجید امجد کے کام کی تفہیم نو کا چلن اور بھی عام ہوگا، اور کیا خبر ایسے میں مجید امجد مزید نکھر کر اپنی قامت مزید بلند کر لے۔

❁❁❁

کشمیری لال ذاکر کا شمار ہندی اور اردو کے اہم تخلیق کاروں میں ہوتا تھا۔ ناقدین ادب اُنھیں ناسٹلجیا کی پر اثر عکاسی کرنے والا فکشن نگار قرار دیتے ہوئے اُن کی کہانیوں کے رچاؤ اور قارئین کے وسیع حلقے کا بالخصوص ذکر کرتے۔ اردو اور ہندی میں انھوں نے لگ بھگ 130 کتابیں لکھیں۔ 7 اپریل 1919 کو آنکھ کھولنے والے اس فکشن نگار نے جموں کشمیر کو کمال مہارت سے موضوع بنایا۔ ان کے ڈرامے، افسانے اور سفرنامے اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ٹھہرے۔ ہندوستان نے انھیں پدم شری ایوارڈ پیش کیا، ہریانہ سرکار نے فخر ہریانہ کے اعزاز سے نوازا تھا۔ 31 اگست 2016 کو چندی گڑھ میں اُن کا انتقال ہوا۔ ان کی عمر 97 سال تھی۔

شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

(سید ضیاء الدین نعیم کے شعری مجموعے ''ندی، دریا، سمندر'' کا ایک جائزہ)

محمد آصف مرزا

قیام پاکستان سے لے کر تا حال غزل اپنے سفر نو کا ایک خاصا طویل اور کسی حد تک کٹھن فاصلہ طے کر چکی ہے اور غزل کی سخت جانی کا کیا ٹھکانہ۔ کسی نقاد نے کہا تھا کہ اگر اردو شاعری باقی رہی تو غزل کی صورت میں رہے گی۔ خیر ہم لوگ تو وہ سخی ہیں کہ جنھوں نے پورا ملک انگریزوں کو تھالی میں رکھ کر پیش کر دیا، مگر شاعری پر آنچ نہیں آنے دی، اس لئے اردو شاعری بالخصوص غزل کے بارے میں یہ خوش گمانی کچھ ایسی بے جا نہیں ہوگی کہ اسے فنا کا کوئی فوری خطرہ درپیش نہیں۔ یوں بھی ہمارے اولین دور کے ایک اہم شاعر حضرت ولی دکنی اپنے ایک مشہور شعر میں یہ پیش گوئی فرما گئے ہیں۔

راہِ مضمون تازہ بند نہیں　　　تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن

بات غزل کی سخت جانی کی ہو رہی تھی۔ ہماری شاعری کے کلاسیکی دور میں تمام اصناف سخن میں یکساں طور پر بڑی بھر پور شاعری ہوئی۔ قصیدہ اور مثنوی کی دیگر ذیلی اقسام میں اس زمانے میں کی جانے والی شاعری کے اعلیٰ اور عمدہ نمونے موجود ہیں، تاہم یہ ہر دو اصناف، شاید اپنی طبعی عمر پوری کر چکیں اور قطعہ اب بھی موجود ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنی ہیئت و ساخت میں اور معنوی و فکری اعتبار سے بھی غزل کے قریب تر ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل میں آزاد نظم مغرب سے آئی اور یہ گویا غزل کی حلیف و دم ساز ٹھہری، اگر چہ ایک زمانے میں اسے غزل کا حریف بنانے کی کوشش بھی کی گئی، تاہم وہ کامیاب نہ ہو سکی، اب ان کا آپس میں کوئی اختلاف نہیں، دونوں اپنے اپنے راستے پر گامزن ہیں۔ نظم کی یلغار غزل کی سخت جانی کو کوئی زک نہیں پہنچا سکی۔ وجہ یہ ہے کہ غزل ایک مقبول ترین صنف سخن بھی ہے۔ گزشتہ تین چار صدیوں سے اس کی مقبولیت میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور حالیہ برسوں میں اس میں مزید تیزی آئی ہے۔

رہی بات غزل کے مضامین کی، تو دیکھئے ہمارے ظفر اقبال کیا کہتے ہیں۔

غزل کہ تھی ہی ظفر حرفِ بازناں گُفتن　　　کہاں کہاں لئے پھرتے رہے غریب کو ہم

لیکن درحقیقت غزل اب تو 'حرفِ باز ناں گفتن' ہے نہ صدائے دردناک، خود ظفر اقبال نے ہی اسے ایسا باثروت اور مالا مال کر دیا ہے کہ اب غزل انھیں ساتھ ساتھ لئے پھرتی ہے۔ رشید احمد صدیقی نے ایک موقع پر کہا کہ غزل میں ہمارے ہاں بے راہ روی بھی ملتی ہے۔ ہر طرح کی بے راہ روی اور جی بھر کے بے راہ روی، یہ غزل کا قصور نہیں یہ اس راہ روی کا قصور ہے، جو اپنی کم نگہی یا کم ظفری سے رہ گزر کے فریب کو منزل مقصود سمجھ لیتا ہے، ادنیٰ درجے کے لوگوں نے زندگی کی بڑی قدروں کی اسی طرح بے حرمتی کی ہے، غزل کو برا بتانا یا اسے ادنیٰ درجے کی شاعری قرار دینا پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگوں کے نزدیک اب ہنسی کی بات سمجھی جاتی ہے۔

غزل تو سچ پوچھئے، ایک جہانِ حیرت ہے، جو ایک بار اس کے اندر داخل ہوا، پھر نکل نہیں پایا۔ جس شہر اور جس ماحول سے گزر رہوا، وہیں کا بھیس بدل لیا۔ ایک بہتے دریا کی مانند جیسی زمین پائی، ویسا ہی راستہ بنالیا۔ یہ ایک بت ہزار شیوہ ہے اور دادِ سخن دینے والوں کو زبان حال سے پکارتی ہے... جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے!

ان آنکھوں کو جو اتنی بھی گنہگار نہیں، اکثر نہایت دیدہ زیب اور جاذب نظر گرد پوش کے اندر شاعری اور بالخصوص غزل کے نام پر وہ کچھ دیکھنے اور پڑھنے کو ملتا ہے، جسے شاعری کے علاوہ کچھ بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور غزل چونکہ سخت جان ہونے کے ساتھ ساتھ مقبول ترین صنف سخن بھی ہے، لہٰذا اسے مقبولیت کا خراج گویا کسی کارخانے میں اسی طرح کے تیار کردہ یکساں اور یک رنگ، بلکہ بے رنگ شعری مجموعوں کی شکل میں ادا کرنا ہی پڑتا ہے۔ اور غزل کی مضبوطی اور مستقل مزاجی کی داد دیجئے کہ ایسے غزل شکن حالات میں بھی نہ صرف اپنا تشخص برقرار رکھے ہوئے ہے، بلکہ نئے امکانات کی طرف اس کا سفر کامیابی سے جاری ہے اور ایسا اس لئے ممکن ہو رہا ہے کہ ہر دو چار برس کے بعد کوئی کھرا اور اصیل شاعر اس سخن کی وادی میں آ نکلتا ہے۔ کچھ ایسے کہ غزل جیسے پھر سے جی اٹھتی ہے۔

"ندی، دریا، سمندر" کو دیکھ کر یہ تاثر اور قوی ہو جاتا ہے کہ اب کوئی بھی لفظ، لہجہ اور موضوع غزل سے باہر نہیں رہ سکتا۔ شاعر نے اپنے گرد و پیش میں پھیلے روز مرہ کی زندگی میں شامل ہر طرح کے جذبوں، رنگوں اور خیالوں کو اپنی شاعری، خاص طور پر غزل کا موضوع بنایا ہے۔ ان کا شعری بیان سادہ، فطرت سے قریب اور زمینی حقائق سے حد درجہ ہم آہنگ ہے۔ میں نے جب پہلی بار کتاب کی صورت میں ان کا کلام یک جا دیکھا تو مجھے بے ساختہ مولانا حالی کی یاد آئی اور پھر آتی ہی چلی گئی۔ مولانا حالی ہمارے ان بڑے شاعروں میں سے ہیں، جن کی غزل گوئی، مثنوی، مدو جزر اسلام اور مقدمہ شعر وشاعری کے درمیان دب کر رہ گئی۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ مثنوی ان کی دینی دردمندی اور اخلاص کا مظہر اور مقدمہ شعر وشاعری ان کی تنقیدی بصیرت کا آئینہ دار ہے، تاہم آج بھی جمیل یوسف یا امجد اسلام امجد جیسا کوئی شعر کا پارکھ ان کی غزلوں کا انتخاب کرے تو ہم یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں کہ مولانا کس پائے کے غزل گو ہیں۔ سید ضیاء الدین نعیم کی کتاب دیکھ کر حالی کا ہی ایک شعر یاد آیا۔

ایسی غزلیں سنی نہ تھیں حالی — یہ نکالی کہاں سے تو نے بیاض

ہر شاعر بڑے اور اہم شعرا سے بالعموم اور کسی ایک سے بالخصوص، شعوری یا غیر شعوری طور پر کسی نہ کسی حد تک متاثر ہوتا ہے، نقال اسی رنگ میں ڈھل کر بے رنگ ہو جاتے ہیں اور باکمال اپنی الگ شناخت بنا لیتے ہیں۔

میں جیسے جیسے "ندی، دریا، سمندر" کو پڑھتا گیا، میرا یہ تاثر گہرا ہوتا چلا گیا۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ وہ کس حد تک مولانا کی یاد دلاتے ہیں اور کہاں اپنا چراغ روشن کرتے ہیں۔ شاعری کے بارے میں مولانا کہتے ہیں: "ایک زمانہ تھا کہ شاعری اور عشق یا تعشق کو لازم وملزوم سمجھتے تھے اور ایسا سمجھنا کچھ بے جا نہ تھا، اول تو شعر کا حدوث ہی دنیا میں اس جوش اور ولولہ سے ہوا ہے، جو عشق اور محبت کی بدولت انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور شعر کی ذات میں جو ایک آتش گیر مادہ ہے، وہ بھی اپنے مشتعل ہونے میں کسی آگ کی اشتعالک کا محتاج ہے۔ جو لوگ عاشقانہ گوئی کے چٹخارے سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ یہ خون منہ کو لگا پھر مشکل سے چھٹتا ہے، مگر زمانے کی ضرورتوں نے یہ سبق پڑھایا کہ دلفریب مگر نکمی باتوں پر آفریں سننے سے کام کی باتوں پر نفریں سننی بہتر ہے۔"

اس بیان کی روشنی میں اور حالی کا یہ مصرعہ ذہن میں رکھتے ہوئے۔

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا

"ندی، دریا، سمندر" کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم دو باتیں اس کتاب میں ایسی ہیں، جو میں نے آج تک کسی شعری مجموعے میں نہیں دیکھیں۔ کم وبیش 70,75 غزلیں ہونے کے باوصف، ایک بھی شعر ایسا نہیں ہے جو خالصتاً عشق مجازی کی ذیل میں آتا ہو یا کیفیات عشق کا کسی طور پر بیان کرتا ہو۔ کتاب کے آخر میں متفرقات کے عنوان سے چند اشعار ہیں (جو اندرون پسِ ورک کے فلیپ پر بھی موجود ہیں) جن پر کسی حد تک عشقیہ ہونے کا گمان کیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

بات یہ ہے کہ اصولوں کا لہو ہوتا ہے — یوں نہیں کہ ہمیں ان سے محبت کم تھی

صحن دل نکہت گل سے بھی کہیں مہکا ہے؟ — خوشبوئے دوست بھی اے باد صبا تھوڑی سی

اک مہک سی فضا میں رقصاں ہے — کہیں قرب وجوار میں ہے وہ

آپ کی بات رہ گئی' چلئے — کیا ہوا ہم جو آپ کے نہ رہے

اوپر یہ عشقیہ ہونے کا گمان کئے جانے والی بات کہنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ آگے آنے والی عبارت یہ بتا رہی ہے کہ حقیقت میں شاعر کا مرکز محبت کیا ہے اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور یہ اس مجموعے کی دوسری خاص بات ہے۔ کتاب کا انتساب رفیق حیات کے نام سے ہونا، انتخاب کے آگے صفحہ چار پر بیٹوں اور بیٹیوں کے نام لکھے ہونا، نواسی کی شبیہہ کا ننھا سا عکس، صفحہ نمبر 15 تا 17 پر شعیب نعیم اور زبیر نعیم کی بالترتیب اردو اور انگریزی میں باپ سے بے پناہ محبت کا اظہار کرتی اور دو خوبصورت نظمیں، صفحہ نمبر 48 پر "رفیق حیات کوثر تسنیم کی نذر" کے عنوان سے شادی کی 18 ویں سالگرہ اور صفحہ نمبر 132 پر بعنوان رفیق حیات کے نام پر شادی کی 27 ویں سالگرہ کے موقع پر تسلسل اور مستقل مزاجی کے ساتھ تصوراتی نہیں بلکہ حقیقی محبت کا اظہار کرتی دو بامعنی اور پر کیف نظمیں، محبت ومؤانست کی ایک اور ہی

کہانی کہہ رہی ہیں۔ یہ وہ رنگ ہے، جوکم ازکم مجھے کہیں اور دکھائی نہیں دیا۔ایک جانب تو یہ صورت کہ اکثر شاعروں کی کتاب چھپ جانے کے بعد بھی گھر والوں سے چھُپی رہتی ہے اور یہاں شاعر کے کلام کی توثیق اول شائع ہونے سے پہلے اس کے اہل خانہ کررہے ہیں۔ ماشاءاللہ! ایں خانہ ہمہ آفتاب است...........مزید دیکھئے...........! کتاب میں غالباً آٹھ یا نو نظمیں ہیں۔صفحہ نمبر 69 پر ایک نوجوان کی خودکشی پر کے عنوان سے اک نہایت دلگداز غزل نما نظم، عنوان ہٹ جائے تو تمیز مشکل ہو کہ غزل ہے یا نظم، ''چراغ منزل، یوم آزادی اور امید'' قومی تفاخر کا اظہار کرتی اور امید بڑھاتی نظمیں، ''بے حسی'' کا موضوع بھی عنوان سے ظاہر ہے، دو نظموں کا اوپر ذکر ہو چکا ہے (رفیق حیات کے حوالے سے) آخر میں ایک نظم ''عورت'' کے عنوان سے شاملِ کتاب ہے۔ مجھے یاد آیا، ضرب کلیم میں عورت کے موضوع پر الگ سے پورا باب باندھا گیا ہے، جس میں 9 نظمیں ہیں، دو کا عنوان ہی ''عورت'' ہے، ان میں سے ایک نظم کا بہت مشہور شعر آپ کو یاد دلاتا ہوں...........!

وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

سید ضیاء الدین نعیم نے اپنی نظم کے گیارہ اشعار میں ''عورت'' کی ہمہ رنگ صفات کو بڑے شاعرانہ پیرائے میں بیان کیا ہے، ایک شعر یوں ہے۔

اسی کے بطن سے پیدا کئے نبی سارے بلند رب کی نظر میں ہے اس قدر عورت

یہاں ہمارے آج کے شاعر کی فکر پر اقبال کا اثر جھلک رہا ہے۔ یوں حالی کے ہاں بھی متذکرہ موضوع پر نظمیں اور اشعار موجود ہیں بطور نمونہ یہ مشہور مصرعہ ہی بہت ہے......

اے ماؤں، بہنو، بیٹیو، دنیا کی عزت تم سے ہے

میں یہاں ایک بار پھر اپنی بات کو دہراؤں، اثر قبول کرنا اور بات ہے اور تقلید دیگر چیز ہے...... مزید وضاحت کیلئے یہ بھی کہہ دوں کہ اگر غالب، اکبر اور حالی نہ ہوتے تو شاید اقبال بھی نہ ہوتے۔

اب ضیاء الدین نعیم کے کچھ ایسے اشعار ملاحظہ فرمائے، جہاں مجھے مولانا حالی کا اثر نظر آیا......

قدم کانٹوں پہ دھرنا ہی پڑے گا کوئی اقدام کرنا ہی پڑے گا
دکھانا ہی پڑے گا دل کا دم خم بس اب جاں سے گزرنا ہی پڑے گا
جو پیچھے رہ گئے ہیں آملیں وہ کہیں دو پل ٹھہرنا ہی پڑے گا
اندھیرے ورنہ پسپا کیسے ہوں گے تجھے سورج ابھرنا ہی پڑے گا

اب حالی کے اشعار دیکھئے:

کہیں الہام منوانا پڑے گا کہیں کشف اپنا جتلانا پڑے گا
بہت یاں ٹھوکریں کھائی ہیں ہم نے بس اب دنیا کو ٹھکرانا پڑے گا
بشر پہلو میں دل رکھتا ہے جب تک اسے دنیا کا غم کھانا پڑے گا
عوام الناس کا ہوگا جنہیں منہ انہیں خاصوں کے منہ آنا پڑے گا

ان اشعار میں ردیف اور بحر کی مماثلت کے ساتھ ساتھ، جذبات واحساسات اور اجتماعی

دردمندی کی یک جائی بھی محسوس کی جاسکتی ہے، معنوی اور فکری مماثلت پر دو تین اشعار مزید پیش ہیں۔زیادہ کی مضمون میں گنجائش نہیں......

نعیم

زیادہ ردّ و کد مت کیجئے گا
نئی باتوں کو رد مت کیجئے گا
دکھائی دیتی ہیں کب خود کو خامیاں اپنی
فریب کھاتی ہے اپنی نظر زیادہ تر
راہ میں اک دیا ہی دھر جائے
آدمی کچھ نہ کچھ تو کر جائے

حالی

حالی اب آؤ پیروئ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر ہوچکی
اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے
جس قدر کرنا ملامت اور کو آسان ہے
کھیتوں کو پانی دے لو اب بہہ رہی ہے گنگا
کچھ کرلو نوجوانو، اُٹھتی جوانیاں ہیں

شاعر کے کلام کی ایک بہت نمایاں خاصیت بڑے جاندار اور بے داغ مطلعے ہیں، نواب مرزا داغ کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ان کے دو مطلعے درج کرتا ہوں۔

خار حسرت بیان سے نکلا دل کا کانٹا زبان سے نکلا
کعبے کی ہے ہوس کبھی کوئے بُتاں کی ہے مجھ کو خبر نہیں مری مٹی کہاں کی ہے

نعیم صاحب کے چند خوبصورت مطلعے ملاحظہ فرمائیں، اور ان کی حد درجہ انوکھی، متحرک، رواں اور بولتی ردیفوں سے بھی لطف اٹھائیں۔

کرم بدرجہ اتم، ستم بدرجہ اتم ہیں انتہا پسند لوگ ہم بدرجہ اتم
یہ کس دھچکے سے دہلا تھا سمندر زمیں کی سمت کیوں لپکا سمندر
لپکے جنوں شعار یکے بعد دیگرے پایا فراز دار یکے بعد دیگرے
کسی سے داد کے طالب نہ ہاؤ ہو والے عجیب لوگ ہیں ہم لوگ جستجو والے
زہر کے جام ہیں بہت سارے سچ کے انعام ہیں بہت سارے
ہاں یہ تو ہے کہ بچ نہیں پائے ضرر سے ہم امکان بھر ہٹے نہیں اپنی ڈگر سے ہم
ہردم کی کشمکش سے نکل راستہ بدل اب اور ان کے ساتھ نہ چل راستہ بدل

چھوٹی بحر میں میرے کچھ مزید پسندیدہ اشعار دیکھئے.......... خیال اور جذبے کی کاٹ، روانی، سادگی اور تازہ کاری کے ساتھ.......... یہ نعیم صاحب کا رنگ خاص ہے۔

پڑ گئے بل کس کے ماتھے پر — اور پرزوں میں بٹ گئی تحریر
جایئے مت سنی سنائی پر — دیکھئے یہ رہی مری تحریر
تم بھی بین السطور تک نہ گئے — تم نے بھی بس پڑھی مری تحریر
نہیں کرنا ہے جو ہے نامناسب — بہاؤ کی طرف بہنا نہیں ہے
سوچ کی بھی کہنگی کا کچھ علاج — شہر تو تم نے نویلا کردیا
یہ طفل کھیلتے ہوئے ماؤں کی گود میں — کھلتے ہوئے گلاب ہیں ایک اعتبار سے
دل ہی زندہ نہ ہوں جن کے وہ کہاں روتے ہیں — زندگی ہونے کی ہوتا ہے نشانی پانی

کچھ باتیں رہ جاتی ہیں، مضمون مجھے سمیٹنا ہے، زیادہ طوالت شاید مناسب نہیں، اختتامی بات سے پہلے کتاب کے ایک قابل ذکر پہلو کی وضاحت ضروری ہے، ندی، دریا، سمندر میں چھ سرائیکی اور ایک پنجابی غزل کے علاوہ منتخب انگریزی نظموں کے بہت عمدہ تراجم بھی شامل ہیں اور مجموعۂ کلام کی عمومی درو بست سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں، ایک آخری بات پر اپنی معروضات ختم کروں گا، رئیس المتغزلین حسرت موہانی نے غزل کی شاعری کی 9 اقسام بیان کی ہیں...... عاشقانہ، عارفانہ، فاسقانہ، ماہرانہ، نافعانہ، ضاحکانہ، شاعرانہ، واصفانہ اور باغیانہ......

اختلاف کا دروار کھتے ہوئے میں سید ضیاء الدین نعیم کی غزل کو نافعانہ غزل کے زمرے میں رکھتا ہوں، یعنی خلق خدا سے محبت کرنے والی اور اسے نفع پہنچانے والی شاعری۔

ان میں تمہیں اخلاص کی بو باس ملے گی — یہ عام سے گھر ہوتے ہیں اور طرح کے

ندی، دریا، سمندر، عمدہ اور مفید شاعری کا ایک ایسا اظہار ہے جس میں شاید بھرتی کا ایک شعر بھی نہ مل پائے، یقیناً یہ مجموعہ کلام ظفر اقبال کے الفاظ میں شاعری میں اضافہ ہے نہ کہ کتابوں میں۔ سید ضیاء الدین نعیم کی شخصیت بھی ان کی شاعری کی مانند شائستہ و شریف ہے، مولانا حالی میں اور ان میں ایک قدر مشترک یہ بھی ہے۔ حالی کا ایک شعر نعیم کی نذر کرتا ہوں اور آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کردیا — خاکساری اپنی کام آئی بہت

❁ ❁ ❁

تقاضے میں پنہاں کہانی

نصرت صدیقی کے شعری مجموعے "تقاضے" پر ایک نوٹ

علی اختر

کہانی ازل سے چلی آ رہی ہے، کبھی کسی صورت میں اور کبھی کسی انداز میں جب مادرسری نظام کا خاتمہ ہوا تو گھر کی ذمے داری عورت نے سنبھال لی۔ بچوں کو سنبھالنے کا کام بوڑھی دادیوں اور نانیوں نے اٹھالیا کہ وہ اپنی جسمانی ساخت اور بڑھاپے کی وجہ سے سخت کام کے قابل نہ رہی تھیں۔ چنانچہ وہ اتھرے اور اڈھب بچوں کو شام ہوتے ہی گودوں رضائیوں یا پھر گھور اندھیرے میں چار پائیوں پر لے کر بیٹھ جاتیں اور کہانیاں سنانے لگتیں۔

بچے سے محبت عورت کی فطرت ہے تو مرد بھی اس محبت میں برابر کا حصہ دار ہوتا ہے، یہ الگ بات کہ مائیں ہمیشہ مرد کی حکمرانی ثابت کرنے کی خاطر اپنے بچوں کو باپ کے خوف سے ڈراتی رہتی ہیں۔ بات کہانی کی ہو رہی تھی۔ پرکھوں سے سنی اور سنائی جانے والی یہ کہانیاں کبھی منظوم داستان کی صورت میں ہمارے سامنے آتی ہیں اور کبھی صورت میں نئی سج دھج اور نئے روپ میں ہمیں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ کہانی گھڑنے اور کہانی سنانے والے کا کمال ہوتا تھا کہ وہ اس کا خمیر کہاں سے اٹھاتا تھا۔ کبھی تو وہ خود اس کی اختراع کرتا۔ کبھی دوسری زبان سے لے کر اسے اپنی زبان میں ڈھال لیتا تھا اور کبھی پھولے پھولے' ذرا ذرا اٹھا کر نئی کہانی بنتا۔ یہ کام صرف اور صرف حقیقی فنکار کرسکتا ہے۔

کہانی شروع سے لے کر آج تک ہمیشہ دو طبقوں میں منقسم رہی ہے اگرچہ کارل مارکس نے معاشرے کے تین طبقے بتائے تھے جن میں سے ایک بورژوا، دوسرا پیٹی بورژوا اور تیسرا طبقہ پرولتاریہ تھا' مگر برطانوی دانشور اور وزیر اعظم بنجمن فرینکلن نے اپنے ناول میں سماج کو دو طبقوں میں تقسیم کیا جن میں ایک "HAVE" اور دوسرا "HAVE NOT" ہے ہمارے آج کے دانشور' شاعر اور ادیب آج تک انہی دو طبقوں کی نمائندگی کرتے چلے آ رہے ہیں اسی وجہ سے کہانی کا دار و مدار بھی انہی دو طبقات کی کشمکش اور جدوجہد کی نمائندگی پر رہا جب ہمارے بچے اپنے اردگرد سے واقف نہ تھے اور معصوم تھے اس سمے تک ہماری دادیاں اور نانیاں ہر سنائی جانے والی کہانی کا آغاز کچھ یوں کرتی تھیں۔ ایک تھا بادشاہ................ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ.......... مگر رفتہ رفتہ زمانے کی ترقی سے بچوں کے

ذہن بالیدہ ہوتے گئے پھر یہ وقت ہی آ گیا جب شاعر اور دانشور کو یہ کہنا پڑا:

فوراً جواب دیتے ہیں ہر اک سوال کا — کتنے ذہین آج کے بچے لگے مجھے

(تقاضے صفحہ نمبر 72)

کہانی سفر کرتے کرتے کہاں سے کہاں تک آ پہنچی، مگر طبقاتی ''بُعد'' اور دوریاں نہ پہلے ختم ہوئیں اور نہ آئندہ ختم ہونے کا امکان ہے، دوسرا طبقہ جسے بنجمن فرینکلن نے HAVE NOT کا نام دیا تھا، وہ طبقہ ہے جس کے پاس زندگی گزارنے کو کچھ نہیں اور وہ ہمیشہ سے کسمپرسی کی حالت میں جی رہا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی طبقہ کا فرد ہے' کہانی کی ابتدا ہی HAVE NOT سے شروع ہوتی ہے وہ نمائندگی کا علم اٹھاتے یوں عہد کرتا ہے۔

میرے شعروں میں دھڑکتا ہے مرے عہد کا دل — شاعری کی ہے کہ تاریخ لکھی ہے میں نے

(تقاضے صفحہ نمبر 154)

جب اس کے وعدے کا ادراک دوسرے طبقے کو ہوا تو اپنے پیشگی خوف سے کہہ اٹھا اس شخص کے عزائم مجھے خطرناک لگ رہے ہیں یہ اپنے مذموم ارادوں سے افراتفری اور بغاوت کو جنم دے سکتا ہے۔ یہ جھوٹا ہے اس کی کسی بات کا اعتبار نہ کرنا۔ ابھی کونسی اس قدر مہنگائی ہے۔ چیزیں تو ابھی دسترس میں ہیں خود ہی یہ نکما' کاہل اور سست ہے اسے پتہ چلا تو اس نے پرزور الفاظ میں اس کی تردید کرتے ہوئے کہا۔

وہ ایک مخصوص طبقہ کہہ رہا ہے — ابھی تو اتنی مہنگائی نہیں ہے

(تقاضے صفحہ نمبر 127)

اس کی مخالفت کرنے والے گو تعداد میں تھوڑے تھے۔ مگر زندگی کی تمام سہولتوں کے مالک تھے۔ سرمایہ داری کے تمام حربوں سے واقف اور ارتکاز سرمایہ کے ہنرمند تھے انہوں نے اس کے نعروں کا جواب اپنے تادیبی حربوں سے دیا۔

وہ مصنوعی پروپیگنڈا سے واقف تھے، انھوں نے اس کے خلاف جب یہ حربہ آزمایا تو دوسروں نے اس کی باتوں پر اعتبار کرنا چھوڑ دیا۔ گواہی کیلئے اس نے اپنے گھر کا حوالہ دیا۔

بقول ان کے یہ خوشحالی کا دور سہی — مگر وہ گھر! کہ جہاں آگ ہے نہ پانی ہے

(تقاضے صفحہ نمبر 46)

اس کی یہ بات سن کر وہ سب بھڑک اٹھے۔ وہ خود پڑھا لکھا تھا۔ لفظ اور حرف بنانے کے فن میں طاق تھا، مگر کمزور طبقے سے ہونے کی وجہ سے اس کے سننے والوں کی تعداد میں کمی ہوتی چلی گئی۔ وہ محنت کے تیشے سے خوشحالی کے دودھ کی نہر نکالنے کی کوششوں میں لگ گیا، مگر یہاں بھی مقدر نے اس کا ساتھ نہ دیا اس کی ترقیوں کے سارے راستے مسدود کر دیئے گئے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں پھر اس کی زندگی میں ایک ایسا مقام بھی آیا جب وہ چیخ اٹھا:

کچے گھروں میں رہتے ہیں شاید اسی لئے — سہمے ہوئے سے رہتے ہیں کالی گھٹا سے ہم

(تقاضے صفحہ نمبر 101)

ایسے میں وہ اچانک اس کی سوچوں پر اتر آئی تھی، اس کے من میں در آئی تھی وہ کون تھی اور کس طبقے سے تعلق رکھتی تھی اس کا شاید اسے علم ہی نہیں۔ چونکہ وہ حساس تھا، اس لئے اس کے من میں بھی شعور کی منزل تک پہنچتے پہنچتے ایک خوبصورت عورت دھرنا مار کر بیٹھ گئی اپنے حالات کے ڈر سے انھوں نے کبھی اس کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ مگر مشہور مفکر رومین رولاں کے مطابق......

''ہر تحقیقی فنکار کی ذات میں ایک عورت بھی چھپی ہوتی ہے اور اسی کی بدولت وہ فنکار' ادیب' شاعر' مجسمہ اور تصویر کو جنم دیتا ہے......!!''

وہ حقیقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زندگی گزارنے کے عمل سے واقف تھا، اس نے اپنا آپ بچانے کی بہت کوشش کی۔ اسے بتایا بھی کہ اس کے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے، مگر شاید وہ بھی اسی طبقہ سے تعلق رکھتی تھی اور اس کی مجبوریوں کو بھی سمجھتی تھی ہنس کر بولی۔

اگر تمھارے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے تو کیا ہوا، میں بھی بھوک کے موسموں میں پیٹ پر پتھر باندھنے کی عادی ہوں۔ ہم دونوں ایک ہی راستے کے مسافر ہیں تو پھر دوریاں کیسی۔ آؤ ہم ایک ہو جائیں!!

پر سنگدل موسموں کی بات ہے کہ وہ دونوں محبت کے بندھنوں میں بندھ گئے اب اس کی بے چین زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔

کہانی سنانے والا یہاں آ کر رک جاتا ہے۔ شاید وہ الفاظ کے ترچھے' نوکیلے اور بکھرے پتھر جمع کرنے لگا ہو۔ ایک توقف کے بعد وہ پھر بولا۔

ہاں تو جب بندہ اکیلا ہوتا ہے، تو اپنے بدن پر تمام تر سختیاں جھیل لیتا ہے کہ جب کسی کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے تو اس کی سوچوں کے در خود بخود کھلنے لگتے ہیں، احساس وادراک کی آنکھیں وا ہو جاتی ہیں۔ ایک ایسا ہی لمحہ اس پر بھی آتا ہے، جب وہ دونوں زندگی کی مشکلوں سے دور خوشیوں کے چند لمحے اپنی جھولی میں ڈالنے کیلئے کسی پارک' کسی ایسی جگہ جا رہے تھے، جہاں وہ قدرت کی طرف سے دیا ہوا خوشیوں کے چند ثانیوں کا دان لے سکیں۔ وہ ایک بھکارن کی طرح ان کے راستے میں آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ۔ میلے کچیلے کپڑے۔ اڑتی ہوئی رنگت۔ اور رگوں سے پھولے چہرے کو دیکھ کر پہلے تو وہ خوفزدہ ہوئے اور ڈر کے مارے وہ اس کے سینے کے ساتھ لگ گئی دونوں نے بے بسی کے عالم میں ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ ایسے لمحوں میں خاموشی بھی زبان بن جاتی ہے اور بے بسی الفاظ کا روپ ڈھال لیتی ہے۔

مجبور بشر ہوں بھلا مختار کہاں ہوں — رازق نہ سمجھ ہاتھ نہ پھیلا مرے آگے

(تقاضے صفحہ نمبر 39)

یہ کیا.......... اس کی نگاہوں نے پہلی بار اس سے سوال کیا۔ تو اس نے کہا کہانی سوال سے جواب تک کا سفر ہے، بے بسی کی مسکراہٹ میں اس نے کہا:

ہم اس لئے بھی ٹھہرے نہیں معتبر کبھی — نصرت ہماری جیب میں پیسے نہیں رہے

(تقاضے صفحہ نمبر 44)

آ گے سے وہ بھی ہنس کر بولی۔

''جاناں میں تمہاری مجبوریوں کو سمجھتی ہوں' مجھے اپنے مفلس ہونے کا بھی ادراک ہے' لیکن تمھیں پتا ہے کہ مہاتما بدھ نے ایک بار کہا تھا۔ جب کوئی اپنی خواہش کو پورا کرنے کیلیئے پہلا قدم رکھتا ہے تو اس کی ''SUFFERING'' شروع ہوجاتی ہے وہ اسے پیار سے جاناں کہتی تھی۔ اور وہ اسے جنڈری کہاتھا۔ مجبوریوں کے کتنے ہی نام ہوتے ہیں چاہے کوئی ہی نام رکھ لوایک روز وہ بہت اداس تھا۔ حسب معمول دن بھر کی ناکامیوں کو جھولی میں ڈالے جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کے بڑوں نے اسے یہ خوشخبری سنائی کہ جب دو انسانوں کے نصیب مل جائیں تو ہوسکتا ہے، خوشحالی کے ٹھنڈے میٹھے موسم ان پر بھی اتر آئیں وہ ہنس کر جانے لگا۔ تو اسے کہا گیا............ وہ لوگ اس کی شادی کررہے ہیں۔

اس نے کہا کہ ایک پسند میری بھی ہے۔

آ گے سے جواب ملا۔ ایک امید اور ایک خواہش ہماری بھی ہے............!!

کیا شکست یہاں بھی میرا مقدر ہوگی؟ اس نے سوچا۔

بوڑھی آ نکھیں بچوں کے پیدا ہوتے ہی اپنی سوچوں اور اپنے احساس میں امیدوں کے دیپ جگالتی ہیں عمر کے اس حصے میں مایوسیوں کے مقتل پر انہیں اکیلا چھوڑ دو گے............!!

پھر سے سوال کیا گیا۔

احساس کی مجبوری نے سر جھکا دیا اور اسے فیصلے کی سولی پر لٹکا دیا گیا بڑی تکلیف کے ساتھ کہ گلے میں ڈالا جانے والا رسہ اس کے پورا بھی نہ تھا۔ جنڈری کو بھی اس بات کا علم ہوگیا تھا مگر پھر بھی وہ مایوس نہیں تھی۔ اس نے ہنس کر کہا تھا مایوس نہ ہو جاناں۔ ہم سب کو اپنی اپنی مجبوریوں' قانون اور نوعیت کے سچ میں رہنا پڑتا ہے یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہیں بھول جاؤں گی۔ غربت میں بنے رشتے بڑے مضبوط ہوتے ہیں۔

جان نے بڑے مایوس اور مریل لہجے میں کہا جنڈری ایک بار شیخ ایاز نے کہا تھا، آج میں وہی الفاظ دہرا رہا ہوں:

''مسافر۔ کیا میں تجھ سے تیرے پاؤں ادھار لے سکتا ہوں۔ مجھے بہت دور جانا ہے اور میں تھک گیا ہوں............!!

جنڈری نے ہنس کر دلیل دی جاناں تم نے مسوئن برن کی نظم سنی ہے۔ سنو میں اس کی دو لائنیں تمہیں سناتی ہوں

''Time, with a gift of tears;

Grief, with a glass that ran;''

''وقت گزر جاتا ہے' تو آنسو تھم جاتے ہیں اور دل کا بوجھ (غم) شیشہ ساعت کی ریت ختم ہونے پر ہلکا ہوجاتا ہے............!''

وہی ہوا............ جاناں اسے بھول تو گیا اسکی اہلیہ گو اسی کے طبقہ سے تھی مگر وہ اپنی خواہشات اور اپنی تمناؤں کی چادر سے اپنے پاؤں باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھ پاتی تھی۔ جاناں نے کئی بار اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی۔ دو نصیبوں کے ملنے سے اتنا تو ہوا کہ اسے ایک چھوٹی سے ملازمت مل گئی مگر وہ اس کی ضرورتوں سے بہت کم اور لاغر تھی جھگڑوں اور نفرت کے بگھیاڑ نے اپنی تھوتھنیاں کھول لیں تو اسے کہنا پڑا۔

خواب محلوں کے نہ دیکھ میری جان غزل   تجھ کو ان خوابوں کی تعبیروں کا اندازہ نہیں

ہم تو کچی بستیوں کے رہنے والے لوگ ہیں   تو بھی شہزادی نہیں ہے میں بھی شہزادہ نہیں

(تقاضے صفحہ نمبر 207)

مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تلخیوں میں اضافہ ہوتا گیا اور بچے بھی پیدا ہوگئے، پھر ایک روز جیسے اس کی زبان پر وقت نے کوئلہ رکھ دیا تھا تنک کر بولی: ''تمھیں تو اپنے بچوں تک کا خیال نہیں۔'' جاناں رو دینے کے انداز میں بولا:

''تم جھوٹ کہتی ہو مجھے میرے یہ بچے کس قدر عزیز ہیں تم نہیں جانتی۔ مگر مجبوریوں اور بے بسی کی ہتھکڑیوں نے مرے ہاتھوں کو یہاں تک جکڑ رکھا ہے کہ کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں''

کس ضرورت کو دباؤں کسے پورا کروں   اپنی تنخواہ کئی بار گنی ہے میں نے

تقاضے صفحہ نمبر 153

جنڈری اسے اب بھی ملتی تھی اس نے اپنی مجبوریوں کی داستان اسے بھی سنائی تھی اس نے اسے حوصلہ دیا تھا کہ بہت جلد اس کے حالات بدل جائیں گے اس کے جواب میں جاناں کی وہی بے بسی اور پھیکی مسکراہٹ تھی جس نے جنڈری کے دل کو بھی دہلا کر رکھ دیا تھا۔

محرومیوں نے دل کی تمنائیں چھین لیں   بچوں نے کرنے چھوڑ دیئے ہیں مطالبات

وہ بولی:

''جاناں'' انسان کے دل میں طرح طرح کی خفیہ آرزوئیں لرزتی رہتی ہیں جو معاشرت اور ارد گرد کے دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے بندھنوں کی وجہ سے کھل کر ظاہر نہیں ہوتیں محض چھپ چھپ کر دیکھتی رہتی ہیں اور اس سے کبھی دانستہ اور کبھی بے ارادہ وہ کام کرواتی ہیں جو اسکے ظاہری عقائد سے ہم آہنگ نہیں ہوتے۔ .... تم بھی جاناں............ حوصلہ رکھنا' استقامت سے قدم آگے بڑھانا تمہیں میری قسم مایوس ہوکر ایسا کچھ نہ کر گزرنا۔ جو تمہارے ظاہری عقائد سے ہم آہنگ نہ ہو.................!

جاناں مایوسی کے عالم میں تقریباً رو ہنسا ہوگیا تھا...... بولا:

''وہ طنز و تضحیک کے سارے تیر مجھ پر آزما چکی ہے............ وہ طعنوں کی برچھیوں سے میری سوچوں کے بدن کو چھید و چھید کرنے پر تلی ہوئی ہے............ وہ کہتی ہے............ اس نے اپنی زندگی ٹھوکروں میں گزار لی۔ مجھے اپنے بچوں تک کا خیال نہیں............ میں اپنے بچوں سے پیار نہیں کرتا۔ بتاؤ جنڈری

بھلا کون ایسا بے درد باپ ہوگا۔ جسے اپنے بچوں سے پیار نہ ہوگا۔

نصرت یہ نونہال یہ لخت جگر مرے　　　کلیاں کبھی لگیں کبھی غنچے لگیں مجھے

(تقاضے صفحہ نمبر 73)

وقت کی یورشوں نے اس کی سوچوں کو بھی اتھل پتھل کر ڈالا تھا' مگر وہ مجبوریوں کے حصار سے خود کو نہ نکال سکا' اس روز وہ حسب معمول کی مایوسیوں اور محرومیوں سے بوجھل ہو کر گھر لوٹ رہا تھا راستے میں اس نے اپنی سوچوں کا راستہ بدلنے کیلئے اخبار خرید لیا' ایک جگہ درخت کے سائے میں بیٹھ کر اس نے اخبار کھولا تو اس کی نظر پہلی ہی خبر پر آ کر اٹک گئی بڑی سرخیوں کے بھاری جسموں تلے چھپی ہوئی ایک چھپی ہوئی ایک چھوٹی سی خبر لیکن وہ اس کیلئے کسی قیامت سے کم نہیں نہ تھی۔

حد سے بڑھی جو بھوک تو مجبور والدین　　　اولاد بیچنے پہ بھی تیار ہو گئے

تقاضے صفحہ نمبر 117

وہ گھر آیا تو گھر والی پہلے ہی جلی کٹی بیٹھی تھی اسے آتے دیکھ کر بولی:

کیا لائے ہو..........!

محرومی..........اس نے بوجھل لہجے میں جواب دیا

اللہ کے بندے میں کب تک ڈھکوسلوں کے سہارے بچوں کو پالتی رہوں گی۔ کہیں سے ادھار مانگ لاتے۔

وہ جواب میں کیا کہتا۔ اس نے مڑا تڑا اخبار اس کے آگے رکھ دیا۔

یہ کیا۔ کیا اس سے تمہارے بچوں کی بھوک مٹ جائے گی۔

اس نے اخبار کھول کر ایک خبر پر انگلی رکھ دی اس کے بچوں کی طرح ننھی لیکن معصوم سی خبر:

لخت جگر کو بیچ دیا کوڑیوں کے مول　　　مقروض نے چکا دیئے پیسے ادھار کے

(تقاضے صفحہ نمبر 133)

تمھارے لاڈلے اسکول نہیں جاتے، ان کی وردیاں پھٹ گئی ہیں، ان کی کتابوں کے پرزے پرزے ہو چکے ہیں، میں نے تو سوچا ہے جتنا پڑھنا تھا انھوں نے پڑھ لیا اب انہیں اسکول سے اٹھا کر کاموں پر بٹھا دوں کم از کم اس بہانے بھوک تو ٹلے گی۔

بھلی لوگ .... میں کوشش تو کرتا ہوں.......... اب اگر صاحب ثروت ہونا ہمارے مقدروں میں نہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے..........؟

اس نے جواب دیا۔

اور یہ لو.......... یہ تمھارے لڑکے نے کھول لیا ہے پڑھ رہا تھا۔ میں نے چھین لیا۔ یہ خطوں کا سلسلہ اب بند ہو جانا چاہیئے۔ یہ کہہ کر اس نے کھلا خط اس کے حوالے کر دیا یہ تو اس کی جندڑی کا خط تھا۔ ایک بھرم تھا جو ٹوٹ جانے پر اسے بے حد افسوس ہوا تھا۔ اس نے جواب میں فوراً جندڑی کو لکھ بھیجا۔

مجھے اب احتیاطاً خط نہ لکھنا　　　مرے بیٹے کو پڑھنا آ گیا ہے

(تقاضے صفحہ نمبر 158)

پھر یہ سلسلہ بھی ٹوٹ گیا اس کے کردار کی طرح..........شاید جارج کونارڈ نے بھی اسی لئے کہا تھا۔

"یہ ایک خطرناک دور ہے۔ لفظ حرمت فنا ہو رہی ہے۔ کردار ٹوٹ کر بکھر رہے ہیں اور یادیں منتشر ہو رہی ہیں۔ کوئی بھی یہ نہیں کہہ کر اپنے آپ کو تسلی نہیں دے سکتا کہ حالات بدلیں گے..........!!

ان ہی دنوں ان کے محلے میں کسی بڑے سرمایہ دار ایم این اے کے نام کی تختی لگ رہی تھی کہ محلے کے ایک کھلے پلاٹ میں ممبر کے صوابدیدی فنڈ سے ایک پارک کی تعمیر ہو رہی ہے، جس کی لاگت کا تخمینہ اتنا اور پھر مدت اتنے عرصے میں مکمل ہو گی۔ اس تختی کو دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

بنا رہے ہیں عبث کھیل کود کے میدان　　　ہمارے شہر کے بچے تو کام کرتے ہیں

(تقاضے صفحہ نمبر 54)

پھر وہ تختی لگی ہی رہی..........تعمیر کو مفاد کی دیمک کھا گئی۔ ہنستے مسکراتے بے فکر بچوں کو محلے کے بڑے بوڑھوں نے کھیلنے سے اس لئے روک دیا کہ ان کی بوڑھی سماعتیں شور و غل کا بوجھ سنبھالنے سے قاصر تھیں۔ وہ دن بھر کی مشقتوں کے بعد واپس آتے تو بھی انہیں کھیلنے کو کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کے کانوں نے پھر یہ بھی سنا کہ یہ سب کچھ وہی سرمایہ دار کر رہے ہیں جن کے نام کی تختی یہاں کہیں لگی تھی:

وہ کون ہے جو انہیں کھیلنے نہیں دیتا　　　یہ کم سنی میں جو روزی کمانے لگتے ہیں

(تقاضے صفحہ نمبر 161)

جارج کونارڈ کا کہا اسے بار بار یاد آ رہا ہے۔

"ہم سب اپنی اپنی زندگی کے کسی نہ کسی سگنل پر رکے ہوئے ہیں اور ہماری خواہشات و توقعات بھکاریوں کی طرح ہمارے مقدروں کے شیشوں پر ہاتھ مار مار کر اپنے ہونے اور شیشوں کے کھلنے کے منتظر رہتے ہیں اور ہم انہیں ٹالنے (IGNORE) کرنے کا رسک لیتے رہتے ہیں.........."

وہ آج بہت اداس تھا صبح سے ہی اس کی سوچوں پر مایوسیوں نے گھیرا ڈالا ہوا تھا گلی میں سے ہر روز وہ گزرتا تھا مگر اس وقت اس کے بچے سوئے ہوئے ہوتے تھے لیکن کچھ دنوں سے اس نے گزرنے کے ساتھ ساتھ ننھا سا باجا بجانا شروع کر دیا تھا جسے سن کر بچے نہ صرف جاگ جاتے تھے بلکہ غبارے خریدنے کی ضد کرنے لگتے تھے۔

وہ ہنستے کھیلتے بچے رلا کے چھوڑ جاتا ہے　　　غبارے بیچنے والا گلی میں روز آتا ہے

(تقاضے صفحہ نمبر 82)

وہ اسی طرح اداس و پریشان گلی میں نکل آیا۔ بوجھل قدم اٹھائے گلی سے محلّہ اور پھر محلے سے پارک میں آ گیا۔ پارک میں کھڑے درخت بھی اس کی طرح اداس کھڑے تھے۔ خزاں نے ان کے ننگے ابدان سے تمام پیرہن چھین لئے تھے۔ اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ اور پھر کسی نے اسے بتایا بھی تو نہ تھا کہ موسم بدل چکا ہے' درختوں کے ننگے بدن دیکھ کر معاً اسے اپنے بچے یاد آ گئے۔

پیڑ بھی ننگے بدن ہیں میرے بچوں کی طرح　　　میرے گھر کی مفلسی صحن چمن تک آ گئی

یہ خیال آتے ہی وہ پاگلوں کی طرح چیخ اٹھا:

حاکم وقت سے اتنا کوئی کہہ دے جا کر   چھین لیتا ہے کوئی میرا نوالہ مجھ سے

مگر اسی لمحے اس کے اندر..........کہیں سے آواز سنی.....تم غلط ہو..........جاناں بات ایسے نہیں..........ایسے ہے..........

ہم نے بشر کو آپ ہی رزاق بنالیا   اپنے حقوق مانگ کر خیرات کی طرح

(تقاضے صفحہ نمبر155)

یہاں آ کر کہانی سنانے والا پھر چپ ہوجاتا ہے کچھ دیر کے وقفے کے بعد ہنس کر کہتا ہے......
یہ وہ کہانی ہے جو ازل سے جاری ہے اور شاید ابد تک یونہی جاری رہے یہ اس کی فنکاری تھی کہ اس نے نصرت صدیقی کے نئے ''مجموعہ کلام'' تقاضے سے ہولے ہولے لے کر پزل کی طرح جوڑا اور ایک کہانی گھڑ لی..........یہ کہانی امر ہو نہ ہو..........مگر حالات کی صداقتیں اس امر سے کہیں اختلاف نہیں کر پائیں گی۔ کیا کوئی فنکار اس طرح مختلف انواع واقسام کے شعروں سے ایسی کہانی تخلیق کر پائے گا۔ اس کو داد دینے کی خاطر آپ بھی سوچیے..........میں بھی سوچتا ہوں..........

❀❀❀

آج پاکستان سمیت دنیا بھر میں دہشت گردی کی لامتناہی لہر غیر محفوظ دنوں کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس لہر کو ختم کرنے کے لیے حکومتوں کے اقدامات سے زیادہ ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں کی ضرورت ہے۔ دنیا کے اُن تمام ملکوں میں جہاں دہشت گردی کا کانٹوں بھرا ببول اپنی جڑیں گہری کر کے ایک مہیب درخت بن گیا ہے، اسے محض کاٹنے سے دہشت گردی ختم نہیں ہوگی، بلکہ اس کی جڑوں کو جلانے کے لیے محبت، امن، دوستی، بھائی چارہ، تعاون اور یگانگت کے موضوعات سے لبریز تحریروں کو جراثیم کش دوا کے طور پر جڑوں میں ڈالنا ہوگا، تاکہ حکومتوں کے سطحی اقدامات کے ساتھ ساتھ اہلِ قلم، تخلیق کاروں، فن کاروں اور صحافت سے جڑے دانش وروں کی پائیدار کوششیں بارآور ہوں۔ اس کے لیے ہمیں اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرنا ہوگا۔
(احسن سلیم)

حیرانی کے در وا کرتا شاعر: خاور وحید

تحریر: ڈاکٹر گل عباس اعوان

کبھی کبھی کوئی منظر آنکھوں میں نقش ہوجاتا ہے' جیسے دل کے شیشے پر محبوب کی تصویر چسپاں ہوجاتی ہے۔ 1981ء کی ایک صبح' ایک وجیہہ مُسکراتا چہرہ' دلکش ہیئر اسٹائل' آنکھوں میں قوس وقزح کے رنگ لئے' لبوں سے پھوٹتے جھرنے......شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو..........زندگی کے ہزاروں خواب بانٹتا' ایک نوجوان فلسفی' ہمارے کلاس روم میں آتے ہیں۔ یہ ہمارے اُردو زبان وادب کے پروفیسر خان محمد بھٹی تھے' پھر وہ دیکھتے دیکھتے ہمارے سامنے خاور وحید ہوگئے۔
ان دنوں وہ غالباً محوسفر تھے۔ کشمکش میں مبتلا بے چین' کسی منظر سے نکل جانے کا کرب' کسی کا ہاتھ چھوٹ جانے کا قلق یا پھر ان ہی منظروں میں واپس گم ہونے کی خواہش' کسی سے ملنے کی طلب۔ کبھی کبھار تو یوں محسوس ہوتا کہ یہ ساری باتیں، یہ سارے راز' ان کے لئے آکسیجن ہیں، جن کی عدم دستیابی پر خاور وحید کی سانسیں اکھڑنے لگتی ہیں، یوں لگتا ہے کہ کسی مور کی بزم طرب میں جانے کی خواہش انھیں ٹکنے نہیں دیتی۔

وہ بولتا ہے تو دل میں خیال ناچتے ہیں   چلو کہ بزم طرب میں وہ مور بھی ہوگا

یوں لگتا ہے کوئی مقناطیسی قوت' انہیں بار بار اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

میرے لوٹ آنے پر تم کو کیسی حیرت ہے   ساحلوں پہ آئے گا، ساحلوں کا پانی تو

طلب کی آگ جنگل کی آگ کی طرح چو فیر لگتی ہے' انسان ماضی پرست ہے تو NOSTALGIA کا شکار ہوجاتا ہے، جی پھر وہی فرصت کے رات دن ڈھونڈتا ہے' مگر خاور وحید حال میں زندہ رہتے ہوئے' ایک طرف تو مستقبل سے جڑے ہوئے ہیں، تو دوسری طرف ان کے تخیل کا مرکزی جذبہ' ان کا ماضی' انہیں اپنی طرف کھینچتا ہے' یہ ماضی انہیں حسین خواب عطا کرتا ہے۔

اک ذرا اس کو سوچ لینے سے   خواب اترے مرے گمان میں کیا

وہ مجھے سوچ کر پلٹ آیا　　دل دھڑکنے لگا چٹان میں کیا

خاور وحید صاحب کا عصری شعور بہت گہرا ہے۔اس کی بنیادی وجہ اس کا وسیع مطالعہ اور عمیق مشاہدہ ہے۔تعلیم کے دوران اور ملازمت کے سلسلہ میں انہیں بہت سارے علاقوں میں جانے اور رہنے کا موقع ملا انہیں سیاسی و معاشی نظام کو نہ صرف سمجھنے بلکہ سمجھانے کا موقع بھی ملا' انہوں نے دیکھا کہ کئی عظیم لوگ' معزز و مکرم ہستیاں اور صاحبان علم و ہنر' وقت کے ہاتھوں بے توقیر ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

کیوں عمر گنواتے رہے اقلیم سخن میں　　یہ سکہ تو بازار میں چلنا ہی نہیں تھا

ہوس پرستی نے انسان سے انسان پرستی چھین لی ہے۔انسان اپنوں اور دوستوں کے رویوں کو دیکھ کر دھند بھری حیرانی میں کھو جاتا ہے' تیر لگنے پر مڑ کے دیکھے تو کمیں گاہ میں اپنوں سے ملاقات ہو جاتی ہے' خاور وحید بھی' اقدار کی ٹوٹ پھوٹ پر دل گرفتہ نظر آتے ہیں۔

اب وفا کے معنی ہیں چھوڑ کر چلے جانا　　اب خلوص باقی ہے دیکھنے اور دکھانے کو
خون کے سب ہی رشتے دور ہوتے جاتے ہیں　　بھائی دوڑے آتے ہیں مارنے' مٹانے کو

اس موضوع پر بات کرتے ہوئے محترم سلیم شہزاد کا کہنا ہے:

''زمانہ جس انداز میں چل رہا ہے اس نے انسان کو انسان سے نہ صرف جدا کر کے رکھ دیا بلکہ رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ بھی اس طور کی ہے کہ ہر رشتہ دراڑ کا رشتہ بن کر رہ گیا ہے' رشتوں کی دراڑ نے سماجی سطح پر انسان کو ایک ایسے اندھیرے غار میں دھکیل دیا ہے کہ وہ اپنی شناخت سے نا آشنا ہوتا جا رہا ہے۔''

خاور وحید صاحب کے نزدیک حرص اس قدر طاقت ور قوت ہے کہ یہ انسان سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لیتی ہے۔انسان اپنوں کی باتوں کے ساتھ ساتھ' اپنے مذہب اور اپنے آئین و قانون سے بھی رہنمائی حاصل کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔

خواہشوں کے جال میں کچھ اس طرح الجھیں گے لوگ　　وقت کا بوڑھا پیمبر' کوستا رہ جائے گا
صورت سیل رواں دل گیر عاشق کی طرح　　میں چلا جاؤں گا اور تو دیکھتا رہ جائے گا

خاور وحید انقلابی فکر اور حر مزاجی کے حامل شاعر ہیں جہاں انہیں عشق نے عاجزی' انکساری' صبر و تحمل اور ملائم لہجہ عطا کیا ہے وہاں انہیں حریت فکر بھی میسر آئی ہے' وہ فلسفہ انکار سے جڑے ہوئے ہیں وہ ہر غاصب قوت کی بیعت سے انکاری ہیں انہیں ہر چیز سے زیادہ دستار عزیز ہے۔

میں تیرے ہاتھ پہ بیعت نہیں کرنے والا　　تو مجھے شہر میں رکھے یا نکالے چاہے
عہد کم ذات میں اک چیز ہی ہو سکتی ہے　　پیٹ بھر لے کہ تو دستار بچا لے چاہے

فلسفہ انکار پر عمل پیرا لوگ پر عزم اور ہر مصیبت سے نپٹنے کیلئے تیار ہوا کرتے ہیں۔وہ جانتے ہیں

کہ انکار کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، انکار کے عوض روگ ملتے ہیں سلاسل' یا لاشیں' لہٰذا وہی شخص ہی انکار کی جرأت کرے گا جو عزم صمیم سے مالا مال ہوگا۔

کچھ ایسے روگ بھی ہم تو چھپا کے پھرتے رہے　　جو حرف حرف سے ٹپکے نہ چشم تر سے گرے
گلہ کیا ہی نہیں کسی سے　　اجڑ کے بھی ہیں نہال بیٹھے

خاور وحید کی شاعری کا ایک اور وصف ان کی شاعری میں موجود آفاقی حقیقتیں ہیں جو زندگی کی نئی راہیں دکھاتی ہیں انہیں پڑھ کر یقین ہوتا ہے کہ شاعر واقعی شعور تقسیم کرتا ہے' خاور وحید کے نزدیک لمحہ موجود سے لطف اندوز ہونا ہی اصل زندگی ہے اس کی لطف اندوزی سے محروم لوگ ہی دراصل زندگی کی رعنائیوں سے محروم ہوا کرتے ہیں۔

گر یار میسر ہے اسے ٹوٹ کے چاہو　　پھر وقت سدا ایسے زمانے نہیں دے گا

موت ایک اٹل حقیقت ہے' زندگی کو نہ جوانی بچا سکی ہے نہ صحت' نہ اسپتال اس کے آگے دیوار بن سکے ہیں' نہ خوشحالی' لہٰذا دیکھا یہی گیا ہے کہ بڑے لوگ موت کا استقبال بھی اک عزیز مہمان کی طرح کرتے ہیں خاور وحید اس صورتحال پر طنزاً کہتے ہیں:

متاع جاں کو بچاتا تو پھر رہا ہوں مگر　　اٹھا ہی لے گا اسے وہ جہاں پہ رکھوں گا

یہ بھی حقیقت ہے کہ عزیز' مخلص اور قریبی رشتے' گزرے لمحوں کی طرح نہیں ہوتے' کہ رنجش ہو جانے کے بعد کبھی بھی لوٹ کے نہ آئیں' اگر گھونسلے اور انسان اپنا قلب وسیع کر لیں تو پرندے اور متر لوٹ آتے ہیں۔

پلٹ آؤ مرے ناراض لوگو!　　میں اپنا دل کشادہ کر رہا ہوں

خاور وحید صاحب اپنی شاعری کو صنائع و بدائع یعنی حسن معنوی اور حسن لفظی سے نکھار بخشتے ہیں انہیں علم بیاں پر قدرت حاصل ہے وہ صنعتوں کے استعمال سے اپنے کلام میں کئی رنگ بھر دیتے ہیں:

یہ طے تھا اسے ساتھ تو چلنا ہی نہیں تھا
آندھی کے مقابل دیا جلنا ہی نہیں تھا
سایہ بھی عداوت پہ اتر آیا تو جانا
دیوار کا لکھا تھا جو ٹلنا ہی نہیں تھا
(صنعت تضاد)

رات بھر جاگتے رہے دونوں
میں تھا اور ہجر کا ستارہ تھا
میرا اس کا ملاپ کیا ہوتا
میں زمیں وہ فلک کا تارہ تھا
(صنعت تضاد)

خاور وحید نفیس مزاج انسان ہیں‘ ان کی نفاست ان کی شاعری کا حسن ہے۔ انہیں جذبوں کا بیاں کرنے کا ہنر آتا ہے‘ اعلیٰ تخیل‘ لفظوں کا چناؤ اور بیان کا سلیقہ‘ ان کی شاعری کو نفیس جذبوں کی شاعری بنا دیتے ہیں۔

جب اس کا ذکر‘ میں اپنی زباں پہ رکھوں گا　　زمیں اٹھا کے کسی کہکشاں پہ رکھوں گا
میں اس کے دل سے نکالوں گا وسوسے سارے　　یقین کا ہاتھ پھر اس کے گماں پہ رکھوں گا

خاور وحید کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر طارق عزیز لکھتے ہیں: ”خاور وحید کی شاعری خالص جذبوں کی شاعری ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر ایک نظم اور غزل کے ایک ایک شعر‘ میں صداقت‘ اخلاق اور شدت احساس کا گہرا شعور ملتا ہے۔“

ہاں، حقیقت بھی ہے کہ ان کے جذبے ان کی نظموں میں بھی اپنے رنگ بکھیرتے ہیں ان جذبوں میں کوئی ان دیکھا خوف کسی سے بچھڑنے کا دھڑکا تو ملتا ہے‘ مگر کہیں کہیں یہ خوف‘ تجربے کی صورت نمایاں ہوتا ہے۔

دیر تلک‘ وہ یونہی بیٹھی / جانے کن سوچوں میں گم تھی / آخر بولی
آج سے پہلے اک راہی نے یہی کہا تھا / اتنی اچھی کیوں لگتی ہو یہ کہہ کر وہ چلا گیا تھا / پھر نہیں لوٹا

مختصر یہ کہ ان کا کلام پڑھنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کی شاعری مکمل زندہ رہنے والی اور دور و دیر تک سفر کرنے والی شاعری ہے۔ ان کی شاعری نے کئی موسموں کو حسن‘ پھولوں کو خوشبو اور رنگوں کو رنگینی عطا کرنی ہے۔

اس ستم گر کے وہاں اپنی کہانی لے جا　　دل کو آواز بنا‘ آنکھ میں پانی لے جا
خط کے لکھے ہوئے جذبات میں تاثیر کہاں　　کوئی تدبیر بنا‘ بات زبانی لے جا

❁❁❁

منیر نیازی......شخص اور شاعر......ایک تحقیقی مقالہ

ڈاکٹر سکندر حیات میکن

تیز ہواؤں اور تنہا پھولوں سے اپنی شعری زندگی کی شروعات کرنے والے اردو شاعری کے خان اعظم کبھی دشمنوں میں شامیں گزارتے رہے اور کبھی جنگلوں میں دھنک رنگ دیکھتے رہے، لیکن چھ رنگین دروازوں سے گزرنے کی ساعت سیار کے بعد انھیں ماہ منیر نظر آتا ہے اور سفید دن کی سفیدی اور سیاہ راتوں کی تیرگی میں وہ ایک دعا مانگنا بھول جاتا ہے اور اردو شاعری میں ایک مسلسل پہلی اور آخری بات کہہ کر منیر نیازی نے خود کو ہمیشہ کیلئے امر کر لیا۔

ملک عزیز میں جہاں اردو کے نفاذ کے مسائل ہیں، تو وہاں دوسری طرف اردو زبان کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اس کے بولنے اور لکھنے والے موجود ہیں، زبان جب تک کسی خطے میں بولی سمجھی اور لکھی جاتی ہے، تو اس کی سالمیت کو اتنے خطرات درپیش نہیں ہوتے۔ پاکستانی جامعات کے اردو کے شعبہ جات، اردو کے مستقبل اور خوشحالی کی اہم علامت ہیں، پاکستانی جامعات میں اردو میں ہر سال کچھ تحقیقی مقالے بھی سامنے آجاتے ہیں جو اردو ادب کی ترویج و ترقی اور علمی حوالے سے خصوصی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان قابل لحاظ مقالہ جات میں ایک اہم مقالہ جو پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ اردو کی جانب سے سمیرا اعجاز نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کیلئے تحریر کیا، جو 2014ء میں مثال پبلی کیشنز، فیصل آباد سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے، سندی تحقیق میں عمومی طور پر مقالہ نگار بہت سے پہلوؤں کو زیر غور نہیں لاتے، لیکن سمیرا اعجاز نے اپنے مقالے ”منیر نیازی شخص اور شاعر“ میں سندی تحقیق کی ایک اعلیٰ مثال قائم کی ہے۔

ڈاکٹر سمیرا اعجاز نے زیر نظر تحقیقی مقالے (منیر نیازی شخص اور شاعر) میں اردو شاعری کے خان اعظم کی شخصی اور شعری پرتوں تک رسائی کیلئے اپنے مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ منیر نیازی کی نادر الکلامی اور شعر و ادب میں ان کا مقام و مرتبہ قابل لحاظ ہے، سمیرا اعجاز نے اس مقالے کا خاکہ

بڑی معروضیت سے تیار کیا ہے۔ کسی بھی مقالے کی ابتدائی صورت اس کا خاکہ ہوتا ہے۔ مقالہ نگار نے منیر نیازی کی جامع شخصیت کا احاطہ پانچ ابواب میں کر دیا ہے۔

منیر نیازی، سوانحی حقائق و شخصی وظائف پہلے باب کا عنوان ہے۔ ڈاکٹر سمیرا اعجاز نے اس باب کی ابتدا میں منیر نیازی کے سوانحی کوائف کو تحقیقی انداز میں پیش کیا ہے۔ سوانحی کوائف کا خاکہ مدلل انداز میں پیش کیا ہے۔ سمیرا اعجاز نے منیر نیازی کی تاریخ پیدائش سے لے کر ان کے بچپن اور لڑکپن اور ابتدائی تعلیم کا احوال مختلف ناقدین کی آراء میں بیان کیا ہے۔ اسی طرح مکمل حوالے سے منیر نیازی کی ازدواجی زندگی کی عکاسی بھی کی ہے۔ منیر نیازی کی زندگی کے ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی میلان کے ساتھ ساتھ مقالہ نگار نے ان کی زندگی کے ابتدا میں ادبی رجحان کی توضیح بھی کر دی ہے۔ منیر نیازی کے شخصی خدوخال سمیرا اعجاز نے بڑے معروضی انداز میں واضح کیئے ہیں۔ ان کی عادات واطوار اور ادبی وشعری رجحانات کی عکاسی بھی خوب کی ہے، سمیرا اعجاز منیر کی کثیر رخی شخصیت کے بارے میں لکھتی ہیں:

''منیر نیازی کی شخصیت کے کئی رُخ ہیں۔ ان کی شخصیت میں ایسا سحر اور کشش تھی، جو ہر کسی کو اپنی جانب متوجہ کرتی تھی۔ ان کے اردگرد پرستاروں اور چاہنے والوں کا ہجوم تھا لیکن ان کی ذات اور باطن تک پہنچنے کی کلید کسی کے پاس نہ تھی۔ وہ زندگی کی دل آویزیوں سے پیار کرتے تھے، کائنات کے حسن اور فطرت سے مکالمہ کرتے تھے۔ دوسری جانب انہیں مکروہ اور منافق دلوں سے نفرت تھی۔ درحقیقت وہ ایک معصوم، سادہ لوح اور صاف گو انسان تھے۔ کوئی لگی لپٹی روا نہ رکھتے تھے۔''

کسی بھی شاعر کی ذاتی، ازدواجی اور سماجی زندگی اس کی شعری تفہیم میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے، شاعرانہ فکری رویوں میں عمومی زندگی کے رجحانات کا بڑا عمل دخل ہوتا ہے، ڈاکٹر سمیرا اعجاز نے منیر نیازی کی پیدائش، بچپن پھر ازدواجی زندگی کی شروعات اور شعر فہمی کے رجحان کے ساتھ ساتھ دیگر عمومی رویوں کی طرف ان کی دلچسپی، حتیٰ کے مشاغل تک کا بیان قلم بند کر کے منیر کی شخصی زندگی کے تمام پرتوں کو اختصار کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ منیر نیازی کی شخصیت سے متعلق اتنی باریک بینی سے پہلے کسی کتاب میں بیان نہیں کیا گیا۔ یہ حالات و واقعات اور منیر نیازی کی شخصیت کی جذباتی اور نفسیاتی پرت ان کی شعری تفہیم میں بہت معاون ہوں گے۔ مصنفہ نے بڑے استدلال کے ساتھ معلومات جمع کی ہیں اور منیر نیازی کے شخصی اور دیگر ذاتی نقوش ابھارے ہیں، اس مقالے کا یہ باب منیر نیازی کو بطور شخص قارئین کے سامنے لاتا ہے، یہ معلومات اور انکشافات منیر نیازی کی شاعرانہ روح تک پہنچنے کا ایک بڑا ذریعہ ہیں۔

''ادبی آثار کا تحقیقی وتنقیدی تناظر'' دوسرے باب کا عنوان ہے۔ ڈاکٹر سمیرا اعجاز نے اس باب میں منیر نیازی کے ادبی سفر کی مکمل روداد قلم بند کر دی ہے۔ اس باب میں انھوں نے زمانی ترتیب سے منیر نیازی کی شعری تخلیقات کا تحقیقی وتنقیدی انداز میں تعارف پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے منیر نیازی کے تمام شعری مجموعوں کو جو متعدد بار مختلف اشاعتی اداروں سے اشاعت پذیر ہوئے، کا مطالعہ اور موازنہ کیا ہے۔ انھوں نے بڑی تحقیق و تدقیق کے ساتھ ایک مکمل اور منظّم فہرست پیش کی

ہے۔ ڈاکٹر سمیرا اعجاز نے اس ضمن میں محض فہرست سازی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کلام کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے اور کئی اختلافات کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اس طرح منیر کے غیر مطبوعہ کلام کے حوالے سے معلومات بھی پیش کی ہیں۔ مصنفہ نے منیر نیازی کی پنجابی شاعری کو بھی متعارف کرایا ہے، اس باب میں منیر نیازی کی دیگر نثری تخلیقات کا بھی مکمل تعارف پیش کیا گیا ہے مثلاً کالم نگاری، گیت نگاری، ڈرامے اور افسانہ کے حوالے سے مکمل معلومات ڈاکٹر سمیرا اعجاز نے قلم بند کی ہیں۔ منیر نیازی کے فلیپ، دیباچے، خاکے، اداریئے، تبصرے اور ان کی پنجابی نثر سے متعلق اہم معلومات تحقیقی انداز میں پیش کی ہیں۔ مصنفہ نے تنکا تنکا جمع کر کے منیر نیازی کے تمام حوالوں سے ان کے ادبی آثار اور مخفی آثار نمایاں کر دیئے ہیں، ایک اہم تحقیقی اشارہ کہ منیر نیازی نے خاکے بھی لکھے بقول سمیرا اعجاز:

''منیر نیازی نے دو خاکے بھی لکھے ہیں۔ ایک خاکہ 'مجید امجد' کے عنوان سے ماہنامہ 'نصرت' لاہور 1961 میں شائع ہوا، دوسرا خاکہ 'خورشید انور سے ایک ملاقات' کے عنوان سے ماہانہ 'ادب لطیف' لاہور میں جنوری 1965ء میں شائع ہوا۔''

مصنفہ کا موضوع چوں کہ ان کی شاعری سے متعلق ہے، اس لئے انھوں نے منیر نیازی کی نثری تخلیقات کی صرف فہرست سازی اور معلوماتی حد تک چیزوں کی رسائی کو ممکن بنایا ہے، منیر نیازی کی نثری تخلیقات کے حوالے سے ان پر الگ مقالے کی گنجائش موجود ہے۔ بہرحال اس بات میں تحقیقی حوالے سے دیکھا جائے، تو منیر نیازی کے مختلف شعری کلام میں متون کا اختلاف ڈاکٹر سمیرا اعجاز کا ایک خصوصی کارنامہ ہے۔

منیر نیازی قیام پاکستان کے بعد ابھرنے والے شعرا کی کھیپ سے تعلق رکھتے ہیں، قیام پاکستان کے بعد اُردو شاعری بالخصوص اُردو نظم میں ان کی ایک نمایاں حیثیت رہی، زیر نظر تحقیقی مقالے ''منیر نیازی۔ شخص وشاعر'' کے تیسرے باب کا عنوان منیر نیازی کی نظم کا فکری و تشکیلی نظام ہے۔ ڈاکٹر سمیرا اعجاز نے اس باب میں منیر نیازی کی نظم نگاری کی ابتدا سے انتہا تک کو موجوع بنایا ہے اور منیر نیازی کی نظموں کا فکری وفنی رجحانات کے تناظر میں مطالعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ نظم ''برسات'' سے اپنی نظم نگاری کی ابتدا کرنے والے منیر کی ستاون برس نظم نگاری پر محیط زندگی کو تین ادوار میں پیش کیا ہے۔

1...... پہلا دور............1949 تا1964

2......دوسرا دور......1965 تا1983

3......تیسرا دور............1984 تا2006

منیر نیازی کی نظم گوئی کے ستاون برسوں میں کل چار سو نظمیں شامل ہیں۔ ڈاکٹر سمیرا اعجاز نے ہر دور کی نظموں کا فرداً فرداً تجزیاتی اور فکری وفنی معالعہ پیش کیا ہے۔ یہ اس مقالے کا اہم باب ہے اور منیر کی نظم کی باطنی اور موضوعاتی ادراک میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

پہلے دور کی غزلوں کے فکری وموضوعاتی رجحانات میں فطرت سے وابستگی، افسردہ رومانیت، داستانوی فضا، ہندی اساطیر کے ساتھ منیر نیازی کی پہلے دور کی غزلوں کے کلیدی استعاروں (ہوا،

جنگل، شام، خزاں اور شہر) کو نمایاں کیا ہے۔ یہ منیر نیازی کی نظموں کے گہرے مطالعے کے بغیر ممکن نہیں، اسی طرح دوسرے دور کے غالب رجحانات میں منیر نیازی کی نظمیہ کائنات کو اہل بیعت اور حب الوطنی کے گرد دیکھا ہے، جب کہ منیر نیازی کی نظموں کے تیسرے دور میں پہلے دور کی خصوصیات کی چھاپ کے ساتھ یاد ماضی اور متنوع موضوعات کو بھی واضح کیا ہے۔

ڈاکٹر سمیرا اعجاز نے منیر نیازی کی نظموں کے مرکزی خیالات کو متنوع موضوعات میں قارئین کی شناسائی کروائی ہے۔ ان میں فطرت اور محبوب کے حسن کا سنگم ایک اہم زاویہ ہے، مصنفہ نے منیر نیازی کے ہر گیت کو ان کی شعری زندگی کے ادراک کا ایک بڑا ذریعہ قرار دیا ہے۔ منیر کی خود پسندی ان کی شعری کائنات میں مرکز کا درجہ رکھتی ہے، بقول ڈاکٹر سمیرا اعجاز:

''منیر نیازی کی سحر انگیز شخصیت اور لوگوں کی جانب سے ملنے والے بے پناہ پیار نے ان کے مزاج میں نرگسیت اور خود پسندی کا عنصر پیدا کر دیا جس کا شاخسانہ ان کی انفرادیت پسندی ہے، جو انہیں ہر دم نئی ڈگر کا مسافر بناتی ہے۔ مزاج میں اسی عنصر کی وجہ سے ان کی شاعری میں خود مرکزیت کا پہلو غالب ہے جس کے نتیجے میں لفظ 'میں' کی تکرار بکثرت ملتی ہے، خود مرکزیت کے اس رویے کے پس پردہ رومانوی رجحان ہے، جس کے تحت وہ اپنے گرد و پیش سے مطمئن نہ ہونے کے سبب قحط الرجالی کا نوحہ سناتے ہیں اور مایوسی کے عالم میں خود اپنی ہی شخصیت کے سحر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔''

منیر نیازی کی نظم کے فکری اور تشکیلی نظام میں مصنفہ نے جو توضیحات کی ہیں، وہ منیر کے ہاں پروان چڑھنے والے اہم فکری اور معروضاتی زاویے ہیں۔ سمیرا اعجاز نے واضح کیا ہے کہ منیر کی نظموں میں آداب عشق کی پاسداری کے ساتھ عشق کا روایتی تصور بھی موجود ہے، اسی طرح ان کی نظموں میں عورت حسن و جمال کا مرقع نظر آتی ہے اور ساتھ ساتھ عورت کے مربوط اور جاندار رویئے کی عکاسی بھی منیر کی نظموں کا روشن پہلو ہے۔ کام دیو، رادھا، کرشنا اور پاروتی کے تذکروں سے مصنفہ نے منیر نیازی کی نظموں میں ہندی اساطیر کی طرف توجہ کو نمایاں کیا ہے۔ منیر کی نظموں میں عورت کے کردار کی اہمیت کو یوں واضح کیا ہے:

''منیر نیازی کے ہاں جس عورت کا نقشہ بنتا ہے وہ حسن و جمال کا مرقع ہے وہ اسے کائنات کا حسین جزو سمجھتا ہے۔ شاعر نے بہت سی نظموں میں اس کا سراپا بیان کیا ہے۔ نظم 'سراپا' محبوب کے حسن و جمال کی مکمل تصویر ہے، ان کے ہاں تصور عورت کا پہلا حوالہ مشرقی عورت کا ہے، جو حسین و جمیل، خوش باش، باوفا، باکردار اور مشرقی تہذیب و روایت میں گندھی ہوئی ہے۔ وہ اچھی بیٹی، اچھی بیوی اور اچھی ماں کے روپ میں سامنے آتی ہے۔ نظم 'ایک خوش باش لڑکی' میں ایک ایسی باعصمت لڑکی کا ذکر ہے، جو جذبات کی رو میں بہنے کی بجائے مشرقی اقدار اور روایت کی پاسداری کرتی ہے۔''

رنگوں کے انتخاب اور منیر نیازی کی نظموں میں رنگوں بھری کائنات کو بھی ڈاکٹر سمیرا اعجاز نے ایک خاص معنویت کے تحت اجاگر کیا ہے۔ اسی طرح وجودیت اور موت کے نقش بھی منیر کے ہاں واضح کئے ہیں، منیر کی نظموں کے دو اہم زاویے مصنفہ نے متعارف کروائے ہیں، انھوں نے بڑے منظّم انداز میں

منیر نیازی کی مذہبی عقیدت اور حب الوطنی کو پیش کیا ہے۔ سمیرا اعجاز نے مختلف ناقدین کی آراء بھی اس حوالے سے پیش کی ہیں اور منیر کے ہاں مذہبی اور وطنی عقیدتوں کو ایک خاص پیرائے میں پیش کیا ہے۔ اس ضمن میں وہ لکھتی ہیں:

''اس ارض پاک کو منیر نیازی، مختلف صفاتی ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ جن میں نظر کی روشنی، جلال حق کا مظہر، نشان سرخوشی، بہار دائمی، شمع دل اور مرگ دانش کے جہاں میں لہلہاتی زندگی شامل ہیں۔ وہ اس وطن کو اسلام کی آخری امید گاہ سمجھتے ہیں، جو خدا اور رسولِ ﷺ کے نام پر حاصل کیا گیا۔ چنانچہ خطہ پاک اسلام سے ان کی وابستگی کی علامت ہے، یہ زندگی میں روشنی لانے کا اعلامیہ اور سرچشمہ ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ قیام پاکستان کے وقت عمل میں آنے والی ہجرت دراصل، اسی ہجرت کا شاخسانہ ہے، جو حضور پاک ﷺ اور ان کے ساتھیوں نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی جانب کی۔''

منیر نیازی کی نظموں میں مرکزی اور فکری رجحان کی عکاسی کے ساتھ مصنفہ نے فنی حوالوں سے بھی منیر نیازی کی نظموں کو متعارف کروایا ہے، ڈاکٹر سمیرا اعجاز نے منیر نیازی کی نظموں کے فنی حوالوں کو جن پہلوؤں سے پرکھا ہے، ان میں نظم اور عنوان کا باہمی ربط نظموں میں ہیئتی تجربات، طرز ادا، لفظیات کا مطالعہ، کرداری نظمیں، استعارہ و علامت سازی، تمثال آفرینی اور علم بیان و بدیع شامل ہیں۔ اسی طرح منیر نیازی کی نظموں میں ہیئتی تبدیلیوں کے حوالے سے واضح رجحانات ملتے ہیں۔ ان میں روایتی ہیئتوں کا استعمال، روایتی ہیئتوں میں جزوی تبدیلیاں، دو یا دو سے زیادہ ہیئتوں کا امتزاج، نئی ہیئتوں کا اختراع، آزاد نظم کا رجحان اور نثری نظم کا رجحان نمایاں ہیں۔

مصنفہ نے منیر نیازی کی نظموں کو ان فنی کسوٹیوں پر پرکھا ہے اور ایک واضح نقطہ نظر قارئین کو پیش کیا ہے۔ منیر نیازی کی نظموں کے فنی نظام میں استعمال ہونے والے محاوارت، استعارات اور تراکیب کو مثالوں کے ذریعے واضح کر دیا ہے، منیر کی نظموں میں علامتی انداز فکر کی عکاسی بھی کی ہے۔ ڈاکٹر سمیرا اعجاز نے شہر اور دیہات کی ایک مخصوص فضا کو بھی منیر نیازی کے ہاں واضح کیا ہے، ان تمام فکری و فنی خصائص نے منیر نیازی کی نظم نگاری کو ایک خاص وقار اور معیار عطا کیا ہے۔ بقول ڈاکٹر سمیرا اعجاز:

''منیر نیازی اردو نظم کے منفرد اور رجحان ساز شاعر ہیں، جنھوں نے اس صنف کو متنوع موضوعات اور انداز بیاں کے مختلف قرینوں اور سلیقوں سے آشنا کیا۔ اپنے من میں ڈوبنے اور سراغ پانے کی جستجو ان کے ایک ایک مصرعے سے عیاں ہے، ذات کے غیاب کی غوطہ زنی، ناسٹلجیائی کیفیات اور عصری صورتحال کیلئے علامتی پیرائے نے ان کی نظم کو جو وقار اور اعتبار عطا کیا ہے، وہ انھیں ان کے معاصرین میں نمایاں مقام بخشتا ہے، تحیراتی فضاء، پراسراریت اور امیجز کی تشکیل، ان کے مابعد شعرا کے لئے تقلید کا وسیلہ بھی بنی۔''

زیر نظر تحقیقی مقالے کا یہ باب خاصی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ اس میں منیر نیازی کی نظموں کا بالاستصحاب مطالعہ کیا گیا ہے۔ یہ مطالعہ محض سرسری نہیں، بلکہ نظموں کی گہری تفہیم کے بعد ممکن ہوا ہے،

کبھی کبھی مصنفہ اپنے تنقیدی خیالات کی رو میں بہنے لگتی ہیں' لیکن انھوں نے تحقیقی طریقۂ کار کو ہاتھ سے نکلنے نہیں دیا ہے۔ مثالوں اور حوالوں کو انھوں نے نظر انداز نہیں کیا۔ منیر نیازی کی نظموں کے فکری اور فنی نظام کی جو تشکیل ڈاکٹر سمیرا اعجاز نے کی ہے، وہ قابل لحاظ ہے۔

''منیر نیازی کی غزل کی شعریات، چوتھے باب کا موضوع ہے جس میں منیر نیازی کی غزل کے فطری مزاج، اسالیب و موضوعات کے ساتھ کلاسیکی رچاؤ اور سوز و گداز کے غالب رجحانات کے تحت تجزیہ کیا گیا، ڈاکٹر سمیرا اعجاز نے منیر نیازی کی غزلوں میں عشقیہ ونشاطیہ اور المیہ وحزنیہ رنگوں کو تلاشا ہے۔ مصنفہ نے منیر کی غزلوں میں ہجرت اور فسادات، ملال، خود کلامی، احساس حیرت واستعجاب' تنہائی وخاموشی، پُراسرار فضا، وجودی رویے اور عہد کی حسیت کو دریافت کیا ہے۔ ڈاکٹر سمیرا اعجاز نے منیر کی غزلیہ کائنات میں استعمال ہونے والے استحصالی رویوں، مظاہر فطرت، رومانی جہت، رنگوں کی مصنوعیت اور علامتی واستعاری نظم کی دریافت بھی منیر کی غزلوں سے کی ہے۔ اسی طرح منیر نیازی کی غزلوں میں علامت اور استعاروں کی توضیح بھی کی ہے، جن میں شہر، سفر، ہوا، شام، جنگل، چاند، سورج، دشت، پانی، شجر، آئینہ اور خواب شامل ہیں۔ منیر کی شاعری میں استعمال ہونے والی اہم علامت کے بارے میں یوں وضاحت کرتی ہیں:

''منیر کی شاعری کی سب سے اہم علامت شہر ہے۔ شہر بنیادی طور پر ڈپریشن، ذہنی دباؤ، اجنبیت، مادہ پرستی، اظہار کی کمی اور بے مقصدیت کا حوالہ ہے۔ منیر نیازی کے ہاں شہر اور ان کے معانی کے علاوہ تنہائی، اجنبیت، مادہ پرستی اور رومان سے منسلک ہے، وہ زندگی کے سیاسی وسماجی اور معاشرتی مسائل کو جوں کا توں بیان کرنے کے بجائے شہر کی علامت کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ یوں شہر کا متمدن اور سائنسی ترقی کا حامل ماحول، سماجی سطح پر زوال کی جانب سفر کرتا نظر آتا ہے۔''

منیر کی غزلوں میں استعمال ہونے والی بحروں کے انکشاف کے ساتھ، اُن کے شعری حسن کی ترجیح کو بھی بیان کیا ہے، تشبیہاتی تزئین، تراکیب سازی، تازہ بیانی تازہ خیالی، لفظی ومعنوی صنائع، منیر نیازی کی غزل کو نیا زاویہ بخشتے ہیں۔ مصنفہ نے منیر نیازی کی غزل کے سفر کو فکری فنی حوالے سے پیش کیا ہے۔ انھوں نے منیر کی غزل کے مخصوص مزاج اور میلانات کو مدلل انداز میں پیش کیا ہے اور منیر کے ہاں معاشرتی تنوع اور فکری رعنائی کی تازگی کو اہمیت دی ہے۔ سمیرا اعجاز گہرے تنقیدی شعور سے منیر نیازی کی غزل کے حوالے سے لکھتی ہیں:

''منیر نیازی کی غزل کلاسیکی اور جدید روایت کا سنگم ہے۔ انھوں نے غزل کے قدیم وجدید رنگ کو باہم اس طرح آمیز کر دیا ہے کہ پرانے رنگ میں جدید عہد کے جذباتی رویے اور محبت کے تصور اس سے اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ وہ جدید عہد کے شاعر ہونے کے باوجود پرانی شاعری کے وارث بھی قرار پاتے ہیں، اور جدید عہد کے نبض شناس بھی۔ یہ صورتحال موضوعات واسالیب دونوں سطح پر اُجاگر ہوتی ہے۔''

''منیر نیازی کے گیتوں کا فکری وفنی دیومالا'' کو پانچویں باب میں پیش کیا ہے۔ چونکہ منیر نیازی

کی نظم اور غزل کے مقابلے میں گیتوں کی تعداد بہت کم ہے، اس لئے مصنفہ مختصر انداز میں منیر نیازی کے کل گیتوں کو، جن کی تعداد صرف انیس ہے کو زیر تحقیق لائی ہیں۔ ڈاکٹر سمیرا اعجاز نے منیر کی گیت نگاری کو خالصتاً ہندی مزاج اور فارسی شعری موضوعات واسالیب کے زاویوں سے پرکھا ہے۔ منیر کے گیتوں میں رادھا، کرشن، انتظار، نسائی جذبات، تنہائی کا احساس زیادہ غالب ہے۔ منیر کے گیت روایتی رنگوں میں رنگے ہوئے ہیں اور ان پر الفاظ کی چندن خوب صورت انداز میں منیر نے اتار دی ہے، منیر کے گیت مختلف فلموں میں گنگنائے گئے، لیکن منیر گیت نگاری میں کوئی خاص ارتقائی منزل طے نہ کر سکے، ڈاکٹر سمیرا اعجاز اس ضمن میں لکھتی ہیں:

''منیر نیازی نے اگرچہ گیت کی صنف میں بھی اپنی تخلیقی شخصیت کا اظہار کیا لیکن ان کے گیتوں کے جائزے کے بعد یہ بات بہ خوبی عیاں ہوتی ہے کہ ان کا تخلیقی جوہر جیسا نظم اور غزل میں کھلتا ہے ویسا گیتوں میں ظاہر نہیں ہوتا۔ ان کی شاعری کے ساتھ جو شعری فضا، تخیل کی فراوانی، لفظی وعلامتی نظام اور پیرایہ اظہار وابستہ ہے، وہ گیتوں میں نہیں ملتا۔ اگرچہ انہوں نے گیت کے صنف کو روایتی تقاضوں کے ساتھ جدت بھی عطا کی لیکن اس کے باوجود ان کے مقام ومرتبے کا تعین کرتے ہوئے گیت ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کا تخلیقی مزاج گیتوں سے اتنی مناسبت نہیں رکھتا، جتنا نظم اور غزل کے مزاج کے ساتھ۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس صنف کو چھوڑ کر نظم اور غزل کو ہی تخلیقی اظہار کے بہترین وسیلے کے طور پر منتخب کیا۔''

ڈاکٹر سمیرا اعجاز نے الگ سے حاصل کلام کے عنوان سے کوئی نیا باب تشکیل نہیں دیا بلکہ ہر باب اور صنف کے آخر میں منیر نیازی کے مقام اور ان کے کلام کی فکری وفنی اور معنوی دریافت اور رجحان کو پیش کر دیا ہے ہر باب کے آخر میں حوالہ جات کی فہرست بھی پیش کر دی ہے اور کتاب کے آخر میں منیر نیازی کے شعری مجموعے درج کئے گئے ہیں، جن سے دوران تحقیق استفادہ کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ دیگر تحقیقی وتنقیدی کتب، استفسارات اور رسائل وجرائد کی ایک لمبی فہرست مصنفہ کے اس تحقیقی مقالے کی اہمت اور معیار کو واضح کرتی ہے۔ اس مقالے کو وقیع بنانے کے ضمن میں مصنفہ نے منیر نیازی کے انگریزی کلام اور دیگر انگریزی کتب سے بھی دوران تحقیق استفادہ کیا ہے۔ اگر منیر نیازی کی پنجابی شاعری کو ایک الگ عنوان کے تحت پیش کر دیا جاتا تو قارئین کے لئے مزید آسانی ہو جاتی، بہر حال ڈاکٹر سمیرا اعجاز کا یہ مقالہ استناد کا درجہ رکھتا ہے۔ منیر شناسی میں ڈاکٹر سید عامر سہیل اسے ایک تاریخی دستاویز کا درجہ دیتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

''کسی بھی محقق اور نقاد کے لئے ایک بڑی تخلیقی شخصیت کو ایک کلیت میں دیکھنا اور اس کے ممکنہ شخصی اور تخلیقی رویوں کی باز آفرینی کرنا یقیناً مشکل اور کٹھن کام ہے، تاہم جو محقق اپنے تنقیدی، وجدانی اور تحقیقی بصیرت سے کسی بڑے شاعر کی تخلیقی کائنات کا حصہ بن کر اس کی شاعری میں Live کرتا ہے، وہ نہایت موثر اور ثمر آور نتائج تک پہنچ کر نہ صرف خود تخلیقی سحر سے لطف اندوز ہوتا ہے، بلکہ دیگر پڑھنے والوں کو بھی اس سرخوشی اور سرشاری میں اپنا شریک بنا لیتا ہے، اس تناظر میں ڈاکٹر سمیرا اعجاز کی یہ کتاب

منیر نیازی کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے نہایت اہم تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔''
عمومی طور پر شخصیات پر لکھے گئے مقالے آثارِ قدیمہ کا حصہ بن چکے ہیں، ان مقالات میں جانب داری کا میلان اور جھکاؤ مقالہ نگار کو بہکا دیتا ہے۔ تحقیقی نظام میں یہ تباہ کن رویہ ہے، ڈاکٹر سمیرا اعجاز نے اپنے مقالے میں کمیتی اور کیفیتی تحقیق کو بروئے کار لاتے ہوئے غیر جانب داری کا واضح ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے مختلف ناقدین کی آرا کو بھی اہمیت دی ہے، مگر اپنی رائے کو دبنے نہیں دیا۔ استدلال اس مقالے کی اہم خاصیت ہے۔ حوالوں کے انبار نے اس مقالے کی رفعت کو بڑھا دیا۔ ڈاکٹر سمیرا اعجاز نے تحقیقی طریق کار کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک معیاری تحقیقی مقالہ رقم کیا تھا، جامعاتی تحقیق میں ایسے مقالے بہت کم لکھے جاتے ہیں، جو مقدار اور معیار دونوں حوالوں سے قابل لحاظ ہوں۔ منیر نیازی کی شخصی و شعری و تفہیم کے ضمن میں یہ کتاب ناگزیر ہے۔ مصنفہ نے اس تحقیقی کاوش میں منیر نیازی کی شخصی اور شعری پرتوں کی تفہیم کو ممکن بنایا ہے اور اس ممکنہ صورت کی پیش کش کیلئے انھوں نے تنکا تنکا اس کی آشیاں بندی کی ہے۔ ڈاکٹر سمیرا اعجاز منیر شناسی میں اپنی الگ پہچان بنا چکی ہیں۔ ایک طرف منیر شناس اور منیر شناسوں کے لئے یہ مقالہ روشن مینار ہے۔

❁ ❁ ❁

اک شمع تبسم جسے بلقیس کہے دل
روشن ہے ابھی تک کسی محراب ہنر میں
(منجمد پیاس۔ احسن سلیم)

سرگوشی کی شاعرہ: تسنیم کوثر

تحریر: شفیق آصف

عصرِ رواں کی معروف اور تخلیقی اعتبار سے مقبول ترین شاعرات میں تسنیم کوثر ایک نمایاں نام ہیں۔ ان سے میرا اوّلین تعارف مدینہ اولیاء ملتان میں ہوا، واقعہ یہ ہے کہ آج سے دس برس قبل میرے عزیز دوست اور خوش فکر شاعر پروفیسر ناصر بشیر نے مجھے فون کیا کہ تسنیم کوثر ملتان آ رہی ہیں، لہٰذا ان کے اعزاز میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا جائے، سو ایک دوست کے حکم کی تعمیل میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقع پر ملتان کے نمائندہ ادبا و شعراء نے تسنیم کوثر کی ادبی خدمات کے حوالے سے گفتگو کی اور ان کا بہت سا کلام سنا گیا، ملتان کی اس تقریب کے بعد تسنیم کوثر سے ان کی نگارشات کے ذریعے رابطہ رہا اور وہ وقتاً فوقتاً مختلف ادبی جرائد کی زینت بنی رہیں۔ حال ہی میں ان کی کتاب ''سرگوشی'' ڈاکٹر راشد متین صاحبہ کے ذریعے ملی وہ ساری یادیں تازہ ہو گئیں، جو پندرہ برس قبل ملتان کی تقریب کے حوالے سے ذہن میں محفوظ تھیں تسنیم کوثر شخصی اور تخلیقی اعتبار سے اپنا ایک بھرپور درجہ رکھتی ہیں، وہ ایک حساس اور وضع دار انسان ہونے کے ساتھ ایک خلّاق ذہن کی مالک بھی ہیں۔

تسنیم کوثر کے شعری مجموعہ ''سرگوشی'' سنگت پبلشرز لاہور نے خوبصورت ''گیٹ اپ'' کے ساتھ شائع کیا ہے۔ سرگوشی میں انھوں نے حمد و نعت اور سلام کے علاوہ غزلیں اور نظمیں شامل کی ہیں۔ تسنیم کوثر چونکہ ایک ہمہ گیر تخلیقی شعور رکھتی ہیں، لہٰذا انھوں نے ان تمام اصناف میں کمال ہنرمندی کا مظاہرہ کیا۔ حمد و نعت اور سلام میں ان کا خالصتاً عقیدت مندانہ اظہار تسنیم کوثر کے جذبہ ایمانی کو ظاہر کرتا ہے اس حوالے سے ان کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے۔

جہاں میں مجھ کو وسیلے بھی معتبر دے گا — وہی تو ہے جو دعا میں مری اثر دے گا
مجھے نواز دے گا اپنے کرم کی دولت سے — وہ علم دے گا مجھے وسعت نظر دے گا

(حمد)

آقاؐ میں آپؐ کے دربار پہ آنا چاہوں — ناؤ گرداب میں ہے پار لگانا چاہوں
کاش دیکھوں میں وہ روضے کی سنہری جالی — دیپ اشکوں کے بھی روضے پہ جلانا چاہوں
(نعت)

ماتم بھری یہ شام بھی تم سے ہے اے حسین — غم کا یہ اہتمام بھی تم سے ہے اے حسین
ہر آنکھ سوگوار ہے پیاسوں کے سوگ میں — یہ محفلِ سلام بھی تم سے ہے اے حسین

تسنیم کوثر کے شعری مجموعہ ''سرگوشی'' کے پیش نظر ڈاکٹر خواجہ محمد ذکریا لکھتے ہیں۔

''تسنیم کوثر کا تخلیقی سرمایہ کئی اصناف پر محیط ہے، افسانہ، سفرنامہ اور شاعری، تینوں جہتوں میں وہ کئی سال سے لکھ رہی ہیں رسائل میں ان کی نظم ونثر برابر شائع ہو رہی ہے اور ادبی ذوق سے بہرہ مند قارئین کو متوجہ کر رہی ہیں، ان کا ایک سفرنامہ کتابی صورت میں طبع ہو چکا ہے اور دوسرے سفرنامے کی اقساط ایک معروف ادبی جریدے میں شائع ہوتی رہی ہیں، ان کے بہت سے افسانے رسائل میں چھپتے رہتے ہیں، اور ان کے بارے میں بالعموم مثبت اور اچھی رائے کا اظہار کیا جاتا ہے اور بالخصوص ان کے اسلوب نثر کو سراہا جاتا ہے۔''

مذکورہ بالا رائے کی روشنی میں جب ہم تسنیم کوثر کی شاعری کو دیکھتے ہیں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ وہ اپنی شاعری میں کلاسیکی روایت اور عصر رواں کے جدید تقاضوں کو بطور خاص ملحوظ خاطر رکھتی ہیں۔ تسنیم کوثر کی شاعری میں یاد اور غم کی آمیزش ایک ایسی فضا پیدا کرتی ہے، جو ''سرگوشی'' کی صورت میں قارئین کے دل میں اتر جاتی ہے۔ تسنیم کوثر کو یہ کمال حاصل ہے کہ وہ اپنے شعری اظہار میں خالصتاً انسانی اقدار کو پیش نظر رکھتی ہیں۔ ان کا لب ولہجہ ایک شائستہ اور مہذب انسان کے طرز تکلم کا آئینہ دار ہے تسنیم کوثر کی غزلیں اردو شاعری کے مروجہ اسالیب سے مکمل طور پر مربوط ہیں وہ غزل کے مزاج اور اس کی نزاکتوں سے بخوبی واقف ہیں اس ضمن میں یہ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

رنگ بھرنا کبھی خاکوں میں کہانی لکھنا — داستان غم کی کوئی یاد پرانی لکھنا
پہلے رکھ دینا چراغوں کو سر راہ گزر — پھر کسی بھٹکے مسافر کی کہانی لکھنا
چاہت کے جلترنگ بڑی دور تک گئے — اپنی وفا کے رنگ بڑی دور تک گئے
آلام روزگار سے گھبرائے ہم کہاں — محرومیوں کے سنگ بڑی دور تک گئے

تسنیم کوثر کی شاعری اور بالخصوص غزل میں غم جاناں اور غم دوراں کی کرشمہ سازیاں دکھائی دیتی ہیں، جبکہ ان کی نظمیہ شاعری غزل کی نسبت نئے عہد کے منظرنامے سے مربوط اور ہم آہنگ ہے غزلوں کی طرح نظموں میں بھی تسنیم کوثر یادوں کی خوشبوؤں سے رہا نہیں ہو پائی، یادیں تو شاعرہ کا ایک قیمتی سرمایہ ہے جس میں وہ ''Live'' کرتی ہیں:

کہیں بھی تم چلے آؤ
کسی بھی شہر میں گھومو
بہت سے دل کشا ملکوں کی سرحد پار کر جاؤ
کسی خطے میں دنیا کے نیا مسکن بنا ڈالو
نہیں ہو دور تم ہم سے
تمہاری یاد کی خوشبو ہمارے ساتھ رہتی ہے
(یاد کی خوشبو)

تسنیم کوثر کی نظم میں عزم اور نئی دنیاؤں کے خواب بھی جھلملاتے ہیں لہٰذا وہ اس عورت کی آواز بلند کرتی ہے جو انہیں منزل خود بتاتی ہے۔ راستوں کے وسوسوں کو یقین میں تبدیل کرتی ہے۔ لہٰذا وہ کہتی ہیں کہ حسیں جذبات کو زنداں میں دل کے قید کرنا ہے مسلسل کام کرنا ہے، مسلسل کام کرنا ہے

یہ جذبات ایک ایسی شاعرہ کے خیالات کی عکاسی کرتے ہیں جو نہ صرف اپنی دنیا اور راستے خود بناتی ہے بلکہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی فکری رہنمائی بھی کرتی ہے۔

100 لفظوں میں کھینچی ہوئی کہانیاں

رضوان طاہر مبین

دو مصرعوں کا شعر ہو یا ہزاروں صفحات تک دراز کوئی طویل، ناول دونوں ہی کی بنیادیں کسی خیال پر استوار ہوتی ہیں۔ یہ بات کہانی پر بھی صادق آتی ہے۔ کارزارِ صحافت کے شہ سوار مبشر علی زیدی نے الفاظ گن کر کہانی کہنے کا سلسلہ اپریل 2013 میں 'نمک پارے' نامی تصنیف سے شروع کیا، جس میں 83 کہانیاں ترجمہ کی گئیں، جب کہ 17 کہانیاں انھوں نے خود لکھیں۔

'نمک پارے' کے بعد ان کی سو لفظوں کی کہانی روزانہ 'فیس بک' پر مقبولیت کے علم بلند کرنے لگی۔ اس دوران تیسری کتاب 'اَلم غلّم' کے عنوان سے شایع ہوئی۔ جس میں ان کی اخبارات و رسائل میں بکھری ہوئی مختلف تحریروں کو جمع کیا گیا۔ یوں تو مبشر زیدی کی کہانیوں میں پیشہ ورانہ مسائل، دفتری ماحول اور پیشہ ورانہ تقاضوں کا بیان خوب ملتا ہے، لیکن الم غلّم میں انہوں نے ذرایع اِبلاغ سے جڑے ہوئے کچھ واقعات کی ایسی منظر کشی کی کہ اگر پڑھنے والا صحافی ہو تو آہ اور اگر عام قاری ہو تو واہ نکلتی ہے۔ خاص طور پر جس طرح ایک بم دھماکے میں چار افراد کی جان چلی جانے پر انھوں نے ان چار افراد کی چار الگ الگ کہانیاں لکھیں، وہ قابل ذکر ہیں۔

مبشر علی زیدی نے روزنامہ 'ایکسپریس' سے وابستگی کے تین برسوں میں سنڈے میگزین کے ساتھ ادارتی صفحے پر بھی قلم کاری کے جوہر دکھائے اور 'شکر پارے' کے عنوان سے باقاعدہ کالم نگاری بھی کی، اور یہی ان کی سو لفظوں کی دوسری کتاب کا عنوان بھی بنا۔

اگلی تصنیف 'شکر پارے' میں تمام کہانیاں مبشر کی رقم کردہ تھیں، مارچ 2014 میں 100 لفظوں میں بُنی ہوئی کہانیاں روزنامہ جنگ کے ادارتی صفحے پر بھی جگمگانے لگیں۔ یوں اردو صحافت میں روزانہ قطعے کی روایت جیسی روزانہ کہانی کی طرح ڈالی۔ روزانہ نپے تلے الفاظ میں کہانی لکھنا یقیناً ایک آسان میدان نہیں، لیکن مبشر زیدی بہ خوبی سو لفظوں میں کہانیاں کہہ رہے ہیں اور کیلنڈر کی بدلتی ہوئی تاریخ کے ساتھ ان کہانیوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ روزنامہ جنگ میں شایع ہونے والی کہانیوں کا ایک انتخاب بہ عنوان ''سو لفظوں کی کہانی'' شایع ہوا ہے۔

چوں کہ اب سو لفظوں کی یہ کہانیاں روزانہ 'جنگ' کی زینت بن رہی تھیں، اس لیے ان میں حالات حاضرہ کا عنصر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ لفظوں کی شرط کے ساتھ اب یہ اکثر خبری پس منظر سے بھی رنگنے لگیں۔ جب انھیں کتاب کی صورت دی تو اس میں ایسی کہانیاں بھی اظہار پانے لگیں، جنھیں اخبار کی ادارتی حکمت عملی نے قارئین تک پہنچنے سے روک دیا تھا۔

'100 لفظوں کی کہانی' ان کی اس طرز کی تیسری کتاب ہے۔ اس کتاب میں فہرست سے پہلے کی تین، دونوں فلیپ، پچھلے سرورق اور آخری حصے کی آٹھ کہانیاں جمع کریں، تو یہ کل 14 کہانیاں کتاب کی سو کہانیوں کے علاوہ ہیں، جنھیں 10 مختلف عنوان تلے سجایا گیا ہے۔ اس کے بعد 'فن پارے' کے حصے میں مختصر کہانی سے جڑی ہوئی چند چیزیں اور اظہارِ تشکر ہے، جب کہ اس کے بعد عشق پارے میں چار ایسی کہانیوں کو بھی جگہ دی گئی ہے، جو کہ اخبار کے لیے ناقابل اشاعت قرار پائیں۔

مبشر زیدی نے آنکھ تو خانیوال میں کھولی، لیکن ایک عرصے سے کراچی کے باسی ہیں 'جاسوسی ڈائجسٹ' سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ 'ایکسپریس' کی دہلیز تک پہنچے۔ 2001 کے آخر میں مبشر زیدی روزنامہ جنگ سے وابستہ ہوگئے اور پھر کچھ عرصے بعد 'جیو نیوز' سے رفاقت کا آغاز ہوا۔

مبشر زیدی کا قلم تو پہلے ہی خوب رواں تھا، لیکن جب جیو کے پروڈیوسر بنے اور خبروں کے الفاظ، دورانیے کے میزان پر تولنا پڑے، تو لفظ گن کر کہانی لکھنے کا خیال لپکا۔ 'فلیش فکشن' کو کھوجا تو انگریزی و دیگر زبانوں میں تو یہ سلسلہ موجود، مگر اردو میں نہیں، مختصر ادب تو بہتیرا، لیکن الفاظ گن کے لکھنے کی کوئی روایت نہ ملی، چناں چہ خود کمر کس کے میدان میں کود پڑے

نپے تلے لفظوں کی کہانیوں کا یہ سلسلہ مکمل طور پر شوق کی بنیاد پر استوار ہے، اور اس کی فصل تین کتابوں کی صورت میں لہلہا رہی ہے۔ مبشر کا یہ فن اب ہندوستان میں بھی پذیرائی پا رہا ہے۔ 19 مارچ 2016 کو وہاں ان کی کتاب 'سو لفظوں کی کہانی' کی دیوناگری رسم الخط میں رونمائی ہوئی۔

بہت سے قلم کار اپنا مافی الضمیر پہنچانے کے لیے بہت سے الفاظ کا سہارا لیتے ہیں، کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر الفاظ گھٹائے گئے، تو شاید ہماری بات کے اِبلاغ میں کوئی کسر رہ جائے گی، لیکن مبشر زیدی جامعیت کی کسوٹی پر بھی اپنی انفرادیت کے ساتھ پورا اترتے ہیں۔ ممتاز صحافی وسعت اللہ خان کے بقول جب ٹیسٹ میچ تماشائیوں کی دل چسپی کھوئے بغیر ون ڈے اور ون ڈے سے ٹوئنٹی ٹوئنٹی میں بدل سکتا ہے، تو پھر ادب کے سنجیدہ قاری کو 100 لفظوں کی صنف کیوں نہ متاثر کرے۔ اب ساشے کا دور ہے اور اس زمانے میں اگر ادب کے جلد باز قاری کو ناواقفیت کی وبا سے نجات دلانا ہے، تو موٹے موٹے ناول یا بیس بیس صفحات کے افسانے شاید اب بطور معجون نہ چل پائیں، مگر یہ راز صرف نئی نسل کا لکھاری ہی جان سکتا ہے اور اس نسل کا مبشر سے بہتر جان کار بھلا اور کون ہوگا۔

بیادِ احسن سلیم

میں سمتِ غیب سے قدموں کی چاپ سنتا ہوں
مدیرِ وقت ہوں صدیوں کی چاپ سنتا ہوں

عکسِ تحریر

دورِ اذکار افسانے
تینوں میں نہ تیرہ میں، منظر بدلتی آنکھیں،
تاریک آوازوں کا چیختا شور
فرشتے کے آنسو
فریاد کی لے کا تسلسل
ویران سرائے کی
خستہ دیوار تلے
بے بسی
زبوں حال
بوڑھی کنیز کی آنکھوں میں
ڈوبتے ڈوبتے
کئی چاند بجھے سرِ آسماں!

آدمی کا سینہ ٹٹولتی ہے
شاخِ مرجاں پر
برسات
جھولا جھولتی ہے
فریاد گونجتی ہے
دل درد سے خالی ہو چکا ہے

عام طور پر یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ افسانہ نگار پہلے کسی موضوع پر غور کرتا ہے پھر موضوع کی مناسبت سے حقیقی یا تخیلی کردار خلق کرتا ہے اور آخر میں کسی خوبصورت اور چونکا دینے اختتام کے ساتھ کہانی یا افسانے کے بیانیے پر ختم شد کی مہر چسپاں کر دیتا ہے۔
لیکن ایسے افسانہ نگار یا کہانی کار کو آپ کیا نام دیں گے جو افسانے کے پہلے فقرے پر آپ کو چونکا دے اور آپ کو محسوس ہو کہ بیانیہ ختم ہو چکا ہے، پھر اگلا فقرہ آپ کی استعجابیہ کیفیت کو اس طرح اپنی طرف کھینچ لے کہ حیرت آپ کے وجود میں تماشا بن کر رہ جائے
بقول بیدل

خانۂ حیرت تماشا می کشد
ایں نہنگِ تشنہ دریا می کشد

بیدل کے معترف ہیں

طویل نظم

’’وراثت‘‘

کے چند ٹکڑے

آسمان
زمین پر کھونٹی تانے سویا ہوا ہے
دروازوں کی پستی
میرے اندر آ گری ہے!
اندھیروں اور اجالوں میں
خوش آمدید کہنے والی ہر ایک آنکھ
فریب کے پہلو سے اُٹھ کر آتی ہے
خواہش
خیالوں میں آگ لگاتی ہے
یہ میرے اندر کی سرکشی ہے
میں کسی بستی کو
آزمائش میں ڈالے بغیر
اپنے گیتوں کو ذبح کرتا ہوں
☆☆☆
ہم نوا_____
میرے نام کا پہلا حرف
اور تمہارے نام کا آخری حرف
ایک دوسرے کے اندر چلتے ہیں
جیسے آگ،
کوئلوں میں سوتی اور جاگتی ہے
تمہاری یاد میں
برسات نے
سمندروں کو مٹی بنا دیا
یہ پھول
جو میرے ہاتھ میں ہیں
مٹی کے انگارے ہیں!!
☆☆☆
اور میں
تم سے زیادہ اپنی اولاد سے پیار کرتا ہوں
میں تم سے
زمانوں کے سکون کا طالب ہوں
اور نہ قیامت کی بھیک مانگتا ہوں
میں،
اپنی وراثت میں
دھوپ یا دیئے
سُرخ یا سُپید
سورج یا سمندر
’’کچھ بھی نہیں چھوڑوں گا‘‘

کتاب ’’ست رنگی آنکھیں‘‘ سے ایک ٹکڑا

تمھیں کچھ یاد ہے
یہ ہولی کا قصہ کیا ہے؟
فرنگی آقاؤں نے تم سے تمھارا حافظہ چھین لیا ہے
تمھاری تاریخ مسخ کر دی ہے
تم شائد سب کچھ بھول گئے ہو
رات کے اولین حصے میں صبح ہونے کا اعلان
ہمارے ساتھ ایک بھیانک مذاق تھا
ایسا مذاق
جو بوڑھی طوائف عمر کے آخری حصے میں اپنے میک اپ سے کرتی ہے
آج تمھاری سیکیولر جمہوریت کا میک اپ اتر چکا ہے
اس ڈھونگ سے چھٹکارا حاصل کروٗ۔۔۔اور پلٹ کر دیکھو
عقل ہے محوِ تماشۂ لبِ بام ابھی!

۞۞۞

غزلیں

باب ِ رحمت کھلا نہیں کوئی
جیسے میرا خدا نہیں کوئی

مجھ میں باقی رہا نہیں کوئی
مجھ سے باہر فنا نہیں کوئی

خواب میں بھی خیال رہتا ہے
اپنے گھر میں دیا نہیں کوئی

خاک پر بھی زوال آتا ہے
دشت ہم سے جدا نہیں کوئی

غم کا نشہ شدید ہوتا ہے
ایسا نشہ کیا نہیں کوئی

وہ بھی ہم سے عناد رکھتے ہیں
جن کا اچھا برا نہیں کوئی

جیسا احسن سلیم شاعر ہے
ایسا شاعر ہوا نہیں کوئی

(منجمد پیاس:ص72)

جب دعا کے حرف سارے کھو گئے
ہم بچھا کر آسماں کو سو گئے

مہ رُخوں کی روشنی میں بیٹھ کر
ہم ستاروں کے مقابل ہو گئے

وہ نظر کے فاصلے پر تھا مگر
ہم تماشے کی حدوں پر سو گئے

زخم تازہ تھا سو اس کے روٗبہ رو
پھول لے کر کچھ سجھانے کو گئے

اُن کے حق میں بھی دعاے خیر ہو
دل دکھا کر اس طرف سے جو گئے

جن سے پھوٹے گی زباں کی روشنی
ہم بھی احسن بیج ایسے بو گئے

(منتخب از: منجمد پیاس،64)

’’پتوں میں پوشیدہ آگ‘‘ سے ایک خط

ڈیئر شفقت نذیر
روشنی اور خوشبو سے لبریز سلام!
یہ جو میں نے ’روشنی‘ لکھا ہے، تو اس کا مطلب ہے ’علم‘...
علم، انسان کے لیے روشنی کا درجہ رکھتا ہے، جس طرح ہم ظاہری اور مادی زندگی میں، روشنی کے بغیر ناکارہ ہوکر رہ جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح علم کے بغیر انسان کی ’روحانی‘ بصیرت اندھیروں میں ڈوبی رہتی ہے۔ اندھیرے کی بہت سی قسمیں ہیں۔ سب سے بھیانک ’اندھیرا‘ جہل کا اندھیرا ہے۔ جہل ایک ایسا حجاب یعنی پردہ ہے، جو انسان اور خدا کے درمیان حائل ہوجاتا ہے اور انسان کی ذہنی بصیرت معدوم ہوجاتی ہے۔ کہا گیا ہے کہ ’’مومن کی بصیرت سے ڈرو، کیوں کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے!‘‘
یہی نہیں ’جہل کا اندھیرا‘ خود انسان اور اس کی اپنی ذات کے درمیان ایک آہنی پردہ بن جاتا ہے۔ انسان اپنی ذات کے ’تقدس‘ سے غافل ہوجاتا ہے، جو انسان اپنے آپ کو نہ پہچان سکے، خود اپنا احترام نہ کرسکے، اس نے گویا اپنے نفس پر ظلم کیا، اس کا...ہونا...اور نہ ہونا، برابر ہے۔ وہ ایک بڑے ’خسارے‘ میں ہے اور ستم یہ ہے کہ وہ اپنے، خسارے کا اندازہ ہی نہیں کرسکتا...اور یہ جو میں نے ’خوشبو‘ لکھا ہے، تو اس سے مراد ہے ’پاکیزگی‘!
انسان کی روح اگر پاکیزگی کی طرف مائل نہیں، تو سمجھو یہ بھی ایک ’بڑا خسارا‘ ہے۔ ’پاکیزگی‘ ہی کی بدولت انسان کائنات میں اپنے ’مرتبے‘ کو پہچان سکتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے ان خیالات کا اظہار کیا ہے کہ جو شخص اپنے نفس پر فرماں روائی نہیں کرسکتا، اس کو دوسروں کا فرماں بردار بننا پڑتا ہے...میرے خیال میں ’نفس‘ پر فرماں روائی اسی وقت ممکن ہے، جب انسان پاکیزگی کی راہ اختیار کرے۔ پاکیزگی نہ صرف خود اپنے ’نفس‘ پر ’فرماں روائی‘ کا اختیار دلاتی ہے، بلکہ خوشبو کی طرح زمانے میں اور کائنات میں پھیلتی ہے۔ اس کی حکمرانی زمین سے آسمان کی طرف بلند ہوتی ہے اور

دست قدرت سے وہ انعام حاصل کرتی ہے، جس کی بدولت وہ دنیا میں تو سرخرو ہوتا ہی ہے، آخرت میں بھی سرخروئی حاصل کرتا ہے۔

اور دیکھو
جو تم سے بہت قریب ہے
''وہ''
ایک نور ہے
تم چاہو بھی تو
اپنی شہ رگ سے دور نہیں جا سکتے
نہ اپنے دل کو نکال کر پھینک سکتے ہو
اور اگر سوچو تو یہ بات جان سکتے ہو
''روح''
ہاں جسے تم ''روح'' کہتے ہو
اس سے فرار ہو کر کہاں جاؤ گے
روح تو خود تمھارے نفس میں پوشیدہ ہے
اور نفس،
تمہارے جسم میں اٹھکھیلیاں کرتا ہے
تم کہیں نہیں جا سکتے
اس وقت تک
جب تک
روح تمھارے نفس کا پردہ چاک نہ کر دے
تب تم جان لو گے
روشنی اور خوشبو
ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں
یاد رکھو
روح ایک ابدی سچائی ہے
جسے تم پامال نہیں کر سکتے
تم اپنے اندر
اس نرمی کو تلاش کرو
جو تمھارے بستر کی زینت بن سکے

ان لمحوں کو یاد کرو
جب تم اپنی تنہائی کے ہاتھوں قتل ہونے لگتے ہو
تب وہ ہوا
نرم اور نازک ہوا چلتی ہے
اپنی لطیف انگلیوں سے
تمھارے بالوں میں دلکشی کے رنگ بھرتی ہے
تمھیں مقتول ہونے سے بچاتی ہے
تم جانتے ہو، وہ کون ہے؟
دیکھو اپنے دل میں جھانک کر دیکھو!
تمھارے مغرور لہجے میں
اس کے رنگ چمکتے ہیں
خوبصورت اور، شگفتہ رنگ!!

☆☆☆

نسرین نقاش کے نام لکھا ہوا خط بھیج رہا ہوں۔ اپنے اخبار، آزادی، میں اور اس پرچے میں جو لندن سے شایع ہوتا ہے، دونوں میں شایع کرادو۔ کوشش کرو۔ کسی طرح سرینگر پہنچ جائے۔ سرینگر کا ایڈریس خط کی پشت پر لکھ رہا ہوں...راؤ چھتر سال کے پوتے راؤ احسان کو ایک عدد پیارا سا سلام۔ نذیر مسعود کے کیا حال ہیں، ذرا پیار تو کر کے دیکھو، کیسا نفیس آدمی ہے۔ اور سب سے آخر میں، شگفتہ خانم، کو والہانہ پیار...فقط

والسلام   تمہارا مخلص

12، اپریل 1992،

احسن سلیم

۞۞۞

اداریہ

چیونٹی، شہد کی مکھی اور مکڑی

ہر لکھنے والے کا ایک ڈھب ہوتا ہے۔

میرا بھی لکھنے کا ایک ڈھب ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اپنے پڑھنے والوں سے اپنی ازلی توفیق کے مطابق، جو میں نے خود کو قبل از خلق، ودیعت کی تھی، بروئے کار لاؤں اور کچھ ایسی باتیں کہوں اور سنوں جو میں نے کبھی نہ سنی ہوں اور نہ کبھی کہی ہوں.... لیکن ہمارے ادبی نظام اور اظہاری سانچوں میں اور ہماری زبان کے اسٹرکچر میں کچھ ایسی خوبی ہے کہ ہم چاہتے ہوئے بھی نہ کچھ نیا کہہ پاتے ہیں اور نہ کچھ نیا سن پاتے ہیں۔

مجھے یاد نہیں کہ جو میں اب کہنے والا ہوں وہ بات میں نے قمر جمیل سے سنی تھی یا سلیم احمد سے.... کہ لکھنے والے تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کا تحریری فعل چیونٹی کے عمل سے مشابہ ہوتا ہے۔ چیونٹی اپنے بِل سے نکلتی ہے اور اِدھر اُدھر سے اپنے مطلب کی چیز گھسیٹ کر بِل کے اطراف ڈھیر کر لیتی ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بل کا منہ ڈھیر تلے دب جاتا ہے۔ بہت سے لکھنے والے بھی یہی کام کرتے ہیں۔ اِدھر اُدھر کی کتابوں سے اپنے مطلب کے کے ٹکڑے یا خیال کو کھینچ تان کر، کبھی جوں کا توں اور کبھی توڑ مروڑ کر اپنے مضمون، کہانی یا شاعری میں ٹھونس لیتے ہیں اور اپنے نام پر کتابوں کا ڈھیر لگا لیتے ہیں۔ اپنے ذہنی افلاس اور کوتاہ نگاہی کے باعث، انہیں پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ چیونٹی کے ڈھیر پر کھڑے ہیں یا ڈھیر تلے دب چکے ہیں۔ چیونٹی کی طرح خود ان میں انجذاب کی صلاحیت موجود ہی نہیں ہے۔ البتہ جیب اتنی بھاری ضرور ہے کہ خود ہی اپنی کتابوں کے پبلشر بن جاتے ہیں۔ ہمارے ملکی نظام میں پبلشنگ کا کوئی قانون نہیں ہے۔ پیسہ ہو تو سب کام ہو جاتے ہیں۔

دوسری قسم کے ادیب، شاعر اور مضمون نویس وہ ہیں، جن کا عمل شہد کی مکھی کے عمل سے مشابہت رکھتا ہے۔ شہد کی مکھی اپنے چھتے سے اڑ کر مختلف پھولوں تک جاتی ہے۔ ان کا رس چوستی

ہے اور اپنے اندر جذب کر لیتی ہے، اور پھر جذب شدہ مواد کو شہد میں تبدیل کر کے اپنے چھتے میں منتقل کر دیتی ہے۔ مختلف النوع پھولوں کے رس کو باہم آمیز کر کے ایک نئی صورت، نیا رنگ اور نیا نشاط آور ذائقہ دے دیتی ہے۔ شہد نہ صرف فرحت بخش ہے، بلکہ انسانی صحت اور تندرستی کے لئے مفید بھی۔۔۔

اچھے اور اہم تخلیق کار بھی اسی طرح کا عمل کرتے ہیں۔ تاریخ، فلسفہ، سائنس، نفسیات، ادبیات اور دیگر معاشرتی و سماجی علوم حاصل کرتے ہیں۔ ان علوم کو اپنے اندر جذب کرتے ہیں اور پھر اس جذب شدہ علم کو اپنے احساسات، جذبات، فہم و فراست، حکمت و تدبر، مشاہدے اور تجربے سے باہم آمیز کر کے کوئی نئی کہانی، نیا ناول، نئی شاعری یا نیا مضمون اپنی اظہاری صلاحیت کے بل بوتے پر سامنے لے آتے ہیں۔ قاری اپنی اپنی سمجھ بوجھ اور ذوق کے مطابق اس نئے اظہاریئے کے متن میں اپنی ذہانت کا رنگ بھرتے ہیں۔ یوں قاری اور مصنف کے حسی ذائقوں کے تال میل سے نومولود فن پارہ قوت اور وسعت حاصل کرتا ہے۔ فن پاروں کے تجزیئے ہوتے ہیں۔ محاسن و معائب تلاش کئے جاتے ہیں۔ تنقید، محاکمہ کرتی ہے۔ نئے نئے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ تغیر و تبدل وقوع پذیر ہوتا ہے۔ کبھی معانی و مفاہیم چونکا دیتے ہیں کبھی تفہیم و شرح کی نئی جہتیں امکانات کی کئی سرحدیں کھول دیتی ہیں۔ انسانی ذہن، حظ اور لطف و لذت سے ہمکنار ہو کر مست خرام ہو جاتا ہے۔۔۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ جس طرح شہد کا تجزیہ کر کے اس میں موجود نشاستہ، لحمیات اور وٹامن کی مقدار اور اقسام تو معلوم کر لی جاتی ہیں، مگر ماہر سے ماہر شخص بھی شہد میں موجود مٹھاس کے بارے میں نہیں بتا سکتا کہ کس کس پھول کا رنگ، خوشبو اور رس کس تناسب میں ہے، اسی طرح تخلیقی فن پارے کی خوبیاں جاننے کے باوجود یہ بتانا مشکل ہوتا ہے کہ فلاں فن پارے میں فلاں فلاں علوم کی اتنی مقدار ہے اور احساسات، جذبات اور تخیل کی مقدار اتنی ہے۔ البتہ کچھ زعمائے ادب فنی محاسن، کچھ تاثیر و تاثر اور کچھ عوامی شہرت و مقبولیت کی بنا پر اس فن پارے کی قدر و قیمت کا تعین کر لیتے ہیں۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ 'زمانے یا عہد' کی تبدیلی کے باعث فن پارے کی قدر و قیمت میں تغیر و تبدل رونما ہو جاتا ہے۔ مقبول چیز عدم مقبولیت کے غار میں جا گرتی ہے۔ افادیت کا ستارہ ماند پڑ جاتا ہے۔ اور غیر مقبول فن پارے اچانک نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ان کی قدر کا تعین از سرِ نو کیا جاتا ہے۔ فن پارے پر سے گمنامی کی گرد جھاڑی جاتی ہے۔ اور اعترافِ فن کے تمغے فن پارے کے سینے پر سجا دیئے جاتے ہیں۔

تیسری قسم کے لکھنے والوں کا عمل مکڑی کے عمل سے مشابہ ہوتا ہے۔ مکڑی نہ ادھر جاتی ہے نہ ادھر جاتی ہے اور نہ کسی پھل پھول کا رس چوستی ہے، نہ اور کسی شے کو اپنے اندر جذب کرتی ہے۔ خود اپنے اندر سے ایک تار نما لعاب نکالتی ہے اور اپنے اطراف جالا بن لیتی ہے۔ بعض اوقات مکڑی کے جالے غار کے بڑے بڑے دہانوں پر محیط ہوتے ہیں۔ درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان مہین نقاب کا کام دیتے ہیں۔ ظاہر کے لئے پوشیدگی کا لباس بن جاتے ہیں۔ گھروں، چھتوں، کونے

کھدروں اور دیواروں پر لٹکتے ہوئے یہ جالے ویرانی کا ماحول پیدا کر دیتے ہیں اور ویرانی خوف کو جنم دیتی ہے۔ خوف کی جبلت انسان کی دفاعی قوت کو بیدار کر دیتی ہے۔ جس کے نتیجے میں دفاعی آلاتِ حرب کی ایجادات اور تحفظ کے نت نئے طریقے ظہور میں آنے لگتے ہیں۔ اسی طرح لکھنے والے بھی ایسے ہوتے ہیں جو نہ اِدھر جاتے ہیں نہ اُدھر جاتے ہیں۔ بعض کی تعلیمی استعداد، علمی قابلیت اور لیاقت بھی بس واجبی سی ہوتی ہے۔ لیکن ان کی صلاحیت غیر معمولی ہوتی ہے۔ ان کی تخلیقات اتنی اوریجنل ہوتی ہیں کہ روایات کی کینچلی از خود غائب ہوجاتی ہے۔ تحیر اور استعجاب کی ہولناک شدت، تخلیقی مدار کے گرد گھومتی ہوئی روزمرہ کی زبان و بیان تک کو لپیٹ کر خلا میں دھکیل دیتی ہے۔ ان کے تخلیقی فن پارے زبان و بیان کی تشکیلِ نو کرتے ہیں۔ اور ایک
نئے روزمرہ کو زبان کے تجریدی اسٹرکچر میں داخل کر دیتے ہیں۔ یوں کمزور پڑتے ہوئے الفاظ و علائم اور محاورات نئی قوت حاصل کر لیتے ہیں۔ اس طرح شعر و ادب میں نئی توانائی، اجتماعی معاشرتی ماحول میں تبدیلی کا اشاریہ بن جاتی ہے۔ ایسے تخلیق کاروں کی تحریریں قدر و قیمت اور مقام و مرتبے کے اعتبار سے ادب عالیہ میں کلاسک کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں۔ ایسے تخلیق کار صدی دو صدی میں ایک آدھ ہی پیدا ہوتے ہیں۔ جنہیں جینیئس یا نابغۂ روزگار کہا جاتا ہے۔ معاشرتی سطح پر وہ کتنے ہی مجبور یا بے بس ہوں، ان کا اندرونی تخلیقی نظام انہیں ''بے نیازی'' کی ایک ایسی بلندی عطا کرتا ہے کہ خوشامد اور بے جا تعریف، انہیں ناگوار گزرتی ہے۔ وہ لوگوں کے درمیان رہتے ہیں لیکن زندگی اپنے تخلیقی نظام میں بسر کرتے ہیں۔ شہرت یا مقبولیت ان کے لئے بے معنی ہوجاتی ہے۔ وہ کام کرتے ہیں، اور بس! کبھی اگر لڑتے بھی ہیں تو ظلم و جبر کے خلاف، وہ بھی محض حقِ آدمیت اور حقوقِ انسانی کے لئے۔

''اجرا'' اپنے قلم کاروں کی تخلیقات اور نگارشات کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کرتا ہے۔ نیز لکھنے والوں کے امکانات کا بھی اندازہ لگایا جاتا ہے۔ تب اشاعت کے لئے چیزوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ بحیثیت مدیر، میں یعنی احسن سلیم ابتدائی مرحلے میں اپنی ذمے داری سمجھتا ہوں کہ اپنے قارئین میں پڑھنے کا 'شوق' پیدا کروں کیونکہ میرا خیال ہے کہ پڑھنے کا شوق بتدریج ترقی کر کے 'ذوق' میں تبدیل ہوجاتا ہے اور 'ذوق' ایک ایسی قوت یا صفت ہے جو 'اچھے اور برے' میں امتیاز پیدا کرتی ہے۔ خیر و شر، نیکی و بدی، خوب و زشت کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے، پھر یہی ذوق، تجربے، مشاہدے اور مطالعے کے زیرِ اثر فعال اور متحرک ہوکر 'ذوق سلیم' میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ ذوقِ سلیم، فہم، وجدان، ادراک، تخیل، حسیت اور قوتِ واہمہ سے ہم آغوش ہوکر، تخلیق کار کو اعلیٰ فن پارہ خلق کرنے کی طرف لے جاتا ہے تو دوسری طرف تنقید لکھنے والے میں ایک ایسا وژن پیدا کر دیتا ہے کہ وہ فن پاروں کی 'قدر و قیمت' کا تعین بہ آسانی کرنے پر قادر ہوجاتا ہے۔ کبھی کبھار تنقید نگاروں کے فیصلے غلط بھی ہوجاتے ہیں۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے کہ تنقید نگار فن پارے کے بجائے فن کار کی دوستی یا

تعلق کو مقدم رکھتا ہے۔ یا پھر کسی اور وجہ سے 'عدم توازن' کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس قسم کے فیصلے زیادہ دیر زندہ نہیں رہتے اور نہ ہی وہ تخلیق زیادہ عرصے زندہ رہ پاتی ہے۔ جس پر تخلیق کار اپنے دوستوں سے تعریفی مضامین لکھوا کر ادبی جریدوں یا اخباروں میں شائع کرواتے رہتے ہیں۔ 'اجرا' اپنے قلم کاروں سے ملتمس ہے کہ خود پر اس قسم کے تعریفی مضامین لکھوا کر 'اجرا' میں اشاعت کے لئے نہ بھیجیں۔ اپنی تخلیقات پر اعتماد کریں۔ ناول، افسانہ، غزلیں، نظمیں اور دیگر اصناف میں طبع آزمائی کریں۔ تحقیقی اور تنقیدی مضامین میں عدل و انصاف کو ملحوظِ خاطر رکھیں۔

وما علینا الا البلاغ المبین!

(اجرا16)

عجب آزاد مرد تھا

سلیم کوثر

حیدرآباد، محبت کرنے والوں کا شہرِ عشق ہے۔ استاد اختر انصاری اکبرآبادی، جبریل صدیقی، بسمل آغائی، خلش مظفر، رضوان صدیقی، انوار احمد زئی، ڈاکٹر اقبال پیرزادہ، عتیق جیلانی، شوکت علی شوکت، صابر وسیم اور بہت سے دوسرے شاعر و ادیب کے ہمراہ احسن سلیم بھی شامل ہیں۔ میں بے شمار لوگوں کے نام یاد نہیں رکھ سکا یا مجھے یاد نہیں، حافظے میں نہیں آ رہے، اور سندھی زبان کے شاعر و ادیب محبت کا الاؤ روشن کیے ہوئے، اس کے اطراف اپنی غزلوں، نظموں، قصوں، کہانیوں کی دیکھی ان دیکھی داستانیں سنانے میں مصروف رہتے تھے۔

میں نے محبت کے اس الاؤ کے گرد ان کا رقصِ جنوں دیکھا ہے، احسن سلیم ان سے الگ، خاموش رہ کر اپنی بات کہنے کا ہنر رکھتا تھا۔ وہ بینک سے منسلک تھا، مگر بینکاری کے اسرار و رموز کا تربیت یافتہ ہونے کے باوجود وہ اپنی زندگی کے کھاتے کو درست نہیں رکھ سکا اور ایک دن اس نے بینک چھوڑ دیا۔ کیوں ...اس کی وجہ خود اسے بھی نہیں معلوم تھی۔ وہ تو بس شاعر رہنا چاہتا تھا اور محبت کرنا چاہتا تھا۔

وہ حیدرآباد سے کراچی آ کر آباد ہوگیا۔ زندگی کے نشیب و فراز سے براہ راست ٹکراؤ کا آغاز ہوا۔ وہ ہارا نہیں مگر اندر سے ٹوٹتا چلا گیا۔ اپنے اندر انتہائی تھکن کا بوجھ لیے وہ ادب کی منڈیروں پر اپنی غزلوں، نظموں، کہانیوں کے چراغ رکھتا رہا، اپنے ایڈٹ کیے ہوئے رسالے کی تخلیقات پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے ایک دن کہا تھا: ”میں ایسی غزلیں نہیں لکھ سکتا، لکھ ہی نہیں سکتا ایسی غزلیں!“

یقیناً وہ ایسی غزلیں نہیں لکھ سکتا تھا، جیسی اسے انتخاب کرنا پڑتی تھیں۔ وہ الگ سے سوچنے والا انتہائی محبت کش شاعر تھا۔ وہ دانش وروں کے درمیان رہنا چاہتا تھا، مگر اسے دانش ور نہیں مل سکے اور ایک دن وہ خود دانش ور ہوگیا۔ فرط دانش وروں نے اسے دانش ور بنا دیا۔ اس نے ادبی دنیا

میں بہت اہم اور یاد رہ جانے والے جرائد کو متعارف کرایا ہے اور بڑی محبت اور تندہی سے اپنی خداداد مدیرانہ صلاحیتوں کی بنیاد پر بہت اہم اداریوں کے ساتھ پڑھنے والوں کے لیے پیش کیا ،اور داد کا منتظر رہا۔ وہ داد چاہتا تھا، اپنے کام کی، اپنے انتخاب کی، اپنی کاوشوں کی، یہ اس کا حق تھا۔ وہ بغیر کسی حیلے کے یہ کام انجام دے رہا تھا۔ اس کے اندر ایک وارفتگی تھی، جس کی لہر میں وہ یہ سب کام انجام دے رہا تھا۔ سہ ماہی اجرا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس نے مسلسل اس کے خوبصورت شمارے ادب پڑھنے والوں کو دیے ہیں، لیکن ادب پڑھنے والوں میں چند ایک کو چھوڑ کر باقی سب نے صرف اپنی غزلیں، نظمیں، کہانیاں، مضامین پڑھنے گوارا کیے، بعض نے تو یہ بھی نہیں کیا۔ اس کا اسے دکھ تھا۔ بہت تھک گیا تھا وہ۔ ہم بھی کیا ہیں، اپنے بہترین لوگوں کے ساتھ ہم یہی کچھ تو کرتے آئے ہیں۔

ہم اچھا نہیں کرتے، جتنی محبت اور دل جمعی سے ہم ان کی غیبت کرتے ہیں، کاش ہم ان تک ان کے بہتر اور بہترین کاموں کی داد پہنچا سکتے۔ اور آخر وہی ہوا، وہ ناراض ہوگیا، جو ناراض ہونا جانتا ہی نہیں تھا۔ روٹھ گیا اور پھر ایک دن ہم سے جدا ہوگیا۔

وہ جدا کہاں ہوا ہے، اس کے چاہنے والوں نے محبت کا ایک الاؤ روشن کیا ہے اس کے اطراف۔ وہ اس کی یادوں کے چراغ لیے بیٹھے ہیں۔ اسے یاد کر رہے ہیں، اسے داد دے رہے ہیں اور اس کے اپنے اجرا کو جاری رکھنے کا اعلان نامہ تقسیم کر رہے ہیں۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

❁❁❁

خرد افروز، فلک آثار، داستان سرا

انوار احمد زئی

شبِ ہجراں کے جاگنے والے
ایسے سوئے کہ پھر خبر نہ ہوئی

داغ مفارقت دے جانے والے احسن سلیم کو یاد کرنے کیلئے شعر بھی یاد آیا تو داغ کا...... اور پھر خیال آیا کہ داغ اور احسن سلیم کے طبقوں میں ''مفارقت'' کے سوا کوئی قدر مشترک نہیں ...... البتہ اس مُغائرت میں کہیں مفاہمت یا اپنائیت بھی نظر آتی ہے اور اس نکتہ کا نام ''اردو'' ہے۔ داغ نے کہا تھا

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
ہندوستان میں دھوم ہماری زبان کی ہے

احسن سلیم نے زبان کے خراج کو ہی کو اپنی زندگی کا وظیفہ سمجھا اور ایک سے زیادہ ادبی پرچوں کی ادارت کے ذریعے ''گیسوئے اردو'' کو نت نئے انداز سے شانہ پیش کیا...... اور بار بار خون تھوک کر چمن اردو کی رنگا رنگی کا سامان کرتے رہے اس کی ایک مثال ان کی تحریر سے یہ اقتباس ہے۔

''اردو اور ہماری دیگر قومی زبانوں کے ادب میں نمو پذیر تازہ تر احساس کی آب یاری اور عصر حاضر کے ذہین قاری کی علمی و تخلیقی پیاس کو تہذیبی، سماجی، ثقافتی اور فکر افزائی کی تازہ جرعہ پیش کرنے کیلئے اعلیٰ معیار کے ادبی رسائل کی اشد ضرورت ہے۔ اس ضمن میں رسائل کے مدیران کو غیر وابستہ اور منصفانہ رویوں کو فروغ دینے کی طرف توجہ دینی چاہئے۔''

احسن سلیم، بلاشبہ مستند، منفرد، صاحب اسلوب اور صاحب لہجہ اور مرتبہ شاعر تھے...... جس نے

اپنا روایتی سفر نیاز مندانہ مرحلے سے، باغیانہ منزل تک بے نیازی سے طے کیا مگر جب ان پر درکِ جدید کا در وا ہوا تو وہ عالمی ادب کے مطالعے کیلئے بحرِ آدرش نو میں غوطہ زن ہو گئے ...... پھر جو وہاں سے طلوع ہوئے تو اپنے ساتھ ست رنگی آنکھوں کے انوار بھی لائے اور فکر عہدِ جدید کے تازہ تر ادبار بھی ...... ان کا لہجہ نیا بھی رہا اور سوچ اور بھی زیادہ نئی ...... وہ اپنی شاعری میں جانِ استقبال کی منزل پر تھے...... تاہم اس ذکر سے قبل یا اس سے کہیں زیادہ جو بات یہاں محتاجِ تذکرہ ہے وہ ان کی مدیرانہ انفرادیت اور نثری ادب کی نرالی، اچھوتی اور ملکوتی آن بان ہے...... جس کی ایک نادر سی مثال ان کی بوقلمونی نگارشات سے یہ خوشہ چینی ہے!!

''معاشرے کا سب سے حساس اور ذمہ دار طبقہ یعنی شاعر، ادیب فن کار اور دانش ور خاموش ہیں ...... کسی مرحلے پر ظلم و جبر کیخلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی جاتی ...... کوئی کانگریس وجود میں نہیں آتی ...... کوئی کانفرنس نہیں بلائی جاتی، عوام، ادیب و شاعر ایک دوسرے سے لا تعلق ہیں۔ ادیب و شاعر کی حقیقی پہچان گم ہوتی جا رہی ہے ...... عوام میں ادب کا اصل رول معدوم ہوتا جا رہا ہے، مفلوک الحالی کے اس ویرانے میں ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کو آگے آنا چاہئے۔ لفظ کی طاقت کو روح عصر سے ہم آہنگ کرنے کیلئے، امن کے دفاع کیلئے، آزادی اور باہمی احترام کیلئے، اپنی قوم اور ملک کو مضبوط بنانے کیلئے ...... ادیب، شاعر، فن کار، سائنسدان، دانشور اور عالموں کو کشادہ دلی کے ساتھ، ایک دوسرے کے ساتھ مل کر دہشت گردی کیخلاف آواز بلند کرنا چاہئے ......''

لگتا ایسا ہے کہ احسن سلیم نے اپنی یہ تحریر حال ہی میں یعنی 8 اگست کوئٹہ میں ہونے والی ہلاکتوں کی خبروں پر اپنا تبصرہ عالم برزخ سے ارسال کیا ہے۔!!

سچی اور اچھی تحریر...... اسی طرح زمانے کے قید سے ماورٰی ہوتی ہے۔ محمد حسین آزاد نے کہا تھا کہ جس طرح لوگوں کی عمریں ہوتی ہیں ایسے ہی کتابوں کی بھی عمریں ہوتی ہیں ...... کوئی کتاب ہزار سال تک زندہ رہتی ہے، کوئی سات سو، پانچ سو سال تک، کوئی کتاب پیدا ہوتے ہی مر جاتی ہے اور کوئی کوئی تو پیدائش سے پہلے ہی ''اسقاط'' کا شکار بن جاتی ہے ...... احسن سلیم کی شاعری کی کتابیں بھی برسوں زندہ رہنے کی دلیل ہیں اور اس کے اجراء کے شذرے بھی......

''اداریئے'' کسی بھی باضابطہ اشاعت کے منضبط اشارے ہوتے ہیں ...... بلکہ کسی بھی ادارے کے محتشم منصوبے اور مربوط آدرش کے مضبوط ضمیمے ہوتے ہیں ...... اِس لئے اردو کے بہت سے روزناموں سے لے کر ماہناموں اور سہ ماہی مجلوں تک میں ''اداریوں'' کو منفرد مقام دیا جاتا رہا ہے ...... ان تمام ہی اداریوں کی قدر مشترک یہ ہوتی ہے کہ ان میں سے اکثر میں ادارے کے مسائل اور شمارے کے معاملات کے رونے روئے جاتے ہیں، قارئین سے قلمی، یا رقمی اعانت کی درخواست ہوتی ہے اور زیادہ سے زیادہ زبان و ادب کی بے قیری کا گِلہ اور شکوہ ...... مگر کسی محقق اور صاحبِ نظر ادیب کو بھی کبھی یارا ہو تو وہ ''اجرا'' کے اداریوں کی وسعتوں کو پرکھے، تلاشے، اور

پھر جائزہ لے کہ ان اداریوں میں کس قدر ''آفاقیت'' بے کرانی، جہات کی فراوانی، موضوعات کی ہماہمی اور دردِ مشترک کی پُر شور روانی ہے ...... ان اداریوں میں کہیں ادب کی نئی جہات کا پتہ ملتا ہے تو کہیں زندگی کی بے تاب صداؤں کی بازگشت ...... احسن سلیم نے اپنے اداریوں کو خلاقی کے جوہر سے اجال کر اپنے نثری اوصاف کو فکری آئینے بخشے ہیں ...... ایسے آئینے جن میں پڑھنے والا بھی اپنا چہرہ دیکھ سکے اور اگر اسے دیدۂ بیدار نصیب ہو تو عہد کی نا آسودہ پکار بھی سن سکے ...... سماعتوں کیلئے تحریر اور بصارتوں کیلئے سرگوشی شاید اِسی ان جانے سے صحرا میں نخلستان کا نام ہے !!

احسن سلیم کی ''اسکیم آف اسٹڈیز'' کا جائزہ لینا ہو تو ان کی یہ تحریر شاید ہماری مدد کر سکے ......

''اکیسویں صدی میں ادبی و فکری اقدار کی صورت گری کرنے والا فنکار، انسان اور سماج کی ایک تازہ اجتماعی دانش کی تشکیل میں مصروف ہے۔ جو عالمی سطح پر پوسٹ ماڈرن ازم اور گلوبل ولیج کے امیج سے جُڑی انفارمیشن ٹیکنالوجی اور اس سے متعلق جدید طرز احساس و فکر کا منظر نامہ مرتب کر رہی ہے ...... ہماری ادبی روایت ایک تازہ اور نیا ورق الٹنے کیلئے مستعد دکھائی دے رہی ہے ...... جدیدیت اور مابعد جدید کے نئے گوشے آشکار ہو رہے ہیں ...... تازہ تر احساس سے مملو ادب اور آرٹ سماج میں انسانی فکر کے ارتقائی سفر میں شعور کے کسی پڑاؤ کی سمت نمائی کرتے ہیں اور یہ جاننے کیلئے ہماری بصارت اور بصیرت، انتظار کے چراغ ہاتھوں میں اٹھائے کھڑی ہے۔''

احسن سلیم کی تحریروں کے اندر جھانکتے جھانکتے میں اس کی شخصیت کے اندر تک اترنے پر خود کو مجبور پاتا ہوں ...... یہ احسن سلیم جو مرتے مرتے ادب کو زندہ کر گیا، وہ کئی جنموں کا جینے والا تھا ...... میرے اس احساس کو ادبی رنگ ہی سمجھا جائے اس پر مذہبی ''گلال'' نہ پھینکا جائے ......رجواڑے کے ماحول میں جنم لینے والا احسن سلیم اپنے اطراف میں جزیرہ تھا اس نے اپنے گھر آنگن کو تو بس بچپن جوانی گزارنے کی جگہ ہی سمجھا اس ''مسکانیت'' میں ''مسکانیت'' نہ تھی ہاں اس میں محصور ہونے کی نہ اس نے آرزو کی نہ اس کے مزاج نے اس کو اس اسیری کا موقع دیا ...... دیا تو اس محبس سے چپکے چپکے آزاد ہو جانے کا پروانۂ پرواز ......

حیدرآباد میں جب اس نے شرمیلے سے اور محجوبانہ سے لہجے میں شعر پڑھنا شروع کیا تو اس کا نام سلیم شعلہ تھا ...... اس وقت اس کا لہجہ روایتی اور شعری اڑان اپنے کمرے کے روشن دان سے باہر نہیں جا پا رہی تھی۔ اس وقت حیدرآباد میں قابل اجمیری، حمایت علی شاعر، مرزا عابد عباس، استاد اختر انصاری اکبرآبادی عظیم الکریم عباسی اور الیاس عشقی اپنا اپنا حصہ ڈال چکے تھے اور چراغ محفل بظاہر برگ یوسفی، درد اسعدی، محمود صدیقی، نظام فتح پوری، بسمل آغائی، جبریل صدیقی، بینش سلیمی اور قاصد عزیز تک آ چکا تھا ...... ایسے میں نئے شعرا اپنا لہجہ بنا رہے تھے اور متعارف کرا رہے تھے ان میں مظفر ہاشمی ان میں کاظم رضا، انور کیف، بدر ساگری، عزیز وارثی، احمد ضیا، ساغر دہلوی، قدم بہ قدم سخنوری کے آستانۂ عالیہ میں قدم رکھ رہے تھے یا جما رہے تھے ......گلی گلی، مشاعروں کا اہتمام ہوتا تھا، طرحی اور غیر طرحی مشاعرے ...... ماہانہ ......ہفت روزہ مشاعرے ان پر تنقیدی نشستیں

مستزاد ......مجلسِ مصنفین، بزم تخلیق، بزم شعر و ادب، جلیسانِ ادب اور بہت سی تنظیمیں ہوٹرز اور نکتہ چینیوں کا اپنا مقام تھا ......قدیر غوثی ......تھا تو افسانہ نگار مگر شاعر مار بھی تھا وہ احسن سلیم کو جو اس وقت سلیم شعلہ کے نام سے شعر پڑھا کرتے تھے ہدفِ تنقید بناتا تھا اور سلیم شعلے کہتا تھا ...... وضاحت میں بتاتا تھا کہ شاعر کا نام سلیم ہے اور اس کے منہ سے جھڑنے والے اشعار، شعلے ہیں ...... پھر کیا ہوا ...... انقلاب آ گیا۔

ریڈیو پاکستان حیدرآباد کے براڈ کاسٹنگ ہاؤس کو تو ہمیشہ اس شہر کی دانش کیلئے نرسری کا درجہ حاصل رہا ہے ......یہیں سے نوعمر لکھنے والوں کی تربیت اور ان کی تہذیب کا سامان ہوتا تھا ...... اس نشر نگاہ میں جو تھا وہ یکتائے روزگار تھا، اس فکری کہکشاں میں جب ایک نئے ستارے کا اضافہ ہوا تو گویا اس گردِ درخشاں کو قطب نما مل گیا ...... اس نئے صاحبِ آدرش کا نام قمر جمیل تھا ...... کون نہیں جانتا کہ قمر جمیل کسی فرد کا نام نہ تھا، ادارے کا، آدرش کا، جہت کا، جدیدیت کا، علمیت کا اور مسلسل شور مچانے والی دانش کا نام تھا۔ بس ...... قمر جمیل کو اپنے مکتب کیلئے مانیٹر کی ضرورت تھی اور سلیم شعلہ کو اپنے مینٹور کی ...... قمر جمیل نے سب سے پہلے احسن کو مشرف بہ ادب کیا تو وہ نئے نام سلیم شعلہ سے احسن سلیم کا حوالہ بن گئے اور پھر ہم سب نے دیکھا کہ قمر جمیل نے احسن سلیم کے ساتھ وہ نہیں کیا جو حمایت علی شاعر نے قاصد عزیز کے ساتھ انداز روا رکھا تھا ...... قاصد عزیز بے چارہ مرتے مر گیا مگر حمایت علی شاعر نے اسے اپنا بستہ بردار ہی رکھا ...... قمر جمیل نے احسن سلیم پر کتابوں کی سوغاتیں نثار کر ڈالیں اور یوں احسن سلیم میرا جی کی ''مشرق و مغرب کے نغمے'' سے لے کر جمیل جالبی کی ''ارسطو سے ایلیٹ تک'' اور پھر نثری نظموں سے لے کر مغربی اور مشرقی ادب کے جغادریوں کی معرکہ آرا کتابوں تک کے مراحل سے گزرتے رہے ...... اب احسن سلیم اپنے انداز میں احسن اور رویے میں سلیم بن چکا تھا ...... مجھے گاڑی کھاتے سے اسٹیشن تک جاتے ہوئے نئے پل کے قریب وہ سڑی ہوئی سی متعفن فضا میں ادب کے طبلۂ عطار کا پتہ ملتا تھا ......

گلی کی ناروا ماحول سے گزر کر جب کھولی کے اندر معطر فضا سے ہم کنار ہوتے تھے تو وہاں ہمیں دو پجاری نظر آتے تھے ان میں سے ایک گرو تھا اور دوسرا چیلا ...... قمر جمیل اور احسن سلیم ...... اب یہیں سے مبصروں کے دو طبقے طلوع ہوتے ہیں ایک کہتا ہے قمر جمیل نے احسن سلیم کو مار دیا، وہ اداروں کے کام کا نہ رہا اور دوسرا طبقہ کہتا ہے کہ قمر جمیل نے احسن سلیم کو نیا جنم دیا ......نکھار دیا اور ایک صاحبِ مطالعہ طالب علم اور ایک صاحبِ اسلوب شاعر بنا ڈالا ......

احسن سلیم، جب کراچی آیا تو پھر وہ شور شرابے کی دنیا میں سج تو گیا مگر اپنی دنیا کو کھوجنے میں لگا رہا ...... وہ کولمبس بنا تو ادارت صحافت تنقید اور تخلیق کی نئی نئی دنیاؤں میں چلا گیا ...... اتنی تیزی سے اور اتنی دور کہ اُسے نہ اپنا ہوش رہا ...... نہ رہا اپنے اہل و عیال کا ...... وہ غیر ذمہ دار نہ تھا، مگر اس کے پاس توسیعی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کیلئے وقت ہی نہیں تھا ...... اس کی ذمہ داری گیسوئے اردو سنوارنا تھی، سو وہ اس عشوہ طراز حسینہ کا پہلو چھوڑنے کو تیار نہ تھا ...... اس نے زندہ رہنے کیلئے

بہت کچھ کیا، بینک کی نوکری، صنعت کار و تاجروں کے شوقِ ادارت و امارت و ملکیتِ ادب کی تحسین و استحسانی آب یاری ...... اس نے دھوکے بھی کھائے اور ناقدری کے زخم بھی ...... اس نے کسی کو محتاج پایا تو اپنا اثاثہ اس پر لٹا دیا اور خود محتاج ہو گیا ...... مگر اس نے پلٹ کر پچھتاوے کی آواز نہ سُنی ...... اپنا اندازِ غنی ہی رکھا اور وہ فقیری میں امیری کرتا چلا گیا ...... اس نے اپنی فکر کبھی نہ کی ...... نہ صحت کی، نہ منصب کی نہ جاہ کی ...... اقبال پیرزادہ، خواجہ رضی حیدر، فراست رضوی اور ناصر شمسی کہتے رہے کہ صحت کا خیال کرو مگر وہ صحت زبان کی فکر سے آزاد ہوتا تو اپنی صحت کا خیال کرتا نا ...... سو وہ چلا گیا، مگر ترکے میں ہمارے لئے بہت کچھ چھوڑ گیا ہے ...... اس کے بچے، اس کی بیوی، اس کے رشتے دار، اس ورثے کو ورثہ سمجھیں نہ سمجھیں، اس کے اصل اہل و عیال اور غم گسار ادب پروانے، احسن سلیم کے دیوانے اس کی ملکیت، اس کی جائیداد، اس کی میراث، اس کی آدرش کو حرزِ جاں ضرور بنائیں گے اس لئے کہ اس میں بھی احسن سلیم کو کوئی فائدہ نہیں اس وراثت سے متمتع ہونے والوں ہی کا فائدہ ہے ...... کیوں؟ اس لئے کہ اسی نے کہا تھا کہ ''ہم ادب کے ذریعے اپنے سماج کو تہذیب یافتہ بنا سکتے ہیں ...... تشدد کی جبلت اور اس کے بڑھتے ہوئے رجحان پر ادب کے وسیلے سے ہی قابو پایا جا سکتا ہے ...... قوم کو اعتدال کی راہ پر ڈالنے کیلئے پاکستان کی تمام قومی اور علاقائی زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کو ایک صفحے پر آنا چاہئے ...... سیاست دانوں کی مہربانیوں سے ہماری زبانوں میں جو خلیج پیدا ہو گئی ہے اور لسانی بنیادوں پر ہمارے عوام تقسیم ہو گئے ہیں اس کا خاتمہ ادیبوں، شاعروں، فنکاروں اور صحافیوں کی یکجائی پر منحصر ہے ...... اس ضمن میں ادب برائے تبدیلی کے حوالے سے اجرا اور عالمی تحریکِ ادب کے زیرِ اہتمام پہلی دو روزہ بین الاقوامی ادبی کانفرنس اگست 12 اور 13 تاریخ کو کراچی میں منعقد ہو گی۔''

احسن سلیم کی صحت اور عمر دونوں نے اُسے مہلت نہ دی اور 12 اگست کو ہونے والی یہ بین الاقوامی ادبی کانفرنس منعقد نہ ہو سکی مگر آج 12 اگست ہے اور میں اس کانفرنس کیلئے سوچنے والے کیلئے سوچ رہا ہوں ...... نہ جانے اس نے قمر جمیل سے مل کر یہ کانفرنس عالم بالا میں منعقد کی یا نہیں ...... مگر یہاں تو وہ ایک ایسا خلا چھوڑ گیا، جسے پُر کرنے کا خیال ہی مارے ڈالتا ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

❁❁❁

اک شخص جو ہم میں سے تھا

سید ایاز محمود

تقویمِ ماہ و سال کے حساب سے دیکھیں تو احسن سلیم سے میری ملاقات کا دورانیہ بہت طویل مدّتی نہیں۔ 2003 کی ایک گہری ہوتی ہوئی شام تھی جب گلشن اقبال کراچی کے کوئٹہ عنابی ہوٹل میں ''چائے کی پیالی پر'' ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ اور بھی لوگ تھے اور سب کے سب اپنے ہم قبیلہ، کسی مہربان نے احسن سلیم سے میرا تعارف کروایا۔ موصوف نے اپنے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ ان کا بنیادی حوالہ نثری نظم کے شاعر کا ہے۔ ان کا اصرار تھا کہ پاکستان میں نثری نظم کے فروغ اور ارتقا میں ان کا شمار لکھنے والوں کی اس اولین کھیپ میں کیا جانا چاہیے جس نے اس صنفِ ادب کو سنجیدگی کے ساتھ اردو پڑھنے والوں میں متعارف کروایا۔ لہجے میں دھیمے سے احساسِ تفاخر کے ساتھ ایک خاص قسم کی تمکنت تھی جسے محسوس کیا جا سکتا تھا۔ یہ میرا ان کے بارے میں پہلا تاثر تھا۔

ان سے دوسری ملاقات ایک نومولود ادبی جریدے کے دفتر میں ہوئی جہاں وہ مدیر کی حیثیت سے اپنی ذمے داریاں نباہ رہے تھے۔ جریدے کی اٹھان غضب کی تھی مگر یہ تین چار اشاعتوں کے بعد کچھ اندرونِ خانہ اختلافات کے باعث جلد ہی داغِ مفارقت دے گیا۔ مگر اتنا ضرور ہوا کہ اس مختصر دورانیہ حیات والے جریدے نے احسن سلیم کی مدیرانہ صلاحیتوں کو متعارف کرا دیا۔ ۔ پھر جناب شاہین نیازی کی سرپرستی میں ایک نئے ادبی جریدے ''سہ ماہی اجرا'' کا ڈول ڈالا گیا۔ اس سلسلے میں احسن سلیم سے طویل اور تفصیلی ملاقات کا موقع ملا پہلے شمارے کی تعارفی تقریب بہت دھوم دھام سے منعقد کی گئی مگر میں ان دنوں ایک پیشہ وارانہ طویل مدتی تربیتی سلسلے کی غرض سے لاہور میں مقیم تھا۔ شرکت نہ کر سکا مگر تقریب کی روداد سے اندازہ ہوا کہ جریدہ اپنی پہلی ہی اشاعت سے قارئینِ ادب کی توجّہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ کسی بھی بڑے کام میں تسلسل ہی اسے اہم بناتا ہے، احسن سلیم نے اجرا کی باگ ڈور سنبھالی تو اس تسلسل کو ٹوٹنے نہیں دیا۔ اجرا کے لیے

گراں قیمت اور اعلیٰ ادبی معیار کی حامل تحاریر کی کمی نہ تھی۔ دنیا اردو کے تمام اہم قلم کاروں نے اپنی تخلیقات سے اجرا کو اعتبار بخشا۔ اس امر کو یقینی بنانے کے لیے کہ اجرا کا ہر شمارہ ایک خاص شمارہ ہو احسن سلیم نے اپنے روابط کے تسلسل میں کمی نہیں آنے دی۔ میں ان سب باتوں کا گواہ ہوں۔ لیکن ماننے کی بات تو یہ ہے کہ اجرا احسن سلیم کی زندگی کا محور بنا تو یہ سراسر محبت کا سودا تھا۔ اس محبت کی سرشاری نے انھیں دیوانہ وار مصروف رکھا۔ اجرا سے ان کی وابستگی روز و شب کا معاملہ تھا۔ وہ دن بھر مختلف کاموں میں مصروف رہتے۔ تحاریر کا حصول، اشتہارات کے لیے تگ و دو، جریدے کے ترسیلی معاملات کے لیے بھاگ دوڑ، کمپوزنگ، پروف ریڈنگ، سرورق کا انتخاب اور طباعت کا اہتمام۔ وہ یہ سارے کام تن تنہا کرتے تھے۔ میں نے احسن سلیم اور مادّی وسائل کو ہمیشہ ایک ہاتھ کی دوری پر دیکھا، لیکن حد درجہ قابلِ تحسین بات یہ ہے کہ انھیں گلہ مند یا حالات سے شاکی نہیں پایا۔ شکوہ شکایت تو دور کی بات ہے انھوں نے اپنے لہجے کو وہاں پر بھی تلخ نہیں ہونے دیا جہاں ان کے ساتھ کی گئی زیادتی کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا تھا۔ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا حوصلہ رکھتے تھے لیکن انھوں نے خود کو ان فروعات میں الجھنے نہیں دیا۔ وہ ایک ایسی سرشار کیفیت میں ڈوبے ہوئے تھے، جو ان کے اندر نہ جھنجھلاہٹ پیدا کرتی تھی اور نہ ہی اضمحلال کو ان کے قریب آنے دیتی تھی۔ یہ ان کے تمام دن کی مصروفیات تھیں۔ رات گئے وہ اجرا کی تدوین و ترتیب کے لیے پھر مصروف کار ہوتے اور یہ سلسلہ اگلی صبح تک جاری و ساری رہتا۔ بہ مشکل چند گھنٹے آرام کے بعد پھر اجرا کی مہم پر نکل جاتے۔ یہ ایک دو دنوں، ہفتوں یا چند مہینوں کی بات نہیں، انھوں نے سالہا سال اس معمول کو اپنے آخری توانا لمحے تک نہایت باقاعدگی سے نبھایا۔

احسن سلیم اجرا کو ایک روایتی ادبی جریدے کے طور پر نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کے اہداف و مقاصد واضح تھے۔ انھیں ابتدا ہی سے یہ احساس تھا کہ ادب سماج میں مثبت تبدیلیوں کا پیش خیمہ بن سکتا ہے اور اس کے ذریعے ان اقتدار کر پروان چڑھایا جاسکتا ہے جو معاشرے کو نظم و ضبط، بلند پروازیٔ فکر، رواداری اور برداشت جیسے رویّوں کے ثمرات سے بہرہ مند ہونے کی توفیق فراہم کرسکے۔ انھوں نے ''ادب برائے تبدیلی'' کا علم بلند کیا اور اس پر متعدد پر مغز اداریے تحریر کیے۔ اجرا میں ادب برائے تبدیلی کے عنوان سے ایک مستقل گوشہ مخصوص کیا گیا جس میں ملک کے بہترین اذہان کی قلمی نگارشات کو نمایاں طور پر جگہ دینے کا اہتمام تھا۔ وہ ادب برائے تبدیلی کو ایک تحریک کے طور پر متعارف کروانے کے خواہاں تھے اور انھیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ ہمارے لکھنے والوں کو اپنی ذمے داری کا احساس کرتے ہوئے معاشرے کے لیے ایک قابل تقلید نمونہ بن کر دکھانا ہوگا۔

احسن سلیم جانتے تھے کہ ہمیں ادبی سماجیات کو تبدیل کرنے سے پہلے خود اس تبدیلی کے عمل سے گزرنا ہوگا۔ اس سے ان کی مراد رویّوں کی تبدیلی تھی۔ ان کو ادراک تھا کہ مقامی اور بیرونی زبانوں کے ادب عالیہ تک رسائی کا مطلب ہے بہترین تخلیقی اذہان تک ہماری پہنچ۔ سو انھوں نے اجرا کا بڑا حصّہ تراجم کے لیے مخصوص کردیا۔ ان کے مطابق فنکار کو اپنی محدودیت کے تالاب میں

غوطہ زن ہونے کے بجائے گہرے سمندروں کی شناوری کرنی چاہیے۔ اجرا میں ترجمہ شدہ تحریروں نے لکھنے اور پڑھنے والوں کو تخلیقی کشادگی کے احساس سے بہرہ مند کیا۔ جناب شاہین نیازی نے Will Durrant کی معرکہ آرا کتاب "The Story of Civilization" کا ایسا جم کے ترجمہ کیا کہ داد و تحسین کے معاملے میں محتاط حضرات بھی بے ساختہ تعریف پر مجبور ہو گئے۔ یہ سلسلہ ایک عرصے سے انقطاع کا شکار ہے۔ مجھے امیدِ واثق ہے کہ جناب نیازی اس سلسلے کو جاری رکھ کر قارئین ادب کے طویل انتظار کا ازالہ کریں گے۔ احسن سلیم ایک ملنسار شخص تھے ۔ وہ اپنے معاملات میں کھرے تھے۔ خوشامد، بے جا تعریف اور خود نمائی سے ان کا دور دور تک واسطہ نہیں تھا۔ وہ کسی بھی قیمت پر رعونت بھرے لہجے کو برداشت کرنے کے روادار نہیں تھے۔ ایسے لوگوں کے لیے وہ محمد سلیم خان بن جاتے تھے۔ درشت بات تو ایک طرف، کسی کی ترچھی نگاہ بھی انھیں اپنے ردّ عمل میں مضمر نفع نقصان کی فکر سے بالاتر کردیتی تھی میں ایسے کئی مواقع کا گواہ ہوں جب انھوں نے نقصان اٹھالیا مگر اپنی عزت نفس پر آنچ نہ آنے دی۔ اپنی عزّت نفس کے احساس نے ان کو حد درجہ خود دار بنادیا تھا۔ اس خود داری نے انھیں اپنے ذاتی مسائل کو پس پشت ڈال کر فقط کام پر مرتکز رہنے کی توفیق سے بہرہ مند کیا تھا۔ انھیں دوسروں کی عزت کرنی اور اپنی عزت کروانی آتی تھی۔ سو وہ اپنے ملنے والوں کو ذاتی مسائل کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتے تھے۔ ہاں قریبی دوستوں سے ان کے بیشتر معاملات چھپے نہیں تھے، لیکن عرض حال میں غرض کا پہلو نہیں تھا۔ بس دل کا بوجھ ہلکا کرنے کا بہانہ ہوا کرتا تھا۔

احسن سلیم ادب میں کسی بھی قسم کی گروہ بندی کے یکسر خلاف تھے۔ اس بات کو ثابت کرتے ہوئے انھوں نے ایسے کئی قلم کاروں کو متعارف کروایا جو دنیا ادب میں نو وارد ہونے کے ساتھ ساتھ احسن سلیم کے لیے ذاتی حیثیت میں ناواقف تھے۔ انھوں نے ایسے تمام لوگوں کو آگے بڑھنے کا موقع دیا کہ وہ اجرا کے صفحات پر چند مخصوص ناموں کی اجارہ داری سے ''ادبی اشرافیہ'' کا ایک اور کلب قائم کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ ایسے میں کبھی کبھار نسبتاً کمزور تحریریں بھی شامل اشاعت ہوجاتیں۔ توجّہ دلانے پر وہ یہ بات مان بھی جاتے، مگر وہ اس خیال کے حامی تھے کہ نئے قلم کاروں کی حوصلہ افزائی وہ ٹانک ہے جو انھیں آگے بڑھنے کا حوصلہ فراہم کرتا ہے۔

اپنی طویل، صبر آزما اور تکلیف دہ بیماری کے دوران وہ اجرا کی اگلی اشاعت کے لیے فکر مند رہے۔ میری ان سے جب بھی بات ہوتی تو اجرا کا ذکر ضرور کرتے۔ تحریریں جمع ہوکر کمپوز بھی ہوچکی تھیں، اور غالبًا اوّلین پروف خوانی کے مراحل بھی طے کرلیے گئے تھے۔ اس کے بعد کے معاملات نے غیر معمولی طول پکڑلیا اور تمام تر کوشش کے باوجود آخری کمپوز شدہ تحریری مواد کی فراہمی میں ٹال مٹول ہوتی رہی۔ بد قسمتی سے اس قسم کی وعدہ خلافی اب ہمارا قومی روّیہ بن گیا ہے۔

احسن سلیم ایک صاحب اسلوب قلم کار تھے۔ ان کا طرز تحریر مکانیکی نہیں تھا۔ وہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے شعر کہنے پر قادر نہیں تھے کہ اس کے لیے انھیں مکمل سپردگی درکار تھی۔ ان کی طویل ترین

نثری نظم ''ست رنگی آنکھیں'' ایسی ہی کیفیت کے تحت معرض وجود میں آئی۔ احسن سلیم اپنی نثری نظموں کے ذریعے پہچانے جانے کے خواہاں تھے۔ انھوں نے غزلیں بھی لکھیں جو کتابی صورت میں چھپ چکی ہیں۔ مجھے ان کی غزلوں میں بھی وہ بانکپن اور طنطنہ نظر آتا ہے، جو ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ وہ روایتی غزل لکھنے والے نہیں تھے، سو انھوں نے یہاں بھی ایک ایسے لہجے کو متعارف کروایا جو سراسر ان ہی کا ہے۔ وہ الفاظ کے زیر و بم اور ان کی گوناں گوں کیفیات اور تہ داری سے بخوبی واقف تھے۔ اُنھوں نے لفظ کے روایتی قبول کردہ مفہوم کو وسعت دیتے ہوئے اپنی دنیا آپ پیدا کی۔ وہ بات کو کھول کر بیان کرنے کے بجائے اخفائے معنی کے قائل تھے، بلکہ ایک طور پر تاثیر کو معنی پر مقدم جانتے تھے۔ ان کی شاعری پر ایک مضبوط اور بھرپور نگاہ نقّادانِ ادب پر قرض ہے۔ میں امید رکھتا ہوں کہ ہمارے سینئر اور نسبتاً نئے لکھنے والے اس پر ضرور توجّہ دیں گے۔

احسن سلیم ہمارے ہم سفر تھے۔ خاک سے خاک تک کے اس محبت بھرے سفر میں وہ ہم سے آگے نکل گئے ۔ میں اپنی بات انھیں کے شعر پر ختم کرتا ہوں۔

میں خاک سے نکلا ہوں محبت کے سفر پر
سو اپنے بدن میں کہیں موجود نہیں ہوں

❁❁❁

احسن سلیم بھی چلے گئے

رئیس فاطمہ

یکم دسمبر 2015 سے میرا رابطہ سوشل میڈیا اور انٹرنیٹ سے ایسا ٹوٹا کہ ادھر رخ کرنے کو جی ہی نہی چاہا۔ زندگی کتنی ظالم ہے اور آپ کے چاروں طرف کس طرح مفادات کے بھیڑیے دانت، پنجے اور ناخن تیز کیے لمحہ لمحہ بڑھتے ہیں۔ اس کا ادراک خوب خوب ہوا، لیکن انھی خونخوار بھیڑیوں میں کوئی امن کی فاختہ یا محبت کا نغمہ گانے والی بلبل چپکے سے نمودار ہو کر کس طرح ہمدردی اور بے لوث خدمت سے کٹھن دنوں کو برداشت کرنے کا درس دیتی تھی۔ اس کا بھی تجربہ خوب خوب ہوا۔

جمعہ 24 جون کو دانیال راشد کے کہنے پر ان کے گھر جا کر اپنے موبائل پہ ای میل چیک کی تو پتا چلا کہ انڈیا سے نندکشور وکرم جی کی کئی ای میلز موجود ہیں۔ میں نے اسی وقت ان کا جواب دیا کہ اس میل میں وکرم جی کا یہ شکوہ بھی تھا کہ راولپنڈی سے شایع ہونے والے ''چہارسوٗ'' کے مدیر گلزار جاوید نے پرانے پتے پر کئی پرچے بھیجے، لیکن وہ مجھے نہیں مل سکے۔ ساتھ ہی وکرم جی نے بار بار اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ میں قاضی اختر جوناگڑھی پر کوئی تازہ مضمون انھیں بھیجوں تاکہ وہ اسے آئندہ آنے والے ''عالمی اردو ادب'' میں شامل کر سکیں۔

اس میل کا جواب بھی میں نے فوراً دیا اور ایک دن کے وقفے کے بعد اتوار 26 جون کی شام جب دوبارہ دانیال راشد کے گھر پہنچی اور موبائل چیک کیا تو ''فیس بک'' پر سب سے پہلے جو چہرہ سامنے آیا وہ احسن سلیم کا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ انھیں ٹی بی کا مرض لاحق ہے، لیکن جس طرح وہ تصویر لگی تھی اس سے میں نے یہ سمجھا کہ ہفتہ واری ادبی نشست کی ہے، لیکن اگلے ہی لمحے ایک ہولناک انکشاف عقیل عباس جعفری اور طارق رئیس فروغ کی لگائی گئی خبر سے ہوا۔ ایک عجیب سا سناٹا میرے وجود میں اتر گیا۔

احسن سلیم مدیر سہ ماہی ''اجرا'' صرف ایک فرد نہیں تھے۔ ان کی ذات میں ایک ذمے دار شوہر، مشفق باپ، مخلص دوست، جفاکش محنتی اور جینوئن ادیب و شاعر تھے۔ وہ ایک وسیع حلقہ

احباب رکھتے تھے۔ نیشنل بینک کی ملازمت سے ریٹائرمنٹ کے بعد وہ کل وقتی مدیر بن گئے تھے۔ ممتاز رفیق کے توسط سے پہلے وہ ''سخن زار'' سے وابستہ ہوئے اور ایک نئے پرچے کو سامنے لانے کے لیے ہمہ تن مصروف ہوگئے۔ ادیبوں اور شاعروں کو بلاتخصیص خطوط ارسال کیے کہ ان کا مطمح نظر صرف اور صرف ''اچھی اور معیاری'' تخلیق تھا۔

قاضی اختر سے ان کا دیرینہ واسطہ تھا، لیکن میری ملاقات ''سخن زار'' کی اشاعت کے بعد ہوئی کہ انھیں میرا ایک افسانہ ''چاندی کی پازیب'' اور بھارت کا پہلا سفرنامہ ''میرے خوابوں کی سرزمین'' بہت پسند تھا۔ ایک موقعے پر ہمارے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے کہنے لگے: ''آپ کے افسانے کے سارے کردار ہمارے آس پاس ہی موجود ہیں اور انھیں بہ آسانی پہچانا بھی جاسکتا ہے، لیکن آپ نے یہ نہیں سوچا کہ اس طرح قلم کو شمشیر برہنہ بنانے سے آپ اکیلی رہ جائیں گی، لوگ آپ کے دشمن بن جائیں گے۔''

تب قاضی صاحب نے کہا تھا: ''بھائی! میں تو سمجھاتے سمجھاتے تھک گیا ہوں، لیکن ان پر تو سچائی سامنے لانے کا بھوت سوار ہے۔ یہ نہیں جانتیں کہ کیا سچ بولنے والے کا مقدر صرف زہر کا پیالہ ہوتا ہے۔'' میں مصلحتاً وہاں سے اٹھ گئی کہ موضوع بدل جائے۔ تھوڑی دیر بعد کھانا لگا کر دونوں کو آواز دی۔ اس دن مٹر پلاؤ اور مٹن فرائی بنا ہوا تھا۔ احسن بھائی نے صرف مٹن فرائی اور شلجم کا پانی والا اچار رغبت سے کھایا۔

تب میں نے بصد اصرار کیا کہ تھوڑا سا تو مٹر پلاؤ بھی چکھ لیجیے کہ شلجم کا اچار اسی کے ساتھ مزہ دیتا ہے۔ انھوں نے ڈش کا ڈھکنا اٹھایا، پلاؤ کو غور سے دیکھا، تھوڑا سا پلیٹ میں نکالا، پہلا نوالا لیا اور پھر مزید پلاؤ پلیٹ میں نکالنے کے ساتھ ہی بولے: ''بھئی! مجھے کیا پتا تھا کہ آپ چاول اتنے اچھے پکاتی ہیں، ایک ایک دانہ الگ، ورنہ ہم نے تو زیادہ تر گلتھی کھائے ہیں۔ اگر پہلے چکھ لیتا تو صرف یہی کھاتا۔'' اکثر و بیشتر جب ہمارے گھر پہ احباب جمع ہوتے تھے تو ان میں ہمیشہ پروفیسر سحر انصاری، احسن سلیم، ندیم ہاشمی اور ان کی بیگم کی شمولیت لازمی تھی۔ بعض اوقات ناصر شمسی بھی تشریف لے آتے تھے۔

جب انھوں نے سہ ماہی ''اجراء'' نکالا تو بہت سے لوگوں نے ان سے کہا کہ وہ کامیاب نہیں ہوں گے۔ لیکن حالات نے ثابت کردیا کہ ''اجراء'' ایک منفرد اور وقت پہ آنے والا جریدہ ثابت ہوا۔ ہمارے ہاتھوں ''اجراء'' کی کاپیاں بھارت بھی پہنچیں۔ نندکشور وکرم بھی ان کے بڑے مداح تھے۔ چند برسوں کی اشاعت کے بعد احسن بھائی نے مجھے بھی ''اجراء'' کی مجلس ادارت میں شامل کرلیا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بقول قاضی اختر جوناگڑھی ''یہ مکمل طور پر ون مین شو ہے۔''

میں نے اکثر و بیشتر سوائے پروف ریڈنگ کے کچھ بھی نہ کیا سوائے اس حکم کی تعمیل کے کہ ''آپ دونوں ہر شمارے کے لیے کچھ نہ کچھ دیں گے۔'' اور ہم دونوں نے اس محبت بھرے حکم کو کبھی نہیں ٹالا۔ سن 2015 کی ابتدا میں انھوں نے ایک ''عالمی اردو کانفرنس'' کرنے کا ارادہ کیا۔ اختر

کے پاس آئے اور ہم دونوں سے سہ روزہ ادبی کانفرنس کا پروگرام بنوایا۔ ہم نے یہ خیال رکھا کہ ریوڑیاں اپنوں اپنوں میں نہ بٹیں۔ پورا پروگرام ''اجراء'' کے نگران کی منظوری کے بعد فائنل ہوگیا۔ بہت سے لوگوں نے مالی مدد کی پیشکش اس طرح کی کہ پاکستان کے باہر سے آنے والے مہمانوں کو وہ ٹھہرانے کی ذمے داری اٹھائیں گے۔

اختر نے احسن بھائی سے کہا یہ پروگرام ان کے خیال میں ناقابل عمل ہے۔ پہلے آپ صرف کراچی شہر کی سطح پر ایک کانفرنس رکھیں اور ان کو بلائیں جنھیں سفارش نہ ہونے کی وجہ سے کوئی دوسرا ادارہ نہیں بلاتا کہ منتظمین کو جس مہمان سے کسی قسم کا کوئی فائدہ نہ ہو وہ اس کا نام قلم زد کردیتے ہیں۔ دوسری دفعہ میں آپ کل پاکستان ادبی کانفرنس کیجیے اور اس کے بعد عالمی کانفرنس کی طرف دیکھیے۔ لیکن احسن بھائی کو کچھ موقع پرست لوگوں نے امید تو دلادی اور اسی امید کے نتیجے میں انھوں نے انڈیا سے نندکشور وکرم کو میرے ذریعے دعوت دلوائی۔ لیکن میں بوجوہ چپ رہی۔ پھر ایک دن ای میل کے ذریعے وکرم جی نے انکشاف کیا کہ انھیں سہ ماہی ''اجراء'' کی طرف سے اکتوبر میں ہونے والی کانفرنس کا زبانی بلاوا مل گیا ہے، تاکہ وہ اپنی تیاری مکمل کرسکیں۔

وکرم جی انھی دنوں ترکی کانفرنس میں شرکت کے لیے جانے والے تھے۔ انھوں نے مجھ سے جب تفصیل پوچھی تو میں حقیقت نہ بتاسکی۔ پھر ہوا یوں کہ ایک شام احسن بھائی آئے، مغرب کا وقت تھا، بہت اداس تھے۔ کہنے لگے: ''اختر بھائی! لوگ پیچھے ہٹ گئے ہیں۔ جنھوں نے ادیبوں کے لیے ہوائی جہاز کے ٹکٹ اور ٹھہرانے کا انتظام کیا تھا، ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں۔''

اختر بولے: ''احسن سلیم! تم بہت معصوم ہو۔ اگر تم پہلے ہی کسی سرمایہ دار، صنعت کار، سیاسی یا کاروباری شخصیت سے معاملات طے کرلیتے کہ کون صدارت کرے گا؟ کون مہمان خصوصی ہوگا؟ کون کون لوگ اسٹیج پہ بیٹھیں گے اور اس کے عوض کتنی اور کون سی خدمت انجام دیں گے تو تم ضرور کامیاب ہوتے۔'' احسن سلیم نے مسکرا کر دیکھا اور بولے: ''پھر مجھ میں اور وہ جو دربار سجاتے ہیں۔ تاتا تھیا کرواتے ہیں، عالموں اور جینوئن ادیبوں کو کھڈے لائن لگاتے ہیں۔ جی حضوری کو پسند کرتے ہیں، موقع پرستوں، متعصبوں اور منافقوں کے بیچ راجہ اندر بنے بیٹھے ہیں، ان میں اور مجھ میں اور ''اجراء'' کی ٹیم میں کیا فرق رہ جائے گا۔'' وہ بہت بددل ہوکر تقریباً ساڑھے گیارہ بجے شب رخصت ہوئے تو شکستگی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

فروری 2016 میں ایک دن انھوں نے فون کیا اور بولے: ''تین چار دفعہ گھر آچکا ہوں، تالا پڑا ملتا ہے، آپ کہاں ہیں؟'' پھر میرا جواب سن کر کہنے لگے: ''تارک الدنیا ہوکر آپ جیتے جی مرجائیں گی، گوشہ نشینی ختم کیجیے اور ہر اتوار کو ہونے والی ''اجراء'' کی نشستوں میں آنا جانا شروع کیجیے۔ آپ کو گھر سے لینے اور واپس گھر چھوڑنے کی ذمے داری ہماری ہے۔ بس آپ ہمت پکڑیے۔'' پھر کچھ عرصے بعد اقبال خورشید سے بات ہوئی تو انھوں نے یہ ہولناک انکشاف کیا کہ احسن بھائی ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ اوجھا سینی ٹوریم میں علاج ہورہا ہے۔

یہ تکلیف دہ انکشاف سن کر میں نے فوراً احسن بھائی سے بات کی اور ان کی ہمت بندھائی کہ ٹی بی تو ایسا مرض نہیں جو لاعلاج ہو۔ پھر دو تین بار مزید بات ہوئی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ احسن سلیم ہمیشہ سے اپنی صحت کی طرف سے بہت بے پروا تھے۔ انھیں کھانسی بہت آتی تھی۔ ہم نے کہا بھی کہ وہ دن بدن کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ کسی اچھے ڈاکٹر سے مشورہ لیں لیکن وہ ''محض کھانسی ہے'' کہہ کر بات ختم کر دیتے تھے اور 26 جون کو بات ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

وہ اپنے گھر کے واحد کفیل تھے۔ گھر بھی کرایے کا ہے۔ ایسے میں اکادمی ادبیات پاکستان اور نیشنل بک فاؤنڈیشن جیسے بڑے اداروں کو ان کی بیوہ کی مدد کرنی چاہیے جو خود بھی ہیپا ٹائٹس C کی مریضہ ہیں، لیکن کمال کی باہمت خاتون ہیں۔ خدا انھیں صبر دے اور حکومتی اداروں کو توفیق دے کہ وہ ایک ادیب، شاعر اور مدیر کی رحلت کے بعد اس کے لواحقین کی ماہانہ مالی مدد کے لیے کچھ اقدام کرے۔ ہم سب کو احسن سلیم کی فیملی کا ساتھ دینا چاہیے، انھیں ہماری ضرورت ہے۔

(یہ کالم 2 جولائی 2016 کو روزنامہ ایکسپریس میں شایع ہوا)

❁❁❁

احسن سلیم کی زندگی کا ایک باب

مرزا سلیم بیگ

احسن سلیم ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بہ یک وقت شاعر، نثر نگار اور ادبی صحافی تو تھے ہی، اِس سے بڑھ کر وہ ایک تحریک ساز فکری راہ نما بھی تھے۔ ذاتی طور پر وہ اوائل عمر میں ہی ماورائی طرز فکر سے متاثر ہوگئے تھے اور اسی راستے پر چلتے چلتے وہ روحانیت کے بلند پایہ مقلد ہو گئے تھے۔ اُنھوں نے جب شاعری کی وادیٔ پُر خار میں قدم رکھا تو سب سے پہلے اپنے آپ کو بہ طور نظم گو شاعر کے آزمایا۔ یہ بات ان کے تقریباً تمام ہی معاصرین کے لیے حیرت کا موجب تھی کیوں کہ اُس زمانے سے حیدرآباد (سندھ) میں آج تک شاعری سے مراد سکہ بند غزل کی شاعری لی جاتی رہی ہے۔ نظم کی طرف معدودے چند شعرائ کے علاوہ کسی نے توجہ نہیں دی۔ گو اُس زمانے کی بزم شعر ڈاکٹر الیاس عشقی، برگ یوسفی، جوش جھالاواڑی، حمایت علی شاعر، درد اسعدی، رفیق ریواڑوی، سالک عزیزی، قابل اجمیری، محسن بھوپالی، نظام فتح پوری، نہال اجمیری، واجد سعیدی اور وحید پیامی جیسے اساتذہ کے دم سے آباد تھی۔ اِن قادرالکلام اور پُر گو ہستیوں کے بعد یہاں سے اُردو شاعری کے اُفق پر جو شعرائ نمایاں ہوئے اُن میں احسن سلیم، اسلم اشعر، ثروت حسین، خلش مظفر، احمد ضیائ اور قصد عزیز خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن بات جب جدیدیت کی ہو تو احسن سلیم اپنی فکر اور اُس کے مثبت اور منفی باہمی اظہار کے باعث سب سے منفرد نظر آتے ہیں۔ اُن کی شاعری اور شخصیت نے دور اور نزدیک کے سب ہی ادبی حلقوں میں اپنا انفرادی تشخص نہایت کامیابی سے قائم کیا، یہاں تک کہ اُردو کے معروف نقّاد ڈاکٹر طاہر تونسوی نے انھیں 'اُردو غزل کی وجودیت کا شاعر' قرار دے دیا۔

اپنے شعری سفر کے آغاز میں احسن سلیم کی پہلی نظم نے ہی حیدرآباد کے ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ سٹی آرٹس کالج کے طالب علموں کو بھی اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ یہ 1968 کا زمانہ تھا جب وہ سٹی آرٹس کالج، حیدرآباد میں انٹرمیڈیٹ کے طالب علم تھے۔ اُنہی دنوں اُن کی شناسائی احمد

ضیاء، خلش مظفر، رشید جمال، سلیم خیام علی، عالم انصاری، قاصد عزیز، سیّد کاظم رضا اور کامل عارفی سے ہوئی۔ اُس وقت بزم فروغ ادب (1965) کے زیر اہتمام ماہانہ مشاعروں کا سلسلہ پوری آب و تاب سے جاری تھا، اُس کے ہوتے ہوئے اِن احباب میں سے بیش تر ہم خیال لوگ ایک ادبی انجمن 'تحریک' کے نام سے قائم کر چکے تھے۔ اِس انجمن کی نشستیں الطاف حسین کی ایماٗ پر لطیف آباد، یونٹ نمبر ١١ کے ایک چائے خانے میں ہوا کرتی تھیں۔ کچھ عرصے بعد ہی یعنی 1968 میں 'تحریک' کا نام تبدیل کر کے 'مجلس مصنفین' رکھ دیا گیا اور مجلس کی پندرہ روزہ تنقیدی نشستیں پہلے منظور چیمبرز، حیدر چوک اور بعد ازاں جمہور لائبریری لطیف آباد نمبر ۷، میں منعقد ہونے لگیں۔ اِن نشستوں میں اجمل کمال، احسن سلیم، احمد ریاض نسیم، احمد ضیاٗ، پروفیسر ارشد رضا، ڈاکٹر الیاس عشقی، پروفیسر انوار احمد زئی، جبرئیل صدیقی، حمید انجم، پروفیسر خالد وہاب، ڈاکٹر حسن منظر، رضوان صدیقی، زبید احمد فردوسی، سرور بھوپالی، سعید الدین، سلیم خیام علی، سید کاظم رضا، شاہد اقبال، صابر وسیم، طارق حسین طارق، ظافر تشنہ، ظفر محی الدین، ظہور قائم خانی، حاجی عدیل، غیور محمد، ڈاکٹر فرید، فضل محمود، قاصد عزیز، قدیر غوثی، قمر حیدر، قوی احمد، قیوم نصرت، محمود صدیقی، ڈاکٹر مظفر، م۔ سلیم انور، وثیق الرحمان اور راقم وغیرہ شریک ہوتے تھے۔ سیّد کاظم رضا مجلسِ مصنفین کے جنرل سیکریٹری تھے۔ وہ ترقی پسند تحریک کے زبردست حامی اور پُر جوش کارکن تھے۔ شاعر بھی بہت اچھے تھے اور افسانہ نگار بھی۔ اُن کی ترقی پسندی کے باعث بہت سے مخالف نظریات کے حامل احباب مجلسِ مصنفین سے الگ ہو کر اُستاد اختر انصاری اکبر آبادی کے اطراف جمع ہو گئے کچھ لوگوں نے 1977 میں م۔ سلیم انور کی قیادت میں ایک اور ادبی انجمن 'ہم قلم' کے نام سے قائم کر لی۔ اِسی دوران میں ایک اور ادبی انجمن 'جلیسانِ ادب' کے نام سے بنی۔ جس کے روح و رواں اسلم اشعر، پروفیسر حبیب ارشد، خبیب حیات، راجا فیض الحسن، ڈاکٹر عتیق احمد جیلانی، قمر مشتاق اور مضطر ہاشمی تھے۔

اِس منظر نامے کو بیان کرنے کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اُس زمانے کے حیدر آباد میں ادبی گھما گھمی اپنے عروج پر تھی، تمام اساتذہ بہ قید حیات تھے۔ بر مکان مشاعروں کے ساتھ ساتھ بڑے مشاعروں کا انعقاد بھی تواتر سے جاری تھا لیکن بہ طور شاعر احسن سلیم کے منفرد طرزِ اظہار کے لیے یہاں کی ادبی فضا بالکل سازگار نہ تھی۔ کوئی پلیٹ فارم ایسا نہیں تھا جہاں اُن کی گنجائش ہو۔ روایت کے رنگ میں رنگی ہوئی سماعتوں کے لیے اُن کی منفرد فکر اور اُسلوب دونوں ہی اجنبی تھے۔ گو کہ اپنی زندگی کے پہلے مشاعرے میں جو بسنت ہال (تھیوسوفیکل ہال) میں جناب فیض احمد فیض کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ اُس میں اُن کی نظم 'کچا رشتہ' بہت اچھے انداز میں سنی گئی اور اُنھیں داد و تحسین سے بھی نوزا گیا۔ لیکن اُس کی حیثیت عوامی پذیرائی سے زیادہ نہ تھی، کیوں کہ ادبی حلقے بہ دستور چپ سادھے ہوئے تھے۔

مزید کچھ لکھنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اُن کی یہ دونوں ابتدائی نظمیں اور ایک غزل کے تین اشعار یہاں نقل کروں، کیوں کہ میرے خیال میں اِن دو نظموں اور تین اشعار سے ایک طرف احسن سلیم کی اُٹھان کا اندازہ ہوتا ہے تو دوسری طرف اُن کی باطنی کیفیت، شعری استعداد، لیاقت اور قابلیت کا بھید بھاؤ کھلتا ہے۔ اِس پہلی نظم 'اِملی کا پیڑ' کے بعد احسن سلیم حیدر آباد کے شعری و ادبی حلقوں میں متعارف ہوئے۔ یہ نظم پسند بھی کی گئی حتیٰ کہ چند ایک شعراٗ نے اِس کی روشنی میں اپنا راستہ بدل کر اِس انداز کو اپنانے کی اپنی سی سعی بھی کی۔ دوسری نظم پیش کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہی وہ نظم ہے جو اُنھوں نے اپنی زندگی کے پہلے مشاعرے میں پڑھی اور یہی اُن کی پہلی تخلیق ہے جو کہیں شائع ہوئی۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

اِملی کا پیڑ

لمحوں کی سونی راہوں پر
سات برس گر لوٹ بھی جائیں
آشاؤں کی بستی میں اب
من موہن کو کیسے پائیں
اب تو جلتی آہیں ہوں گی
بھولی بسری یادیں ہوں گی
ارمانوں کا ڈھیر ملے گا
میری طرح سے
تنہا، اُجڑا
اِک اِملی کا پیڑ ملے گا

یہ مختصر سی نظم جو آزاد نظم کی فارم میں ہے، اِس میں لڑکپن کی رؤمان پرور فضا، اپنے محبوب یا اپنے لڑکپن کے دوستوں کی یاد اور ایک معصوم سا دکھ آخری مصرعے 'اِک اِملی کا پیڑ ملے گا' تک پہنچتے پہنچتے قاری یا سامع کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اِس آخری مصرعے سے یہ نظم اچانک علامتی طرزِ اظہار میں ڈھل جاتی ہے۔ 'اِملی کا پیڑ' زمین سے شاعر کے فطری تعلق اور رشتے کو ظاہر کرتا ہے اور پھر ہمارے احساساتی تلازمات اِس نظم کی معنویت کو اُس بلندی تک وسعت دے دیتے ہیں کہ جہاں سے آدم کی تخلیق پھر آدم و حوا کا اپنے اصل وطن کو چھوڑ کر نکلنا، سب کچھ جھلکیوں میں دکھائی دینے لگتا ہے۔ یوں یہ نظم بلا تکلف 'وطن' سے جدائی کے دکھ کی علامت بن جاتی ہے۔ سات برس کے بعد اپنے گاؤں لوٹنے کی آرزو کے آئینے میں شاعر کو اپنی تنہائی اور اپنے اُجاڑ ہونے کا احساس اِملی کے پیڑ کے مماثل دکھائی دیتا ہے یوں اِملی کا پیڑ علامت کے ساتھ ساتھ ایک

اُجاڑ ویرانے کا اِستعارہ بھی بن جاتا ہے۔ یہاں ’سات‘ کا ہندسہ بھی محض وقت کی پیمائش کے لیے استعمال نہیں ہوا بل کہ احسن سلیم کے ذہنی اسٹرکچر میں شاید کچھ ایسے لوازمات جنیاتی حوالے سے وراثتاً منتقل ہوتے چلے آئے ہیں کہ جن کی جڑیں ماضی کی توہماتی دنیا سے جڑی ہوئی ہیں۔ بہ قول قمر جمیل:

’’احسن سلیم کی شاعری کا ایک رُخ توہماتی دنیا یعنی (Occult) دنیا سے بھی جاملتا ہے۔ مثلاً ان کے یہاں ساتواں کیلنڈر، ساتواں آسمان، سات رنگ اور ’ست رنگی آنکھیں‘ ایک طلسماتی فضا پیدا کردیتی ہیں۔ الفاظ ایسے آئینے بن جاتے ہیں جن میں کبھی ہم خود، کبھی ہماری تاریخ اور کبھی ہمارے آسیب بولنے لگتے ہیں‘‘۔(’ست رنگی آنکھیں‘ ص:13-12)

احسن سلیم کی دوسری نظم جو’اِملی کا پیڑ‘ کے بعد لکھی گئی اُس کا عنوان ہے’کچا رشتہ‘ اِس نظم میں اُس وقت کے سیاسی حالات یعنی یحییٰ خان کے مارشل لاء کے نتیجے میں عوامی اجتماعی ذہن میں خوف، سراسیمگی اور اندیشوں کی الم ناک آندھیاں سرایت کرگئی تھیں۔قومی وحدت،ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتی جارہی تھی اور ملک دولخت ہونے ہی والا تھا۔ یہ احساس تخلیقی سطح پر احسن سلیم کی اِس نظم میں کس طرح اُبھرتا ہے ملاحظہ فرمایئے:

کچا رشتہ

ماں جی
بارش کے آنے سے پہلے ہی
ہم، چاروں پانچوں بھائی مل کر
گوبر
چکنی مٹی میں گوندھا کرتے ہیں
اپنے ہاتھوں
اپنے گھر کو لیپا پوتا کرتے ہیں
ماں جی
ہلکی ہلکی بوندا باندی سے ہی
اپنے گھر کی چھت سے پانی رسنے لگتا ہے
اور آندھی آنے سے پہلے ہی
اپنے گھر کی دیواریں ہلنے لگتی ہیں

ماں جی
گوبر، چکنی مٹی اور پانی
ان تینوں میں
کون سا رشتہ کچا ہے

(جوئے میں جیتی ہوئی آنکھیں، غیر مطبوعہ)

یہ نظم بہ ظاہر دیہات کے ایک کچے گھر کا منظر پیش کررہی ہے لیکن اپنے علامتی اظہار کے باوصف اِس کی معنویت کا دائرہ وسیع ہوکر وطنِ عزیز کا اِستعارہ بن جاتا ہے۔ چاروں، پانچوں بھائیوں سے شاعر کی مُراد چاروں صوبوں اور وفاق سے بھی ہوسکتی ہے اور چار مقامی قومیتوں اور پانچویں اُردو بولنے والی قوم سے بھی۔ ماں جی، مادرِ وطن ہے۔آندھی اور بارش، ناگہانی مصیبتوں اور پریشانیوں کی طرف اِشارہ ہے۔ دیواروں کا ہلنا اور چھت سے پانی کا رسنا، دفاعی حصار میں کم زوری اور بہ حیثیت قوم اجتماعی احساس میں اتحاد اور محبت کی کمی کی علامت ہے۔ گوبر، چکنی مٹی اور پانی سے گارا بنتا ہے۔جس سے گھر کی مضبوطی کا بندوبست کیا جاتا ہے لیکن شاید شاعر کو اتحاد باہمی، محبت اور اجتماعی احساسِ یگانگت میں خلا محسوس ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ خلا یا کمی اِخلاصِ نیت کی ہو۔جس کا اظہار اُس وقت کے حالات میں پوری شد و مد کے ساتھ نظر آتا ہے۔ میرے نزدیک سقوطِ ڈھاکا سے پہلے کی یہ نظم اپنے باطن میں اس قومی سانحے کے پس منظر میں ایک پیش گوئی اور انتباہی حکم کا درجہ رکھتی ہے۔ بسنت ہال کے مشاعرے میں کام یابی حاصل کرنے بعد یہی نظم 1969 ڈاکٹر وزیر آغا کے رسالے میں شائع ہوئی۔

جس طرح عام آدمی کی زندگی میں پہلی نوکری، پہلی شادی اور پہلی جماعت اُس کی زندگی کی راہیں متعین کرنے میں کلیدی اہمیت رکھتی ہیں، اُسی طرح شاعر کی زندگی کا پہلا مشاعرہ اور اُس کی نظم یا غزل کی کسی جریدے میں پہلی اشاعت اُس کے لیے بہت اہمیت رکھتی ہے۔احسن سلیم کے لیے اِس نظم کی مشاعرے میں کام یابی اور اُس کے بعد’اوراق‘ میں اِشاعت عجیب قسم کی سرشاری سے عبارت ہوگئی جس نے اُن کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ بہ طور شاعر اُن کی روح میں اپنی ذات پر اعتماد اور یقین نے تخلیقی صلاحیت میں حوصلے اور اِرادے کے جوہر کو بڑھاوا دیا۔

☆☆☆

اب وہ تین اَشعار دیکھیے جن کی سرگوشیانہ گونج کراچی اور اطرافِ حیدرآباد میں پیدا ہوگئی تھی۔اِن اشعار میں زبان و بیان اور احساس کی ندرت، اُجالے کی طرح اُبھرتی اور پھیلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے:

اُس کا جب ادراک ہوا تھا
میرا سینہ چاک ہوا تھا

رات شجر سے پھول گرے تھے
چاند کہیں نم ناک ہوا تھا
موجِ دُعا تھی اور مرا دل
زیرِ زمیں افلاک ہوا تھا

(’منجمد پیاس‘،ص:360)

اِن اشعار کی معنویت اپنی جگہ، اُسلوب اور اُس کی جمالیات اپنی جگہ۔ میری ذاتی رائے میں مندرجہ بالا دو نظمیں اور ایک غزل کے یہ تین اشعار ہی احسن سلیم کی وہ کلیدی تخلیقات ہیں جن کی کوکھ سے، روحِ عصر کو اُجالتی ہوئی وہ شاعری اور نثر خلق ہوئی کہ جس کی پُرکشش تابنا کی آج اُن کی تخلیقی اِنفرادیت کی ضامن ہے۔ اِس نکتے کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے اُن کے ذاتی کوائف اور خاندانی پس منظر سے آگاہی ضروٗری ہے کیوں کہ اُن کی شاعری اور نثر میں جس ’جلال اور جمال‘ کا اِظہار ہوا ہے اُس کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں اُن کے ماضی یعنی نسب نامے میں پیوست ہیں۔ مکتبہ نئی قدریں کی طرف سے انیق احمد ، احسن سلیم کی غزلوں کے مجموعے ’منجمد پیاس‘ کے حرفِ آغاز میں لکھتے ہیں:

’’رواں صدی میں برپا ہونے والی دو عالم گیر جنگوں کے بعد دنیا کا نقشہ جس تیزی کے ساتھ بدلا اُس کی توضیح بہت مشکل ہے۔ جغرافیائی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ ہی مادّی وسائل کی دریافت نے روئے ارض کو یک سر بدل کر رکھ دیا اور اِس تبدیلی کی حیرت انگیزی یہاں تک پہنچ گئی کہ انسان اپنے دروں کو بھی بدلتا ہوا محسوس کر رہا ہے۔ سماجی قدریں یوں تبدیل ہوتی جارہی ہیں کہ پہلے جن رسومات کو تہذیب سمجھا جارہا تھا وہ بے وقوفی اور جن باتوں کو بے حیائی و درندگی کا نام دیا جاتا تھا وہ آزادی اور طاقت کی علامت بن گئی ہیں۔
اِس صورت حال میں اگر مغرب کی طرف دیکھیں تو کیٹس، ملٹن، شیلے اور جان ڈن جب کہ مشرق میں رومی، حافظ، سعدی، حتیٰ کہ میر اور غالب جیسے نابغہ روزگار کسی جنیاتی وسیلے (Genetical Sources) سے بھی آنے والی نسلوں کے محسوسات میں اپنا سفر جاری نہ رکھ سکے یعنی یہ شخصیات یا اِن کی امکانی حد بھی اُن کے بعد کے تخلیق کاروں میں ملنا مشکل ہوگئی۔ یہ ایک مایوسی کا زمانہ ہے۔ ایک طویل تاریکی ہے جس میں ’شاید‘ کہیں کہیں شعلہ بھر روشنی ہماری نااُمیدی کی سیاہی دھونے کی سعی کرتی ہے۔ ایسی ہی ایک روشنی کا نام احسن سلیم ہے۔ ایک شاعر، ایک نثر نگار، ایک بھرے پُرے معاشرے میں اجنبی، کیوں کہ وہ متذکرہ بالا جنیاتی سلسلے سے از خود مل گئے ہیں‘‘۔

(’منجمد پیاس‘،ص:7)

اُن کی ادبی زندگی میں قمر جمیل کے حیدرآباد اور بعد میں خود اُن کے کراچی تبادلے کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے وہ اِس لیے کہ اجنبیت کی گرد میں اٹی ہوئی جس ناقدری کے وہ یہاں حیدآباد میں شاکی رہے، اُس کے برعکس کراچی میں اُنھیں ایسی فضا میسر آئی جس کی بنیاد گفت گو اور مکالمے پر تھی۔ اِس صورتِ حال میں اجمل سراج، احمد امتیاز، احمد شکیل، احمد ہمیش، انوپا حیدر، خواجہ رضی حیدر، شاہد حمید، ڈاکٹر عبداللہ جاوید، عزم بہزاد، عنائتی صاحب ،قمر جمیل اور لیاقت علی عاصم اُن کے حق میں تازہ ہوا کے جھونکے سے کسی طور کم نہ تھے۔ یہی وہ ابتدائی لوگ ہیں جنھوں نے اُنھیں سب سے پہلے پہچانا۔ اِن احباب سے ملاقات کے بعد اُن کا سفر ہندوستان وہاں ایس سلطانہ حمیدی سے ملاقات اور ’ست رنگی آنکھیں‘ (کتاب کو یہ عنوان بعد میں دیا گیا) کی تخلیق پھر وہ خطوط جنھیں بعد میں راقم نے جمع آوری کے بعد ’پتوں میں پوشیدہ آگ‘ کے نام سے ترتیب دیا۔ خواجہ رضی حیدر کی مساعیٔ جمیلہ سے اِن دونوں کتابوں ایک ساتھ کی اِشاعت۔ یہ وہ واقعات ہیں جن پر احسن سلیم کی زندگی کا ایک باب مکمل ہوتا اور اِس کے خاتمے پر وہ اپنی زندگی کے اگلے باب میں داخل ہونے کے لیے نک سک سے درست ہو کر آئینہ خوانی کرنے لگتے ہیں۔

❁❁❁

خاں صاحب

محمد امین الدین

احسن سلیم سے میری پہلی ملاقات تو شاید 1983 یا 1984 میں ہوگئی تھی، مگر اس کے بعد ایک طویل عرصے تک ان سے دوبارہ ملاقات نہ ہوسکی۔ یہ 1997 کی بات ہے جب خواجہ رضی حیدر کے اصرار پر میں پہلی بار آستانہ بہزاد لکھنوی (سخی حسن) گیا، تو وہاں، جہاں بہت سے شاعر و ادیب حضرات نے مجھے خوش آمدید کہا، وہیں احسن سلیم سے بھی قربت کا آغاز ہوا۔ اس بیٹھک پر سب احسن سلیم کو خاں صاحب کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ تب سے میں بھی انھیں خاں صاحب ہی کہہ کر پکارا کرتا رہا ہوں۔ میرے لیے آج بھی وہ خاں صاحب ہیں۔ جیتے جاگتے خاں صاحب۔

خاں صاحب بنیادی طور پر ایک شاعر تھے اور نثری نظم میں تو خوب کمال دکھاتے تھے۔ مگر میں نے انھیں ادب کی دیگر اصناف اور خاص طور پر افسانے کے حوالے سے صاحب علم پایا تھا۔ اچھے افسانوں اور اچھی کتابوں کا ذکر میں نے اکثر ان سے سنا، بلکہ بعض ایسی کتابوں کی بھی نشان دہی کی جو میں نے نہیں پڑھ رکھی تھیں۔ 1998 کے زمانے میں ہم اپنے کچھ غیر ادبی دوستوں کے ساتھ پاکستان جونیئر چیمبر نامی ایک این جی او سے وابستہ تھا۔ اس این جی او میں ٹریننگ، سیمینار، میڈیکل کیمپ وغیرہ جیسی اہم مگر غیر ادبی سرگرمیاں ہوا کرتی تھیں۔ میں نے اپنے چیپٹرز پہلے سینٹرل جے سیز اور بعد میں آئیڈیل جے سیز کے پلیٹ فارم سے کئی سالوں تک مشاعرے منعقد کرنے کی روایت ڈالی۔ ان مشاعروں میں جہاں اور بہت سے شعرا نے شرکت کی وہیں احسن سلیم بھی شریک ہوتے تھے۔ پھر ایک سال تو احسن سلیم کے مشورے سے ہم نے حیدرآباد سے چند شعرا کو بھی بلوایا، جن میں عتیق جیلانی، رعنا ناہید رعنا وغیرہ شامل تھے۔ ان ہی برسوں میں میرے گھر پر بھی مشاعرے کی نشستیں رکھی گئیں۔ 1998 کے ایسے ہی ایک مشاعرے کی تصویروں میں سے ایک تصویر میں نگار صہبائی، عزم بہزاد اور احسن سلیم ایک ساتھ کھڑے ہوئے ہیں...اور آج وہ ان کے ہی ساتھ جا کھڑے ہوئے ہیں۔

یہ ہم سب جانتے ہیں کہ خاں صاحب معاشی لحاظ سے آسودہ حال نہیں تھے۔ بینک کی نوکری

کے بعد وہ زندگی کی کڑی سختیوں اور مشقتوں سے گزرے تھے۔ انھوں نے کئی کاروبار میں اپنا سرمایہ لگایا، مگر کاروباری ناتجربہ کاری کی بنا پر وہ ہر بار خسارے سے دوچار ہوئے۔ نہ آسودگی اور اس پر یہ خسارہ ان کی بے چینی کو بڑھاوا دیتا رہا۔ مگر وہ حوصلے والے آدمی تھے۔ حالات کی ستم ظریفی کو وہ سگریٹ کے دھوئیں میں اڑاتے رہے۔ کچھ دھواں اشعار کی صورت میں ڈھل کر کاغذوں پر منتقل ہوتا رہا اور وہ یہ سمجھتے رہے کہ اس طرح دکھ کم ہوجاتا ہے۔ مگر سارا دھواں نکلتا ہی کب ہے۔ جو نکل رہا ہے، وہ سماج کے منہ پر کالک مل دیتا ہے اور جو اندر ہی رہ جاتا ہے وہ روح کی گہرائیوں میں اتر کر بدن کے نازک حصوں پر خراشیں ڈال دیتا ہے۔ ان خراشوں سے صرف روح ہی زخمی نہیں ہوتی، بدن بھی تارتار ہوجاتا ہے۔ خاں صاحب نے جو خود پر جھیلا وہ کم ہی لوگ جھیل پاتے ہیں۔ ان کی ادارت میں شایع ہونے والے سخن زار اور اب اجراء میں ان کے لکھے اداریے اگر صرف انشا پردازی کا نمونہ ہی نہ سمجھا جائے اور اسے سماج کے ہاتھوں زخمی روح کی آواز کو دردمندانہ طریقے سے سمجھنے کی کوشش کی جائے، تو ہم پر ایک اور ہی احسن سلیم منکشف ہوتے ہیں۔ یہ احسن سلیم محض ایک شاعر، ادیب یا مدیر نہیں، بلکہ کیچڑ میں لتھڑے ہوئے گندے سماج کو پاک صاف کرنے کی کوشش کرنے والے ایک ایسے شخص کے طور سامنے آتا ہے، جو تبدیلی چاہتا ہے۔ یہ کایا کلپ ادب کی ہو، فرد کی ہو یا پورے سماج کی Transformation ہو، مگر ایسی زندگی سے بھرپور سماج اور اس میں بسے افراد کے استحصال سے پاک معاشرہ کی خواہش ہے، جہاں مسرت پر کوئی پابندی نہ ہو۔ وہ اپنے پلیٹ فارم سے اسی مقصد کے لیے لڑ رہے تھے۔

میں ہمیشہ سے گوشہ نشیں قسم کا آدمی رہا ہوں۔ احسن سلیم بہت کوشش کرتے تھے کہ میں باہر نکلوں۔ لوگوں سے ملوں، ادب پر گفتگو کروں۔ میں ازراہ مذاق پوچھتا کہ پھر کیا کروں۔ فوراً کہتے کہ ہم چند ادیب دوست فلاں ہوٹل پر بیٹھے ہیں۔ آجاؤ۔ میں ہنس کر ٹال دیتا۔ بار بار کے اصرار پر میں نے ان سے کہا کہ خاں صاحب! میں نے اپنی ترجیحات طے کر رکھی ہیں۔ پہلی ترجیح میرا گھر میری فیملی ہے، دوسری میری نوکری اور آخر میں تیسرے درجے پر ادب کو رکھا ہوا ہے۔ پہلی دو مصروفیات سے فراغت پاتا ہوں، تو ادب کی طرف آتا ہوں، اور یہ آنا ہی پڑھنے اور لکھنے کی طرف ہوتا ہے۔ احسن سلیم مجھے اکساتے تھے اور میں ٹالتا رہتا تھا۔

خاں صاحب نے گزشتہ سات آٹھ سالوں میں ایک کام بڑی دل جمعی سے کیا۔ ادبی رسالوں کی اشاعت کا کام۔ پہلے سخن زار اور پھر اجراء۔ اجراء کے ابتدائی شماروں پر مشاورت میں وہ میرا نام شایع کرتے تھے۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ میرا نام شایع نہ کیا کریں۔ انھوں نے کہا کہ آپ میری ٹیم میں شامل ہیں۔ اور ویسے بھی کسی رسالے کی ادارت یا مشاورت میں کسی کا نام شامل ہو تو وہ خوش ہوتا ہے۔ میں جواب میں کہتا کہ میں گم نام ہی رہنا چاہتا ہوں۔ درحقیقت احسن سلیم بہت مروت والے آدمی تھے۔ لوگ اپنی جو بھی غزلیں، نظمیں، مضامین یا افسانے بھیجتے، وہ محبت سے اسے اپنے رسالے میں شایع کر دیتے تھے۔ کبھی کبھی بعض تحریریں ادبی معیار کی نہیں ہوتی تھیں۔ مگر

احسن سلیم کسی کو مروتاً منع نہیں کر پاتے تھے۔ کبھی کبھی کسی افسانے کے حوالے سے میں نشان دہی کرتا، تو وہ مجھ سے کہتے کہ تم خط لکھ دو۔ میں وہ خط شایع کردوں گا۔ اس طرح لکھنے والوں کو اپنی تحریر کے معیار کا اندازہ ہوجایا کرے گا۔ میں ان سے کہتا کہ میں خط نہیں لکھتا۔ آپ کسی بھی رسالے میں میرا کوئی خط کسی بھی حوالے سے نہیں دیکھیں گے۔ وہ جواب دیتے کہ پھر تو کسی لکھنے والے کو اچھے اور برے کا اندازہ نہیں ہوسکے گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بھی درست کہتے ہیں، مگر میں اپنی عادت سے مجبور تھا۔ آخر کار جب کئی شماروں میں کچھ کم زور اور ادبی معیار سے گری ہوئی تحریروں کی اشاعت پر میرا اور خاں صاحب کا مکالمہ ہوتا رہا تو میں نے، ان کی بات کو مانتے اور اپنی خط نہ لکھنے کی عادت پر بھی قائم رہتے ہوئے، اجراء کے گزشتہ تمام شماروں میں شایع ہونے والے افسانوں کا ایک مختصر مگر جامع جائزہ لکھنے کا آغاز کیا۔ تب تک اجراء کے سترہ شمارے شایع ہوچکے تھے اور غالباً 129 افسانوں کو مجھے دوبارہ پڑھنا تھا۔ جب میں نے تیس صفحات پر مشتمل جائزہ انھیں پیش کیا، تو وہ بہت حیران اور خوش ہوئے، اور بولے، یہ تو آپ نے بہت زبردست کام کردیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ احسن سلیم اگر بار بار مجھے نہ اکساتے، تو میں وہ کام نہ کرتا۔ یہ بات میں ہی نہیں اور لوگ بھی کہتے ہیں کہ وہ اکثر لوگوں کو اسی طرح ادب کے کسی کام میں شامل کرلیا کرتے تھے۔

احسن سلیم اپنی زندگی میں ایک بڑا کام کرنا چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ کراچی میں ادب کے نام پر جو سالانہ میلہ سجتا ہے یا کانفرنس ہوتی ہے، اس سے نہ تو ادب کی سمت کا تعین ہوتا ہے، نہ بہتری آتی ہے اور نہ ہی مکالمے کی ایسی فضا پیدا ہوتی ہے جس سے ادب کو فروغ حاصل ہوسکے۔ انھوں نے اجراء کے پلیٹ فارم سے اپنے مشن ادب برائے تبدیلی کے عنوان سے کانفرنس کے سلسلے میں پوری تن دہی سے کام شروع کردیا تھا۔ حتیٰ کہ اجراء کے ایک شمارے میں تاریخ، سیمینار کے مقاصد اور پروگرام کا خاکہ بھی شایع کردیا تھا۔ ایک بار انھوں نے مجھے اپنے بیگ سے نکال کر پروگرام کا خاکہ دکھایا۔ میں نے ان کے حوصلے کی داد دیتے ہوئے انھیں ایک تجویز دی کہ وہ کسی بڑے میگا پروگرام کی سمت جانے سے پہلے اپنے مشن ادب برائے تبدیلی کو چھوٹے چھوٹے پروگراموں سے سجائیں۔ مثلاً شہر میں کسی اچھی جگہ کا انتخاب کرکے ماہانہ ادبی نشست کا انعقاد کروایئے۔ مگر یہ نشست عام نشستوں کی طرح نہ ہو بلکہ مکالمے کی فضا قائم ہو۔ چند ماہ کے بعد مجھے اطلاع ملی کہ اجراء تخلیقی فورم کا آغاز کردیا گیا ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہوگی کہ احسن سلیم نے صحیح سمت میں قدم رکھ دیا ہے۔ اب جو وہ تبدیلی چاہتے ہیں، اس کا اظہار اپنی ان نشستوں کے ذریعے کردیا کریں گے۔ مگر کسے پتا تھا کہ ادب میں وہ جتنے در کھول رہے ہیں، وہ سب اوجھا سینی ٹوریم کی طرف جاتے ہیں۔ ادب برائے تبدیلی کی آواز اٹھانے والے کی مدھم پڑتی دھڑکنوں کو میں نے ساؤتھ کیرولینا امریکا میں سنا تھا۔ قریب ہوتا، تو اجراء کا سلور جوبلی نمبر شایع کرنے تک رکنے کی درخواست کرتا۔ مگر وہ تو شاید سارے کام ادھورے چھوڑ جانے کی عجلت میں گھر گئے تھے۔

۞۞۞

جدید طرز فکر کا حامی

سائرہ غلام نبی

احسن سلیم سے پہلی ملاقات تو یاد نہیں کہ ان سے باضابطہ تعارف کب ہوا تھا۔ یا ہوا تھا بھی یا نہیں۔ کیوں کہ میں انھیں کسی نہ کسی ادبی تقریب میں دیکھتی چلی آرہی تھی۔ کبھی آرٹس کونسل، کبھی پریس کلب میں، یہاں وہ اکثر نظر آیا کرتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بریف کیس/ بیگ ہوا کرتا تھا۔ اور چہرے پر خیر مقدمی مسکراہٹ۔ وہ غیر محسوس طریقے سے ادبی حلقوں میں اپنے ہونے کا احساس دلایا کرتے تھے۔ اس سے پہلے میں ان کو ایک عمدہ نظم گو کی حیثیت سے جانتی تھی۔ ان کی نظمیں رسائل و جرائد میں شایع ہوتی تھیں۔ وہ اپنی ان نظموں میں جدید طرز فکر کے حامی نظر آتے تھے۔ ازلی اور ابدی تنہائی ان کی شاعری کا بنیادی موضوع تھا۔ اداسی کی لہر بھی ان کے مصروں میں جھلکتی تھی۔ اور ایسی فضا بناتی تھی کہ شاعر کا احساس کرب علامتوں میں ڈھل کر ان نظموں کا عنوان بن جاتا۔ وہ اپنی ایسی کئی نظموں سے شناخت کرواتے تھے۔

اجراء جب تواتر سے شایع ہونے لگا، تو ان کا ادب سے انسلاک نمایاں ہوکر سامنے آیا۔ وہ ہمہ وقت ادب کی آب یاری کے لیے زمین ہموار کرنے میں مصروف کار رہنے لگے۔ اور بہت جلد انھیں بہترین لکھنے والوں کا تعاون حاصل ہوگیا۔

بلاشبہ ادبی پرچے کا مدیر ہونا کوئی آسان ہدف نہیں کہ اسے ہنستے کھیلتے پالیا جائے۔ مواد اکٹھا کرنا اور بہترین مواد کے حصول کے لیے سرگرم رہنا۔ مواد کی وصولی کے بعد اس کو اس کے مقام کا تعین کرنا، کمپوزنگ، لے آؤٹ، ٹائٹل کے مراحل سے گزر کر چھاپے خانے تک لے جانا۔ اور پھر اس کی گھر گھر ترسیل کرنا۔ اس کے مابعد اثرات سہنا، ان جاں گسل مراحل سے گزرتے ہوئے احسن سلیم نے تقریباً پانچ سال گزارے۔ اور اجراء کی تواتر اشاعت کو یقینی بنایا۔ وہ بہترین منتظم کار بھی تھے۔ کہ اس خصوصیت کی بنا یہ کام ہرگز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ اجراء کے ذریعے نئ فکر کو بطور تحریک پیدا کرنے کے خواہش مند تھے۔ وہ خواہاں تھے کہ سماج میں تبدیلی ادب کے ذریعے لائی جائے۔

اس کے لیے وہ مسلسل ادباء وشعراء کو آمادہ کرتے کہ اس طرز فکر پر اظہار خیال کریں اور اپنی سوچ کا حصہ اس میں ڈالیں۔ اور بیشتر شماروں میں اہم لکھنے والوں کے مضامین اس موضوع پر محفوظ ہیں۔ اس سلسلے میں وہ عالمی کانفرنس بھی کرنا چاہ رہے تھے۔ کہ ان کی زندگی کا چراغ ٹمٹمانے لگا۔

اور ادھر کچھ مہینوں سے ان کی بیماری کی خبریں آ رہی تھیں، لیکن یہ بیماری جان لیوا ہوگی، اندازہ نہیں تھا۔ اور پھر وہ اپنے ارادوں، عزائم، ولولے اپنے سینے میں لیے اس جہان فانی سے رخصت ہوگئے۔ (خدا انھیں غریق رحمت کرے)۔ اب ان کے قریبی احباب نے اجراء کا بیڑا اٹھایا اور امید واثق ہے کہ یہ چراغ جلتا رہے گا۔

❁❁❁

جو خاک سے نکلا تھا محبت کے سفر پر

اقبال خورشید

اس تپتی دوپہر مجھ پر کھلنے، سایہ دار درخت کی اہمیت آشکار ہوئی۔

وہ ایک گرم دن تھا۔ دھوپ ایسی کہ بدن جھلس جائے، دماغ پگھل جائے۔ حبس تھا۔ اور پھر کرب۔ ایک دوست چلا گیا۔ دانش کی صراحی خالی ہوئی۔ ادب کے برتن میں تلچھٹ رہ گئی۔۔۔ یہ اس گرم دن کا تذکرہ ہے، جب ہمیں ایک صاحب اسلوب تخلیق کار کو دفن کرکے اپنی اپنی جمود زدہ زندگیوں کی سمت لوٹنا تھا کہ وہ اپنی تحریک، اپنی توانائیاں اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہی قدرت کا فیصلہ تھا!

میں خاک سے نکلا ہوں محبت کے سفر پر
سو اپنے بدن میں کہیں موجود نہیں ہوں

25 جون کو نہ صرف کراچی کی ادبی فضا سوگوار تھی، بلکہ اردو ادب کو بھی بھاری نقصان اٹھانا پڑا، جب معروف شاعر، دانشور اور سہ ماہی اجرا کے مدیر، احسن سلیم نے اُس کشتی میں سوار ہونے کا فیصلہ کرلیا، جو سمندر میں اترنے کے بعد کبھی لوٹ کر نہیں آتی۔ گذشتہ تین ماہ سے بیماری نے گھیر رکھا تھا۔ امراض نے اِس متحرک شخص کو، جو اردو ادب کی گراوٹ کے باوجود مایوس نہیں تھا۔۔۔ ادبی سرگرمیوں سے کاٹ دیا تھا۔

ہماری ملاقاتوں کے سلسلے میں تعطل نہیں آیا۔ میں اور رفیع اللہ میاں کبھی اسپتال پہنچ جاتے، کبھی گھر چلے جاتے۔۔۔ کرائے کا گھر، جسے خالی کرنے کا نوٹس مل چکا تھا۔۔۔ آخری بار ملا، اور یہ انتقال سے چار روز پہلے کی بات ہے، تو حالت بہت خراب تھی۔ لیٹے لیٹے بے چینی ستائے، تو اٹھ بیٹھنا۔ کچھ دیر بعد جسم دُکھنے لگے، تو پھر لیٹ جانا۔ مسلسل قے۔ اس روز تو تھوڑی بہت باتیں کیں، مگر آنکھیں موندنے سے 48 گھنٹے قبل خاموشی اختیار کر لی تھی۔ شاید سبب یہ ہو کہ وہ جو کچھ کہنا

چاہتا تھا، کہہ چکا تھا۔ ڈاکٹروں کے اندیشوں کی مجھے خبر تھی، دل میں خدشات تھے، اس کے باوجود جب انتقال کی خبر مجھ تک پہنچی، تو اس پر یقین کرنا آسان نہیں تھا۔

احسن سلیم کا تذکرہ اس مختصر سی تحریر میں سمونا ممکن نہیں۔ شمار نظم کے اہم شعرا میں ہوتا تھا۔ اسلوب جداگانہ۔ اُن کی نثری نظمیں پڑھیے، اس صنف کا جواز مل جائے گا۔ بلند خیال، نئی لفظیات، پرقوت آہنگ۔ دو مجموعے آئے، ست رنگی آنکھیں اور منجمد پیاس۔ ایک مجموعہ خطوط کا؛ پتوں میں پوشیدہ آگ۔ کچھ اپنی عدم توجہی، اور کچھ اپنوں کی غفلت۔۔۔ وہ کتابیں کبھی صحیح معنوں میں قارئین تک نہیں پہنچ سکیں۔ کتابیں، جنھیں پڑھ کو قمر جمیل نے کہا تھا: احسن سلیم، ایک لیجنڈ ہے!

اپنے ادبی سفر میں احسن سلیم نے فقط صاحب علم شخصیات کی صحبت کو کافی نہ جانا، جو نو وارد تھے، ان کی راہ نمائی کا بھی اہتمام کیا۔ تعلق قائم کرنا اور اسے نبھانا، دونوں ہنر جانتے تھے۔ حیدرآباد اور کراچی کی ادبی فضا پر احسن سلیم نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ کتنے ہی نوجوانوں کی تربیت کی۔ حیدرآباد میں فردوس ہوٹل کو بیٹھک بنایا، کراچی میں کیفے الحسن کو۔ جہاں بیٹھے، اپنا نظام شمسی بنا لیا۔۔۔ ادبی جراید کی ادارت میں کئی کارنامے انجام دیے۔ پہلے سخن زار۔ پھر اجرا۔ ذرا جراید کی حالت پر غور کیجیے صاحب۔ پانچ سو کی تعداد میں شایع ہوتے ہیں، خریدار کم یاب، بیش تر تقسیم ہوتے ہیں، جنھیں پیش کیے جاتے ہیں، وہ بھی فقط اپنی اور اپنے جاننے والوں کی تخلیقات پڑھتے ہیں۔۔۔ اِن حوصلہ شکن عوامل کے باوجود اتنے مختصر عرصے میں جو مقام اجرا نے بنا لیا تھا، اس کی مثال ملنا مشکل۔ جی، اس کی ایک وجہ ”ادب برائے تبدیلی“ کی تحریک بھی ہوسکتی ہے۔

اِس خیال کو احسن سلیم نے تواتر سے اجرا کے اداریوں کا موضوع بنایا، مباحث کا اہتمام کیا، منشور تیار کروایا۔ جو ہماری ادبی صورتحال، اس میں کسی بھی نئی تحریک کے لیے بڑا حوصلہ چاہیے۔ یاروں نے دیوانے کا خواب قرار دیا، مگر اِس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ادیب کی عالمی حیثیت کے قائل اس شخص نے ”ادب برائے تبدیلی“ کو مباحثوں کا موضوع بنا دیا تھا۔

کبھی کبھی احسن سلیم کے ارادے مجھے متذبذب کر دیتے، منصوبے ذرا غیر حقیقی لگتے، مگر یہ سوچ کر مطمئن ہوجاتا کہ جس شخص نے ادب کو زندگی کا محور بنا رکھا ہو، نہ تو زر کی طلب، نہ ہی زمین کی، جس کی کتاب زندگی کے ہر ورق پر تخلیقی آرزو، اس کے مستقبل کے خواب بھی ادبی خواہشوں ہی سے سجے ہوں گے۔ اور بھلا کیا امکان ہے دوست! اس تحریک کی صورت گری کے لیے کراچی اور حیدرآباد میں سیمینارز منعقد کروائے گئے۔ ادبی تنظیم ”اجرا تخلیقی مکالمہ“ کی بنیاد رکھی، جس کا مجھے بھی حصہ بننے کا موقع ملا۔ ابتدائی اجلاسوں ہی سے ثابت ہوگیا کہ احسن سلیم کا کراچی کے ادبی منظر میں کیا مقام۔ تقدیر نے ساتھ نہیں دیا، اور کچھ موقع پرست بھی وجہ بنے، جن کی جانب محترمہ رئیس فاطمہ نے اپنے کالم میں اشارہ کیا، ورنہ قومی کانفرنس سمیت اِس بیدار ذہن میں کتنے ہی منصوبے تھے۔

اس بلند قامت شاعر کی شخصیت میں بلا کا اعتماد تھا، یقین کی قوت گفت گو سے جھلکتی، کسی سے

مرعوب نہ ہوتا۔ یہ صلاحیت بیش قیمت۔ بس اِس کی ایک خامی، یا تو یہ صلاحیت پیروکار عطا کرتی ہے، یا مخالفین۔ دوست کم ہی بنتے ہیں۔ ان کے ہاں وہ فکری گہری ملتی، جو اب ادیبوں میں عنقا ہوئی۔ اُن کا ایک فصیح و بلیغ جملہ: ادب موضوعات سے نہیں، اسلوب سے بنتا ہے۔۔۔ بہت سوں کی تنقیدی کتب پر بھاری۔ جب وہ کہتے تھے: تشدد انسان کی جبلت ہے، فقط ادب ہی اس جبلت پر قابو پاسکتا ہے۔۔۔ تو آواز میں ٹھہراؤ ہوتا۔ ملکی انتشار کا سبب وہ سیاست دانوں کو ٹھہراتے۔

اس کے سدباب کے لیے سیاسی، لسانی اور مذہبی تفریق پاٹ کر ادیبوں کے اکٹھ کی ضرورت پر زور دیتے۔۔۔ اور پھر سادہ پیرایے میں نوجوانوں کو یہ سمجھانا کہ مختلف سماجوں کی ثقافت، عقائد، جغرافیہ، زبان ضرور الگ، مگر دنیا میں بسنے والے تمام انسانوں کے احساسات یکساں۔ ان مشترکہ احساسات تک رسائی پانے والا ادیب اجنبی سماج میں بھی اپنے لیے قبولیت پیدا کر لیتا ہے، اور اگر وہ اپنے الفاظ میں انسانیت کا فلسفہ گوندھ دے، تو اس کا ادب عالمی حیثیت اختیار کر جائے گا، جیسے ٹالسٹائی اور ڈکنز، جیسے کافکا، جیسے مارکیز۔ صاحب، احسن کی شخصیت کا ایک روحانی پہلو بھی تھا، مگر میں اس کا گواہ نہیں۔ سو خاموشی بہتر۔

تو وہ ایک گرم دن تھا۔ تپش، گھٹن، اور پھر کرب۔۔۔ احسن سلیم نے آنکھیں موند لی تھیں۔ قبرستان میں خاموشی تھی۔ اُس تپتی دوپہر مجھ پر گھنے سایہ دار درخت کی اہمیت آشکار ہوئی۔۔۔ عزیزو، ممکن ہے، کل شہرت کی دیوی مجھ پر مہربان ہوجائے، کچھ حکومتی تمغے میرے نام ہوجائیں، میرے بھی ”فین پیج“ ہوں، تقریبات میں بہ طور صدر مدعو کیا جاؤں، ادبی میلوں میں میرے سیشن ہوں، کچھ وزیروں سفیروں سے روابط ہوجائیں، شاید تب میری گردن کچھ اکڑ جائے، مجھ میں رعونت آجائے، شاید میں اپنے محسنوں کو بھول جاؤں۔۔۔ سو بہتر ہے کہ میں آج، اِسی لمحے اعتراف کرلوں۔۔۔ احسن سلیم، میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرے ادبی سفر میں تم نے اہم کردار ادا کیا۔ مجھ سمیت کئی نوجوان یہ اعتراف کرتے ہیں، اور ہم سب تمھارے لیے دعا گو ہیں، اللہ تعالی تمھارے درجات بلند فرمائے۔ آمین!

(یہ کالم 5 جولائی 2016 کو روزنامہ ایکسپریس میں شایع ہوا)

❁❁❁

آہ، احسن سلیم بھائی

طارق رئیس فروغ

احسن سلیم بھائی خوبصورت شاعر، مستند ادیب، بہترین مدیر اور ان سب سے بڑھ کر انتہائی نفیس انسان...افسوس کہ وہ ہم سے بچھڑ گئے۔

چونکہ کچھ عرصے سے میری رہائش ان کے محلے میں ہی ہوگئی تھی، محلے کے ایک ہوٹل میں روزانہ ہماری بیٹھک ہوتی، جو ایک لمبی نشست پر محیط ہوتی، جس میں نور الہدیٰ سید، احسن سلیم، حنیف عابد اور میں شریک ہوتے۔ ہم نے اس بیٹھک کا نام ''سڑک کنارے'' رکھا تھا۔ اس میں اکثر و بیشتر دیگر احباب بھی شریک ہوجاتے تھے۔

ادب احسن سلیم کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ جب بھی ملاقات ہو، تو گفتگو ادب سے ادب تک ہی رہتی۔ اردو ادب کی بات ہو، مغربی ادب کی بات ہو، اسلامی یا دیگر مذہبی تاریخ کی بات ہو، احسن سلیم انتہائی آسان الفاظ میں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دل میں اتر جانے والے الفاظ میں اس بارے میں اپنے خیالات بیان کرتے کہ سننے والے کو بات کی پوری تفصیل سمجھ میں آجاتی۔ علم کی دولت سے مالامال احسن سلیم میں بناوٹ نام کو نہیں تھی۔ بلکہ ایسا لگتا تھا کہ ان میں نئی سے نئی ادبی معلومات حاصل کرنے کی جستجو دن بدن بڑھتی چلی جارہی تھی۔ کوئی نئی بات، کوئی نیا علم یا کوئی نئی سائنسی دریافت، تو اُس کے بارے میں تفصیل سے معلومات حاصل کرتے اور پھر کسی نئی معلومات کی جستجو میں لگ جاتے۔

سہ ماہی اجرا کے 23 شمارے منظر عام پر آچکے ہیں، اور ہر ایک کی ضخامت 576 صفحات سے کم نہیں۔ اتنا ضخیم اور پسند کیا جانے والا ادبی رسالہ نکالنا کوئی آسان بات نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس رسالے کی تمام کی تمام تر ذمے داری احسن سلیم نے اپنے کاندھوں ہی پر اٹھائی ہوئی تھی۔ چاہے اس کی طباعت ہو یا سرکولیشن ہو۔ کبھی کسی سے کسی بھی قسم کی اعانت کے طلب گار نہیں ہوئے۔ اشتہار مل گئے تو لگادیے، نہ ملے تو بھی رسالہ اپنے وقت پر نکال دیتے۔ اللہ توکل۔

طباعت کے بعد اس کی ترسیل میں لگ جاتے، گوکہ پاکستان کے علاوہ دیگر ممالک جن میں ہندوستان، سعودی عرب، امریکہ و دیگر مغربی ممالک شامل ہیں، سب جگہ رسالہ بھیجتے۔ یکا وتنہا۔ نہ ہی دولت کی تمنا تھی، اور نہ ہی شہرت کی ہوس۔ بس ایسا لگتا کہ ادب کی خدمت ہی ان کی زندگی تھی۔ اس کے علاوہ اجرا کے پلیٹ فارم سے ادب برائے تبدیلی کی تحریک بھی شروع کررکھی تھی، جس کا اثر اب ادبی تخلیقات میں نمایاں ہوچلا ہے۔

سمارو (میر پور خاص) سے حیدرآباد اور پھر کراچی آکر سکونت اختیار کی۔ غزل، نظم اور نثری نظم کہی۔ نثری نظم کی تحریک جو قمر جمیل، رئیس فروغ، ضمیر علی بدایونی و دیگر سینئر احباب نے شروع کی تھی، اس کے ہراول دستے میں احسن سلیم شامل تھے۔ احسن سلیم نے بھی بے شمار نثری نظمیں کہیں، جن میں سے کچھ تو بے مثال ہیں جیسے وراثت، آسمانی جنون وغیرہ۔

اجرا تخلیقی مکالمہ کے نام سے ایک ادبی تنظیم کی بنیاد بھی احسن سلیم نے رکھی۔ جس کے سیکریٹری احسن سلیم ہی تھے۔ اجرا تخلیقی مکالمہ کے تحت ہر پندرہ دن کے بعد ایک اجلاس ہوتا تھا، جس میں ادب سے وابستہ شہر کے چیدہ چیدہ افراد شرکت کرتے تھے۔ اس اجلاس میں مضامین، افسانے اور شاعری پڑھی جاتی تھی اور پھر اس پر تنقیدی مکالمہ بھی ہوتا تھا۔ کراچی کے ادبی حلقوں میں یہ اجلاس انتہائی پسند کیے جاتے رہے ہیں۔ امید ہے کہ اجرا تخلیقی مکالمہ سے منسلک دیگر احباب اس سلسلے کو جاری رکھیں گے۔

اللہ تعالی احسن سلیم مرحوم (جنھیں مرحوم لکھتے ہوئے ہاتھ لرز رہے ہیں) کی مغفرت فرمائے اور ان کے اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

عجیب مانوس اجنبی

مرزا ناصر علی

احسن سلیم کا تعلق جمیس آباد، ضلع سانگھڑ سندھ سے تھا۔ وہ قائم خانی راجپوت تھے۔ اس بات کا پتا مجھے ان کی وفات کے دن نماز جنازہ و تدفین کے مراحل میں چلا۔ اس بات کی کیا اہمیت ہے؟ ہر انسان کسی نہ کسی جغرافیے یا قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر کوئی انسان طویل عرصے تک کسی سے آشنا ہو، میل جول رکھتا ہو اور کبھی اس کے ذاتی کوائف سے واقف نہ ہو، پھر بھی وہ اس کا گرویدہ ہو۔ یہ کبھی ممکن نہیں ہے، جب وہ شخص انتہائی درجے کا ایمان دار ہو اور پیشہ ورانہ اعتبار سے مخلص ہو، جب ہی تو اس کی خوبیوں کا احاطہ کرنے میں اس بات کی فرصت تک نہ ہو کہ وہ کس قبیلے اور جغرافیے سے تعلق رکھتا ہے۔

احسن سلیم صاحب کو مرحوم لکھتے ہوئے میرا قلم رک رک سا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ابھی آتے ہوں گے، اپنی مسکراتی ہوئی شخصیت کے ساتھ اور وہ امید اور یقین سے بھرپور کسی نئے پروجیکٹ پر کام کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔

احسن سلیم صاحب ایک شاعر، ادیب، دانش ور تھے ان ہی حوالوں سے جناب سید ایاز محمود صاحب سے ان کا تعلق تھا۔ سید ایاز محمود صاحب کے ماتحت ہونے کی وجہ سے مجھے بھی ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا، ورنہ مجھ جیسے بے ادب شخص سے ان کے میل جول کی وجہ نہ تھی۔

میرا جناب احسن سلیم سے تعارف چار سال قبل جناب سید ایاز محمود کے توسط سے ہوا۔ پتا چلا کہ وہ ادبی جریدے ''اجراء'' کے مدیر ہیں۔ میں اور چند دوست ''اجراء'' کے سالانہ خریدار بن گئے۔ شمارہ ہاتھ آیا، تو احساس ہوا، ان کا اداریہ، شمارے کا مواد ان کی مدیرانہ صلاحیتوں کا مظہر تھا۔

میرے لیے سب سے حیرانی کی بات یہ تھی کہ نہ تو ان کے پاس کوئی سواری تھی، نہ ہی اسٹاف، نہ ہی کوئی باقاعدہ دفتر، نہ ہی ''اجراء'' کے لیے اشتہار یا مستقل ذریعہ آمدن، مگر ہر مرتبہ شمارہ

''اجراء'' شان دار چھپتا۔ ملک بھر سے اور دنیا بھر سے لکھنے والے اس کا حصہ بنتے اور گزشتہ برسوں میں مَیں نے ''اجراء'' کو ملک کے مستند اور تسلسل کے ساتھ چھپنے والے شمارے کے طور پر دیکھا، وہ بھی بغیر وسائل کے۔ ایسا ممکن ہوا جناب احسن سلیم صاحب کی وجہ سے۔

ان کی علمی و ادبی سطح کا میں احاطہ کرسکوں یہ میرے لیے محال ہے، البتہ ان سے ذاتی ملاقاتوں میں ان کی شخصیت سے آگاہی ہوئی۔ مجھے اجراء کا شمارہ ہمیشہ وہ خود پہنچاتے۔ بسوں میں اور پیدل سفر کرتے ہر مرتبہ نئے ''اجراء'' کے مسودے کی کاپیاں لیے کمپوزنگ، پروف ریڈنگ کے سخت مرحلے خود ہی طے کرتے۔ بطور مدیر لکھنے والوں سے خود ہی رابطہ کرتے، ان کی تحریریں شمارے کا حصہ بناتے۔ پھر کاغذ خریدتے، سرورق بناتے، کتاب سے چھپائی مکمل کراتے اور پھر ایک ایک کاپی ذاتی طور پر یا ڈاک کے ذریعے ارسال کرتے۔ یہ مرحلے طے کرنے کے بعد کبھی کبھار وہ میرے پاس بھی آجاتے، تو مجھے ان کو دیکھ کر ایسے دہقان کی یاد آتی جو سخت گرمیوں میں چاول کی پنیری گرم پانی میں کھڑے ہوکر لگاتا۔ یا ایسے کوہن کی، جو سخت چٹانوں میں تیشے سے راستے بناتا، اور پھر اس محنت کے ثمر ملنے پر خوش ہوتا۔ بظاہر کمزور و نحیف نظر آنے والے احسن سلیم انتہائی محنتی، جفاکش، خوددار، غیرت منداور عاجزی سے بھرپور انسان تھے، جو ہمیشہ محنت کرنے اور جستجو کرنے پر یقین رکھتے تھے۔ دنیاداری کے عیوب سے پاک مخلص انسان آج ہم میں نہیں۔ جب میں انھیں کام کرتے دیکھتا تھا تو اقبال کا شعر پڑھتا تھا:

شرعِ محبت میں ہے عشرتِ منزل حرام
شورشِ طوفان حلال، لذت ساحلِ حرام

اللہ پاک ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین!)

حرف اگر سچائی دے

صائمہ احسن سلیم

بسنے کی تمنا دل ناشاد نہ کرنا
میں خاک سفر ہوں، مجھے برباد نہ کرنا

طاؤس طلب ہے میری آواز کا شعلہ
تحریر میں شامل کبھی فریاد نہ کرنا

احسن سلیم کا تذکرہ ایک شام یا کسی ملاقات کا نہیں، بلکہ میری زندگی کے ان شب و روز کا ہے، جو ایک شجر سایہ دار تلے گزرے۔ وہ تناور اور زرخیز شجر جس کا سایہ باپ کہلاتا ہے، جس کی مضبوط جڑیں اس بات کی ضامن ہوتی ہیں کہ اس درخت کے سائے کا کوئی وقت یا حد مقرر نہیں۔

کہاں سے سمیٹوں؟ بے شمار لفظوں کی لغت اس عظیم اور مقدس رشتے کے بے شمار احسانات سمیٹنے کے لیے ناکافی ہے، اس شجر تلے نہ صرف خاندان احسن پروان چڑھا، بلکہ دنیائے ادب بھی اس کے پھل کھا کر سیراب ہوئی یا یوں کہیے دنیائے ادب زیادہ مستفید ہوئی۔

احسن سلیم انتہائی سادہ لوح انسان، جن کے لیے مادی اشیا کی معنویت ضروریات زندگی پورا کرنے سے بھی کم تھی۔ انھوں نے اپنے مضبوط کاندھوں پر کبھی خواہشات کا لاشہ اٹھایا ہی نہیں۔ نہ تو مادی دنیا کا حصول ان کا مقصد حیات تھا، نہ ہی کبھی وہ مادی مراعات سے مرعوب دکھائی دیے، لیکن قدرت نے انھیں علم و عقل، شعور، اخلاق، اولاد اور بہترین دوست رزق حلال کے طور پر عطا کیے، اس کا ثبوت احباب کا ایک وسیع حلقہ ان کے اطراف دکھائی دیتا تھا۔ محبت، خلوص، ایثار، قربانی اور جرأت جیسی بے شمار خوبیاں ان کی روح میں سرایت رکھتی تھیں، ان کے خیال میں مادی وسائل کا ذخیرہ مقصد حیات نہیں تھا، لکھنے کی جس خوبی اور فن سے اللہ نے انھیں نوازا اس کو انھوں

نے مقصد حیات متعین کیا اور جب یہ فہم و ادراک ان پر واضح ہوا، تو انھوں نے زندگی کا محور ادب کو بنالیا۔ میں نے انھیں نہ صرف بحیثیت انسان، بلکہ ادیب بھی ایک جری انسان پایا، وہ کہیں اپنے نفس کے ہاتھوں بے بس نظر نہیں آئے۔ بھوک پیاس اور نیند جیسی بنیادی عنصر بھی ان کے سامنے بے بس دکھائی دیتے تھے، ان کی جمالیاتی تحریروں نے ادب میں اُنھیں ایک ممتاز حیثیت دلوائی۔

اجرا کے مدیر کی حیثیت سے جن کاوشوں اور کوششوں میں وہ سرگرم تھے، وہ یقیناً اپنے کام سے دیانت داری کا ثبوت ہے، سلسلہ وار سہ ماہی اجرا کے لیے تحریریں اکٹھا کرنے سے لے کر رسالے کی ترسیل کا کام اکیلے بخوبی سرانجام دیتے رہے اور بڑی کامیابی سے اجرا کے 23 شمارے جاری کیے۔ اس کام میں وہ اتنے منہمک تھے کہ اپنے آرام اور کھانے پینے کو بھول گئے اور ٹی بی کی آخری اسٹیج MSR سے متعارف ہوگئے۔

تبدیلی کا عزم لیے انھوں نے اجرا ہی کے توسط سے ہفتہ وار اجرا تخلیقی مکالمہ کا آغاز کیا۔ جہاں نامور شعرا اور ادیبوں کی تحریروں کی رسائی عام قاری تک آسان ہوئی، انھوں نے نئے لکھنے والوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی، بلکہ ان کی اصلاح بھی کی۔

ان کے رجحانات اور فکر انگیزی، جو معاشرتی اصلاح کا ضمن ''ادارہ ادب'' کو جانتے تھے، اسی سلسلے میں ایک تحریک ''ادب برائے تبدیلی'' کی صورت میں ادیبوں میں متعارف کروائی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ادب وہ ادارہ ہے، جو لوگوں میں اپنی تحریروں کے ذریعے سے احساس کے وہ دیے روشن کرسکتا ہے جو عام انسان کو آگاہی کے نزدیک لے جاسکتے ہیں۔

بقول احسن سلیم:

حرف اگر سچائی دے
چاروں اور دکھائی دے

کسی شجر میں دیا جلے
کوئی شعر سجھائی دے

وہ سمجھتے تھے کہ ادیب کا قلم وہ ہتھیار ہے، جسے بروئے کار لاکر کار خیر کا فریضہ سرانجام دیا جاسکتا ہے، ایسے میں خود پسندی کی قید سے رہائی پانا سب سے ضروری عمل ہے، اپنی ذات کی نفی اپنے آپ میں مشکل ترین عمل ہے۔ اس کے لیے دو صورتیں ہیں، انسان یا تو خالق حقیقی سے خوف رکھے یا خلق خدا سے محبت، تیسری کوئی صورت بہتری کی جہت کو نہیں جاتی۔

مولانا رومیؒ ارشاد فرماتے ہیں: ''دین نہ تسبیح کے دانوں میں ہے اور نہ مصلے میں، بلکہ دین تو خلق خدا کی خدمت میں پوشیدہ ہے۔ ایسے میں اگر ادیب خودی کی قید سے رہائی پاتا ہے، تو وہ آزادی کے معنی جان لیتا ہے اسی لیے ''ادب آزاد ہے'' اور یہی ''احسان کا خواب بھی!''

ایک یونانی کہاوت ہے: ’’وہ قومیں ہمیشہ دنیا میں ترقی کرتی ہیں، جن کے معمر افراد یہ سوچے بغیر درخت لگائیں کہ اس درخت کا سایہ انھیں نصیب ہوگا یا نہیں۔‘‘ احسن سلیم، ایک ایسا ہی ادب برائے تبدیلی کا پودا کئی نوجوان ادیب، شاعروں اور دوستوں کے دلوں میں لگا گئے ہیں۔ امید کرتی ہوں کہ یہ پودا تناور درخت بن کر سایہ اور ثمر ضرور دے گا، اور معاشرہ اس سے مستفید ہو سکے گا۔ انشا اللہ!

ہو جشن برابر مرے مخدوم کا احسن
جو دشت سجانے رہ تعمیر میں آیا

بہت سی نیک تمنائیں اجرا کے مدیر اعلیٰ ناصر شمسی، مدیر اقبال خورشید اور معاون مدیر رفیع اللہ میاں کے لیے، جن کے کاندھوں پر اس پودے کو پروان چڑھانے کی ذمے داری ہے۔ انشا اللہ اجرا ترقی کی راہ پر گامزن رہے گا اور قارئین کی توجہ کا مرکز رہے گا۔

❁ ❁ ❁

سر احسن سلیم صاحب کا شمار ان درد دل رکھنے والی قابل احترام ہستیوں میں ہوتا تھا، جو اپنی بے لوث خدمات کے باعث تا دیر یاد رکھی جائیں گی۔ انھوں نے اردو ادب کے لیے ایک معمار کا کام انجام دیا۔ وہ نہ صرف ایک بلند پایہ شاعر، ادیب، نقاد اور نثر نگار تھے، بلکہ ایک قد آور انسان بھی تھے، ان کی ادبی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی شاعری میں عشق رسول کا جذبہ بھی موجزن نظر آتا ہے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ آمین

ان کا ایک شعر، جو مجھے بہت پسند ہے:

اس دور کم حیات میں امکان چاہیے
آقاؐ ہمارے عہد کو انسان چاہیے

یاسمین حامد

حلقہ اربابِ ذوق، کراچی کی رپورٹ

بیاد احسن سلیم

حلقہ اربابِ ذوق، کراچی کا ہفتہ وار تنقیدی اجلاس مورخہ 05 جولائی 2016 کو وفاقی وزارتِ اطلاعات پاکستان سیکریٹریٹ کے ڈائریکٹریٹ آف الیکٹرانک میڈیا اینڈ پبلی کیشن کے کانفرنس ہال میں صابر ظفر صاحب کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ اس نشست میں مشہور شاعر، ادیب اور سہ ماہی اجرا کے مدیر احسن سلیم (مرحوم) کو یاد کیا گیا اور انھیں خراج تحسین پیش کیا گیا۔

نشست کا آغاز طارق رئیس فروغ نے روزنامہ اوصاف میں 27 جون 2016 کو اپنا چھپا مضمون "آہ احسن سلیم" سنا کر کیا، جس میں احسن سلیم سے اپنی طویل بیٹھکوں پر محیط ملاقاتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ احسن سلیم بھائی سے جس موضوع پر بات کرتے، ایسا محسوس ہوتا علم کا سمندر موجزن ہے، چاہے اردو ادب ہو، مغربی ادب، فلسفہ ہو، نفسیات یا روحانیت... ہر موضوع پر ان کو مکمل عبور تھا۔ استدلال کے ساتھ نہایت نرم لہجے میں گفتگو کرتے تھے۔ سہ ماہی اجرا کے ساتھ ساتھ اجرا تخلیقی مکالمہ میں ان کی جان تھی، ان کی تدفین بھی اتوار کے دن اور تقریباً اسی وقت ہوئی، جس وقت اجرا تخلیقی مکالمہ کی نشست ہوا کرتی تھی۔ ایسا لگا کہ شاید آج بھی اجرا تخلیقی مکالمہ ہو رہا ہے، مگر مقام اور موضوع تبدیل ہو گئے ہیں۔

اقبال خورشید نے روزنامہ ایکسپریس میں اپنے کالم کے سلسلے میں "نمک کا آدمی" میں "احسن سلیم، جو خاک سے نکلا تھا محبت کے سفر پہ" کے عنوان سے چھپا مضمون پڑھا۔ انھوں نے کہا ؛25 جون کو نہ صرف کراچی کی ادبی فضا سوگوار تھی، بلکہ اردو ادب کو بھی بھاری نقصان اُٹھانا پڑا ، جب معروف شاعر، دانشور او سہ ماہی اجرا کے مدیر امن سلیم نے اس کشتی میں سوار ہونے کا فیصلہ کر لیا، جو سمندر میں اترنے کے بعد کبھی لوٹ کر نہیں آتی۔ ان کا شمار نظم کے اہم شعرا میں ہوتا تھا۔ اصلوب جداگانہ تھا۔ ان کی نثری نظمیں پڑھتے ، اس صنف کا جواز مل جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ بہت سے دیگر نوجوانوں کی طرح میرے ادب کے سفر میں بھی احسن سلیم نے اہم کردار ادا کیا۔ جناب رئس احمد فاروقی صاحب نے اپنا مضمون پڑھ کر سنایا۔ انھوں

نے کہا، احسن سلیم ایک اچھے شاعر، محقق، ادیب اور صوفی تھے، میری نظر میں وہ ایک شریف النفس انسان تھے جس نے مال و دولت کی کبھی تمنا نا کی کبھی فرق نہ کیا، اُردو ادب کے کچھ گمشدہ پتھروں کو تلاشا انھیں تراشا۔

اس اجلاس میں نور الہدیٰ سید، اشتیاق طالب، فہیم الاسلام انصاری، سید کاشف رضا، رفاقت حیات، صائمہ احسن سلیم اور دیگر نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اُن کے فن و شخصیت اور ان سے جڑی یادوں کا تذکرہ کیا۔ آخری میں تقریب کے صدر صابر ظفر نے مرحوم کی شاعری پر طویل گفتگو کرتے ہوئے ان کی نظم اور غزل کی مختلف خوبیوں کا تذکرہ کیا۔ ساتھ ہی ان کی شخصیت سے جڑے واقعات بیان کیے۔ اور امید ظاہر کی سہ ماہی اجرا کا سلسلہ جاری رہے گا۔

❁❁❁

احسن سلیم کی رحلت پر ایک نظم

صفدر صدیق رضی

مجھے کہہ رہا ہے کوئی
زندگی کس قدر مختصر ہے
سو میں سوچتا ہوں کہ وہ کس قدر بے خبر ہے،

ابھی ایک شخص
اس مسافت پہ
ہم زندہ احباب کو چھوڑ کر
اپنے گھر سے روانہ ہوا ہے
کوئی جانتا ہے
اسے کتنی صدیوں کا لمبا سفر اور درپیش ہے
کتنی آنکھوں کے خیموں میں
کتنے برس تک مسلسل ٹھہرنا ہے، کتنے دلوں کے پڑاؤ میں
پیہم کئی سال تک اس کو رہنا ہے
کتنے برس
کتنے اشکوں کے دریاؤں میں بہتے جانا ہے
اور کتنی پلکوں کے سائے میں
کتنے مہ و سال رکنا ہے
کیا یہ سفر مختصر ہے
محلِ نظر ہے

☆☆☆

احسن سلیم کے لیے

سید ایاز محمود

موجود میں خبر ہے، میسر میں جال ہے
اس زندگی کے واسطے جینا محال ہے

ہم ہیں خیال خام کی مٹّی بساط پر
چاہت کا حوصلہ ہے نہ خوف زوال ہے

اک آرزو کو رکھا ہوا ہے گماں کے بیچ
اور آرزو بھی کیا ہے، سمٹتا سوال ہے

تخلیق کر رہا ہوں میں آواز کا ہنر
دم گھونٹتی فضا میں بھی شوق کمال ہے

منزل کو تج دیا ہے تو رستے کو کیا کریں
لیکن جو اس گلی میں تمھارا خیال ہے

خوشبو ہے، واہمہ ہے یا مہتاب کی کرن
یا اس گلی میں آج وہی مہ جمال ہے

''آسائش جمال سے مہکا ہوا ہے درد''
یہ درد دوا ہے، یہی لازوال ہے

☆☆☆

جب آگ کا دریا لب اظہار میں آیا
میں مہر بہ لب کوچۂ دلدار میں آیا

تفویض ہوا نخل فلک سے مجھے جس پل
اک حرف سخن سایہ دیوار میں آیا

حیرانی و اندیشہ فرقت سے گزر کر
وہ منظر ناپید بھی اظہار میں آیا

قاموس کی حد سے ہے فزوں تر میرا لہجہ
میں یوں ہی نہیں شاخ ثمر بار میں آیا

''ادراک طلب ہیں مرے الفاظ کے معنی''
یہ زعم کہاں جبہ و دستار میں آیا

☆☆☆

احسن سلیم

فیض عالم بابر

ایسی بھی کیا تھی عجلت، احسن سلیم صاحب
حُسنِ سلوک احسن ، حُسنِ عمل مثالی
سب جانتے تھے اُنکو، سب مانتے تھے اُنکو
نقدِ عمر اپنی، لفظوں پہ صرف کردی
سب کونوازتے تھے، اجراء میں چھاپتے تھے
لقمان بھی ادب کا، ہوجان بھی ادب کا
یک دل تھے، یک زباں تھے، سب محفلوں کی جاں تھے
میں کیا جواب دوں گا؟ کب آرہے ہیں ملنے؟

ہوتے نہ ہم سے رخصت احسن سلیم صاحب
تم تھے امامِ جدّت احسن سلیم صاحب
علم و ہنر کی دولت، احسن سلیم صاحب
کتنے تھے نیک نیّت احسن سلیم صاحب
تم تھے ادب کی وحدت احسن سلیم صاحب
سب کی کہاں یہ قسمت احسن سلیم صاحب
خوش رنگ ،خوش طبیعت احسن سلیم صاحب
پوچھے جو میری فرصت احسن سلیم صاحب

☆☆☆

احسن سلیم کی نذر

آفتاب مضطر

ا: اک شخص تنہا تنہا جو انجمن تھا خود میں
ج: جدت کا ترجماں بھی، جودت کا پاسباں بھی
ر: رہوارِ فکر پر تھا جو پارکاب ہردم
ا: اجرائی دشت میں تھا، اک خود میں کارواں بھی

☆☆☆

احسن سلیم کے حضور منظوم خراج محبت

جاوید پارس

احسن سلیم تھے نہیں، احسن سلیم ہیں
'اجرأ' کے روپ میں یہیں احسن سلیم ہیں
رقصاں گلاب دیکھ کے ہوتا رہا گماں
نغمہ سرا یہیں کہیں احسن سلیم ہیں
اِس بار انقلاب ادب ہی سے آئے گا
یہ قول ہے جہاں وہیں احسن سلیم ہیں
پہلے نظر کے سامنے رہتے تھے چار سو
اب رہ میں دور دور تک نہیں احسن سلیم ہیں
یادوں کی گرد کیسا ہیولا بنا گئی
پارس بتاؤ کیا یہیں احسن سلیم ہیں

☆☆☆

احسن سلیم کے لیے

محمد مشتاق آثم

چراغ صدق وصفا اٹھائے
کہاں چلے ہو؟
نگر ہے اندھی بصارتوں کا
سماعتیں، بے مروتی کا لبادہ اوڑھے
اداس آنگن میں گھومتی ہیں
چمکتی صبحیں، اداس شاموں میں ڈھل گئی ہیں
کہ پونمیں سب اماوسوں میں بدل گئی ہیں
اندھیرا عالم کو کھا رہا ہے

مگر تمھارا لطیف لہجہ
تمھارے لفظوں کے ننھے جگنو
بساط بھر اپنی روشنی سے جہاں منور کئے ہوئے ہیں
تمھارے افکار قارئین ادب کے اذہاں کھولتے ہیں
سماں ہے، تہذیب دائرہ ہے
کہ گنگ انسان بولتے ہیں
دمک رہا ہے ادب کا اک باغ
ہر روش پر
سخن کے تازہ گلاب خوشبو بکھیرتے ہیں
یقیں ہے احسن سلیم
برزخ
ترے لئے مسئلہ نہیں ہے
کہ تیرے اندر کا نور
تیری لحد کو بھی جگمگا رہا ہے

☆☆☆

میں شاعر ہی کی حیثیت سے زندہ رہوں گا: باب ڈیلن

(نوبیل انعام یافتہ برائے ادب، سن2016)

عام خیال ہے، اور کچھ ایسا غلط بھی نہیں کہ ادب کی کیٹیگری میں نوبیل انعام پانے والوں کی اکثریت کا تعلق فکشن کے میدان سے ہوتا ہے۔ البتہ کچھ فکشن نگار ایسے بھی ٹھہرے، جو اپنی تمام تر عظمت اور اثر پذیری کے باوجود تا حال اس انعام کے حق دار نہیں سمجھے گئے، جیسے میلان کنڈیرا۔ کچھ ایسا ہی معاملہ چند شعرا کا بھی، جیسے ادونیس۔ 2016 کے نوبیل انعام برائے ادب کے اعلان سے قبل 75 سالہ امریکی گیت نگار اور گلوکار، باب ڈیلن کا نام بھی اسی فہرست میں شامل تھا، جس کے دل کش گیتوں نے کبھی تو نئی نسل کے دلوں کو محبت اور امن کے جذبے سے گرمایا، اور کبھی ان کے سینوں میں بغاوت کے شعلے بھڑکائے۔

ٹائم میگزین اس کا شمار 20 ویں صدی کی 100 اثر آفریں شخصیات میں کرتا ہے، تو بے سبب نہیں۔ وہ ان گنے چنے گلوکاروں میں شامل، جن کے البموں کی 25 کروڑ سے زاید کاپیاں فروخت ہوئیں۔ اس کے گیت انسانی حقوق کی تحریکوں میں ترانوں کی حیثیت اختیار کر گئے۔ اس کا نام ''راک اینڈ رول ہال آف فیم'' میں شامل ہوا۔ گریمی لائیو ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ اس کے حصے میں آیا۔ 24 مئی 1941 کو امریکی ریاست من سوٹا کے ایک یہودی خاندان میں پیدا ہونے والے اس فن کار نے فوک میوزک سے کیریر کیا آغاز کیا، اور وہاں شہرت کے جھنڈے گاڑے، مگر راک اینڈ رول کی دنیا میں آنے کے بعد اس نے احتجاجی شاعری اور پرسوز گلوکاری سے امریکی موسیقی کا منظر بدل دیا۔ فن میں مقصدیت کو مقدم جانے والوں کلاکاروں کی صف میں وہ جان لینن کے برابر جا کھڑا ہوا۔

باب ڈیلن نے ہمیشہ کہا: ''میں سب سے پہلے ایک گیت نگار اور پھر موسیقار ہوں، میں شاعر ہی کی حیثیت سے زندہ رہوں گا، اور ایک شاعر کی حیثیت سے مروں گا!'' اب نوبیل انعام کی کمیٹی نے بھی اس بات کا اعتراف کر لیا ہے۔ آخر میں اُس کے یادگار گیت Blowing In The Wind کا، سینئر صحافی اور شاعر، جناب احفاظ الرحمان کے قلم سے نکلا ترجمہ:

ہوا کے دوش پر
آدمی کتنی راہوں کی مسافت طے کرے
کہ آپ اُسے آدمی کا نام دے سکیں؟
سفید فاختہ کتنے سمندروں پر سفر کرے
جس کے بعد اسے
ریت پر سونے کی مہلت مل سکے؟
توپ کے گولوں کو کتنی بار
پرواز کرنی چاہیے
کہ پھر ان پر ہمیشہ کے لیے
پابندی عاید کر دی جائے؟
جواب... دوستو، اس کا جواب
ہوا کے دوش پر تیر رہا ہے

(مدیر)

☆☆☆